جلد 46 • شمارہ 07 • جولائی 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول ۔ مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ۔ مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

ہر محاذ پر کوششیں جاری ہیں مگر معاشرے میں عدم برداشت اور تشدد کا عنصر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بھائی نے بہن کو ہلاک کر دیا، بیٹے نے باپ اور بھائی کو مار ڈالا...... اور ایسی ہی خبریں آئے دن سنائی دیتی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ تشدد کا عفریت رشتوں کے تقدس کو نگل چکا ہے۔ جب گردوپیش میں ایسے واقعات ہو رہے ہوں تو بڑے بڑے واقعات بھی لوگوں کو زیادہ حیران نہیں کرتے۔ ریاستی اقدامات اپنی جگہ مؤثر اور مستحکم ہیں لیکن کیا کہا جائے کہ جب بھی حالات میں ذرا ٹھہراؤ آتا ہے، کوئی نہ کوئی بڑا واقعہ رونما ہو جاتا ہے اور اس بار تو ایک نہیں، یکے بعد دیگرے دو واقعات ہوئے ہیں جنہوں نے پوری سرکار کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ سندھ کے چیف جسٹس کے صاحب زادے کا اغوا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ تادمِ تحریر کچھ پتا نہیں کہ مغوی کن ہاتھوں میں ہے اور اغواکاروں کے کیا عزائم ہیں...... بس ایک بات سامنے کی ہے کہ عملاً کوئی بھی، کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔ عدم تحفظ کا یہ احساس بہت ہولناک ہے۔ اس کا مداوا ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ مجرم جلد پکڑے جائیں اور کیفرِ کردار کو پہنچیں۔ دوسرا واقعہ ایک عوامی فنکار کے بہیمانہ قتل کا ہے۔ نتیجہ اس کا بھی وہی ہے۔ عدم تحفظ کا گہرا ہوتا ہوا احساس...... اس کے باوجود شہریوں کی جس بڑی تعداد نے امجد صابری مرحوم کے جنازے میں شرکت کی، اس سے یہ ظاہر ہے کہ لوگ وحشت و بربریت کی بالادستی کو نہیں مانتے۔ عوامی مقبولیت کے اس عظیم الشان مظاہرے پر کسی نے خوب کہا ہے کہ اگر سیاست داں، امجد صابری کے جنازے جتنے لوگ اپنے دھرنے میں لا سکیں تو وہ ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں ہائی پروفائل وارداتوں کے مجرمان کب قانون کی گرفت میں آتے ہیں۔ معاشرے سے خوف و ہراس کی فضا ختم کرنے اور ریاستی اداروں پر عوامی اعتماد بحال کرنے کے لیے مجرموں کی تیز ترین سرکوبی وقت کی اہم ترین ضرورت بن چکی ہے۔ آیئے آپ کی تند و تیز محفل کا رخ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کون کس کی گرفت میں ہے۔

راجن پور سے زاکم علی خان گورچانی کی تاریخی حقیقت نگاری ''بہت ہی لمبے عرصے کے بعد جاسوسی میں شرکت کا موقع مل رہا ہے کیونکہ مصروفیات ہی ایسی رہیں کہ جاسوسی کو پریم پتر نہ لکھ سکے۔ بالآخر تعلیمی لیول میں ترقی اور محنت، سیاست اور محبت میں شمولیت، محبت کا عروج اور سیاست کا زوال، ان سب اچانک ہونے والے حادثات سے فراغت اس وقت حاصل ہوئی جب یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوئیں۔ تبھی میں نے ایک ایک کر کے جاسوسی کو پڑھنا شروع کیا۔ تبصرہ شروع کرنا چاہوں گا سرورق سے۔ سرورق پر انڈرورلڈ کے گینگسٹر اور قتالۂ عالم کی موجودگی چنداں حیران نہ کر پائی کیونکہ عورت اور مرد کا رشتہ ایسا ہے کہ یہ ازل سے ہی یک جان دو قالب میں ڈھلا ہوا ہے۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کا تاریخ کا طالب علم ہونے کے ناتے مجھ کو گزشتہ دنوں تجربہ بھی ہو چکا ہے کہ عورت کے سامنے مرد ہمیشہ ہی زیرنگوں رہے ہیں۔ فہرست میں آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی خوب صورتی دل کو بھائی۔ چینی نکتہ چینی میں جاسوسی کے محبوب قارئین کی شگفتہ خیزیاں اور گل کاریاں چمن میں لہلہاتے ہوئے پھولوں کے مانند لگیں۔ اداریے میں حکمرانوں کی نااہلی واضح نظر آئی۔ خدا جانے وہ دن کب آئے گا جب ان بے ڈھنگے حکمرانوں کی عارضی سطوت کے محل دھڑام سے زمین بوس ہو کر گریں گے اور غریب فاقہ زدہ مجبور و مقہور عوام کو سکھ کا سانس میسر ہوگا۔ سب سے پہلے آوارہ گرد کی جانب لپکے۔ جواں ہمت شہزی دلیرانہ وار اتنی مشکلات کا مقابلہ تن تنہا ہی کر رہا ہے۔ سے جی کو ہارا کی یوٹ پہ اتنے مسائل کا سامنا اور بے غیرت جوگی بابا کا انجام۔ ایسی ڈبا پیری جس میں پردے والی سرکار اور نام نہاد بابے شامل ہیں جن کا مستقل خاتمہ وقت کی اولین ترجیح ہے۔ انگارے بھی بہت خوب جا رہی ہے۔ تمام دوستوں کی کترنیں اور شگوفے بھی بے مثال تھے۔ اکثر پرانے قاری غیر حاضر نظر آئے۔ احمد اقبال کی لہولہان رشتے میں معاشرے کے مکروہ چہرے سے پردہ ہٹایا گیا۔ گرمی کے اس زور میں ماہِ صیام کا مکمل راج ہے۔ خدا ہمیں روزے رکھنے کی سعادت نصیب فرمائے۔'' (آمین)

نیازی، کراچی سے نعمان دانش کی دانش مندیاں ''اس دفعہ یکم جون کو دو مرتبہ بک اسٹال پر چکر لگانے پر جاسوسی نہ ملا۔ خیر بھلا ہو بڑے بھائی کا جو رات کو آتے ہوئے ڈائجسٹ لے کر آئے اور آتے ہی کہنے لگے بھائی...... شاہ زیب اور سردار کی لڑائی اس قسط میں شروع ہو چکی ہے۔ ہم نے کہا بھائی پہلے بائیک تو اندر کھڑی کرو پھر ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ خیر، انکل ہم نے جا. بی اس وقت سے پڑھنا شروع کیا تھا جب ہم نیا نیا لکھنا پڑھنا سیکھ رہے تھے اب تو آئی ڈی کارڈ بھی بننے کے لیے دیا ہوا ہے۔ (چلو شکر ہے، بڑے تو ہوئے) چینی نکتہ چینی میں رانا بشیر احمد بہت اچھے تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ احسان سحر صاحب اس دفعہ گرمی برداشت نہیں کر پائے۔ معراج محبوب عباسی صاحب کا شاعرانہ اتار چڑھاؤ پسند آیا اور چودھری سرور صاحب کی بھاگ دوڑ بہت پسند آئی، رسالہ تبدیل کرانے میں۔ افتخار حسین صاحب کی افسردگی نے ہمیں بھی افسردہ کر دیا، اللہ تعالیٰ ان کی اہلیہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ احرام زل ایک دن تو سب ہی کو جانا ہے۔ پلیز اپنے جذبات قابو میں رکھیں اور رسالہ پڑھنا مت بند کریں۔ صفدر معاویہ، مرحا گل، عمران جونانی، عابد حسین، ادریس خان اور ہمارے آبائی شہر بہاولپور سے تعلق رکھنے والے سعید عباسی کی پسند بھی بہت پسند آئی۔ رستم سیال کے چھوٹے بھائی نادر سیال صاحب آپ کو رہائی بہت مبارک ہو۔ طاہرہ گلزار اور محمد مرتضیٰ کا ڈرامائی انداز بھی بہت پسند آیا۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے مغلِ اعظم کی انگارے پڑھی۔ شاہ زیب کے جان بوجھ کر مقابلہ ہارنے پر غصہ تو بہت آیا مگر اس کی عقل مندی دیکھ کر دل اَش

آش کرا تھا۔ آوارہ گرد میں شہزی نے دشمنوں کو چنے چبوا دیے، بہت زبردست۔ رنگوں میں پہلا رنگ محمد فاروق انجم نے اچھا لکھا۔ سارہ نے مہرہ بن کر بھی بازی پلٹ دی، دوسرے رنگ میں امجد رئیس برقیلا جہنم کے بعد خونِ وفا بھی اچھا لے کر آئے مگر ہیرو سکندر کے بجائے سلیم کو ہونا چاہیے تھا۔ پہلی کہانی میں احمد اقبال کو دیکھ کر دل خوش ہوا مگر جب کہانی شروع کی تو...... افسوس کے ساتھ اقبال صاحب آپ نے دوبارہ ایسی کہانی لکھی تو پلیز اسے جاسوسی کے بجائے خاتونِ خانہ کے ڈائجسٹ میں پوسٹ کر دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔ بہرحال آپ جیسے رائٹر سے ایسی بور کہانی لکھنے کی توقع نہیں تھی۔ (حیرت ہے آپ کو کہانی پسند نہیں آئی؟) چھوٹی کہانیوں میں اس دفعہ منظر امام، سیریناراض اور تنویر ریاض نے جو دل خوش کر دیا بقیہ کہانیاں بھی اچھی تھیں، پہلی مرتبہ چبھن نکتہ چینی میں شامل ہوئے ہیں، امید ہے کہ شرفِ قبولیت بخشیں گے۔" (کیوں نہیں، آپ کی دانش مندانہ باتیں نظرانداز تھوڑی کریں گے)

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی شگفتہ کاری" ایک ماہ بلاوجہ غیر حاضری کا سبب یہی تھا کہ شگفتہ کے مطابق دوسرے احباب کو بھی موقع ملنا چاہیے۔ یہ مشورہ انتہائی موزوں ہونے کی وجہ سے قابلِ عمل ٹھہرا اور ہم نے گزشتہ ماہ تبصرہ نہیں بھیجا۔ اس کے علاوہ ماہ جولائی تاریخی لحاظ سے کافی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ ہم نے یکم جولائی کو اتیس سال کا ہونے کی بھرپور کوشش فرمائی ہے.... ادارے اور تمام قارئین کو عید کی مبارک باد۔ اس دفعہ سرورق پر جو کشیدہ کاری کی گئی، وہ دماغ کی کشیدگی کو فزوں تر کر گئی۔ یہ کوئی جڑواں بہن بھائی دکھائی دے رہے تھے جن کے سر کسی طبی پیچیدگی کے باعث آپس میں جڑے ہوئے ہوں۔ یہ سرورق شگفتہ کی جمالیاتی حس پر بھی گراں گزرا۔ (جی ہاں آج کل تو ہر حس کی پروا ہوگی آپ کو) بہرحال اچھی بات یہ کہ ہم کو چبھن نکتہ چینی میں جانے کی جلدی تھی ورنہ سرورق پر مزید عرق ریزی کی جا سکتی تھی۔ ابتدائی تبصرہ رانا بشیر احمد صاحب کا تھا۔ مختصر ضرور تھا مگر بہتر انداز میں لکھا ہوا تھا۔ احسان سحر، آپ کے دکھ اور بے جا خدشات دیکھ کر میری تو آنکھوں میں آنسو آگئے، حوصلہ کرو میرے دوست۔ معراج محبوب عباسی نے بھی اپنی بزرگی کا اعتراف کر لیا۔ اچھی بات ہے۔ افتخار بھائی کے تبصرے نے بہت دل گرفتہ کیا۔ یہ اللہ پاک کی مصلحت ہے کہ وہ بندے کو کن کن آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ مرحاگل، پہلے تو تقریباً شکریہ تبصرہ پسند کرنے کے لیے۔ دوسری بات یہ کہ جسے دنیا کہے بجا، اسے بجا سمجھو۔ آپ بھی سمجھ جاؤ بس...... کافی سمجھ دار تو واقع ہوئی ہیں آپ...... یہ شگفتہ کا کہنا ہے میرا نہیں۔ (جی ہاں شگفتہ کی رشتے داری ہے شیکسپیئر سے) ایم عمران جونانی اور محمد صفدر معاویہ کے تبصرے جاندار تھے۔ طاہرہ گلزار صاحب مجھے سخن شناسی کا زیادہ دعویٰ تو نہیں لیکن آپ کا تبصرہ ماشاء اللہ جس نے بھی لکھا ہے، اس کی محنت قابلِ داد ہے، اب آپ خود بھی کوشش کر لیا کریں۔ (یہ کیا کر رہے ہو بھائی؟) محمد مرتضیٰ صاحب بہت شکریہ برادر شادی کی مبارک باد کے لیے۔ اصل بات یہ کہ جاسوسی ڈائجسٹ میری پڑوسن اور شگفتہ دونوں پڑھتی ہیں تو میں نے کوشش کی تھی یہ بات زبان زدِ عام نہ ہو۔ لیکن شادی سے بھلا کس کو رستگاری ہے۔ سب پہلے بات کروں گا لہولہان رشتے جو اولین صفحات کی سوغات تھی۔ احمد اقبال نے کہانی میں واقعات اور کردار نگاری کو انتہائی مربوط اور شاندار طریقے سے پیش کیا۔ آج کل کے کھوکھلے اور مادی رشتوں کو صحیح معنوں میں آئینہ دکھایا۔ تین نسلوں پر محیط خود غرضی اور لالچ کی اثر انگیز داستاں۔ بس شیری اور ڈاکٹر زمان کے متعلق واضح نہیں ہوا آخر میں کہ وہ واقعی الگ ہو جاتے ہیں۔ رضیہ بیگم کا واحد کردار تھا جو مکمل اور سب کے اوپر غالب نظر آیا۔ انگارے میں سجاول اور شاہ زیب کی لڑائی توقعات سے کافی زیادہ ماٹھی رہی۔ تاجور کی گھر واپسی خوش آئند اور جاناں کی شاہ زیب کے ساتھ دوبارہ ڈیرے پر آمد اچھی نہیں لگی۔ آوارہ گرد کی رفتار اتنی ہے کہ پڑھتے پڑھتے دماغ کی چولیں ہل جاتی ہیں۔ مختصر کہانیوں میں سرور اکرام کی ایک پرانی کہانی اور جڑواں کا مطالعہ کیا۔ ایک پرانی کہانی میں واقعی حقیقت کا رخ دکھایا گیا کہ اب انسان کو کچھ حاصل کرنے کے لیے ایمان داری ہی نہیں بلکہ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں بھی مارنا ضروری ہے خرگوش کی طرح۔ جڑواں میں منظر امام صاحب نے حسبِ روایت بہت ہی شگفتہ تحریر پیش کی اور غیر متوقع انجام سے چونکا دیا۔ مترجم کہانیوں میں جمال دستی کی حسن پرست کا مطالعہ کیا۔ یہ کہانی کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ سکی۔ بہت ہی عامیانہ طریقے اور کسی بھی سسپنس کے بغیر قاتل تک لے گئی۔"

کراچی سے ادریس احمد خان کی پسندیدگی" جاسوسی ڈائجسٹ حسبِ معمول اپنے وقت پر دستیاب ہو گیا۔ بلاشبہ سرورق بھی توقع کے عین مطابق پایا۔ اندر چبھن نکتہ چینی میں اداریے کے بعد رانا بشیر احمد براجمان ہے۔ دیگر دوستوں کی حاضری بھرپور تھی۔ سب سے پہلے کہانیوں میں احمد اقبال کی لہولہان رشتے پڑھی، خوب صورت کہانی تھی۔ حقیقی رشتے جب تکلیف دہ ہو جاتے ہیں تو دل کو ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ رشتوں کو دور کرنے میں بنیادی وجہ دولت ہے جو اچھے بھلے رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہے۔ حرص و ہوس میں انسان کو حقیقی رشتے نظر نہیں آتے اور ان پُرخلوص و اپنائیت بھرے رشتوں کو اپنے ہاتھوں پامال کر دیتے ہیں۔ سیریناراض کی نئی منزل بہتر تحریر تھی۔ منظر امام کا جواب نہیں جو مزاح کی آڑ میں بھی اپنی تحریر کو بامعنی بنا دیتے ہیں جس سے تحریر کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے، بہت خوب اور مبارک باد منظر امام صاحب، خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ جڑواں ایسی ہی کہانی تھی، مزہ آگیا۔ حسن پرست بھی ایک اچھی کہانی تھی جس میں ایک بہن نے جوشِ رقابت میں اپنی بہن کو موت سے ہمکنار کیا مگر قانون کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکی۔ اس کے بعد مقبول کہانی انگارے تھی، واقعی ایک بار شروع کرنے پر پھر ایک ہی نشست میں پوری پڑھے بغیر اور کسی مصروفیت کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ ایسی تحریر کا سحر عرصے تک طاری رہتا ہے۔ اس مہینے کی قسط میں تحریر سے نگاہیں اٹھانے کو بھی دل نہیں چاہا جب تک تحریر کا آخری لفظ نظروں کے سامنے رہا۔ خواب ناک نے بھی کافی محظوظ کیا۔ ادھورا مشن بھی بہتر لگی۔ بے خبری میں ایک چھوٹے سے نکتے نے قاتل کا چہرہ واضح کر دیا جس کے اپنے کہے گئے الفاظ نے ہی لیلا کو پابند سلاسل کر دیا جس نے بے خبری میں اپنے بولے گئے جملے سے اپنے قاتل ہونے کا اعتراف کر لیا۔ آوارہ گرد بھی جاری و ساری ہے اور دلچسپی سے پڑھی جا رہی ہے۔ ایک پرانی کہانی نے بھی لطف اندوز کیا۔ گمنام خط اور مہرہ اچھی کہانیاں تھیں۔ خونِ وفا بس واجبی سی لگی۔"

قیصر اقبال کچھ کی کلول، ضلع بھکر سے کہانیاں" دس جون کی شدید گرمی میں جاسوسی کا دیدار ہوا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق سرورق کی حسینہ کو

پرہیزی نگاہ سے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ ہماری پرہیزی نگاہ کوئی اور گل کھلاتی، ہم نے صفحہ پلٹ کر فہرست پھلانگی اور اپنی محفل کے دروازے پر دستک دی۔ رانا بشیر صاحب نے جھٹکے جھٹکے انداز میں دروازہ کھولا۔ شاید یہ صدارت کا بوجھ تھا۔ احسان صاحب پاناما لیکس کے زیرِاثر کچھ چہروں کی نقاب کشائی کرتے نظر آئے۔ معراج عباسی اپنے سفید ہوتے بالوں کا رونا روتے نظر آئے تو چوہدری سرفراز رسالے کے صفحات آگے پیچھے ہونے پر نالاں۔ معذرت معاویہ بھائی! آپ نے محبت سے یاد کیا اور ہم چلے آئے۔ مرحا گل کی لمبی تقریر سننے کا کام ایم عمران جونانی کے ذمے لگایا اور دل پر پتھر رکھ کر طاہرہ گلزار آنٹی کا خطاب سنا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے احمد اقبال کی لہولہان رشتے پڑھی۔ احمد اقبال کے مخصوص کٹیلے انداز میں رشتوں کو ناسور کی طرح ختم کرتی بے حسی کی ایک عمدہ روداد تھی لیکن اختتام قدرے تشنہ سا لگا۔ انگارے کی اس قسط کا شاہ زیب اور سیالکوٹی کی فائٹ کی وجہ سے شدت سے انتظار تھا۔ فائٹ کا انجام سوچ کے عین مطابق ہوا۔ سجاول اور شاہ زیب کے بڑھتے ہوئے مراسم کہانی میں کئی سنسنی خیز موڑ لا سکتے ہیں جن کا بے صبری سے انتظار ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ مہرہ ہوسِ زر کے گرد گھومتے کرداروں کی ناکام حسرتوں کا احوال تھا۔ تحریر کافی بہتر تھی۔ دوسرا رنگ خونِ وفا، امجد رئیس کی تحریر میں سنسنی اور تجسس اپنی جگہ زبردست ہے۔ لیکن ہمارا ذہن آغاز ہی میں اصل مجرم تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ آوارہ گرد کی آوارہ گردیں انڈیا میں عروج پر ہیں۔ پرت در پرت کھلتی اس تیز رفتار داستان کے مزید واقعات اور انکشافات کا انتظار ہے۔ سیریناراض کی نئی منزل میں آخر کار جان نئی منزل کے سفر پر روانہ ہو ہی گیا۔ سید علی ارسلان کی خواب ناک سوئی ناک کے پس منظر میں گھومتی بہترین انجام کی کہانی پسند آئی۔ جرم وسزا اور سراغ رسانی کے گرد گھومتی......تنویر ریاض کا ادھورا مشن ایک پُراثر تحریر ثابت ہوئی۔“

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی تبصرہ نگاری ”جاسوسی کا شمارہ چار تاریخ کو موصول ہوا۔ ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی دنیا کی حقیقی تصویر سامنے آگئی۔ واقعی انسان بھی ڈبل چہرہ رکھتے ہیں۔ نظروں کے سامنے کچھ ہے اور اندر سے کچھ اور یہی تو دھوکا دہی ہے اور ایک انسان سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ آخر کون اس کے ساتھ اس قدر گھناؤنا کھیل کھیل رہا ہے۔ جیسے سرورق کی آخری کہانی میں بے چاری چاندنی چکور کے چکر میں شپٹا کر رہ جاتی ہے۔ آوارہ گرد میں شہزی کی سمندر سے جان چھوٹی تو ایک عجیب قسم کے خوفناک شخص سے پالا پڑ گیا جو شہزی اور سوشیلا کا خون چوس لینا چاہتا تھا مگر وہ بھی جان سے گیا۔ شکر ہے اک مسیحا نے ان کا علاج کیا اور کچھ ہوش وحواس ٹھکانے آئے۔ انگارے میں شاہ زیب نے کشتی تو لڑی لیکن عین موقع پر ہار مان کر اپنے آپ کو منوا لیا اور سجاول کی باپ دادا کی طرف سے ملنے والی یا استعمال کرنے والی پُراسرار طاقت دھری کی دھری رہ گئی۔ ماحول دوستانہ ہو گیا۔ تاجور اور پہلوان بھی اللہ اللہ کر کے اپنے گھروں کو پہنچے۔ شاہ زیب کا دل تو پسیجا لیکن اب جاناں نے کسی حد تک تاجور کی جگہ لے کر شاہ زیب کو سنبھال لیا ہے۔ لہولہان رشتے بھی عمدہ رہی۔ حمید نے زیورات کے لالچ میں اپنی ماں اور ملازم کا خون کر دیا لیکن ڈرامائی طور پر خدا بخش بچ گیا اور حمید کے گلے کا پھندا ثابت ہوا اور خدا بخش نے اپنے نمک کا حق ادا کر دیا۔ مغرب سے آئی گمنام خط بھی اچھی رہی۔ سائدرہ نے انتقام لینے کے لیے اپنی طرف سے ہی گمنام خط لکھ ڈالا اور اس کے نزدیک سامنے سے انتقام لینے کے بجائے درپردہ انتقام لیا جائے جس میں وہ کامیاب ٹھہری۔ کبیر نے پیسوں کے لالچ میں سارا کو مہرہ بنایا تو وہ اس میں خود ہی پھنس گیا۔ سارا نے الٹی چال چل کر احتشام کو اس کے مجرم بھی پکڑا دیے اور دو کروڑ بھی برآمد ہو گئے، ساتھ میں منا مل کو کبیر جیسے غلط شخص سے بچا لیا۔“

ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کی خبریں ”نکتہ چینی نیوز کے اس بلیٹن میں ویلکم بیک۔ سب سے پہلے ہماری پوری ٹیم کی جانب سے ہمارے معزز ناظرین کو آمدہ عیدالفطر مبارک۔ جاسوسی کے ٹائٹل کے حوالے سے ہمارے نیوز ڈیسک نے رپورٹ تیار کی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں۔ اس بار کے سرورق کی اگر بات کی جائے تو چہرہ در چہرہ، گردن در گردن اور کھوپڑی در کھوپڑی بنا ہوا تھا جب دیر تک ہم دونوں کو الگ نہ کر پائے تو پستول بدست سے مدد مانگی لیکن اس نے یہ کہہ کر کہ محبت، جنگ اور سرورق میں سب جائز ہے، رپورٹنگ ٹیم کو ٹکا سا جواب دے دیا۔ کیمرا مین خدا بخش کے ساتھ اللہ بخش چوہدری یعنی اے پی سی نکتہ چینی نیوز خاص سرورق۔ ملک جاسوستان سے بریکنگ نیوز ہے کہ رانا بشیر احمد ایاز سکنہ ناظم آباد، کراچی کو تخت نشین ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اہالیانِ سلطنت کی جانب سے اور ہماری ٹیم کی جانب سے مبارک باد منزلِ مراد۔ لیکن دوسری جانب ولی عہد، جناب احسان سحر بے جا خدشات میں گھرے نظر آئے جس کی وجہ انہوں نے ہمارے نمائندے کو درباریوں کا دوغلا پن بتایا۔ جناب عاجزانہ ومخلصانہ مشورہ ہے جو کوئی ایسا کر رہا ہے اسے اس کے حال تے چھوڑ دو۔ کیچڑ میں پتھر مارنے سے کاٹن کا سوٹ تو اپنا ہی خراب ہوتا ہے ناں؟ افسوسناک خبر ہمارے ساتھی افتخار صاحب کی شریکِ حیات کی وفات پر نیوز ٹیم ان کے غم میں برابر کی حصے دار ہے۔ اللہ مرحومہ کو جنت اور پسماندگان کو صبر دے۔ نکتہ چینی نیوز کی جانب سے کوریج نہ ملنے پر مرحا گل کا شکوہ۔ محترمہ میں نے اس کا ازخود نوٹس لے لیا ہے اور ذمہ داران کو کٹہرے میں لایا جائے گا۔ نادر سیال مبارک باد میری طرف سے جون میں ہی آزادی مبارک۔ محبت میں فراق کی گھڑی آن پہنچی، دو ہنسوں کا جوڑا بچھڑ گیا رے۔ بالآخر دو لونگ برڈز جدا ہو گئے۔ جی ہاں ہم آپ کو خبر دے رہے ہیں کہ شاہی کو تاجور سے جدا ہونا ہی پڑا۔ تاجور اپنے ماں باپ کے پاس اور پہلوان اپنے گھر جبکہ یاسر کا نقاب اترنے پر جاناں شاہ زیب کے سنگ۔ یہاں بڑی خبر دیں آپ کو۔ آوارہ گرد ہیرو شہزادو نے دشمن کو خاک چٹا دی ہے اور اپنی پارٹنر سوشی کے ساتھ مل کر دشمن کے ناک میں دم کرنے والا ہے لیکن آخری لائن میں تھی بات کی کھوج لگانے کے واسطے آپ کو کرنا ہو گا انتظار۔ ایک اور خبر دیں آپ کو کہ ڈراما آرٹسٹ چاندنی کو دھمکانے والی قاتلہ چکور عرف کرن پکڑی گئی۔ کرن پر چاندنی کو دہشت زدہ کرنے کے ساتھ ساتھ سلیم کو زخمی، جمیل کو مارنے کا الزام ہے جبکہ ملزمہ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ چاندنی کی بہترین ہمراز سہیلی تھی۔ یعنی نفسیاتی پہلو۔ ساتھ ہی چاندنی کی جان بچانے کا سہرا دانش کے پیکر سکندر کے سر ہے اور ساتھ ہی دوسرا سہرا بھی۔ چینی نکتہ چینی نیوز نے خواب ناک کے نکاح نامہ، معذرت کے ساتھ ناک نامہ کی کاپی حاصل کر لی ہے۔ کاپی کے متن میں ایثار وقربانی پر زور دیا گیا ہے اور بتایا

گیا ہے کہ اگر آپ ایب نارمل ہیں اور عوام کی کوئی اور خدمت نہیں کر سکتے تو بیوی کا صدقہ کر دیا کریں۔''

ملتان سے شیخ وقار احمد کی نکتہ چینی ''بے شک یہ آپ کے ماہناموں کا ہی کمال ہے کہ جون کی آگ برساتی دوپہریں ٹھنڈی میٹھی ساعتوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ سرورق اپنی روایات برقرار رکھتے ہوئے دلکش اور دلنشیں تھا۔ حسین چہرے کی مسکراہٹ اور عیار چہرے کی آنکھوں کا تاثر بلاشبہ مصور کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ چینی نکتہ چینی میں آپ کے مختصر مگر اثر انگیز استقبالیے نے کروڑوں مجبور پاکستانیوں کی ترجمانی کی پھر اپنے ہم ذوق دوستوں پر نگاہ کی تو رانا بشیر احمد ایاز کو اپنے طویل نام اور مختصر تبصر کے ساتھ فتح کا جھنڈا لہراتے دیکھا۔ ان کو سراہتے ہوئے آگے بڑھا تو احسان صاحب بڑے دل جلے نظر آئے۔ احسان صاحب آپ کے لیے ایک حقیر سا مشورہ ہے دل جلانا چھوڑ دیں۔ دو چار لوگوں کی ہرزہ سرائی سے ہمارے پیارے راج دلارے جاسوسی کا کچھ نہیں بگڑنا باقی حق رائے وہی کی اجازت ہے جو چاہے کہے۔ معراج محبوب عباسی کا تبصرہ کم تجزیہ بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ چوہدری محمد سرفراز صاحب آپ کا تبصرہ مع میٹھے سے شکوے کے بہت اچھا تھا۔ افتخار حسین اعوان صاحب اللہ آپ کو صبر جمیل اور مرحومہ کو بلند درجات عطا فرمائے، آمین۔ مرحا گل آپ نے میرے تبصرے کو پسند کیا۔ مہربانی، آپ بھی قلم کا استعمال جانتی ہیں۔ نادر سیال کو دل کی گہرائی سے آزادی کی عید مبارک اللہ کرے ان کی زندگی میں یہ صورت حال دوبارہ نہ آئے۔ طاہرہ گلزار اور ایم عمران کے تبصرے بھی جاندار تھے اور کئی باریکیوں کی طرف دھیان دلاتے تھے۔ احمد اقبال کی لہولہان ایک عمدہ کہانی تھی جس میں اعلیٰ طبقے کی ادنیٰ حرکات پر روشنی پڑی۔ زر، زمین، زن ہر جگہ فساد کی جڑ ہیں۔ سیر بنا راض کی نئی منزل نئی شادی کا عندیہ دے رہی تھی، زندگی اسی کا نام ہے آگے بڑھنا۔ جمال دستی کی حسن پرست اور سلیم انور کی بے خبری ایک جیسی ہی تھی۔ دو صفحات میں ہی ملزم سے مجرم کا فاصلہ طے ہو گیا۔ یہ مغربی سراغ رساں کتنی مہارت اور پھرتی سے کتنا درست نتیجہ نکالتے ہیں۔ علی ارسلان کی خواب ناک بڑی خوب ناک لگی یہ کہانی۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے لکھی گئی ہو گی کہ اب تو ایسی اولاد ملنا ہی ناممکن ہے جو ماؤں سے ایسی والہانہ محبت کرے کہ بیوی میں بھی ماں کی شباہت تلاش کریں۔ تنویر ریاض کی ادھورا مشن اپنے نام کی نسبت تشنگی چھوڑ گئی۔ ایرلین اسٹارک کا انجام بڑا دردناک تھا۔ اس کے اور دوسری معصوم لڑکیوں کے مجرم کو معقول سزا ملنی چاہیے تھی۔ آوارہ گرد میں شہزاد عرف شہزی عجیب و غریب حالات میں پھنس گیا ہے مگر کہانی میں دلچسپی کا عنصر بھی بڑھ گیا ہے۔ کہانی میں بہت سی باتیں وضاحت طلب تھیں امید ہے اگلی قسط میں ان کا مداوا ہو جائے گا۔ پہلا رنگ مہرہ ایک اچھی کہانی تھی مگر اختتام کافی فلمی انداز سے ہوا۔ کیپر پرانا اندھا اعتماد احتشام بیگ جیسی فطرت والے سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ خون وفا میں امجد رئیس نے جاسوسی اور سسپنس کو آخری حصے تک برقرار رکھا مگر کرن کے چھوٹے چھوٹے جملے اس کو کہانی کے شروع سے ہی مشکوک کر گئے تھے اس لیے اینڈ نے اتنا نہ چونکایا۔''

ڈسٹرکٹ جیل اٹک سے اسرار بشیر ساقی کی نیک خواہشات ''اس ماہ کا شمارہ 7 تاریخ کو ملا۔ شدید گرمی میں ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ سرورق کو دیکھا، بڑا عجیب لگا دو دھڑ اور ایک سر اچھا تھا۔ دوستوں کی محفل میں تشریف لائے تو رانا بشیر احمد ایاز کو براجمان پایا۔ احسان سحر آپ کو بھی چھوٹی مبارک۔ مذاق کر رہا ہوں۔ بھائی برا مت ماننا۔ اس کے علاوہ محترم جناب معراج محبوب عباسی کا تبصرہ کافی جاندار تھا۔ چوہدری محمد سرفراز صاحب آپ کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ آپ نے شمارہ تبدیل کراتے کراتے بڑی دیر کر دی کیوں بھائی بک ڈپو دور ہے یا کوئی اور بات تھی۔ ملک افتخار حسین اعوان صاحب اللہ تعالیٰ آپ کی بیوی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ آپ کا تبصرہ کافی اچھا تھا۔ احرام زل آپ تبصرہ تھوڑا بڑا لکھا کریں آپ اچھا لکھتے ہیں۔ محمد صفدر معاویہ صاحب آپ بہت خوب صورتی سے الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں۔ آپ کے تبصرے کافی جاندار ہوتے ہیں۔ مرحا گل آپ کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ ایم عمران جونانی صاحب کا تبصرہ بھی اچھا تھا، عابد حسین، ادریس احمد خان، سعید عباسی سب بھائی لوگوں کا تبصرہ بڑا ودھیا تھا۔ نادر سیال بھائی آپ کو رہائی کی بہت بہت مبارک ہو، ہمارے لیے بھی دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو معاف کرے اور جلد از جلد اس قید سے رہائی نصیب فرمائے، آمین۔ تبصروں کی رانی جن کا ذکر کیے بغیر تبصرہ نہیں لکھا جا سکتا... محترمہ طاہرہ گلزار صاحبہ آپ کے تبصرے کافی جاندار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مثال اینڈ نوال، شفقت محمود صاحب، انور یوسف زئی صاحب اور دونوں شاہ صاحب سید عبادت حسین اور سید شکیل حسین شاہ جی آپ کے بغیر تو محفل ادھوری لگتی ہے۔ ٹائم کی کمی کی وجہ سے ابھی اپنی پسندیدہ اسٹوری انگارے پڑھی ہے۔ سجاول اور شاہ زیب کی لڑائی شاندار تھی۔''

سینٹرل جیل میانوالی سے سجاد خان آف موچھ کی مسکان پسندی ''ماہ جون کا جاسوسی 11 تاریخ کو ملا۔ پھر بھی خط لکھنے کی ناکام سی کوشش کر ڈالی تاکہ دوستوں کی محفل میں حاضری دے سکوں۔ چینی نکتہ چینی میں تو شگی ڈرون ایک پر توجہ کناں نظر آئے۔ ہماری تو سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہو گئی ہے اور حکمرانوں کو ہوش بھی نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں اس ماہ رمضان کے صدقے اللہ پاک پاکستان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے گا انشاء اللہ۔ اب چلتے ہیں محفل میں سب سے پہلے رانا بشیر احمد ایاز نام تو نیا لگ رہا ہے لیکن کھلاڑی پرانا ہے۔ معراج محبوب عباسی صاحب بہت افسوس ہوا یہ سن کر کہ آپ کے بال نامیمائنڈ کی وجہ سے سفید ہو گئے۔ مجھے تو لگتا ہے بالوں کی جڑوں تک اثر ہوا ہے۔ صفدر معاویہ بھائی زندگی ہنسی مذاق کے ساتھ گزر جائے تو اچھا ہے۔ گل بہت شکریہ آپ نے گہرائی سے تبصرہ پڑھا ویسے میں نہ اتنا گہرا ہوں نہ گہرا لکھتا ہوں۔ شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ نادر سیال سے ویسے بھی نوک جھوک ہوتی ہے۔ ایم عمران جونانی بہت شکریہ تبصرہ پسند کرنے کا۔ اوہ نادر سیال مبارکاں مبارکاں آپ کی صلح ہو گئی ہے اور ہاں بھائی ایک احسان کرنا ہم سب پر جو کہانی لکھ رہے ہو وہ اگر خون کے آنسو رلانے والی ہے تو پلیز دریائے سندھ کی نذر کر دو۔ طاہرہ گلزار صاحبہ 230 سال کسی اور کی عمر کہی تھی آپ محبوب عباسی صاحب کو خواہ مخواہ طیش دلا رہی ہیں۔ کہانیوں میں انگارے پڑھی، بہت اچھی جا رہی ہے۔ تاجور پھر ملے گی شاہ زیب کو کہانی مزید نئے کرداروں کے ساتھ مزہ دے گی۔ دوسرے نمبر پر آوارہ گرد پڑھی، شہزی اچھا جا رہا ہے نئے کردار شامل ہوں گے آخر میں سب دوستوں کو ایڈوانس عید مبارک۔''

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی مبارک باد ''جون کا شمارہ 2 تاریخ کو ہمیں سرور بیں کراچی سے ملا۔ سرورق کو عجیب طریقے سے سجایا گیا تھا۔

صنفِ نازک اور صنفِ وجاہت کا چہرہ مکس کر دیا گیا۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ سچ کہا، مقاصد نامعلوم سہی پر ہیں زہر آلود۔ اصل میں امریکا، بھارت، اسرائیل ایسے ممالک ہیں جو پاکستان کو خوش حال نہیں دیکھ سکتے۔ دہشت گردی کہیں بھی ہو نام پاکستان کا اول نمبر پر۔ اپنی محفل میں آئے تو رانا بشیر احمد ایاز کو خوب صورت تبصرہ کے ساتھ پایا۔ مبارکاں جی۔ میانوالی کے احسان سحر بھی عمدہ تبصرے کے ساتھ محفل میں موجود تھے۔ معراج محبوب عباسی کا انداز بہت پسند آیا، اچھا تبصرہ لکھا۔ چوہدری محمد سرفراز کی بھی عمدہ حاضری۔ بھائی افتخار حسین آپ پر جو سانحہ گزرا، واقعی بہت بڑا نقصان ہے۔ اللہ پاک آپ کی زوجہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ کو صبرِ جمیل اور اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ احرام زل حسین کی محبتیں اچھی لگیں۔ مرحا گل بہت ہی پیارے انداز میں تبصرہ کرتی نظر آئیں۔ آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ جونانی بھائی کی اچھی حاضری۔ عابد حسین بہت نوازش بھائی چار چاند والی بات تو ٹھیک پر کبھی چودہ طبق ہی روشن نہ ہو جائیں۔ ادریس احمد خان، سعید عباسی کی عمدہ تبصرہ نگاری، نادر سیال بھائی آپ کو بہت مبارک ہو رہائی کی۔ دل سے خوشی ہوئی مجھے۔ اب کندیاں کا چکر لگا تو ملوں گا آپ سے۔ جھنگ سٹی سے محمد مرتضیٰ کا بہت پیارا انداز۔ کہانیوں میں سے... پہلے انگارے پڑھی۔ سسپنس سے بھرپور رہی یہ قسط۔ سجاول اور شاہ زیب کا ٹکرانا، پہلوان اور تاجور کو بہ حفاظت گھر پہنچانا، جاناں کا واپس آجانا، شاہ زیب کا ماضی بھی کھولتے ہوئے وہیں شاہ زیب اور سجاول میں انڈرسٹینڈنگ بھی پیدا ہو رہی ہے۔ آخر میں وڈے صاحب کے لیے عجیب تحفہ، اگلی قسط کا انتظار ہے۔ آوارہ گرد بھی بہت فاسٹ جا رہی ہے۔ اپنے اور ملک دشمنوں کو بھاری پڑ رہا ہے شہزی۔ سرورق کی پہلی کہانی محمد فاروق انجم کے قلم سے۔ بہت ہی سیدھی سی تحریر اچھی لگی۔ کبیر نے سارہ کو دھوکا دیا تو اس نے منال کو اغوا کر کے بساط ہی پلٹ دی۔ کبیر اور تومی دونوں کو لالچ لے بیٹھا۔ منال کا چھوٹا سا کردار اچھا رہا۔ امجد رئیس کے قلم سے دوسرا رنگ خونِ وفا کافی دلچسپ کہانی تھی۔ کرن جو کچھ کر رہی تھی، آخر تک یقین نہیں آیا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے چاندنی کے ساتھ بلکہ جمیل کو مار ڈالا سکندر کی بروقت آمد نے چاندنی اور سلیم کو بچا لیا۔ کوئی کسی سے ایسی محبت بھی کرتا ہوگا کہ اس کی خاطر بندہ ہی مار ڈالے؟ ابتدائی صفحات پر احمد اقبال کے قلم سے لہولہان رشتے آئی۔ کافی اچھے پیرائے میں معاشرتی پہلو اجاگر کیے گئے۔ آج کل کے دور کے حمید نے دولت کے لیے ماں کو مار ڈالا۔ میں شاک میں تھا لیکن یہ صرف لفظوں میں نہیں حقیقت میں دنیا میں ایسا ہو رہا ہے۔ خدا بخش نے خوب وفاداری نبھائی۔ میر ریاض کی نئی منزل اچھی تحریر تھی۔ منظر امام کی جڑواں میں خرم کی قسمت، جمال دتی کی حسن پرست اچھی رہی۔ خواب ناک ایوبی تھی۔ تنویر ریاض کی ادھورا مشن اور سلیم انور کی بے خبری بھی اچھی رہیں۔ سرور اکرام کی ایک پرانی کہانی بھی اچھی تھی۔ بابر نعیم کی گمنام خط بھی اچھی رہی۔ کترنوں نے بھی لطف دیا۔ تمام اہلِ اسلام کو پہلے رمضان مبارک اور پھر عید مبارک۔''

درابن کلاں سے مرحا گل کی باتیں ''جاسوسی اس مرتبہ 10 کو ملا۔ دوپہر کے چار بج کر 15 منٹ پر ہلکی ہلکی بوندا باندی میں ایسا لگا جیسے وقت سے پہلے افطاری ہو گئی ہو۔ جی بالکل بہت محبت ہے۔ ٹائٹل پر نظر ڈالی تو بے اختیار آہ نکل گئی۔ اداریہ پڑھا تو دل و دماغ دکھ سے بھر گیا۔ غریب عوام روٹی کو ترس رہی ہیں اور حکمرانوں کے آف شور کمپنیز ختم ہونے کا نام نہیں لے رہیں۔ دوستوں کی محفل میں سب سے پہلے مرحا گل کے تبصرے کو شرف بخشا۔ شکریہ جناب۔ رانا بشیر احمد کا مختصر تبصرہ اتنے منجھے انداز میں لکھا تھا کہ گمان ہونے لگا کہ کافی پرانے تبصرہ نگار ہیں موصوف مبارک باد اینڈ ویلکم۔ احسان سحر کی واپسی اچھی لگی۔ آپ کے خدشات بے جا نہیں ہیں بس کچھ لوگوں کی سوچ اتنی گندی ہو گئی کہ فیس بک پر ڈالنے سے گریز نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کا قلع قمع کر دینا چاہیے پھر محفل میں خوشامدیں کرتے پہنچ جاتے ہیں۔ بس اپنا دامن ایسے غلیظ لوگوں سے بچانا چاہیے۔ چوہدری سرفراز صاحب کسی کے جذبات انڈین ڈرامے کہہ کر مجروح نہیں کرتے، آپ کا تبصرہ بھی تو نال قلم کا منظر پیش کر رہا تھا۔ انڈین ہو یا پاکستانی آپ کو نہیں پڑھنا چاہیے تھا، باقی آپ خود سمجھ دار ہیں۔ افتخار حسین کا تبصرہ پڑھ کر دل کافی دکھی ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے آمین۔ اتنی مختصر مدت یقین نہیں آ رہا۔ موت اتنی بھی ظالم ہو سکتی ہے یقین نہیں آ رہا، یکے بعد دیگرے ہم سے پیارے رشتے چھین رہی ہے۔ محفل کے سب دکھی دوستوں کو اللہ تعالیٰ صبر دے آمین۔ احرام زل کا معصوم سا تبصرہ دل میں کھب گیا ویسے مریم بھابی سے کیا مراد؟ مریم کے خان ہیں ہمیں تو مریم کے خان کا اندازِ تحریر کاشف زبیر صاحب سے کافی ملتا جلتا ہے۔ نجانے کیا گورکھ دھندا ہے۔ (جی مریم کے خان، مسز کاشف زبیر ہیں) محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ ایک خوشگوار موسم کی طرح لگا۔ ایم عمران جونانی صاحب شاباش یونہی حاضری دیتے رہا کریں۔ ویسے ہم بھی کہانی 30 اقساط والی بات سے متفق ہے۔ نادر سیال صاحب سب سے پہلے آپ کو رہائی کی مبارک باد۔ طاہرہ آنٹی کی غلطی دور ہو گئی سو انسان خطا کا پتلا ہے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ ہم تو مر کر بھی یہ غلط فہمی نہیں کر سکتے، دونوں اپنی اپنی جگہ پر ہٹ تحریر لکھتے ہیں۔ 'تھے' ماننے کو دل تیار ہی نہیں کاشف زبیر صاحب کے بارے میں باقی طاہرہ آنٹی کا تبصرہ سپر ہٹ تھا۔ محمد احتشام مرتضیٰ کو اتنے عرصے بعد محفل میں دیکھ کر جو خوشی ہوئی بیان نہیں۔ ادریس احمد خان واقعی قسمت بنانے والا تو اوپر والا ہے۔ بس ذرا کہانی تھی اس لیے چل چلا گئی۔ عابد حسین کی سادگی تو سادہ سے بھی سادہ تھی بھئی کیا شگوفے بھیجے تھے جو پوچھنا پڑا۔ معراج محبوب عباسی کے شاعرانہ تبصرے نے مزہ دیا۔ عباسی صاحب کا تبصرہ کافی سے بھی کافی زیادہ اچھا لگا۔ اس مجرم کو آخرت کی عدالت میں سزا ملے گی۔ سخت گرمی میں انگارے کو گرم انگاروں کے طور پر پڑھا مگر یہ کیا...... اوپر سے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے آنے لگے۔ انگارے کہیں بھی نہ تھے۔ درابن کا موسم اکثر دوپہر کے وقت سہانا ہو جاتا ہے تاجور کے بچھڑتے وقت دل کو کچھ ہوا۔ کافی غمگین قسط تھی، اداس کر گئی۔ اب شاید ہی جلد از جلد مل پائیں تاجور اینڈ شاہی۔ اس مرتبہ کافی مختلف لڑائی تھی۔ بہر حال شاہی نے لڑائی روک کے عقل مندی کا ثبوت دیا۔ خونِ وفا نہایت سنسنی خیز رنگ تھا۔ چاندنی کی طرح حواسوں میں چھایا رہا۔ کرن پر کافی غصہ آیا۔ چاندنی اینڈ کرن کے ملاپ سوری سکندر کے ملاپ نے دل خوش کر دیا۔ جمیل اینڈ سلیم بے چارے مفت میں جان سے گئے۔ محمد فاروق انجم کا رنگ ایک شاندار رنگ تھا۔ شوخی سے بھرپور۔ کبیر کو تو اچھا ہوا سزا مل گئی۔ منال پر البتہ افسوس ہوا۔ احتشام بیگ کو بھی اس کے کرتوتوں کی سزا ملنی چاہیے تھی۔ منظر امام کی کہانی آخر میں افسردہ کر گئی۔ ہمیشہ سے ہٹ کر تحریر لکھتے ہیں ہر مرتبہ ویل ڈن جناب۔ آوارہ گرد بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اور اب کہانی میں کافی بہتری آ گئی ہے۔ ایچ اقبال سے کوئی تحریر لکھوائیں عرصہ ہوا ایچ اقبال کی تحریر پڑھتے ہوئے۔'' (لیجیے آپ کی خواہش پوری ہو رہی ہے)

میانوالی سے احسان سحر کی تجویز ''چھٹیوں کے دن ہیں یارو، لمبی دوپہریں، گرم دوپہریں، والد صاحب بینک سے واپس آتے ہوئے اپنے

ساتھ ہمارے ہمدرد کو لیتے آئے۔ سگار پیتے ہوئے معنی خیز نظروں سے گھورتے پائے گئے۔ پستول کا دیدار اور صنفِ نازک کا مسکرانا، دل کو بھی ہنسانے پر مجبور کر گیا۔ بہت سے پھول اپنی جگہ خوب صورتی کا احساس جگا رہے تھے۔ کس کا دیدار کروں یہی کشمکش جاری رہی، لیکن پہلے پھول نے آخر متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا وہ تھے جناب رانا بشیر احمد، مبارکاں۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے اچھے رہے۔ پہلی کاوش احمد اقبال صاحب لائے۔ رشتے واقعی لہولہان تھے۔ دولت کی ہوس میں جتلا...... ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں جتلا۔ جسم کی ہوس میں جتلا۔ ہر کردار میں ہوس ہی ہوس نظر آئی۔ انگارے کی یہ قسط اچھی رہی۔ آخر مقابلہ شروع ہو کر ختم ہوا۔ تاجور اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔ ایک اور بلا شاہ زیب کے گلے پڑ گئی اب نئے مشن پر گامزن اگلی قسط کا انتظار ہے۔ دوسرا رنگ...... کافی سسپنس فل اور دلچسپ رہا۔ دوستی، محبت، حسد پر مبنی جاری جنگ تمام ہوئی۔ کرن کا پختہ کردار اچھا لگا۔ دوستی جیسے مقدس رشتے میں اگر حسد اپنے پنجے گاڑ لے تو پھر سب کچھ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ منظر امام جڑواں لائے، جیسا سوچا جائے ضروری نہیں کہ ویسا ہی ہو۔ جھوٹ کی آخر سزا تو ملتی ہے پرنس خرم کو آخر سزا مل ہی گئی۔ پہلا رنگ، مہرہ، دولت کا نشہ انسان کے حواس چھین لیتا ہے، خود غرضی کا منہ بولتا ثبوت اور کردار کبیر بھی دولت کی خاطر ہر حد پار کر گیا۔ حسن پرست مختصر مگر ذہانت سے بھرپور اچھی کاوش ثابت ہوئی۔ خواب ناک اچھوتے اور نئے موضوع کی حامل کہانی نے کافی گہرا اثر چھوڑا۔ سید علی ارسلان منجھے ہوئے پرانے رائٹر ہیں، امید ہے آتے جاتے رہیں گے۔ ادھورا مشن بروک کی دوڑ بھاگ رنگ لائی اور قتل کی وجہ جاننے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ کافی سسپنس فل کہانی رہی۔ ایک پرانی کہانی، آج کل دور تیز سے تیز تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کچھوے کی چال چلنے والے ہمیشہ سے ہی سلمان کی طرح ناکام ہی رہتے ہیں۔ ادھورا خط طویل اور دلچسپ کہانی رہی۔ دھڑکنوں میں ہی زندگی چھپی ہے اور دھڑکنوں نے دل سے وفا کی تو آتے رہیں گے۔ ہو سکے تو ایچ اقبال صاحب کو جاسوسی میں مستقل ان کریں۔ ایم اے راحت صاحب سے بھی کچھ نہ کچھ لکھواتے رہا کریں، امید کرتا ہوں ان تجاویز پر عمل کیا جائے گا۔''

جتوئی سے چوہدری محمد سرفراز کی تجزیہ نگاری ''جاسوسی ڈائجسٹ ماہِ رمضان سے چار پانچ دن پہلے ہی مل گیا تھا۔ ٹائٹل گرل کسی خوب صورت خیال کے زیرِ اثر مسکرا رہی تھی تو صنفِ وجاہت کا نمائندہ سگار کے زیرِ اثر مسکرا رہا تھا۔ بس جلدی میں یہی مسکراہٹ نوٹ کر سکے اور چھیڑ نکتہ چینی میں جا پہنچے۔ شکوک و شبہات میں جتلا ہونا اگرچہ خالصتاً زنانہ کام ہے مگر پہلے خط کی آخری اور ارتی لائن نے ہمیں بھی شکوک و شبہات میں ڈال دیا اور کچھ دوستوں کی بات درست ثابت ہوتی دکھائی دی کہ نام بدل بدل کر خط لکھے جا رہے ہیں۔ اگر نام بدلے جا سکتے ہیں تو جنس بدلنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ احسان سحر کے خدشات میں سو فیصد نہیں تو ننانوے فیصد سچائی ضرور تھی۔ جو دوست سوشل میڈیا استعمال کر رہے ہیں وہ ان خدشات کی تائید ضرور کریں گے۔ افتخار حسین اعوان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ مرحا گل کی ثابت قدمی جہاں قابلِ تعریف تھی وہاں کرخت کرخت کی تکرار نے طبیعت کی کرختگی میں ہور (اور) بھی اضافہ کر دیا۔ میرے دوست میرے بھائی عمران جونانی کو سب اچھا دکھائی دے رہا تھا۔ بھائی تھوڑی نکتہ چینی بھی کر دیا کرو۔ کب تک صرف چینی سے ہی کام چلاتے رہو گے۔ نادر سیال آپ کے اسیری کے دن ختم ہونے کی مٹھائی تو بنتی ہی ہے اور اس مٹھائی میں آپ کی ہر ماہ کی حاضری پکی ہونی چاہیے۔ آپ کی آپ بیتی کا بھی انتظار رہے گا۔ طاہرہ گلزار کو ہم سے ماضی قریب میں ایک ہی شکایت تھی جو بڑھتے بڑھتے دو تین تک جا پہنچی ہے۔ ارے بابا، ہم آپ کی لمبی عمر چاہتے ہیں۔ اب سمجھ بھی جائیے۔ انگارے میں وہی ہوا جو سوچا بھی نہیں تھا۔ شاہ زیب ہار کر بھی جیت گیا اور سجاول جیت کر بھی ہار گیا۔ دوسری طرف تاجور بھی فی الحال سین سے آؤٹ ہو گئی اور یہ آؤٹ ہونا کچھ جچا نہیں۔ مکمل جدائی ہوتی تو شکیل صاحب کچھ اور ہی انداز میں پیچ دیتے۔ اس قسط نے سارا منظر نامہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ احمد اقبال کے اندازِ تحریر کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ان کی تحریروں میں جو روانی ہوتی ہے، شائستگی ہوتی ہے، برجستگی ہوتی ہے وہ شاید ہی کسی اور رائٹر کے ہاں ملے۔ لہولہان رشتے پڑھنے میں تقریباً دو گھنٹے لگے اور مجال ہے کہ ایک دفعہ بھی توجہ ادھر ادھر ہوئی ہو۔ مال و زر کی ہوس میں رشتوں کے تقدس کی پامالی کا منظر پیش کرتی کیا ہی شاندار تحریر تھی۔ پہلا رنگ محمد انجم فاروق کی مہرہ بھی اچھی رہی مگر اس کے مقابلے میں دوسرا رنگ خون وفا نے ابتدا سے لے کر آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ محبت میں زیادہ تر قربانی دی جاتی ہے مگر یہاں کرن قربانی لینے کے چکر میں تھی۔ بہرحال یہ بھی محبت کا ایک رخ ہے۔ سیریناراض کی نئی منزل روایتی انتقام کے گرد گھومتی اچھی تحریر تھی۔ منظر امام کی جڑواں اوسط درجے کی تحریر تھی۔ ابتدا اچھی تھی مگر اختتام پر کچھ بھی چونکا دینے والا نہیں تھا۔ حسن پرست میں سب کچھ مصنوعی سا لگ رہا تھا مگر اختتام پر مینڈی نے انسانی نفسیات کا خفیف سا نکتہ بیان کر کے تحریر میں جان ڈال دی۔ خواب ناک کا ناک کا ڈراما ذرا بھی متاثر نہ کر سکا۔ ادھورا مشن کو اتنا کھینچا گیا کہ پھر بھی مشن ادھورا ہی رہا۔ بعض اوقات بے خبری کتنا نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ سلیم انور کی بے خبری پڑھ کا اندازہ ہوا۔ گمنام خط میں رائٹر نے اینڈ تک تجسس قائم رکھا اور یہی اس تحریر کا پلس پوائنٹ تھا۔''

کھیوڑا سے شفقت محمود کا تبصرہ ''کہتے ہیں کہ رمضان آتے ہی شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے اور ادنیٰ سے ادنیٰ بندہ بھی مومنین کی صف میں کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن آج کے دور میں شیاطین تو پابندِ سلاسل ہیں لیکن ان کے چیلے چانٹے جو چیچ کر جیسے ننگِ آدمیت اور ملت کا بین ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے رمضان بازار کی سہولت میسر ہے تو وہیں پر منافع خوری اور دو نمبری عروج پر ہے۔ دوسرے ممالک میں جہاں رمضان المبارک کا ریلیف دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں اسی مہینے کو بابرکت سمجھتے ہوئے منافع خور دونوں ہاتھوں سے غریب عوام .... سے برکت گھسیٹ گھسیٹ کر اپنے جہنمی پیٹوں میں بھر رہے ہوتے ہیں۔ اوپر سے وطنِ عزیز کو درپیش خطرات اور کی جانے والی سازشیں ایک طرف۔ 3 تاریخ کو جاسوسی ملنے سے کافی حیرت ہوئی۔ خطوط میں رانا بشیر صاحب اچھے تبصرے کے ساتھ پہلے نمبر پر تھے۔ احسان سحر صاحب فیس بک کی دو نمبری سے کافی نالاں نظر آئے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر کسی نے سینگ نکالے ہوئے ہیں۔ مجموعی طور پر معراج محبوب صاحب، ایم عمران صاحب، مرحا گل کے تبصرے اچھے تھے۔ مرحا گل مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کیا آپ تین تین ڈائجسٹ لیتی ہیں؟ میں تو ایک ہی لیتا ہوں وہی کافی ہو جاتا ہے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ بھی کافی غصے میں لگ رہی ہیں۔ باقی

غصہ تھوک دیں۔ محمد مرتضیٰ صاحب میں اپریل میں کمالیہ گیا تھا۔ تو واپسی پر فیصل آباد سے ہو کر آیا تھا اور کھوڑ واقعی دیکھنے والا شہر ہے۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک اور گندے ندی نالے، ویران ریلوے اسٹیشن، گندگی کے ڈھیر، 5 ارب ریونیو دینے والا کھوڑ ابلاشبہ بہت پسماندہ ہے۔ آپ جب چاہے آئیں آپ کو ویکم کہنے کے لیے حاضر ہوں۔ (یہی دکھ ہے کہ ہمارے ملک میں سرکار کو کسی سے سروکار نہیں) کہانیوں میں انگارے سب سے پہلے پڑھی، شاہ زیب نے سامبرا دھورا چھوڑ کر سجاول پر بہت بڑا احسان کر دیا ہے بلاشبہ انگارے ہٹ جارہی ہے۔ تاجور باعزت اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ چکی ہے۔ اب انتظار ہے سجاول کے عبرت ناک انجام کا۔ پہلی کہانی لہولہان رشتے احمد اقبال صاحب کی مشرقی اور مغربی تہذیب کا کسچر بہت لاجواب کہانی تھی۔ آوارہ گرد بھی بہت دھماکے دار تھی۔ شہزی نے تو اس دفعہ کمال ہی کر دیا۔ جوگی بابا کا کردار بہت حیرت انگیز تھا۔ عجیب وغریب آوارہ گرد کسی اور طرف ہی جارہی ہے، امید ہے بہتر سے بہتر ہی ہوگی۔ جڑواں، نئی منزل، پرانی کہانی بھی لاجواب تھیں۔ شاطر اور عیار ذہن کی مجرمانہ بساط کا کھیل مہرہ بہت عمدہ تھی۔‘‘

پشاور سے طاہرہ گلزار کی کتھا ’’جب اگلا شمارہ آئے گا تو رمضان ختم ہو چکا ہوگا، تمام دوستوں اور ادارے والوں کو رمضان اور ایڈوانس میں عید مبارک۔ اپنا سوئٹ جاسوسی 7 جون کی شام 7 بجے ملا۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو ڈاکر انکل کی سوچ کو داد دینی پڑی۔ مرد، عورت ایک دوسرے کے لیے ہیں ایک کے بغیر دوسرا ادھورا ہے لیکن مرد جب غرور میں آتا ہے تو وہ دوسری، تیسری مانگنے لگتا ہے اور پھر جو بگاڑ پیدا ہوتا ہے، یہ ان کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا ہے۔ ساتھ ہی پستول والا ہاتھ ان کو دھمکی دے رہا ہے۔ زیادہ خوش نہ ہو بجٹ کے بعد کی مہنگائی پستول سے پہلے آپ کو مار دے گی ہاہاہا۔ محفل چیچی نکتہ چینی میں پہنچے تو دروازہ رانا بشیر احمد ایاز صاحب نے کھولا، مبارکاں۔ نام سے کچھ شک ہوا کہ پہلے نام تمہارا نا بشیر احمد بھٹی آف لاہور واللہ اعلم۔ بھائی آپ نے تو ڈاکٹر کی طرح حسینہ کا پوسٹ مارٹم کیا، ہولا ہاتھ رکھیں اگر شادی شدہ ہو تو بھائی پھر ہم آپ کو بھابی کے بیلن سے نہیں بچا سکتے ہاہاہا۔ ویسے نوکرے تو بھیج دیے بلقیس سسٹر کو لیکن وضاحت نہیں کی کہ ان نوکروں میں کیا تھا۔ اب سوچ رہے ہیں کہ کچھ بھی ایسا ویسا ہو سکتا ہے ہاہاہا۔ باقی تبصرہ واقعی آپ کا لاجواب ہے۔ احسان سحر بھائی آپ کی تمام باتیں سر آنکھوں پر، ان لوگوں کے ساتھ کیا کریں سحر بھائی۔ میں آپ کو کہتی ہوں محفل نہ چھوڑیے یہ تو راہِ فرار ہے۔ کنول تو کیچڑ میں پیارا لگتا ہے... باقی تیری اس بہن سے زیادہ دنیا سے کوئی اور بیزار نہیں ہوگا ہمیں چھوڑ کے مت جانا۔ معراج محبوب عباسی بھی کافی تفصیلی لیکن خوب صورت تبصرہ لے کر حاضر۔ واہ یہ تو ہمارے گروپ کے ایڈمن سرفراز بھائی بھی اس بار تفصیلی تبصرہ لے کر آئے۔ بھائی اس کستوری بابا کو بھی آنے پر مجبور کریں۔ افتخار حسین بھائی یہی دنیا کے حالات ہیں آپ صبر کریں، وہ انتاہی لکھ کر لائی تھی۔ ویسے بھی بھائی آپ لوگوں کو تو اللہ نے چار کی اجازت دی ہے لوگ تو زندہ بیوی پر لے آتے ہیں آپ کا تو یہ مسئلہ بھی نہیں۔ احرام زل ٹھیک کہتی ہو، کاشف زبیر تو اپنے ساتھ زندگی کے رنگ لے گیا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ صفدر معاویہ بھی حسبِ عادت اپنا خوب صورت تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ بس اپنے گروپ کے خاص دوستوں کا ذکر شاید ان لوگوں نے رشوت دی ہے اور ہماری محبت میں ہی کچھ کی ہے، ہے نا صفدر بھائی...... مرحا گل بھی اپنے بھرپور انداز سے حاضر تھی ڈیئر صنف وجاہت ان میں ہوگی تو کوئی کہے گا نا بہنوں کی کریم اور دوسرے میک اپ کی چیزیں چرا کر استعمال کرنے سے تو کوئی صنفِ کرخت نہیں ہو جاتا۔ ادریس احمد خان بھائی کچھ بجھے بجھے سے نظر آئے، تبصرہ پھر بھی لاجواب۔ ہائے ری قسمت اب سعید عباسی بھی بولنے لگے، یہ کیا بھائی حسینہ کو اتنی باتیں سنا ڈالیں۔ رقیب جل جائیں گے۔ بھائی مجھے اتنے پیارے یاد کرنے کا شکریہ تبصرہ واقعی آپ کا لاجواب ہے۔ نادر سیال بھائی رہائی بہت بہت مبارک ہو۔ شکر کرو اللہ کا کہ اس بار رمضان اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارو گے۔ تبصرہ بہت ہی پیارا اور تفصیلی ہے۔ بھائی میں دماغ کے لیے کچھ نہیں کھاتی بس بچ کی پھوار پڑتی رہتی ہے۔ آخری محبت نامہ محمد مرتضیٰ جھنگ کا رہا۔ بہت تفصیلی، لاجواب اور خوب صورت تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ حسبِ عادت اپنے فیورٹ رائٹر مغل اعظم کی تحریر انگارے پہلے پڑھنا شروع کیا، واہ مزہ آگیا۔ سجاول کے برسوں کے غرور کو شاہ زیب نے توڑ دیا۔ تاجور کے رویے نے مجھے بھی دکھی کر دیا اور غصہ بھی آیا۔ شاہ زیب بھی تو ان حالات میں اس کی وجہ سے آیا ہے۔ محبت تو اتنی کمزور اور بزدل نہیں ہوتی۔ شاہ زیب نے کس کس طرح حالات کا مقابلہ کر کے تاجور، پہلوان اور جانان کو اپنے اپنے گھر پہنچایا لیکن تاجور کتنی کٹھور نکلی۔ شاہ زیب نے غلطی کی اب جاناں کی صورت میں سزا کاٹ رہا ہے۔ لیکن اب لگتا ہے آخر شاہ زیب سجاول کے چنگل سے نکل جائے گا لیکن مشکلات کے ساتھ۔ میرے دوسرے فیورٹ رائٹر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی جس کو اللہ نے پہلے بھی عزت دی تھی اور اب اور بھی عزت عطا کی، اللہ ان کو ہمیشہ ایسا ہی رکھے۔ بہت اچھے اور نفیس انسان، میں تمام رائٹرز کے ساتھ رابطے میں ہوں۔ سب بہت اچھے ہیں لیکن میں جس طرح ہر بات کو بھٹی کے ساتھ شیئر کرتی ہوں، دوسروں کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ شہزی تو چندر کلا کے چنگل سے نکل کے اب پھر شہزی اور سوشیلا ان ایکشن شہزی وہاں سے نکلا تو جوگی بابا کے ہاتھوں چڑھا۔ واہ بھٹی صاحب نے تو یہاں اپنی ڈاکٹری بھی دکھا دی۔ ویلڈن بھٹی اس بار تو سرور اکرام صاحب بھی اپنی مختصر لیکن بہت ہی سبق آموز کہانی لے کر حاضر تھے۔ کیا کریں اس معاشرے کا یہاں تو ہر ایک خرگوش بنا ہے اور کچھوا آخر ظلم اور ناانصافی دیکھ کے سازشی بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی مہرہ وہی انسانی فطرت جو دولت حاصل کرنے کے لالچ میں ہر رشتے ہر اخلاق کو رد کر دیتے ہیں۔ کبیر نے دولت کے لالچ میں اتنی اچھی جاب بھی کھو دی اور منامل جیسی منگیتر بھی لیکن سارہ نے اپنی ہوشیاری سے کبیر اور تومی کو بھی پکڑوا دیا۔ باس کے پیسے بھی بچائے اور عزت سے دوسری جاب بھی حاصل کی ویلڈن فاروق انجم، سرورق کی دوسری کہانی خونِ وفا واقعی وارداتِ قلبی اور ذہنِ انسانی کی ناقابلِ فہم کرشمہ سازیوں کا مجموعہ رہا بہت ہی شاندار تحریر۔ لازوال منظر کشی مجھے شروع سے یقین ہو گیا تھا کہ یہ کرن ہی ہے۔ جمال دستی کی مغربی تحریر مختصر ہونے کے باوجود انسانی سوچ اور طریقہ کار کو اختصار کے ساتھ لایا۔ اس بار منظر امام جڑواں لائے جس میں دولت کے لالچ میں پرنس خرم نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماردی۔ وہ مثال کہ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔‘‘

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

مسز صدیقی، کراچی۔ ہما انصار، کوٹری، کاشف رفیق، حیدرآباد۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ وقار احمد، میرپورخاص۔ حرا افتخار، کراچی۔ راحیل علی، کراچی۔

چہرہ در چہرہ

ایچ اقبال

کس قدر سخت کس قدر ظالم
دستِ قاتل کا وار ہوتا ہے
ناز جس کو جفا پہ ہو اپنی
وہ کہاں شرمسار ہوتا ہے

رشتے برسوں کی رفاقتوں کا ثمر ہوتے ہیں... کسی کے نزدیک رشتوں سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا... اور کسی کی دانست میں ہر شے ان بندھنوں سے بڑھ کر ہوتی ہے... آغاز و ارتقا کے مراحل سے گزرتی ایک ایسی ہی دلچسپ اور الجھی ہوئی کہانی کے اسرار... کسی قدم پر گریز تھا... تو کہیں تصادم کے مہلک امکانات... تشنہ و بے قرار خواہشات کے مدّوجزر... تضادات و مفادات کی جنگ اور جرم کی دلدل میں اترنے کے بعد صرف دھنسنے کا عمل جاری رہتا ہے... وہ... کھلاڑی اناڑی تھے... اور اس کھیل میں ان کا سب کچھ داؤ پر لگ چکا تھا...

خواہشات و تعیشات سے مغلوب مفاد پرستوں کی سازشوں کے جال

ثاقب شب خوابی کا لباس پہننے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ روحی نے پہلے ہی شب خوابی کا لباس پہن لیا تھا اور بستر پر لیٹی ہوئی ہلکے سُروں میں گنگنا رہی تھی۔ ثاقب سے اس کی شادی کو پانچ مہینے گزر چکے تھے۔ شادی سے کچھ دن پہلے تک وہ دونوں ہی انگلینڈ میں زیرِ تعلیم تھے۔ روحی اپنے ارب پتی باپ باقر سلمان کی اکلوتی اولاد تھی۔

ثاقب کے باپ طاہر سلمان کے کاروباری حالات بھی کچھ کم اچھے نہ تھے لیکن باقر سلمان کی کاروباری حیثیت ان سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ بہت آسودہ تھے لیکن زندگی کی آخری سانس تک انہیں یہ قلق ضرور رہا ہوگا کہ ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ شاید اپنے اس قلق ہی کو کم کرنے کے لیے انہوں نے روحی کی پرورش اس طرح کی تھی جیسے وہ ان کا بیٹا ہو۔ وہ خود تو گولف کے کھلاڑی تھے ہی، روحی کو بھی انہوں نے یہ کھیل سکھایا تھا۔ اس طرح روحی کو گھڑ سواری بھی آ گئی تھی جبکہ وہ اس وقت تک میٹرک سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ باقر سلمان نے اسے اپنے رائفل کلب کا ممبر بھی بنوایا تھا۔ وہ ایک اچھی نشانے باز بھی بن گئی تھی۔ اسے خود ہوا بازی کا بھی شوق تھا اس لیے وہ ایک فلائنگ کلب کی ممبر بھی بنی۔

"میں جب جہاز اُڑاتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں شاہین ہوں۔" اس نے تعلیم کے لیے بیرونِ ملک جانے سے پہلے ثاقب سے کہا تھا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگتا جہاز اُڑاتے ہوئے؟"

"ڈیڈ نے میری تربیت ہی اس طرح کی ہے کہ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے خوف جیسا کوئی احساس میرے دل میں پیدا ہو ہی نہیں سکتا لیکن میں یہ بھی کہوں گی کہ شاید میرا یہ خیال غلط ہو۔ شاید کوئی بہت ہی خوفناک منظر مجھے ڈرا ہی دے لیکن ہوا بازی کرتے ہوئے مجھے بالکل خوف محسوس نہیں ہوتا۔ تم دیکھنا! جب میری تربیت مکمل ہو جائے گی تو میں پرواز میں ایسے ایسے کرتب دکھاؤں گی کہ لوگ دانتوں میں انگلیاں دبا لیں گے۔ شاید میں پائلٹ ہی بنوں۔"

لیکن روحی کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ اس کی تربیت مکمل ہونے سے پہلے ہی باقر سلمان نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیج دیا۔

اس کے ساتھ ہی طاہر سلمان نے اپنے بیٹے ثاقب کو بھی بھیج دیا جس سے روحی بہت خوش ہوئی تھی۔ ثاقب سے اسے اتنا ہی پیار تھا کہ اس سے اتنے عرصے تک دور رہنا، اس کے اختیار میں نہ ہوتا۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ ثاقب کے بغیر ملک سے باہر جانے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی۔

باقر سلمان اور طاہر سلمان نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ ان کی اولادیں ایک دوسرے کو بہت چاہتی ہیں لہٰذا دونوں بھائیوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب وہ دونوں اپنی تعلیم مکمل کر لیں گے تو ان کی شادی کر دی جائے گی۔

اس فیصلے پر عمل بھی ہوا لیکن روحی کو یہ صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا کہ شادی کے وقت اس کے والدین زندہ نہ رہے اور ان دونوں کی موت ہوئی بھی اس طرح تھی کہ کوئی آخری مرتبہ ان کے چہرے بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔

روحی اور ثاقب ان دنوں انگلینڈ ہی میں تھے جب طاہر سلمان نے انہیں باقر سلمان اور ان کی اہلیہ کے بارے میں بڑی لرزہ خیز اطلاع دی تھی۔

روحی اور ثاقب فوری طور پر وطن پہنچے تھے لیکن جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ روحی تڑپتی رہ گئی۔ وہ ایسا صدمۂ جانکاہ تھا کہ روحی کا ہر بات سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اس وقت اس کی اور ثاقب کی تعلیم مکمل ہونے میں آٹھ دس ماہ باقی تھے۔ اس حادثے کے بعد روحی کا دل تعلیم سے بھی اچاٹ ہو گیا۔ وہ اس کی تکمیل کے لیے واپس انگلینڈ جانا ہی نہیں چاہتی تھی لیکن ثاقب کے بے حد اصرار اور سمجھانے بجھانے پر اس نے واپس انگلینڈ جا کر تعلیم مکمل کی۔ اسے آج بھی اس پر تعجب تھا کہ اس قدر دردناک صدمے سے ذہنی طور پر منتشر ہو جانے کے باوجود وہ تعلیم مکمل کرنے میں کامیاب کیسے ہو گئی۔

گزرتا ہوا وقت روحی کے روحانی زخم مندمل کرتا رہا۔ انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد اس نے ثاقب سے شادی تو کر لی تھی لیکن اس پر یہ ضد رہی تھی کہ وہ رہے گی اسی گھر میں جہاں وہ پیدا ہوئی تھی، جس گھر کے در و دیوار سے اس کی وہ یادیں وابستہ تھیں جن کا تعلق اس کے مرحوم والدین سے تھا۔

"تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے ثاقب!" اس نے شادی سے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ "چچا کا گھر بھی اپنا ہی گھر ہوتا ہے۔ یہاں رہ کر تم گھر داماد نہیں بن جاؤ گے۔ یہ سب کچھ جو اَب میرا ہے، وہ سب اب تمہارا ہی ہے۔ اتنا بڑا کاروبار بھی اب تمہیں اور انکل کو ہی سنبھالنا ہو گا۔ میں اس جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتی، بلکہ پڑ ہی نہیں سکتی۔"

اس طرح ان دونوں کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد گھر کا وہی کمرا حجلۂ عروسی بنا جو ہمیشہ سے روحی کی خواب گاہ رہا تھا۔ اس وقت وہ اسی کمرے میں بستر پر لیٹی گنگنا رہی تھی اور ثاقب شب خوابی کا لباس پہنے باتھ روم میں تھا۔

موبائل فون کی گھنٹی بجتے ہی روحی کی گنگناہٹ رک گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل سے موبائل فون اٹھایا۔ اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دیکھ کر اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن پڑ گئی تاہم اس نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو!"

"شکر ہے کہ تم نے اپنا فون نمبر تبدیل نہیں کیا۔" دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز آئی اور روحی نے بے اختیار ایک طویل سانس لی۔ خاصا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس نے پرویز کی آواز پہچان لی تھی۔

دوسری طرف سے کہا جا رہا تھا۔ "انگلینڈ سے تمہارے آنے کے بعد بھی میں نے خود کو قابو میں رکھا اور تمہیں فون نہیں کیا۔ پھر تمہاری شادی میرے لیے متوقع سہی لیکن دل پر چرکا لگا تھا۔ اس کے بعد بھی خاصا عرصہ گزر گیا۔ میں نے دل پر قابو رکھا اور تمہیں فون نہیں کیا لیکن آج......؟ ہاں روحی! آج ضبط کرتے کرتے میرے اعصاب ٹوٹنے لگے۔ شدت سے دل چاہا تھا کہ تمہاری آواز ہی سن لوں۔"

"سن چکے؟" روحی نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر سن چکے ہو تو میں اب فون بند کر دوں؟"

''تم کہاں ہو؟...... اکیلی ہو؟''

''جب تم میری شادی سے بے خبر نہیں تو میرے شوہر کے نام سے بھی واقف ہو گے؟''

''ہاں، ثاقب بہت خوش قسمت ہیں۔'' دوسری طرف پرویز نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔

''وہ اس وقت باتھ روم میں کپڑے تبدیل کر رہے ہیں لیکن اگر وہ میرے قریب بھی ہوتے تو میں تم سے کسی جھجک کے بغیر بات کرتی۔'' روحی نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ثاقب کی طرف دیکھا جو باتھ روم سے نکل آیا تھا۔

''کیا کبھی تھوڑی دیر کی بھی ملاقات نہیں ہو سکتی؟'' بڑی حسرت تھی پرویز کے لہجے میں۔

''ملاقات میں کوئی حرج نہیں ہو گا لیکن صرف دوست کی حیثیت سے۔ اگر تم نے پرانا راگ الاپنا شروع کیا تو پھر وہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔''

ثاقب غور سے روحی کی طرف دیکھنے لگا۔

پرویز نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''اب تو دوست ہی کی حیثیت سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ میں تمہیں دور سے تو کئی بار بلکہ بہت مرتبہ دیکھ چکا ہوں لیکن قریب سے دیکھنے کو، چند باتیں کرنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔ ہم کب اور کہاں مل سکتے ہیں روحی؟''

''تمہارا نمبر آگیا ہے میرے پاس۔ میں کسی وقت بتا دوں گی۔ میرا خیال ہے کہ تم نے میری آواز خاصی سن لی۔ اب تمہیں فون بند کر دینا چاہیے۔ دراصل تہذیب کا تقاضا یہی ہے کہ جسے فون کیا گیا ہو، وہ خود فون بند نہ کرے۔ پہل فون کرنے والے کو کرنا چاہیے۔ ثاقب بھی باتھ روم سے آ گئے ہیں۔''

''اوہ...... اچھا۔ میں بے چینی سے تمہاری کال کا انتظار کروں گا، خدا حافظ۔'' دوسری طرف سے جلدی جلدی کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

روحی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا فون بند کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''کون تھا؟'' ثاقب نے پوچھا۔

''میٹرک کے زمانے میں عاشق ہوئے تھے یہ مجھ پر۔'' روحی نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ دماغ کے کیڑے تھوڑا بہت اب بھی کلبلا رہے ہیں۔''

ثاقب ہنسا۔ ''تم ہو ہی ایسی...... کسی کا دل تم پر آ جائے تو سمجھو کہ گیا وہ کام سے...... تو کب مل رہی ہو اس سے؟''

''مل لوں گی کسی وقت...... دراصل وہ ہمیشہ تہذیب کے دائرے میں رہا ہے ورنہ میں اس سے ملنا ہرگز پسند نہیں کرتی۔''

''کیا کرتا ہے؟''

''جب تو پڑھ ہی رہا تھا۔ فائنل ایئر میں تھا۔ یہ میں کیا جانوں کہ اب کیا کر رہا ہے۔''

''فون پر یہ تو پوچھ لیتیں، اگر اسے دوست کی حیثیت سے قبول کر رہی ہو۔''

''ضرورت نہیں سمجھی میں نے۔ اچھا اب چھوڑو اس کا ذکر۔'' روحی نے کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح پھیلائے جیسے ثاقب کو اپنی آغوش میں دیکھنا چاہتی ہو۔

ان کی زندگی اب بھی ایسی گزر رہی تھی جیسے ان کی شادی کو دو چار دن سے زیادہ نہ ہوئے ہوں۔

اس رات بھی وہ بارہ بجے کے بعد سوئے۔

پھر نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ روحی یکا یک بیدار ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اسے جھٹکا لگا ہو۔ فوراً ہی اس کی نظر سامنے کے دیوار گیر کلاک کی طرف گئی جس میں ڈھائی بجے تھے۔ وہ قدیم طرز کا کلاک تھا جس سے ہلکی پھلکی سنہری زنجیریں لٹکی ہوئی تھیں۔ انہیں ساکت ہونا چاہیے تھا لیکن وہ ہل رہی تھیں۔

زلزلہ...... روحی کو یک لخت خیال آیا۔ زلزلے کا جھٹکا!

ثاقب اب بھی سو رہا تھا۔ روحی نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جانتی تھی کہ ثاقب گزشتہ رات دو ایک گھنٹے ہی سو سکا تھا۔ وہ دفتر سے کچھ ضروری کام لے آیا تھا۔ اسی میں مصروف رہا تھا۔

زلزلے کا خیال آنے کے باوجود روحی اس لیے پریشان نہیں ہوئی کہ **اس سال چند ماہ** کے بعد اور کبھی اس سے بھی کم وقت میں زلزلے کا ایک آدھ جھٹکا ضرور لگ جایا کرتا تھا جس سے مضبوط عمارات کو تو نہیں لیکن غریبوں کی بستیوں میں کم یا زیادہ تباہی ضرور ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ روحی کو خیال آیا کہ وہ ٹی وی کھول کر خبریں سنے۔ زلزلہ آیا ہوتا تو خبر ضرور آتی لیکن ٹی وی کی آواز سے ثاقب کی آنکھ کھل جاتی جو روحی کے خیال میں مناسب نہیں ہوتا۔ ویسے اسے یقین بھی تھا کہ زلزلہ آیا ہو گا۔ کسی جھٹکے ہی کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تھی اور پھر یہ بھی اس کے سامنے تھا کہ دیوار گیر کلاک کی زنجیریں ہل رہی تھیں لیکن اب

ساکت ہوچکی تھیں۔
روحی لیٹ گئی مگر اب اسے فوری طور پر نیند نہیں آسکی دماغ میں زلزلے سے متعلق خیالات گردش کرتے رہے اور یہ خیال بھی رہا کہ شاید دوسرا جھٹکا بھی لگے لیکن ایک گھنٹا گزر جانے کے بعد بھی کوئی جھٹکا نہیں لگا۔ ضروری نہیں تھا کہ دوسرا جھٹکا ایک گھنٹے کے اندر لگ جاتا۔ زیادہ وقفے سے بھی جھٹکا لگنا ممکن تھا لیکن پھر روحی کو نیند آ گئی۔
دوسری صبح وہ اور ثاقب اٹھے تو روحی نے اسے رات کے بارے میں بتایا، پھر بولی۔ ''ٹی وی کھول کر خبریں سنتے ہیں۔''
''چھوڑو بھی، معلوم ہو جائے گا جو ہوا ہوگا۔ دو چار مہینے میں اب یہ ہونے ہی لگا ہے۔ میں جلدی سے شاور لے لوں۔ آج دفتر ذرا جلدی پہنچنا ہے۔''
وہ باتھ روم کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔
''کون ہے؟'' ثاقب نے باتھ روم کی طرف جاتے جاتے رک کر پوچھا۔
''فیضو۔'' باہر سے ان کے خاص ملازم کی آواز آئی۔ آواز میں پریشانی کے ساتھ کچھ خوف کا عنصر بھی تھا۔
''کیا بات ہے؟'' ثاقب دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا۔
روحی ابھی شب خوابی کے لباس میں تھی۔ اس نے جلدی سے گاؤن اٹھا کر پہنا۔
ثاقب نے دروازہ کھولا۔ باہر کھڑا ہوا پچاس سالہ ملازم فیضو خاصا گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔
''میں صفائی کرنے لائبریری میں گیا تھا صاحب!'' وہ چھوٹتے ہی بولا۔ ''لائبریری کی ایک دیوار ٹوٹ گئی ہے۔''
''ارے، کیسے؟'' ثاقب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
روحی تیزی سے ان دونوں کے قریب پہنچی۔
فیضو بولا۔ ''رات کو زلزلہ آیا تھا نا...... اسی کے جھٹکے سے ٹوٹی ہوگی۔''
''کون سی دیوار؟'' ثاقب نے جلدی سے پوچھا۔
''میں کیا بتاؤں صاحب! خود چل کر دیکھ لیجیے۔ بدبو بھی پھیل گئی ہے وہاں۔ ٹوٹی ہوئی دیوار سے کسی انسان کا ڈھانچا بھی گرا ہے۔''
''کیا بکواس ہے؟'' روحی چیخ سی پڑی۔
''چل کر دیکھتے ہیں۔'' ثاقب نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ خبر ایسی تھی کہ اسے گاؤن پہننے کا خیال بھی نہیں آیا۔ وہ شب خوابی ہی کے لباس میں تھا۔
روحی نے بھی اس کے ساتھ تیزی سے قدم بڑھائے۔
''دیوار میں سے انسانی ڈھانچا کہاں سے نکل آئے گا ثاقب؟'' روحی نے تیزی سے چلتے ہوئے پوچھا۔
''ابھی چل کر دیکھتے ہیں نا ڈیئر۔'' اب ثاقب کے لہجے سے بھی پریشانی ہویدا تھی۔
روحی بہت مضطرب نظر آ رہی تھی۔
فیضو اُن کے ساتھ تھا۔
لائبریری کا دروازہ کھولتے ہی بدبو کا تیز بھبکا آیا۔ وہ تینوں ہی تیزی سے پیچھے ہٹ گئے۔ ان دو ایک لمحوں میں ہی روحی کی نظر گری ہوئی دیوار اور انسانی ڈھانچے پر پڑ گئی تھی۔
''مائی گاڈ'' اس کے منہ سے نکلا پھر وہ تیزی سے بولی۔ ''پولیس کو فون کرنا پڑے گا ثاقب۔''
''ہم ہی پریشانی میں پڑ جائیں گے۔'' ثاقب نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''ہمارے ہی گھر سے نکلا ہے یہ ڈھانچا، اور وہ بھی کسی انسان کا۔''
''مجبوری ہے یہ تو۔'' روحی نے کہا۔ ''ہم کچھ اور تو کر بھی نہیں سکتے۔''
ثاقب کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ فیضو پریشانی کے عالم میں ان دونوں کے منہ تکتا رہا۔
ثاقب بولا۔ ''ہمیں ہی کسی طرح یہ سب کچھ صاف کر دینا چاہیے۔'' پھر اس نے فیضو سے پوچھا۔ ''تم نے ابھی کسی اور کو تو نہیں بتایا؟''
فیضو کے جواب دینے سے پہلے روحی بول پڑی۔
''ہمارا یہ سب کچھ کرنا غیر قانونی ہوگا ثاقب۔''
''کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا روحی...... کیوں فیضو، تم نے......''
''بتا دیا ہے صاحب۔'' فیضو بول پڑا۔ ''جب آ رہا تھا نا آپ کی طرف تو وہ مل گیا تھا، ابراہیم...... اسے بتا دیا تھا میں نے اور اس نے تو سبھی کو بتا دیا ہوگا۔'' ابراہیم بھی گھر کا ملازم ہی تھا۔
اس گھر میں دو ملازماؤں کے علاوہ دو مرد ملازم بھی تھے۔
ثاقب نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور

بڑبڑایا۔ ”میں نے سوچا تھا کہ بات ہم تینوں تک رہے گی۔“

”اسے راز رکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے ثاقب۔“ روحی نے زور دے کر کہا۔ ”پولیس کو فون کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا۔“

ثاقب پریشانی سے روحی کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

”میرا موبائل کمرے ہی میں ہے۔ میں فون کرتی ہوں جا کر۔“ روحی نے کہا اور واپس جانے کے لیے تیزی سے مڑی۔

☆☆☆

پولیس نے وہاں پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی کیونکہ روحی ایک ارب پتی باپ کی بیٹی تھی اور اب مرحوم کا بہت بڑا کاروبار اس کا شوہر سنبھالے ہوئے تھا۔

پولیس نے فوراً ہی سب کو اس کمرے میں جانے سے روک دیا جس کی دیوار گری تھی۔

”جب تک ہم تفتیش کر رہے ہیں، اس کمرے کی طرف کوئی نہ آئے ثاقب صاحب!“ انسپکٹر نے کہا جب روحی اور ثاقب ڈرائنگ روم میں متفکر بیٹھے ہوئے تھے۔

ان دونوں میں، رات کو آنے والے زلزلے کے بارے میں گفتگو ہو چکی تھی۔ دیوار گرنے کا سبب زلزلے کا وہ جھٹکا ہی ہو سکتا تھا۔ اخبارات میں بھی اس کی خبر آ چکی تھی۔ ٹی وی بھی رات کو وہ خبر کئی مرتبہ دے چکا تھا۔ زلزلے کے اس جھٹکے سے شہر کی ان بستیوں میں خاصی تباہی پھیلی تھی جہاں بنے ہوئے مکانات معمولی سرمائے کے مرہونِ منت تھے۔ بعض نہایت قدیم کئی منزلہ عمارتوں کو بھی جزوی نقصان پہنچا تھا۔

”یہ دیوار۔“ روحی سوچتے ہوئے بولی۔ ”جب ہم پڑھ کر باہر سے آئے تھے، تبھی میں نے سوچا تھا کہ ڈیڈی نے یہ دیوار بنوا کر خاصی بڑی لائبریری کے دو حصے کیوں کروا دیے تھے۔ جب ہمارا باہر جانا ہوا تھا، اس وقت یہ دیوار نہیں تھی۔“

”شادی سے چھ ماہ قبل جب میں ممی کے انتقال پر چار دن کے لیے یہاں آیا تھا، تو میں نے یہاں کا چکر بھی لگایا تھا۔ دیوار اس وقت بھی تھی۔ سامان سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے وہ کمرا کافی، بلکہ بہت بڑا تھا۔ اسی لیے انکل نے اسے دو حصوں میں تقسیم کروایا ہوگا۔ دوسرے حصے میں انہوں نے نوادرات اور وڈیوز کی لائبریری بنائی تھی۔“

روحی کے والد باقر سلمان کو نوادرات جمع کرنے کا بہت شوق تھا، شوق کیا، جنون تھا، اس لیے بے پناہ نوادر جمع ہو گئے تھے۔

ثاقب کے خاموش ہوتے ہی روحی نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ ”اس معاملے میں پولیس ہم سے بہت زیادہ پوچھ گچھ کرے گی۔ اس شبے کا اظہار کیا جا سکتا ہے، اور شبہ کیا، پولیس تو یقیناً یہی سمجھے گی کہ ڈیڈی نے کسی کو جان سے مار کر اس کی لاش دیوار میں چن دی تھی یا کسی طرح چنوا دی تھی۔ تم بتا چکے ہو مجھے کہ جب تم لندن سے آئے تھے تو یہ دیوار بنوائی جا چکی تھی۔ اگر تم یہ نہ بتاتے تو میں سوچ سکتی تھی کہ یہ دیوار ڈیڈی کے بعد کسی نے بنوائی ہوگی۔“

”ان کے بعد کون بنواتا؟“

”آں۔“ روحی اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی پھر ایک طویل سانس لے کر بولی۔ ”ہاں، بعد میں کون بنواتا۔ بے تکی بات نکل گئی میرے منہ سے۔ دماغ بہت منتشر ہے نا ثاقب۔“

ثاقب سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر وہ اور روحی اس وقت چونکے جب انہوں نے دیکھا کہ دو پولیس والے پھاوڑا، کسی قسم کے سامان لیے ہوئے آتے دکھائی دیے۔

ثاقب تیزی سے اٹھ کر سپاہیوں کی طرف بڑھا۔

”یہ سب کیوں؟“ ثاقب نے پوچھا۔ اس کا اشارہ اس سامان کی طرف تھا جو وہ لائے تھے۔

”صاحب نے منگوایا ہے۔“ ایک سپاہی نے جواب دیا۔ ”صاحب“ سے اس کی مراد پولیس آفیسر ہی سے ہو سکتی تھی۔

”مگر کیوں؟“ ثاقب بہت الجھ گیا تھا۔

روحی اپنی جگہ بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی۔

”یہ تو آپ صاحب ہی سے پوچھیے۔“ سپاہی نے ثاقب کو جواب دیا اور دونوں سپاہی آگے بڑھ گئے۔

ثاقب کھوئے کھوئے سے انداز میں روحی کی طرف واپس لوٹا۔

روحی بولی۔ ”کیا کمرے کی کھدائی کروانا ہے ان لوگوں کو؟“

”جو سامان لایا گیا ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔“ ثاقب نے سوچتے ہوئے کہا۔

”عجیب بات ہے۔ چلو چل کر معلوم کرتے ہیں۔“

”پولیس آفیسر کہہ گیا ہے کہ ہم وہاں نہ آئیں۔“

”ایسی تیسی اس کی۔ ہمارا گھر ہے یہ، ہم کو یہ جاننے کا

حق ہے کہ وہ ہمارے گھر میں ہماری اجازت کے بغیر......"
وہ یہ دیکھ کر چپ ہوگئی کہ پولیس آفیسر ان کی طرف آرہا تھا۔
"ابھی مجھے بتایا گیا ہے۔" وہ قریب آتے ہی بولا۔
"آپ لوگ کچھ جاننا چاہتے ہیں؟"
"جی ہاں۔" روحی بولی۔ "آخروہ سامان......
"وہ دیوار پوری طرح تڑوانا ہے۔" آفیسر نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "دیوار میں ایک اور انسانی ڈھانچا بھی پھنسا ہوا ہے۔"
"کیا؟" روحی کے منہ سے نکلا۔
ثاقب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔
"جی ہاں۔" پولیس آفیسر نے کہا۔ اب وہ روحی اور ثاقب کو بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے ان کے چہروں کے تاثرات سے کوئی اندازہ لگانا چاہتا ہو۔ وہ بہت معمولی توقف سے پھر بولا۔ "جو ڈھانچا دیوار ٹوٹنے سے باہر آگیا تھا، اس کے علاوہ بھی کوئی ڈھانچا ہے دیوار میں۔ صرف انگلیاں نظر آرہی ہیں اس کی۔ دیوار توڑ کر ہی اسے باہر نکالا جاسکتا ہے۔"
"مائی گاڈ!" روحی ہذیانی انداز میں بولی۔ "یہ سب کیا ہوا ہے ہمارے گھر میں ثاقب؟"
ثاقب کچھ نہیں بولا۔ وہ اس طرح اپنی پیشانی مسل رہا تھا جیسے سر میں شدید درد ہو گیا ہو۔
"آپ لوگ ابھی اس طرف نہیں آئیں گے؟"
پولیس آفیسر نے کہا، پھر واپس جاتے جاتے رک کر ثاقب کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "ابھی تک طاہر سلمان صاحب نہیں آئے، کیا انہیں اطلاع نہیں دی آپ نے؟"
"آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟" ثاقب نے بے ساختہ پوچھا۔
"فون پر مجھے ہیڈ آفس سے کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔" پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ "باقر سلمان صاحب اور ان کی اہلیہ کے اغوا اور...... مختصر یہ کہ اس سارے معاملے کی تفصیلات علم میں آگئی ہیں میرے۔ اسی سے میں نے اندازہ لگایا اور آپ کیونکہ روحی صاحبہ کے ساتھ ہیں اس لیے ان کے شوہر ہی ہوں گے، یعنی طاہر سلمان صاحب کے بیٹے۔"
ثاقب نے سر ہلایا۔ "ڈیڈی تین روز سے بیرونِ ملک ہیں۔ پرسوں کسی وقت واپس لوٹیں گے۔"
"انہیں فون پر تو اطلاع دے دی ہوگی آپ نے۔"
"جی ہاں، اطلاع دے چکا ہوں۔"

روحی کو ثاقب کا جواب عجیب سے لگا۔ وہ بے خبر تھی کہ ثاقب، طاہر سلمان کو اطلاع دے چکا ہے۔
اس وقت ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے دیوار توڑی جارہی ہو۔
پولیس آفیسر نے ثاقب سے پوچھا۔ "اس معاملے کی اطلاع پر ان کا کیا ردِعمل تھا؟"
"ظاہر ہے کہ یہ ان کے لیے ایک پریشان کن اطلاع تھی۔ ان کا یہ دورہ کاروباری ہے۔ آٹھ دس دن بعد آنا تھا انہیں لیکن یہ اطلاع ملنے پر انہوں نے مجھ سے کہا کہ اب وہ جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے لیکن شاید پرسوں سے پہلے نہ آسکیں۔"
پولیس آفیسر نے سر ہلایا اور لائبریری کی طرف واپس جانے لگا۔
"کب فون کیا تھا تم نے انکل کو؟" روحی نے پوچھا۔
"تھوڑی دیر پہلے تم باتھ روم گئی تھیں۔ اسی وقت فون کیا تھا انہیں۔"
"اور مجھے بتایا بھی نہیں۔"
"دماغ پریشان ہی اتنا ہے روحی۔"
"اب تو پریشانی اور بڑھ گئی۔ ایک اور ڈھانچا...... آخر یہ سب کیسے ممکن ہے ثاقب کہ ہمارے گھر میں......"
"اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" ثاقب نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ دوپہر کا کھانا روحی نے ثاقب کے ساتھ اپنے کمرے میں کھایا۔ کھانا کیا کھایا، بس چند لقمے توڑ لیے۔ ذہنی پراگندگی کے باعث بھوک ہی مر گئی تھی۔
دیوار توڑے جانے کی آوازیں گھنٹا بھر قبل بند ہو چکی تھیں۔
"کسی تیسرے ڈھانچے کی اطلاع نہ مل جائے۔" روحی چائے پیتے ہوئے بڑبڑائی۔
ثاقب سوچ میں ڈوبا خاموش بیٹھا رہا۔ وہ دفتر فون کر کے اپنے سیکریٹری کو اطلاع دے چکا تھا کہ آج نہیں آسکے گا۔
روحی اور وہ چائے پی چکے تھے جب ملازم نے آکر اطلاع دی کہ پولیس آفیسر انہیں ڈرائنگ روم میں بلا رہا ہے۔
ثاقب اٹھتا ہوا طویل سانس لے کر بولا۔ "پوچھ گچھ تو ہوگی۔"

روحی بھی اس کے ساتھ اٹھی۔
ملازم ان دونوں سے ایک قدم پیچھے چلتے ہوئے بولا۔ ''ذرا دیر پہلے ایک ایمبولینس آئی تھی صاحب! اس میں سے چمڑے کے تھیلے ہاں صاحب! چمڑے ہی کے ہوں گے، وہ لائے گئے تھے۔''
روحی اور ثاقب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ملازم کہتا رہا۔ ''وہ تھیلے لائبریری ہی میں لے جائے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد چار سپاہی وہ تھیلے اٹھائے ہوئے باہر نکلے۔ پولیس افسر بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ تھیلے ایمبولینس میں ڈالے گئے پھر ایمبولینس چلی گئی۔''
''ہوں۔'' ثاقب نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔
روحی سمجھ گئی کہ ان تھیلوں میں ڈھانچے لے جائے گئے ہوں گے۔
ڈرائنگ روم میں پولیس آفیسر ان کا منتظر تھا۔
''فی الحال لائبریری سیل کر دی گئی ہے۔'' وہ ان دونوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''ممکن ہے کہ تفتیش مکمل ہونے تک وہ بند ہی رکھی جائے۔''
روحی اور ثاقب خاموش رہے۔
''وہ ڈھانچے آپ لوگوں کے گھر سے نکلے ہیں۔'' اس مرتبہ پولیس آفیسر نے ان دونوں کو کچھ تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟''
''ہم کیا کہہ سکتے ہیں آفیسر۔'' روحی بول پڑی۔ ''ہم کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ وہ ڈھانچے کس کے ہوں گے اور اس دیوار میں کہاں سے آگئے۔''
''ان دونوں کو غالباً قتل کر کے ان کی لاشیں اس دیوار میں چھپائی گئی تھیں۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔
''جو کچھ بھی ہوا، ہمارے ہوتے ہوئے تو ممکن نہیں۔'' اس مرتبہ ثاقب بول پڑا۔ ''ساڑھے پانچ مہینے پہلے ہم اس گھر میں نہیں تھے۔ بہ غرض تعلیم انگلینڈ میں تھے۔''
''اس کا علم مجھے ہو چکا ہے۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔ ''ملازمین سے پوچھ گچھ کی تھی۔ آپ دونوں کی آمد سے چند دن پہلے انہیں اس گھر میں ملازم رکھا گیا تھا۔''
''جی ہاں، ڈیڈی سے معلوم ہو چکا ہے مجھے۔ دونوں عورتیں ان دونوں کی بیویاں ہیں۔ آج کل ملازم رکھتے ہوئے بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اس لیے ڈیڈی نے اپنے دفتر کے دو معتمد چپراسیوں کا انتخاب کیا تھا۔ انہی دونوں کا انتخاب اس لیے کیا کہ ان دونوں ہی کی بیویاں بانجھ ہیں۔

بچوں وغیرہ کا مسئلہ نہیں ہے۔''
یکا یک پولیس آفیسر نے روحی کی طرف دیکھا۔ ''جب آپ کے والدین حیات تھے، کیا اس وقت ملازمین نہیں تھے؟''
''یقیناً تھے۔'' روحی نے جواب دیا۔
''میرے ڈیڈی نے الگ کر دیا تھا انہیں۔'' ثاقب بول پڑا۔ ''روحی اور میں تو انگلینڈ میں تھے۔ ڈیڈی نے مناسب نہیں سمجھا کہ گھر صرف ملازمین پر چھوڑ دیا جائے۔ تنخواہیں بھی بلاوجہ جاتیں۔ اس کے بعد ڈیڈی نے اپنا معمول بنا لیا تھا کہ مہینے بیس دن میں جب بھی انہیں چند گھنٹوں کی فرصت ہوتی تھی، وہ اپنے کچھ ملازمین کو یہاں لے آتے تھے اور اپنی نگرانی میں گھر کی صفائی کروا دیا کرتے تھے ورنہ ہمارے آنے تک تو اس گھر کی نہ جانے کیا حالت ہو جاتی۔''
''گویا مہینے بیس دن تک گھر بالکل خالی پڑا رہتا تھا؟''
''جی ہاں، بس ایک چوکیدار رہتا تھا جس کی کوٹھری پھاٹک کے قریب ہی ہے۔''
''مجھے ملازمین سے پوچھ گچھ کرتے ہوئے معلوم ہوا تھا کہ جن دنوں میں انہیں یہاں رکھا گیا ہے، انہی دنوں میں چوکیدار بھی رکھا گیا تھا۔ چوکیدار بھی بتا چکا کہ وہ یہاں ساڑھے پانچ ماہ سے ملازم ہے۔''
''تو پھر یہی ہو سکتا ہے کہ پرانا چوکیدار ملازمت چھوڑ گیا ہو۔'' ثاقب نے جواب دیا۔ ''میں اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں کر سکتا۔ ڈیڈی ہی کچھ بتا سکیں گے۔''
''کیا یہ لاشیں انہی دنوں دیوار میں چنی گئی ہوں گی جب گھر خالی پڑا رہتا تھا؟''
''اندازہ تو یہی لگایا جا سکتا ہے۔''
''چوکیدار تو اس سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔''
''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''
''ہوں۔'' پولیس آفیسر نظریں جھکا کر اس طرح بڑبڑایا جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو۔ ''اس چوکیدار کا پتا لگانا پڑے گا۔''
روحی اور ثاقب خاموش رہے۔
''آپ دونوں کا بیان باقاعدہ قلم بند کیا جائے گا۔'' پولیس آفیسر کچھ توقف سے بولا۔
''ہم حاضر ہیں آفیسر۔'' اس مرتبہ روحی بول پڑی۔
ان دونوں کے بیانات لینے کے بعد پولیس چلی گئی۔

جاتے جاتے پولیس آفیسر کہہ گیا تھا۔ ''پولیس کو اطلاع دیے بغیر آپ دونوں شہر سے کہیں نہیں جائیے گا۔''

روحی اور ثاقب ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے تھے۔ پولیس کے جانے کے بعد بھی کچھ دیر سکوت رہا، پھر ثاقب آہستہ سے بولا۔

''بہت تھکن ہو گئی ہے۔ چل کے کچھ دیر آرام کرنا چاہیے۔''

ثاقب کے ساتھ روحی بھی کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''ہم پر اس پابندی کا مطلب؟''

''اتنا تو ہوگا روحی۔'' ثاقب نے کہا۔ ''اگر انسانی ڈھانچے کسی معمولی شخص کے گھر سے نکلے ہوتے تو اسے حراست میں لے لیا جاتا۔''

روحی سر جھکا کر ثاقب کے ساتھ خواب گاہ کی طرف بڑھتی رہی۔

باقی دن بھی ذہنی انتشار میں گزرا۔ رات کو بھی وہ دونوں ٹھیک سے نہیں سو سکے۔ روحی بے ہنگم خواب بھی دیکھتی رہی۔ دوسری صبح ناشتا کرنے کے بعد ثاقب نے دفتر جانے کی تیاری شروع کی تو روحی بولی۔

''آج جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

''کہنے کی ضرورت نہیں تھی تمہیں۔ مجھے خود احساس ہے۔ میں دو تین گھنٹے کے اندر واپس آجاؤں گا۔''

پھر وہ چلا گیا۔ روحی اسے برآمدے تک چھوڑنے کے بعد کمرے میں لوٹ آئی۔ لیٹنے کے بعد اسے اخبار کا خیال آیا۔ عموماً وہ اور ثاقب ناشتے کی میز پر ہی اخبار دیکھ لیتے تھے مگر اس دن دونوں ہی کی ذہنی حالت کچھ ایسی تھی کہ انہیں اخبار کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ گھر میں اردو اور انگریزی دونوں ہی اخبار آیا کرتے تھے اور کوئی نہ کوئی ملازم وہ اٹھا کر لاؤنج میں رکھ دیتا تھا۔ روحی نے ملازمہ سے اخبار منگوایا۔ اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ اس کے گھر سے برآمد ہونے والے انسانی ڈھانچے کی خبر اخبارات میں ضرور آگئی ہوگی۔ اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ چار کالمی خبر تھی۔ ذیلی سرخی میں اس کے والد باقر سلمان کے اغوا اور ان کی ہلاکت کا حوالہ بھی تھا۔

روحی نے خبر پڑھنا شروع ہی کی تھی کہ ایک کال آگئی اور اس کے بعد تو کالز کا تانتا ہی بندھ گیا۔ سبھی جاننے والے اس خبر کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ روحی جیسے تیسے سب کو جواب دیتی رہی۔ انہی کالز میں ایک کال پرویز کی بھی تھی۔

''یہ کیا معاملہ ہے روحی؟ میں نے ابھی اخبار پڑھا۔ دس منٹ سے برابر فون کر رہا ہوں۔ لائن انگیج مل رہی تھی۔''

''ہاں۔'' روحی نے کہا۔ ''جاننے والوں کے پے در پے فون آرہے تھے۔ رہ گئی یہ بات کہ کیا معاملہ ہے، تو وہ تم نے اخبار میں پڑھ ہی لیا ہوگا۔ میں نے ابھی اخبار ٹھیک سے نہیں پڑھا لیکن میرا خیال ہے کہ میرے اور ثاقب کے وہ بیانات بھی چھپے ہوں گے جو ہم نے پولیس کو دیے ہوں گے۔''

''وہ تو میں پڑھ چکا ہوں۔''

''تو اب اور کیا بتاؤں کہ کیا معاملہ ہے؟'' روحی کا لہجہ کچھ خشک ہو گیا۔ وہ فون اٹینڈ کرتے کرتے اکتا گئی تھی۔

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا تھا روحی کے پولیس نے تمہیں یا ثاقب صاحب کو پریشان تو نہیں کیا؟''

''نہیں، میرا خیال ہے کہ اب تمہیں فون بند کر دینا چاہیے۔''

''معذرت خواہ ہوں کہ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔ آخر میں بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر پولیس تم لوگوں کو بلاوجہ پریشان کرے، جو عموماً پولیس والوں کی عادت ہوتی ہے، تو اس صورت میں تم مجھ سے ضرور رابطہ کرنا، بلکہ کسی بھی قسم کی پریشانی ہو، مجھے ضرور بتانا۔ شاید میں تمہارے کام آسکوں۔''

پرویز کی بات روحی کی سمجھ میں نہیں آسکی۔ اگر پولیس اس کے لیے کسی پریشانی کا سبب بنتی تو پرویز اس کے کیا کام آسکتا تھا؟

شاید روحی اس بارے میں استفسار کر بیٹھتی لیکن دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔

اس کے بعد جاننے والوں کے دو چار فون اور آئے تھے۔ جب یہ سلسلہ تھما تو روحی نے اخبار کی طرف توجہ دی۔ خبر بہت تفصیل سے دی گئی تھی اور خبر کے آخر میں رپورٹر نے یہ سوال کھڑا کیا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ باقر سلمان کے گھر سے ڈھانچوں کی برآمدگی کے کیس کی کوئی کڑی باقر سلمان اور ان کی اہلیہ کے اغوا اور ہلاکت سے مل جائے؟

روحی نے اخبار ایک طرف ڈال دیا۔ رپورٹر کی قیاس آرائی نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ رپورٹر کی قیاس آرائی کی بنیاد اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔

دو گھنٹے بعد ثاقب دفتر سے لوٹا تو روحی نے اس سے بھی اس بارے میں بات کی۔

ثاقب بولا۔ ''اس میں اپنا دماغ مت کھپاؤ۔ خبر میں سنسنی پیدا کرنے کے لیے رپورٹر حضرات اس قسم کی باتیں بھی لکھ ڈالتے ہیں۔''

لیکن روحی رپورٹر کی قیاس آرائی کو اپنے دماغ سے نہیں کھرچ سکی۔ اس کے علاوہ پرویز کی پیشکش بھی اس کے لیے ایک سوالیہ نشان بنی رہی لیکن یہ ذکر اس نے ثاقب سے نہیں کیا۔

پھر اسی دن سہ پہر کو انہیں ایک اور پریشانی لاحق ہوئی جب پولیس آئی اور ان سے کہا گیا کہ ان کے لان کا جائزہ لیا جائے گا۔

''مگر کیوں؟'' روحی نے تیزی سے پوچھا۔

''ابھی نہ پوچھیے تو بہتر ہوگا۔'' پولیس آفیسر نے خشک لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' ثاقب جلدی سے بول پڑا۔ اس نے روحی کا ہاتھ بھی دبایا تھا۔ ''جو دل چاہے کیجیے۔'' دوسرا جملہ بھی اس نے پولیس آفیسر ہی سے کہا۔

روحی چپ ہوگئی۔

پولیس کی نفری اچھی خاصی تھی۔ وہ سب لان میں پھیل گئے جو خاصا بڑا تھا۔ پولیس ایسے آلات بھی لائی تھی جن سے زمین کی گہرائی کا بھی کسی حد تک جائزہ لیا جاسکتا تھا۔

روحی اور ثاقب برآمدے میں کھڑے پولیس کی سرگرمی دیکھتے رہے۔ وہ آپس میں یہ باتیں بھی کرتے رہے کہ پولیس لان میں آخر کیا جھک مار رہی ہے۔

''ارے! یہ کیا۔'' اچانک روحی کے منہ سے نکلا۔

ثاقب نے بھی دیکھ لیا تھا کہ پولیس نے ایک جگہ کھدائی شروع کردی تھی۔

''یہ تو ہمارا سارا لان تباہ کردیں گے۔'' روحی پھر بولی۔ ''ان سے پوچھو تو سہی کہ آخر......''

''آؤ۔'' ثاقب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور برآمدے سے اترنے لگا۔ روحی بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔ پولیس آفیسر نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا تو خود بھی ان کی طرف بڑھ آیا۔

''فرمائیے۔'' وہ ان کے قریب پہنچ کر بولا۔

''آپ تو ہمارا لان تباہ کیے ڈال رہے ہیں۔'' روحی نے شدید احتجاجی لہجے میں کہا۔

''کچھ شبہ ہے جس کی تصدیق ضروری ہے۔'' پولیس آفیسر نے جواب دیا۔

''کیا شبہ ہے؟'' اس مرتبہ ثاقب بول پڑا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ ابھی نہ پوچھیے۔''

''کیوں نہ پوچھیں؟'' روحی نے تیز لہجے میں کہا۔ ''آپ ہمارا خوب صورت لان تباہ کیے ڈال رہے ہیں۔''

پھر ثاقب بھی بول پڑا۔ ''کیا اس کے لیے آپ کے پاس اجازت نامہ ہے کسی مجسٹریٹ کا؟''

ثاقب کو قانون کے بارے میں ذرا بھی واقفیت نہیں تھی۔ اس نے بس اندھیرے میں ایک تیر چلادیا تھا۔

پولیس آفیسر کے چہرے پر تختی کے تاثرات ابھر آئے۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ''زیادہ قانونی باتیں نہ کیجیے ورنہ آپ کو کچھ پریشانی لاحق ہوسکتی ہے۔ مجھے کم از کم یہ اختیار ضرور ہے کہ ڈھانچے آپ کے گھر سے برآمد ہوئے ہیں اس لیے میں آپ کو پوچھ گچھ کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر لے جاسکتا ہوں۔ آٹھ دس گھنٹے تک بھی آپ سے پوچھ گچھ کی جاسکتی ہے۔ اگر آپ اس پریشانی سے بچنا چاہتے ہیں تو بہتر ہوگا کہ ہمارے کام میں دخل نہ دیں۔''

ثاقب یک لخت ڈھیلا پڑ گیا۔ اسے خیال آیا تھا کہ پولیس آفیسر انہیں اس حد تک تو پریشان کرہی سکتا ہے۔

روحی کو فوراً پرویز کی بات یاد آگئی جو اس نے فون پر کہی تھی۔

''میرے ساتھ آؤ ثاقب۔'' وہ کہتی ہوئی واپسی کے لیے مڑی۔

ثاقب اس کے ساتھ چل پڑا۔ ''کیا خیال آگیا جو اتنی تیزی سے چل پڑی ہو؟''

''میں ایک فون کروں گی۔''

روحی اپنا موبائل فون برآمدے کی ایک کرسی پر چھوڑ آئی تھی۔ ثاقب کا موبائل وہ استعمال نہیں کرسکتی تھی کیونکہ اسے پرویز کا نمبر یاد نہیں تھا لیکن وہ نمبر اس کے موبائل میں تھا۔ اس نے پرویز کی کال ڈیلیٹ نہیں کی تھی۔

برآمدے تک پہنچتے پہنچتے اس نے ثاقب کو پرویز کی کال کے بارے میں مختصراً بتادیا۔

''وہ ہماری کیا مدد کرسکتا ہے پولیس کے معاملے میں۔'' ثاقب بولا۔

''آزمانے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔''

وہ دونوں برآمدے میں پہنچ گئے۔ روحی نے موبائل اٹھایا۔ پرویز سے رابطہ قائم ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔

''بے حد خوشی ہوئی کہ تم نے مجھے فون کیا۔'' دوسری طرف سے چھوٹتے ہی کہا گیا۔

''تم نے مجھ سے کچھ کہا تھا پرویز!'' روحی جلدی سے بولی۔ ''کیا تم واقعی کسی معاملے میں مدد کر سکتے ہو؟''

''ایسا کوئی وقت آئے تو آزما کر دیکھ لینا۔''

''تو سنو! میں اس وقت ایک پریشانی ہی سے دوچار ہوں۔ کیا تم فوری طور پر میرے گھر آ سکتے ہو؟''

''بات کیا ہے روحی؟'' پرویز کے لہجے میں سنجیدگی آ گئی۔

''وقت کم ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لو کہ پولیس کا معاملہ ہے۔''

''کیا ہوا؟'' پرویز نے جلدی سے پوچھا۔

''فون پر وقت ضائع نہ کرو۔ اگر تم پولیس کے معاملے میں کچھ کر سکتے ہو تو فوراً آ جاؤ۔ یہیں آ کر جان لینا سب کچھ۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔ بیس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔''

باتوں میں مزید وقت ضائع نہ ہو، اس خیال سے روحی نے فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔

روحی نے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا اس لیے ساری باتیں ثاقب نے بھی سن لی تھیں۔ وہ بولا۔ ''کیا وہ کہیں قریب ہی ہو گا؟ بیس منٹ میں پہنچنے کے لیے کہا ہے اس نے۔''

''کار ہو گی اس کے پاس۔ مناسب گھرانے سے تعلق ہے اس کا۔ کالج آیا کرتا تھا، تب بھی کار تھی اس کے پاس۔''

ثاقب نے ملازم کو ہدایت کی کہ پندرہ بیس منٹ میں ایک کار آئے گی۔ اس کے لیے پھاٹک فوراً کھول دیا جائے۔

پولیس نے اندر آنے کے بعد پھاٹک بند کروا دیا تھا۔

روحی کو پرویز سے بات کیے ہوئے بیس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ انہوں نے پھاٹک کھلتے اور ایک کار اندر آتے دیکھی۔ چمکتی دمکتی کار تھی جو بہت قیمتی تو نہیں لیکن معمولی بھی نہیں تھی۔

وہ برآمدے کے سامنے ہی آ کر رکی۔ پرویز ہی اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کئی برس میں اتنی تبدیلی نہیں آئی کہ کسی کو پہچانا نہ جا سکے۔ روحی کو وہ پہلے سے زیادہ پُروقار دکھائی دیا۔

''ہیلو۔'' وہ کار سے اتر کر تیزی سے برآمدے میں آتا ہوا بولا۔

''ہیلو پرویز۔'' روحی نے کہا۔

''ہیلو۔'' ثاقب کی آواز دھیمی سی تھی۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' پرویز نے پُرجوش انداز میں ثاقب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ ثاقب صاحب ہی ہوں گے۔''

''رسمی باتیں پھر کسی وقت پرویز۔'' روحی جلدی سے بولی۔

''ٹھیک ہے۔ کیا مسئلہ ہے۔ پولیس لان میں کیا کر رہی ہے؟''

''اسی کی وجہ سے تو میں نے تمہیں بلایا ہے۔'' روحی نے جواب دیا اور مختصر طور پر ساری بات بتا دی۔

پرویز کے چہرے پر سوچ بچار کا تاثر دکھائی دیا پھر وہ بولا۔ ''اچھا میں جا کر پولیس آفیسر سے بات کرتا ہوں۔ تم یہیں رکو۔'' اس نے روحی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا لیکن اس کا مطلب یہی ہو گا کہ ثاقب بھی وہیں رکے۔

روحی نے سر ہلانے پر اکتفا کی تھی۔ پرویز برآمدے سے اتر کر تیزی سے لان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

پھر اس وقت روحی چونک گئی جب اس نے دیکھا کہ پولیس آفیسر نے پرویز کو سیلیوٹ کیا تھا۔

''کیا مطلب۔'' ثاقب کے منہ سے نکلا۔

''میں خود بھی حیران ہوئی ہوں ثاقب۔'' روحی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''کیا پرویز کا تعلق بھی پولیس کے محکمے سے ہے؟''

''ایسا ہی سمجھا جا سکتا ہے۔'' روحی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اور یقیناً وہ کسی بڑے عہدے پر ہے۔''

روحی کے چہرے پر مسکراہٹ کا تاثر ابھرا۔ ''وہ یقیناً ہمیں اس پریشانی سے نجات دلا سکتا ہے۔ میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ اب وہ پولیس کے محکمے میں کسی بڑے منصب پر ہو گا۔''

وہ دونوں پرویز کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ ان کی نظریں پرویز اور پولیس آفیسر ہی کی طرف تھیں۔ پولیس آفیسر کچھ بتا رہا تھا اور پرویز کبھی کبھی سر کو خفیف سی جنبش دے دیتا تھا یا کبھی کوئی مختصر جملہ بولتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ برآمدے کی طرف لوٹ آیا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے تاثرات تھے۔

''پرویز، تم......'' روحی نے بے چینی سے کوئی سوال

کرنا چاہا۔

"کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟" پرویز نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ برآمدے میں ایک ہی کرسی پڑی تھی۔

"چلیں، اندر چلتے ہیں۔" ثاقب بولا۔

وہ تینوں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

"تم میرے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو روحی؟" پرویز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "لیکن پہلے اس معاملے پر بات کر لیں تو بہتر ہوگا جس کی وجہ سے تم پریشان ہو اور ثاقب صاحب بھی۔ میں یہی کہوں گا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پولیس جو کچھ کر رہی ہے، بلاوجہ نہیں کر رہی ہے۔ لان کچھ خراب ہو رہا ہے تو ٹھیک بھی ہو جائے گا۔ کچھ معلومات حاصل ہونے کی وجہ سے پولیس کو کچھ شبہ ہوا ہے۔"

روحی اور ثاقب خاموشی سے پرویز کی طرف دیکھتے اور سنتے رہے۔

پرویز نے بات جاری رکھی۔ "جس دیوار سے ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں، وہ دیوار یقیناً بالکل صاف ستھرے انداز میں بنی ہوگی اور ایسا کام وہ مزدور یا کاریگر ہی کر سکتے ہیں جن کا پیشہ ہی یہ ہو۔ وہ دیوار یقیناً ایسے ہی مزدوروں سے بنوائی گئی ہوگی۔ انسپکٹر سلیم نے مجھے بتایا ہے کہ وہ دیوار تھی بھی غیر معمولی طور پر...... موٹی...... یا چوڑی...... فوری طور پر میرے ذہن میں کوئی اور لفظ نہیں آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ عام قسم کی دیوار میں انسانی ڈھانچے نہیں چھپائے جا سکتے۔ گویا یقینی طور پر یہ کام ماہر افراد ہی کر سکتے ہیں۔ کسی نے اس کام کے لیے ایسے دو چار افراد کی خدمات حاصل کی ہوں گی چنانچہ کل ہی تمام پولیس اسٹیشنوں کو ہدایات دے دی گئی تھیں کہ وہ اپنے علاقے کے مزدوروں سے پوچھ گچھ کریں کہ ان میں سے کس نے اس عمارت میں ایک دیوار تعمیر کی ہے لیکن انسپکٹر سلیم کو شبہ کیا، یقین تھا کہ ایسا کوئی مزدور نہیں ملے گا۔ اس کے یقین کی بنیاد یہ خیال تھا کہ جس نے بھی ان دو افراد کو ہلاک کر کے...... ظاہر ہے کہ ان کی لاشیں ہی دیوار میں چنوائی گئی ہوں گی اور جس نے بھی یہ کام کیا ہے، اسے یہ خیال ضرور آیا ہوگا کہ وہ مزدور اس کا یہ راز فاش کر سکتے ہیں۔ ان سے یہ کام بھی ریوالور کی نال پر زبردستی کروایا گیا ہوگا۔ مزدوروں سے خطرہ محسوس کرنے والا ان مزدوروں کو بھی ہلاک کر سکتا ہے۔ جو دو قتل کر چکا ہو، وہ دو چار اور قتل بھی کر سکتا ہے۔ انہیں قتل کرنے کے بعد اس کے سامنے یہ مسئلہ ہوگا کہ وہ ان مزدوروں کی لاشیں کیسے غائب کرے۔ کیونکہ ان مزدوروں کو یہیں قتل کیا ہوگا اس لیے شبہ کیا جا سکتا ہے کہ انہیں دفن بھی یہیں کہیں کیا گیا ہوگا اور یہاں ایسی جگہ یہ لان ہی ہو سکتی ہے۔ کچی زمین میں بھی ایک بڑا گڑھا کھودنا ناممکن نہیں۔ انسپکٹر سلیم اس وقت اپنے اسی شبہے کی وجہ سے لان کھدوا رہا ہے لیکن سارا لان وہ ظاہر ہے کہ نہیں کھدوائے گا۔ آلات سے زمین کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ جہاں کچھ آثار ملیں گے، کھدائی اسی جگہ کروائی جائے گی۔"

"یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے پرویز صاحب۔" ثاقب بولا۔

"میں سمجھ گیا آپ کیا کہیں گے۔" پرویز نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں نے بھی انسپکٹر سلیم سے کہا تھا کہ جس نے بھی ان دو افراد کو قتل کر کے دیوار میں چنوایا ہے، اسے اس کام کے لیے مزدوروں کی خدمات حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ انہی دو لاشوں کو لان میں دفن کر دیتا۔"

"جی۔" ثاقب نے سر ہلایا۔ "یہی سوال آیا تھا میرے ذہن میں۔"

"انسپکٹر سلیم کا کہنا ہے کہ ان دو افراد کا قتل کسی پیشہ ور شخص کا نہیں ہو سکتا اور ایسے لوگ زیادہ سوچ بچار نہیں کر سکتے۔ فوری طور پر تو اس نے لاشیں دیوار میں چنوانے کے لیے مزدوروں کی خدمات حاصل کر لی ہوں اور ریوالور یا ایسے کسی بھی قسم کے ہتھیار کے زور پر ان سے یہ کام کروایا ہوگا لیکن کام کے دوران میں ہی اس نے مزدوروں سے خطرہ محسوس کیا ہوگا اور تب اس نے فیصلہ کیا ہوگا کہ وہ ان مزدوروں کو بھی ختم کر کے لان میں دفن کر دے گا۔"

"لیکن یہ صرف قیاس یا شبہ ہی ہے نا۔" ثاقب بولا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس نے ان مزدوروں کو زیادہ رقم دے کر ملک سے باہر بھجوا دیا ہو۔ مزدوروں کے مالی حالات ایسے ہی ہوتے ہیں کہ بڑی رقم کے لالچ میں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"انسپکٹر سلیم ایک ذہین افسر ہے۔ اس نے یہ پہلو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے۔ ایک بات اور بتا دوں۔ محکمہ پولیس میں مختلف فنون کے ماہرین بھی ہوتے ہیں۔ انسپکٹر سلیم نے محکمے کے ایک ایسے ہی آدمی کو بلا کر دیوار دکھائی تھی، وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس دیوار کو بنے ہوئے کتنا عرصہ گزرا ہوگا۔ ماہر کے بیان کے مطابق وہ دیوار اس گھر کی تعمیر کے بہت عرصے بعد بنوائی گئی تھی۔ اس نے دیوار کی تعمیر کی مدت کا جو

اندازہ لگایا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ آپ کے والدین کی ہلاکت سے کچھ ہی عرصے پہلے بنائی گئی تھی چنانچہ اس کی بھی چھان بین کروا رہا ہے کہ اس عرصے میں کتنے مزدور بیرونِ ملک گئے ہیں۔ ان جانے والوں کی تفصیلات بھی جمع کی جائیں گی۔"

"مزدور تو بیرونِ ملک جاتے ہی رہتے ہیں۔" ثاقب بولا۔ "اس عرصے میں تو بے شمار مزدور باہر گئے ہوں گے۔ خاص طور سے خلیجی ریاستوں میں تو بہت جاتے ہیں۔"

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ اس کام میں خاصا عرصہ لگ جائے گا لیکن اس قسم کے معمولات میں تفتیش سالوں تک بھی پھیل جاتی ہے۔ انسپکٹر سلیم نے سوچا کہ اس عرصے میں وہ کم از کم اپنا یہ شبہ تو دور کر لے کہ ان کی لاشیں شاید لان میں ہی دفن کی گئی ہوں۔ لان کچھ خراب تو ہوگا لیکن جیسا میں کہہ چکا ہوں، وہ ٹھیک بھی کروایا جا سکتا ہے۔ آپ لوگ کیوں پولیس کے کام میں رکاوٹ بنیں۔ اچھا ہے اگر لاشیں یہیں سے مل جائیں۔ تفتیش تیزی سے آگے بڑھ سکے گی۔ قاتل سے پہلے یہ معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ مقتول کون تھے۔ ان کی لاشیں لیبارٹری میں ہیں۔ سلیم کو لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ کا بھی انتظار ہے۔ اس کے علاوہ شناختی کارڈ کے محکمے کا تعاون بھی حاصل کیا گیا ہے۔"

روحی جو اس دوران میں بالکل خاموش رہی تھی، یکا یک بول پڑی۔ "ٹھیک ہے پرویز! اگر تم کہتے ہو تو ہم اس معاملے میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ اگر وہ پولیس آفیسر...... کیا نام......"

"انسپکٹر سلیم۔"

"ہاں، اگر یہی سب باتیں انسپکٹر سلیم ہی ہمیں بتا دیتا تو اچھا تھا۔"

"عام طور پر پولیس اپنے کسی کام کا مقصد قبل از وقت کسی کو نہیں بتاتی۔ انسپکٹر سلیم تو اس معاملے میں خاصا سخت ہے۔"

"لیکن تم نے کیوں بتا دیا۔" روحی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تم بھی تو پولیس میں ہو اور یقیناً کسی بڑے عہدے پر ہو۔ انسپکٹر سلیم نے تمہیں سیلیوٹ کیا تھا۔"

"نہیں۔" پرویز بھی مسکرایا۔ "میں محکمۂ پولیس میں نہیں ہوں۔ ایک اور خفیہ ایجنسی میں ہوں جس کا پولیس سے قریبی رابطہ رہتا ہے۔ عام پولیس والے تو نہیں لیکن افسران مجھ سے واقف ہیں۔ میں نے تمہیں یہ سب کچھ اس لیے بتا دیا کہ تمہاری پریشانی ختم ہو۔"

"ہاں۔" ثاقب مسکرایا۔ "آپ کو روحی کی پریشانی کا خیال تو ہونا ہی چاہیے۔"

"جی۔" پرویز کچھ ٹپٹا گیا اور اس نے روحی کی طرف دیکھا۔

"ہاں پرویز!" روحی ہنس پڑی۔ "میں نے ثاقب کو بتا دیا ہے۔"

"اب ہم بس اچھے دوست ہیں۔" پرویز نے جلدی سے کہتے ہوئے ثاقب کی طرف دیکھا۔

"کیوں صفائی پیش کر رہے ہیں آپ۔" ثاقب مسکراتا رہا۔ "میری بیوی ہے ہی اتنی خوب صورت کہ ہر ایک کو ہی اچھی لگے گی۔"

روحی نے گھور کر ثاقب کو دیکھا اور پھر اپنی جھنجلاہٹ کو ہنسی میں چھپاتے ہوئے، پرویز سے بولی۔ "میں نے اس پریشانی میں تم سے چائے کافی کے لیے بھی نہیں پوچھا۔ مجھے یاد ہے کالج کی کینٹین میں تم کافی ہی پیا کرتے تھے۔ میں بنواتی ہوں۔"

"ارے نہیں روحی، تکلف کی ضرورت نہیں۔ مجھے اب جانا بھی ہے۔"

لیکن روحی نے اسے اصرار کر کے روکا اور کافی پلا کر ہی رخصت کیا۔ جاتے جاتے پرویز نے کہا تھا۔ "میں نے سلیم سے کہہ دیا ہے کہ وہ تم لوگوں سے نرم لہجے میں بات کرے۔ تم لوگ بھی کوشش کرنا کہ اس سے ایسی ویسی کوئی بات نہ کہہ بیٹھو۔"

پرویز کے جاتے ہی روحی نے بگڑ کر ثاقب سے کہا۔ "میں نے تمہیں پرویز کے بارے میں حقیقت اس لیے تو نہیں بتائی تھی کہ تم اسے شرمندہ کرو۔"

"سوری ڈیئر۔" ثاقب نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور پھر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "چلو چل کر دیکھیں۔ پولیس اب کیا کر رہی ہے۔"

روحی کا منہ کچھ پھولا ہی رہا لیکن وہ ثاقب کے ساتھ باہر آ گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ دو گڑھے پاٹے جا رہے تھے جو کھودے گئے تھے۔

گڑھے پاٹنے کے بعد جب پولیس رخصت ہونے لگی تو انسپکٹر سلیم ان دونوں کے قریب آیا۔ "پرویز صاحب نے بتایا تھا کہ آپ ان کی دوست ہیں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ سے بات کرتے ہوئے میرا لہجہ ایک مرتبہ کچھ سخت ہو گیا تھا۔"

روحی اس کی بات ٹال گئی اور پوچھا۔ ''دو گڑھے کھودے آپ لوگوں نے، کچھ ملا؟''

''نہیں، میرا شبہ غلط ثابت ہوا۔ اب اجازت دیجیے۔''

''ممکن ہو تو ہمیں حالات سے کچھ باخبر رکھیے گا۔''

''جی۔'' انسپکٹر سلیم نے اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔

پھر پولیس چلی گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن طاہر سلمان بیرون ملک سے آگئے۔ خود روحی اور ثاقب نے ائرپورٹ جا کر انہیں ریسیو کیا۔ ڈرائیونگ ثاقب کررہا تھا۔ طاہر سلمان اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ثاقب اگرچہ انہیں فون پر حالات سے آگاہ کرچکا تھا لیکن اس وقت وہ پھر کرید کرید کر تمام باتیں پوچھ رہے تھے اور ثاقب انہیں جواب دے رہا تھا۔

روحی ان کی باتوں کی طرف متوجہ تھی کہ موبائل کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے وینیٹی بیگ سے اپنا موبائل فون نکالا اور اسکرین پر نظر ڈالی، جو نمبر اسے دکھائی دیا، وہ اس کے لیے اجنبی تھا۔

''کون ہے روحی؟'' ثاقب نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔ کوئی اجنبی نمبر ہے۔''

''کال ریسیو کرو۔''

''اجنبی نمبر کی وجہ سے میں ہچکچاہٹ محسوس کررہی ہوں۔''

''نہیں روحی۔'' طاہر سلمان بول پڑے۔ ''حالات کی وجہ سے اجنبی نمبر کی کال بھی ریسیو کرلینی چاہیے۔''

اب روحی نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو!'' اس کی آواز غیر شعوری طور پر دھیمی رہی۔

''روحی صاحبہ؟'' دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

روحی کو وہ آواز کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ ''جی ہاں۔'' وہ بولی۔

''میں انسپکٹر سلیم ہوں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''مجھے اطلاع ملی ہے کہ طاہر سلمان صاحب آگئے ہیں اور اس وقت آپ لوگ کار میں ہیں۔''

''جی!'' روحی نے طویل سانس لے کر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے طاہر سلمان اور ثاقب کو بتایا۔ ''انسپکٹر سلیم۔''

''کار کا رخ کس طرف ہے؟'' انسپکٹر سلیم نے پوچھا۔

''انکل کے گھر کی طرف۔'' روحی نے جواب دیا۔

''انہیں چھوڑ کر ہی ہم اپنے گھر آئیں گے۔''

''آپ طاہر سلمان صاحب کے ساتھ اپنے گھر ہی پہنچیں۔'' انسپکٹر سلیم نے کہا۔ ''کچھ اہم پیش رفت ہوئی ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ تینوں ہی ہوں جب میں آپ کو پیش رفت سے آگاہ کروں۔''

''ہولڈ کیجیے پلیز۔'' روحی نے کہا، پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر طاہر سلمان اور ثاقب کو بتانے لگی کہ انسپکٹر سلیم نے کیا کہا ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' طاہر سلمان بولے۔ ''اس سے کہہ دو کہ ہم اب وہیں پہنچیں گے۔''

''ٹھیک ہے انسپکٹر۔'' روحی نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

''میں کوشش کروں گا کہ آپ لوگوں کو انتظار نہ کرنا پڑے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر رابطہ منقطع ہونے کی ہلکی سی آواز آئی۔

''عجیب بات ہے۔'' روحی نے موبائل فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے معلوم تھا ہم اس وقت کار میں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہماری نگرانی کی جارہی ہے۔''

''یہی ہوسکتا ہے۔''

''کیا پیش رفت ممکن ہے۔'' ثاقب کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا۔

''تھوڑی دیر میں معلوم ہو ہی جائے گا۔'' طاہر سلمان نے کہا۔

اس کے باوجود راستے بھر قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ثاقب نے کار کا رخ اپنے گھر کی طرف کردیا تھا۔

گھر پہنچتے ہی روحی نے ملازم سے چائے کے لیے کہہ دیا کیونکہ طاہر سلمان نے راستے ہی میں چائے کی خواہش کا اظہار کردیا تھا۔

لیکن چائے آنے سے پہلے انسپکٹر سلیم کے آنے کی اطلاع ملی۔ اسے ڈرائنگ روم ہی میں بلا لیا گیا۔ ثاقب نے اس کا اپنے والد سے تعارف کرایا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس وقت ان دونوں کے ساتھ تیسری شخصیت طاہر سلمان ہی کی ہوسکتی تھی۔

''کیا پیش رفت ہوئی ہے آفیسر؟ کوئی پکڑا گیا؟'' روحی نے بے چینی سے پوچھا۔

''ابھی اس کی نوبت نہیں آئی لیکن یہ معلوم ہوگیا کہ وہ

کہیں ٹرین نہ نکل جائے؟

ڈھانچے آپ کے والدین کے تھے۔''

''کیا؟'' روحی کے منہ سے نکلا اور سینے میں اسے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا۔

''جی ہاں۔ اس سلسلے میں مجھے دو رپورٹس ملی ہیں جو ایک دوسری کی تائید کر رہی ہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے آفیسر؟'' طاہر سلمان پریشان لہجے میں بولے۔

ثاقب اس طرح خاموش بیٹھا رہا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

''یہ کیسے ممکن ہے، اس کا جواب بھی مل جائے گا۔ ابھی تو میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر سلیم نے طاہر سلمان ہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پہلے تو میں تقریباً وہی باتیں دہراؤں گا جو روحی صاحبہ کے والدین کے سلسلے میں آپ سے پہلے بھی کی جا چکی ہیں۔''

طاہر سلمان اس کی طرف دیکھتے رہے۔ روحی آبدیدہ ہو گئی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے والدین کو بہت پہلے رو دھو چکی تھی لیکن یہ بھی اس کے لیے صدمے کا سبب بنا تھا کہ اس کے والدین کے ڈھانچے اسی کے گھر سے برآمد ہوئے ہیں۔

انسپکٹر سلیم، طاہر سلمان سے کہہ رہا تھا۔ ''آپ کو فون پر اطلاع دی گئی تھی کہ آپ کے بھائی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔''

''جی۔'' طاہر سلمان نے کہا۔ ''اور مجھ سے دو گھنٹے کے اندر پچاس کروڑ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ وہ جگہ بھی بتائی گئی تھی جہاں مجھے رقم پہنچانی تھی۔''

''اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر پچاس کروڑ دو گھنٹے میں نہ پہنچائے گئے تو آپ کے بھائی کو ہلاک کر دیا جائے گا۔''

''جی ہاں اور دو گھنٹوں میں پچاس کروڑ کا بندوبست کرنا ممکن نہیں تھا، اسی لیے میں نے پولیس کو اس صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔''

روحی کا دھیان ان کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔ وہ اپنے والدین کے سلسلے میں خاصی جذباتی ہو چکی تھی۔ ویسے بھی اسے ماضی کے ان سب واقعات کا علم پہلے ہی ہو چکا تھا۔ طاہر سلمان پولیس کی ہدایت پر ایک بڑا بریف کیس لے کر اس ویران مقام پر گئے تھے جہاں رقم پہنچانے کے لیے کہا گیا تھا۔ نشانی یہ بتائی گئی تھی کہ بارہ چودہ سال کا ایک لڑکا بش کوٹ اور نیکر پہنے وہاں ہوگا۔ رقم اسی کے حوالے کرنی تھی۔ پولیس والے پہلے ہی سے اس جگہ گھات لگا کر بیٹھ گئے تھے لیکن بارہ چودہ سال کا کوئی لڑکا وہاں تھا، نہ آیا۔ پندرہ بیس منٹ انتظار کے بعد موبائل فون پر متعلقہ پولیس افسر نے ان سے کہا تھا کہ اب وہ اپنے گھر واپس لوٹ جائیں۔ اس ہدایت پر وہ گھر واپس لوٹ رہے تھے تو ان کے موبائل فون پر ایک کال آئی۔ کال کرنے والا وہی شخص تھا جس نے پچاس کروڑ کا تاوان مانگا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ طاہر سلمان نے خاموشی سے تاوان ادا کرنے کے بجائے پولیس سے رابطہ کیا تھا لہٰذا ان کے بھائی بھاوج کو قتل کر دیا گیا ہے اور ان کی لاشیں کسی ویران جگہ دفن کر دی جائیں گی۔ طاہر سلمان جس وقت اپنے گھر پہنچے تھے، اسی وقت متعلقہ پولیس افسر بھی پہنچ گیا تھا۔ غم سے نڈھال طاہر سلمان نے اسے صورتِ حال بتائی تھی۔ اس کے بعد ہی طاہر سلمان نے فون کر کے ثاقب کو اس سانحے کی اطلاع دی تھی اور ثاقب نے روحی کو بتایا تھا جس کے بعد وہ دونوں لندن سے کراچی آئے تھے۔

طاہر سلمان کو دونوں مرتبہ مختلف پبلک کال آفس سے فون کیے گئے تھے۔ پولیس نے دونوں جگہ چھان بین کی

تھی۔ دونوں جگہ سے بہت سے لوگ فون کر چکے تھے اور فون کرنے والوں کا تعلق نہایت غریب طبقے سے تھا جو موبائل فون رکھنے کی استطاعت ہی نہیں رکھتے تھے۔ صرف ایک شخص کے بارے میں پولیس کو کچھ شبہ ہوا تھا۔ اس شخص کا نام جنید تھا جس نے دونوں ہی فون پبلک کال آفس سے کیے تھے اور وقت وہی تھا جب طاہر سلمان کو فون کیے گئے تھے۔

پولیس نے جنید کے بارے میں چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک بے حد مشہور ماڈل گرل شیبا کا بھائی تھا۔ جنید اپنی بہن ہی کے ساتھ رہتا تھا لیکن چند روز قبل شیبا اس سے شدید ناراض ہو گئی تھی۔ اس نے جنید کو اپنے گھر سے نکال دیا تھا، نہ صرف نکال دیا تھا بلکہ اس کے پاس جو کچھ قیمتی چیزیں تھیں، وہ بھی اس سے چھین لی تھیں کیونکہ وہ اسی نے اپنے بھائی کو دی تھیں۔ ان میں اس کا موبائل، اس کی قیمتی رسٹ واچ اور سونے کی وہ زنجیر بھی جو وہ اپنے گلے میں پہنے رہتا تھا۔ جب وہ گھر سے نکلا تو اس کی جیب میں چند سو روپے تھے۔ سر چھپانے کے لیے اسے ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک اس قسم کی سرائے میں جگہ مل سکی تھی جہاں صرف رات کو سونے کے لیے ایک بستر مل جاتا تھا۔ جنید کے پاس اتنی رقم تھی ہی نہیں کہ وہ کوئی معقول جگہ کرائے پر لے سکتا۔ اس نے دو مرتبہ پبلک کال آفس سے جو فون کیے تھے، وہ شیبا کو کیے تھے۔ دونوں مرتبہ اس نے یہی کوشش کی تھی کہ اپنی بہن کی خفگی دور کر سکے لیکن شیبا نہیں مانی تھی۔ وہ جنید سے تین سال بڑی تھی۔

پولیس نے شیبا سے پوچھ گچھ کی تو اس نے تصدیق کی کہ جنید نے اسے فون کیے تھے۔ استفسار پر شیبا نے یہ بھی بتایا تھا کہ جنید نے انٹر کر کے تعلیم چھوڑ دی تھی جس کے باعث اس نے ناراض ہو کر جنید کو گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ ایک بنگلے میں صرف ملازموں کے ساتھ رہتی تھی۔

بعد میں کچھ ہوا یا نہیں، روحی اس سے بے خبر تھی لیکن ثاقب اور طاہر سلمان کے اس خیال سے متفق ہو گئی تھی کہ پولیس نے تھک ہار کر فائل ہی بند کر دی ہو گی۔

ثاقب نے روحی کا ہاتھ دبایا تو وہ چونکی۔ ''خود کو قابو میں رکھو روحی۔'' اس نے کہا تھا۔

روحی ٹشو نکال کر اپنی بھیگی ہوئی پلکیں خشک کرنے لگی۔

اس وقت انسپکٹر سلیم، طاہر سلمان سے کہہ رہا تھا۔ ''میں وہ ساری فائل دیکھ تو چکا ہوں اس لیے مجھے بھی باتوں کا علم ہے لیکن میں ایک بار پھر آپ سے کچھ پرانے سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیجیے۔''

''اغوا ہونے سے چند دن پہلے باقر سلمان صاحب افریقہ سے لوٹے تھے اور کچھ علیل تھے؟''

''جی ہاں۔'' طاہر سلمان نے کہا۔ ''ان کے کاروبار کا تعلق زیادہ تر افریقی ممالک سے تھا۔''

''اور اب بھی وہیں سے ہے؟''

''جی ہاں۔ میں نے ان کی کمپنی اور اپنی کمپنی کو ختم نہیں کیا ہے کیونکہ روحی کے شوہر کی حیثیت سے اب ثاقب ہی اس کا سب کام دیکھ رہا ہے۔ رابطے اب بھی افریقی ممالک سے ہیں۔''

''جب وہ افریقہ سے لوٹے تھے تو غالباً مراکش سے فلائٹ لی تھی انہوں نے؟ اور ان کی طبیعت بھی وہیں خراب ہوئی تھی۔''

''جی ہاں۔ میں پہلے ہی بات چکا ہوں کہ......''

''وہ مجھے معلوم ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ میں وہ سوالات دوبارہ کر رہا ہوں۔''

''انہیں وہاں فوڈ پوائزننگ ہو گئی تھی۔'' طاہر سلمان شاید پرانے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے اکتانے لگے تھے۔ ''نہ جانے کیا کھا لیا تھا انہوں نے...... وہاں دو دن اسپتال میں رہے تھے۔ ان کی فوڈ پوائزننگ کے اثرات تو ختم کر دیے گئے تھے لیکن ہلکا سا بخار ہو گیا تھا۔ بھائی صاحب نے اسی عالم میں اسپتال چھوڑ دیا اور فلائٹ پکڑ کر واپس آ گئے لیکن ان کا بخار تیز ہو گیا۔ اس لیے وہ دفتر بھی نہیں جا سکے۔ یہاں ان کا علاج ان کے فیملی ڈاکٹر نے کیا۔ ان کی طبیعت ٹھیک ہو گئی لیکن نقاہت اتنی تھی کہ ڈاکٹر نے انہیں ایک ہفتے آرام کا مشورہ دیا تھا۔'' طاہر سلمان تفصیل سے بتاتے چلے گئے۔ غالباً وہ نہیں چاہتے تھے کہ بار بار سوال کیے جائیں۔ ''میں ایک دو گھنٹے ان کے ساتھ ضرور گزارتا تھا۔'' وہ بولتے رہے۔ ''ایک گھنٹے دفتر جانے سے پہلے اور ایک گھنٹا رات کو۔ بھائی کے اصرار پر کھانا بھی وہیں کھاتا تھا۔ کبھی کبھی میری اہلیہ بھی ساتھ ہوتی تھیں۔ وہ اس وقت حیات تھیں۔ ایک رات وہاں سے آنے کے بعد ہم سو چکے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ کال کرنے والے نے بتایا کہ اس نے میرے بھائی اور بھاوج کو اغوا کر لیا ہے اور انہیں پچاس کروڑ کے عوض ہی چھوڑے گا۔ اس نے صرف دو گھنٹے کی مہلت دی تھی۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بجے تھے۔''

''آپ باقر سلمان صاحب کے گھر سے کس وقت لوٹے تھے؟'' انسپکٹر سلیم سوال کرہی بیٹھا۔

''ہم ساڑھے نو بجے گھر آگئے تھے اور......''

''وہاں سے کس وقت چلے تھے؟''

''گھڑی تو نہیں دیکھی تھی میں نے۔'' طاہر سلمان نے کچھ اکھڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن وہاں سے میرے گھر تک کی ڈرائیو بیس منٹ کی ہے۔ ساڑھے نو بجے کے قریب ہم گھر آگئے تھے۔''

''گویا لگ بھگ نو بج کر دس منٹ پر وہاں سے چلے ہوں گے۔''

''جی۔''

''اچھا تو...... ساڑھے گیارہ بجے آپ کو وہ کال آئی؟''

''جی! اور رات کے دو گھنٹے میں پچاس کروڑ کا بندوبست کسی طرح بھی نہیں ہوسکتا تھا اس لیے......''

''اگر بندوبست ممکن ہوتا؟''

''تو میں اپنے بھائی کو بچانے کے لیے مطالبہ تسلیم کر لیتا کیونکہ......'' طاہر سلمان کا لہجہ کچھ کھردرا ہوگیا۔ ''ہماری پولیس اس قسم کے معاملات میں عموماً کچھ نہیں کر پاتی اور ہوا بھی یہی۔ میں نے پولیس سے رابطہ قائم کیا لیکن کیا نتیجہ نکلا۔ میرے بھائی اور بھاوج تو مار ڈالے گئے اور آج تک ان کے قاتلوں کا سراغ بھی نہیں ملا۔''

انسپکٹر سلیم نے طاہر سلمان کے لہجے کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور بولا۔ ''پولیس سے رابطہ کرنے سے پہلے آپ باقر سلمان صاحب کے گھر گئے تھے؟''

''جی ہاں، یہ جاننا تو ضروری تھا کہ کیا واقعی انہیں اغوا کرلیا گیا ہے۔ میں نے وہاں پہنچنے سے پہلے بھائی صاحب کے موبائل سے بھی رابطہ قائم کرنا چاہا تھا لیکن وہ بند ملا۔ گھر میں جو دو ٹیلی فون تھے، وہ بھی انگیج ملتے رہے۔ یہ تو وہاں جانے کے بعد معلوم ہوا کہ دونوں ٹیلی فونوں کے ریسیور، کریڈل سے الگ پڑے ہوئے تھے اور موبائل فون تو غائب ہی تھے۔ بھائی اور بھاوج کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ملازمین بھی بے خبر تھے کہ گھر میں کیا ہوچکا ہے۔ اس وقت تو سمجھ میں ہی نہیں آسکا تھا کہ انہیں کس طرح اغوا کیا گیا تھا۔ وہ تو بعد میں جب آپ کے محکمے نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ اغوا کرنے والا یا والے پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ وہ دروازہ صرف ملازمین صبح یا شام کو استعمال کرتے تھے۔ گھر کا کوڑا پچھلی گلی کے ایک ڈسٹ بن میں پھینکا جاتا تھا۔ اغوا کرنے والوں نے باہر سے کوئی تیز دھار آلہ اندر ڈال کر دروازے کی کنڈی کاٹ دی تھی۔''

انسپکٹر سلیم سوچتا ہوا بولا۔ ''نو بج کر دس منٹ سے ساڑھے گیارہ بجے تک دو گھنٹے بیس منٹ ہوئے۔ یعنی اسی دوران میں آپ کے بھائی بھاوج کو اغوا کیا گیا۔''

''اس سارے معاملے میں سب سے عجیب پہلو یہ ہے کہ ان کی لاشیں چھپانے کے لیے انہی کے گھر کی ایک دیوار کا انتخاب کیا گیا۔''

''جی ہاں۔ عجیب پہلو تو یہی ہے۔ انہوں نے خاصا خطرہ مول لیا۔ لاشیں وہ کہیں بھی دفن کرسکتے تھے۔''

''یہ حرکت ان کے ملازمین کی تو نہیں؟''

''پولیس نے ان سب سے پوچھ گچھ کر کے اپنا اطمینان کرلیا تھا۔ اب یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا اطمینان غلط تھا یا درست۔''

''آپ نے ان ملازمین کو الگ کب کیا تھا؟''

''تین چار دن بعد ہی الگ کردیا تھا۔ چوکیدار خود ہی ملازمت چھوڑ گیا تھا۔''

انسپکٹر سلیم کی پوچھ گچھ کا سلسلہ چند منٹ اور جاری رہا، پھر اس نے کہا۔ ''میں اب اجازت چاہوں گا۔ آپ کے بھائی اور بھاوج کی لاشیں...... اگر ان ڈھانچوں کو لاشیں کہا جاسکے...... وہ آپ کو ایک گھنٹے بعد مل جائیں گی۔ غالباً آپ لوگ ان کی تدفین کرنا چاہیں گے۔''

''ظاہر ہے۔'' طاہر سلمان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

روحی یکایک پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے ڈرائنگ روم سے بھاگی۔

''روحی...... روحی!'' ثاقب اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

انسپکٹر سلیم نے ٹھنڈی سانس لی اور جانے کے لیے اٹھا۔ پھر یکایک بولا۔ ''ہاں، ایک بات رہ گئی۔ آپ ملازمین کو الگ کرنے کے بعد پندرہ بیس دن میں وہاں صفائی کروانے جاتے تھے۔ اس دوران میں کوئی چوکیدار تو رکھنا چاہیے تھا آپ کو۔''

''چند دن بعد خیال آیا تھا مجھے کہ چوکیدار تو ہونا ہی چاہیے۔ میرے دفتر کا ایک چپراسی اپنے ادھیڑ عمر باپ کی ملازمت کے سلسلے میں کہہ چکا تھا، میں نے اسی کو ملازم رکھ لیا تھا لیکن صرف رات کے لیے۔ دن میں تو سامنے کی سڑک پر خاصی آمدورفت رہتی ہے۔ پچھلا دروازہ میں نے اینٹیں چنوا کر دیوار بنوادی تھی۔ اس طرف سے کسی چوری چکاری کا

خطرہ نہیں تھا۔ چار دیواری خاصی اونچی ہے۔''

اس کے بعد انسپکٹر سلیم نے کوئی اور سوال نہیں کیا اور چلا گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن جب رات ہو چکی تھی۔ پرویز شب خوابی کے لباس میں بستر پر لیٹا کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یکایک کسی خیال کے تحت اس نے سرہانے رکھے موبائل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایک نظر گھڑی پر ڈالی جو دس بج کر چالیس منٹ کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ کسی کا نمبر ملانے لگا۔

دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔ ''ہیلو۔''

''پرویز بول رہا ہوں۔''

''سر!'' دوسری طرف سے بہ عجلت کہا گیا۔

''کہاں ہو اس وقت؟''

''گھر پر ہوں سر۔''

''کیا تم اسی وقت میرے پاس آسکتے ہو؟''

''اس طرح بات کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے سر! آپ مجھے حکم دے سکتے ہیں۔ میں آدھے گھنٹے کے اندر اندر آپ کے سامنے ہوں گا۔''

''میں منتظر ہوں۔'' پرویز نے کہا اور رابطہ منقطع کر کے، موبائل اپنے سینے پر رکھ لیا اور کچھ سوچتا رہا۔ چہرے پر قدرے اداسی بھی تھی۔

پینتیس منٹ بعد وہ اپنے ڈرائنگ روم میں انسپکٹر سلیم سے کہہ رہا تھا۔ ''اچھا نہیں لگ رہا تھا مجھے، اتنی رات کو تمہیں بلانا۔''

''آپ مجھے پھر شرمندہ کر رہے ہیں سر۔''

''میں اب تمہارا آفیسر نہیں ہوں سلیم۔''

''مگر کبھی تھے تو سر۔'' اور میں اس وقت صرف اے ایس آئی تھا۔ آپ ہی کی تربیت کی وجہ سے اتنی جلدی انسپکٹر بن گیا۔''

''صلاحیت کی بات بھی ہوتی ہے۔ خیر، چھوڑو۔ میں تم سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تو میں نے تمہیں روحی کے گھر پر ہی بتا دیا تھا کہ وہ میری کلاس فیلو رہی ہے۔ اسی لیے میں اس کیس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوں۔ اس معاملے میں تم کتنا آگے بڑھ سکے ہو؟ اگر مناسب سمجھو تو مجھے بتا دو۔''

''آپ مجھے برابر شرمندہ کیے جا رہے ہیں سر، مناسب سمجھنا کیا مطلب؟ آپ مجھے حکم......''

پرویز نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ملازم کو آواز دی اور اسے اسکواش بنانے کی ہدایت دی، پھر انسپکٹر سلیم کی طرف متوجہ ہوا۔

''معاملہ خاصا پیچیدہ ہے سر۔'' انسپکٹر سلیم نے کہا۔ ''شاید آپ کے علم میں ہوگا کہ جس پولیس آفیسر نے باقر سلمان صاحب کے بارے میں تحقیقات کی تھیں، اسے چند ماہ قبل اینٹی کرپشن والوں نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا اور اب وہ اپنی سزا بھگت رہا ہے۔''

''نہیں، مجھے علم نہیں۔'' پرویز کے چہرے پر الجھن کا تاثر ابھرا۔

''جی ہاں سر۔'' انسپکٹر سلیم نے کہا۔ ''اسی لیے، میرا خیال یہ ہے کہ اس نے باقر سلمان صاحب کے معاملے میں بعض اہم باتیں اپنی رپورٹ میں لکھے بغیر فائل بند کر دی تھی۔ اس کے لیے کسی نے اسے ایک بڑی رقم ضرور دی ہو گی۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں سر، کہ میں اتنے کم وقت میں جو معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں، وہ باتیں اس کے علم میں کیوں نہیں آئیں۔''

''ایسی کیا باتیں ہیں؟ تم نے تو مجھے...... اچھا خیر، وہ باتیں بتاؤ مجھے۔''

''سر! مجھے طاہر سلمان صاحب پر ابتدا ہی میں شبہ ہو گیا تھا۔ اگر کسی کو تاوان کے سلسلے میں اغوا کیا جائے تو اغوا کنندگان خاصی بڑی رقم کے لیے صرف دو گھنٹے کا وقت نہیں دیتے۔ ایک دن...... کم از کم ایک دن تو انتظار کرتے ہیں، دو گھنٹے ہی میں مغوی کو ہلاک نہیں کرتے۔''

پرویز نے پرخیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایک پہلو یہ بھی تو ہے کہ اغوا کنندگان کو علم ہو گیا تھا کہ طاہر سلمان صاحب نے پولیس سے رابطہ کر لیا تھا۔''

''جی ہاں، مغوی کو قتل کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ جس سے مطالبہ کیا جائے، وہ پولیس سے رابطہ کر لے لیکن میں نے اس پوائنٹ پر زیادہ سوچا کہ اتنی بڑی رقم کے لیے صرف دو گھنٹے کی مہلت دینا بڑی عجیب بات ہے۔''

''اچھا تو...... میں تمہاری ان باتوں سے اندازہ لگا رہا ہوں کہ تم نے اس شبہے کے نتیجے میں کوئی خاص بات معلوم کی ہے۔''

''جی ہاں۔ میرے شبہے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ طاہر سلمان صاحب نے اپنے بھائی کے گھر کے تمام ملازمین کی چھٹی کر دی تھی۔ ایک ہفتے بعد کوئی چوکیدار رکھا تھا۔ نہایت قیمتی سازوسامان سے آراستہ گھر کوئی ایک دن کے لیے بھی

بالکل خالی نہیں چھوڑتا لیکن طاہر سلمان صاحب نے وہ گھر ایک ہفتے کے لیے خالی چھوڑ دیا۔ آخر کیوں؟''

''تم نے جو بات معلوم کی ہے، وہ بتاؤ؟'' پرویز نے بے تابی سے پوچھا۔

''طاہر سلمان صاحب بیس سال پہلے دوسری شادی کر چکے ہیں اور اس بیوی سے ان کا ایک لڑکا بھی ہے جس کی عمر اب انیس سال ہے۔''

''اوہ!''

''اور روحی صاحبہ کو اس کا علم نہیں۔ میں آج پھر ان سے ملا تھا، چند سوالات کیے تھے لیکن دراصل میں صرف یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس بات سے باخبر ہیں یا نہیں۔ میں آج ہی شام ان سے ملا تھا۔ میں نے ان سے یہ بات بظاہر روا روی میں کی تھی کہ طاہر سلمان صاحب اپنی بیوی...... یعنی ثاقب صاحب کی والدہ کے انتقال کے بعد سے تنہا زندگی گزار رہے ہیں۔ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس پوچھ گچھ کے وقت ثاقب صاحب بھی موجود تھے۔ میں نے یہ بات ان دونوں ہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہی تھی۔ جواب ثاقب صاحب نے اثبات میں دیا تھا اور روحی صاحبہ کے چہرے سے یہ بات ظاہر نہیں ہوئی تھی کہ ثاقب نے غلط جواب دیا ہے۔''

''یعنی وہ دونوں ہی بے خبر ہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ روحی صاحبہ تو یقیناً بے خبر ہیں لیکن ثاقب صاحب کے بارے میں مجھے شبہ ہے۔ یہ مجھے ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے کہ بیٹا اتنا طویل عرصے تک اپنے باپ کی دوسری شادی سے بے خبر رہے۔''

''ہاں ناممکن سی بات تو لگتی ہے لیکن کبھی کبھی ایسی باتیں ہو بھی جاتی ہیں۔ طاہر سلمان صاحب اس معاملے میں انتہائی رازداری سے کام لے تو سکتے ہیں۔ خیر، تو...... کیا تم اس پہلو پر غور کر رہے ہو کہ اپنے بھائی اور ان کی اہلیہ کو طاہر سلمان صاحب ہی نے قتل کیا ہے؟''

''جی ہاں سر۔''

''قتل کرنے کا سبب؟'' پرویز نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ ''سبب کیا ہو سکتا ہے؟''

''حصولِ زر۔'' انسپکٹر سلیم نے جواب دیا۔ ''دونوں بھائیوں کے کاروبار الگ الگ تھے لیکن طاہر سلمان صاحب کا کاروبار بڑے بھائی کے مقابلے میں آدھا بھی نہیں تھا جبکہ بعد میں وہ کاروبار بھی طاہر سلمان صاحب ہی نے سنبھالا جس میں اب ثاقب صاحب بھی شریک ہیں۔ دونوں مل کر ہی سب کچھ سنبھالتے ہیں۔ روحی صاحبہ کو تو شاید کاروباری معاملات سے ذرہ برابر دلچسپی نہیں۔''

پرویز سر ہلاتا اور سوچتا ہوا انسپکٹر سلیم کی طرف دیکھتا رہا۔ اسی دوران میں ملازم اسکواش کے گلاس رکھ کر جا چکا تھا مگر دونوں ہی کی توجہ گلاس کی طرف نہیں تھی۔ اب پرویز نے یکایک کہا۔ ''یہ تو لو۔'' اس نے خود بھی گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''تھینک یو سر۔'' انسپکٹر سلیم نے بھی گلاس اٹھاتے ہوئے کہا، پھر ایک گھونٹ لے کر بولا۔ ''بھائی کی دولت سے طاہر سلمان صاحب نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ اپنے دوسرے بیٹے ایاز کے نام سے انہوں نے خاصا بڑا کاروبار شروع کیا ہے۔''

''یعنی باقر صاحب کی دولت سے؟''

''جی ہاں۔ اس کاروبار کا آغاز باقر سلمان صاحب کی موت کے چار ماہ بعد شروع کیا گیا تھا۔''

''وہ کاروبار خود طاہر سلمان چلا رہے ہیں؟''

''ان کا بیٹا ایاز کالج کے بعد اسی کاروبار کے دفتر میں ہوتا ہے۔ میں نے کیونکہ فوراً ہی طاہر سلمان صاحب کی نگرانی شروع کروا دی تھی اس لیے میرے علم میں آیا ہے کہ وہ صرف آج گھنٹا بھر کے لیے اس دفتر میں گئے تھے۔ شاید ان کا کوئی بااعتماد شخص بحیثیت منیجر وہ کاروبار سنبھالتا ہے۔ ابھی مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن معلوم ہو جائے گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان کے انیس سالہ بیٹے ایاز میں اتنی کاروباری سوجھ بوجھ ہو۔ وہ بس بیٹھتا ہو گا وہاں جا کے۔''

''ان کی دوسری بیوی کا گھر...... غالباً الگ ہی ہو گا۔''

''جی ہاں۔'' انسپکٹر سلیم نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے کہ اب طاہر سلمان صاحب کی راتیں وہیں گزرتی ہوں لیکن فی الحال یہ میرے علم میں نہیں آیا ہے۔''

''سابقہ تفتیش کے مطابق باقر سلمان صاحب کے گھر کا پچھلا دروازہ استعمال کیا گیا تھا۔''

''جی ہاں، سابقہ تفتیش کے مطابق، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ سب دکھاوے کے لیے کیا گیا تھا اگر واقعی باقر سلمان صاحب کو اغوا کر کے قتل کیا جاتا تو اغوا کرنے والے یہ خطرہ کیوں مول لیتے کہ لاشیں انہی کے گھر میں لے جا کر دیوار میں چنواتے۔''

''ہوں۔'' پرویز نے سر ہلایا۔ ''تمہارے پاس

سب سے مضبوط جواز یہی ہے کہ طاہر سلمان پر شبہ کرنے کے لیے۔''

''آج سے میں نے ثاقب صاحب کی نگرانی کا بندوبست بھی کیا ہے۔''

''وجہ؟ کیا تمہیں یہ شبہ بھی ہو گیا ہے کہ ثاقب بھی اس سارے کھیل میں اپنے باپ کے ساتھ ہوگا۔''

''ابھی میں نے اتنا زیادہ تو نہیں سوچا لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے اپنے باپ کی دوسری بیوی سے ناواقفیت کا اظہار کیوں کیا ہے۔''

پرویز نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہ خونی کھیل طاہر سلمان ہی نے کھیلا ہے اور اس میں ثاقب بھی شریک ہے تو یہ روحی کے لیے بہت بڑا صدمہ ہوگا۔''

''یہ تو ظاہر ہے سر۔''

''اور کوئی خاص بات؟''

''آپ کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ میں کسی بھی پہلو کو نظرانداز نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے جنید کی نگرانی بھی شروع کروائی ہے۔''

''جنید؟ اچھا وہ...... ماڈل گرل شیبا کا بھائی؟''

''جی سر۔''

''ان دنوں شیبا اپنے بھائی سے ناراض تھی؟''

''جی، لیکن اب نہیں ہے۔ جنید اپنی بہن کے ساتھ ہی رہ رہا ہے۔ قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ شیبا کے پاس اب دولت کی فراوانی ہے جو پہلے نہیں تھی۔''

''پہلے؟ یعنی باقر سلمان صاحب کے قتل سے پہلے؟''

''جی۔''

''خاصی پیچیدگیاں ہیں۔''

''میں نے ابتدا ہی میں عرض کر دیا تھا آپ سے۔''

''ہوں، خیر...... اور......؟''

''ابھی میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا جتنا آپ کو بتا چکا ہوں۔''

''مزید جو پروگریس ہو، اس سے آگاہ رکھنا مجھے۔''

''یقیناً سر، اب اس معاملے میں آپ کی دلچسپی کا سبب معلوم ہو گیا ہے تو میں آپ کو بے خبر کیسے رکھ سکتا ہوں۔''

پرویز نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔ انسپکٹر سلیم کو رخصت کر کے وہ اپنی خواب گاہ میں آ گیا۔ گاؤن اتار کر وہ بستر پر لیٹا۔ اس کے دماغ میں وہ سب باتیں چکرا رہی تھیں جو اسے انسپکٹر سلیم سے معلوم ہوئی تھیں۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ یہ معاملہ جلد از جلد اپنے انجام تک پہنچے تو شاید روحی کچھ پُرسکون ہو جائے۔ یہ جاننے کے بعد وہ بہت اداس ہو گئی تھی کہ دیوار سے نکلنے والے ڈھانچے اس کے والدین کے تھے۔ پرویز نے شام کو فون پر اس سے اظہارِ ہمدردی کے لیے فون کیا تھا تو وہ کچھ اس انداز میں باتیں کرتی رہی جیسے ہذیانی کیفیت میں ہو۔ اسی کیفیت میں اس نے دو مرتبہ کہا تھا۔

''میرے ماں باپ کو اس طرح سفاکی سے دیوار میں چنوانے والا کون ہو سکتا ہے پرویز؟ کون ہو سکتا؟ کون؟''

اسی وقت سے پرویز بہت بے چین تھا۔ روحی سے اس کی محبت اتنی ہی شدید تھی کہ وہ اسے کرب میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ اتنی ہی شدید محبت روحی کو ثاقب سے بھی تھی۔ اسی لیے پرویز اب یہ بھی چاہتا تھا کہ اس سارے معاملے میں ثاقب کہیں ذرا سا بھی ملوث نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو روحی ایک اور صدمے سے دوچار ہوتی اور پرویز اسے پے در پے صدمات سے دوچار ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ روحی سے اس کی محبت کچھ ایسی ہی تھی۔

روحی سے فون کرنے کے بعد سے اب تک وہ مسلسل سوچتا ہی رہا تھا اسی لیے اس نے انسپکٹر سلیم کو بھی بلایا تھا لیکن اس سے حاصل کردہ معلومات اس کے دماغ پر بوجھ کچھ اور بڑھا گئی تھیں۔ اب تو اس کے سر میں شدید درد ہونے لگا تھا۔ بالکل لاشعوری کیفیت میں اس نے سرہانے سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔ جو چینل پہلے سے لگا ہوا تھا، اس وقت اس پر کھیلوں کی خبریں آ رہی تھیں۔ ان خبروں سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود وہ ٹی وی دیکھتا اور سنتا رہا۔ اس طرح وہ اپنا ذہن بٹانا چاہتا تھا۔ ممکن تھا کہ اس طرح اس کے سر کا درد کچھ کم ہوتا ورنہ اسے نیند بھی نہیں آتی۔

خبروں کے بریک میں اشتہار آنے لگے۔ پرویز وہ بھی دیکھتا رہا۔ انہی اشتہاروں میں ایک اشتہار ایسا بھی آیا جس میں شیبا تھی۔ پرویز اسے صرف اس لیے جانتا تھا کہ اخبارات میں اس کی تصویریں اس کی نظر سے گزرتی رہی تھیں۔

اشتہار لگ بھگ ایک منٹ کا تھا جو ختم ہو گیا لیکن اس ایک منٹ میں ہی پرویز کی دماغی کیفیت کچھ ایسی ہوئی کہ وہ

بستر سے اٹھ بیٹھا۔ اسے یکایک یوں محسوس ہوا جیسے وہ اخبارات اور ٹی وی سے ہٹ کر بھی شیبا کو کہیں دیکھ چکا ہے۔

زندگی میں اس قسم کے اتفاقات ہوتے ہیں لیکن یہ اتفاق پرویز کو بے چین کر گیا۔ کہاں دیکھا ہے اس نے شیبا کو؟

کہاں؟ کہاں؟ اس کے دماغ میں جیسے شور مچ گیا۔ اس نے ٹی وی بند کیا اور بستر سے اتر کر ٹہلنے لگا۔ دماغ پر حد درجہ زور دینے کے باوجود اسے یاد نہیں آسکا کہ شیبا کو اس نے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اس کے سر کا درد کچھ اور بڑھ گیا تو وہ نڈھال سا ہو کر بستر پر گر گیا۔

☆☆☆

اگلے روز دوپہر کو انسپکٹر سلیم لنچ کرنے کے بعد اپنے دفتر کے کمرے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ موبائل فون پر ایک کال آگئی۔ کال کرنے والا اس کے ان ماتحتوں میں سے ایک تھا جن کو اس نے ثاقب کی نگرانی پر مقرر کیا تھا۔

"کوئی خاص خبر؟" اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی صاحب!" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "ایک ماڈل گرل ہے، شیبا۔ شاید آپ نے اس کا نام سنا ہو۔"

سلیم یک لخت اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہوا اسے؟" اس نے بے اختیار پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ "میں نے تمہیں ثاقب کی نگرانی کے لیے کہا تھا۔ یہ شیبا......"

"یہی تو بتا رہا ہوں صاحب...... انہی کی نگرانی کرتے ہوئے میں شیبا کے گھر تک پہنچا ہوں۔"

انسپکٹر سلیم کا سارا جسم سنسنا گیا۔

دوسری طرف سے کہا جا رہا تھا۔ "پندرہ منٹ پہلے وہ شیبا کے بنگلے میں گئے تھے۔ ابھی ان کی کار وہاں سے نکلی ہے۔ میں ان کا تعاقب کرتے ہوئے آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔"

"پندرہ منٹ بعد اطلاع دے رہے ہو؟" انسپکٹر سلیم کا لہجہ خواہ مخواہ تیز ہو گیا۔ اگر اسے پندرہ منٹ پہلے بھی یہ اطلاع ملتی تو وہ شاید فوری طور پر کوئی اقدام نہیں کر سکتا تھا۔

"صاحب!" دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔ "آپ کو اطلاع دینے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ بنگلا ہے کس کا۔ آس پاس پوچھ گچھ کرنے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ پھر میں آپ کو فون کرنے والا تھا کہ ثاقب کی کار بنگلے کے احاطے سے باہر آتی دکھائی دی۔ میں اپنی گاڑی کی

تین دن بول چال بند رکھنے پر یہ تحفہ...... تمہارے لیے

طرف دوڑا جو کچھ فاصلے پر کھڑی کی تھی۔ اب میں ان کا تعاقب کرتے ہوئے فون کر رہا ہوں۔"

"ہوں...... ہوں......" انسپکٹر سلیم ٹہلنے لگا۔ "اور کوئی خاص بات؟"

"جی نہیں۔ بس یہی اطلاع دینی تھی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ یہ اطلاع فوراً دینا کہ اب ثاقب کہاں جاتا ہے؟"

"جی ٹھیک ہے۔"

انسپکٹر سلیم نے رابطہ منقطع کیا اور ٹہلتا رہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی اہم سراغ ہاتھ لگا ہے۔ اب اسے سوچنا یہ تھا کہ وہ اس سراغ سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے؟

چند منٹ سوچ کر اس نے ایک فیصلہ کیا اور دفتر سے شیبا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ شیبا کے گھر کا پتا اسے باقر سلمان کے اغوا کی تحقیق کرنے والے افسر کی فائل سے مل چکا تھا لیکن ابھی تک اس نے شیبا کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق اب اسے بہترین موقع ملا تھا۔ شیبا ذرا ہی دیر پہلے ثاقب سے مل چکی تھی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک پولیس افسر کو سامنے پا کر وہ حواس باختہ ہو سکتی تھی اور اس حواس باختگی میں اس کے منہ سے کوئی ایسا جملہ نکل سکتا تھا جو انسپکٹر سلیم کے لیے کارآمد ہوتا۔

ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اس کے ماتحت کی کال آئی۔ اس نے بتایا کہ ثاقب سیدھا اپنے دفتر پہنچا تھا اور اب بھی وہیں ہے۔

اس اطلاع سے انسپکٹر سلیم کے دماغ میں یکایک کچھ

تبدیلی آئی۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کرتے کرتے اسے سڑک کے کنارے روک دیا اور اپنے دماغ میں ابھرنے والے نئے خیال پر غور کرنے لگا اور پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ پہلے ثاقب سے ملنا چاہیے۔ گاڑی پھر حرکت میں آ گئی اور وہ ثاقب کے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس وقت وہ سادہ لباس میں تھا اور جب وہ سادہ لباس میں ہوتا تھا تو پولیس موبائل استعمال نہیں کرتا تھا۔

ثاقب اپنے دفتر ہی میں تھا جب انسپکٹر سلیم وہاں پہنچا۔ اس نے اپنا کارڈ چپراسی کے ذریعے بھجوایا۔ چپراسی کو واپس آنے میں قدرے تاخیر ہوئی تو انسپکٹر سلیم کو خیال آیا کہ جو بات اس نے شیبا کے بارے میں سوچی تھی، کچھ اسی قسم کا معاملہ ثاقب کے ساتھ بھی تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے شیبا سے مل کر آیا تھا اس لیے اس وقت انسپکٹر سلیم کی آمد پر اسے پریشانی لاحق ہوسکتی تھی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اب سے پہلے انسپکٹر سلیم اس سے اس کے گھر پر ہی ملتا رہا تھا، دفتر کبھی نہیں پہنچا تھا۔

انسپکٹر سلیم کی دانست میں اس کا امکان تھا کہ وہ چپراسی کو روک کر شیبا سے فون پر پوچھنے لگا ہو کہ پولیس نے اس سے تو رابطہ نہیں کیا۔

ایک منٹ سے زیادہ تاخیر کے بعد چپراسی باہر آیا۔

''صاحب باتھ روم میں تھے اس لیے مجھے دیر لگ گئی۔'' چپراسی نے کہا۔ ''صاحب آپ کے منتظر ہیں۔''

انسپکٹر سلیم کو یہ بات بھی کھٹکی کہ چپراسی نے تاخیر کا جواز کیوں پیش کیا تھا۔ اسے اس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ ثاقب ہی نے اس کو یہ جواز پیش کرنے کی ہدایت کی ہو اور یہ بھی اسی صورت میں ہوسکتا تھا جب دل میں کوئی چور ہو۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو ثاقب نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''ضرور کوئی خاص بات آپ کے علم میں آئی ہے جو آپ اس کے بارے میں جاننے کے لیے دفتر تشریف لے آئے۔''

''نہیں، اچانک تو کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی مجھے ابتدا ہی میں اس کا علم ہوگیا تھا۔'' انسپکٹر سلیم نے کہا۔

''تشریف رکھیے۔'' ثاقب نے کہا۔

''شکریہ۔''

بیٹھنے کے بعد ثاقب سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ثاقب صاحب!'' انسپکٹر سلیم نے کہا۔ ''یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ باقر سلمان صاحب کے اغوا کے بارے میں جب تحقیقات کی گئی تھیں تو ایک شخص جنید کا نام سامنے آیا تھا جو ایک ماڈل گرل شیبا کا بھائی ہے۔''

''جی۔'' ثاقب نے کہا۔ ''جب آپ ان تمام معاملات کے بارے میں ڈیڈی سے بات کر رہے تھے تو یہ نام میرے علم میں آئے تھے۔''

اس سے پہلے کہ انسپکٹر سلیم کچھ کہتا، ثاقب پھر بولا۔ ''کیا جنید کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے؟''

''ابھی میں عرض کر چکا ہوں کہ ابھی اچانک کوئی خاص بات علم میں نہیں آئی بلکہ ابتدا ہی میں معلوم ہوگیا تھا کہ اب شیبا کے مالی حالات پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہیں اور جنید سے اس کی ناراضگی بھی نہیں ہے۔ جنید اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔''

''کیا آپ اس معاملے میں جنید پر توجہ دے رہے ہیں؟''

''ہمیں ہر پہلو ہی پر نظر رکھنی پڑتی ہے ثاقب صاحب، کسی بات کا سراغ اسی طرح لگایا جاتا ہے کہ ہر پہلو پر نظر رکھی جائے۔ کوئی جادو تو ہم جانتے نہیں ہیں۔'' انسپکٹر سلیم دھیرے سے ہنسا۔ پھر سنجیدہ ہوکر بولا۔ ''ابھی بس آپ سے ایک بات پوچھنے کا خیال آیا تھا لیکن یہ خیال بھی آیا تھا کہ آپ کا جواب نفی ہی میں ہوگا ورنہ آپ اسی وقت کچھ بتاتے جب طاہر سلمان صاحب سے باتیں کرتے ہوئے جنید اور شیبا کے نام آپ کے سامنے آئے تھے لیکن یہ دوسرا خیال میرے دماغ میں اس وقت آیا جب میں آپ کے دفتر کی لفٹ میں سوار ہو چکا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ یہاں تک آگیا ہوں تو آپ سے ملاقات تو کر ہی لی جائے۔''

ثاقب نے ایک بٹن دبایا اور کمرے کے باہر بجتی ہوئی گھنٹی کی ہلکی سی آواز آئی۔

''آپ چائے پینا پسند کریں گے یا......''

''ان تکلفات کی ضرورت نہیں ثاقب صاحب۔''

چپراسی کمرے میں آگیا۔

''آپ اب آئے ہیں تو...... کچھ تو......''

''آپ اصرار کر رہے ہیں تو چائے منگا لیجیے۔''

ثاقب نے چپراسی کو ہدایت دے کر رخصت کیا اور سوالیہ نظروں سے انسپکٹر سلیم کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں چائے پی کر رخصت ہو جاؤں گا۔'' انسپکٹر سلیم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں جو بات جاننا چاہتا

ہوں، اس کے لیے مجھے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ میں نے ابھی کہا تھا نا کہ آپ کا جواب تو نفی ہی میں ہوگا یا آپ کہیں گے کہ اگر ایسا کچھ ہے تو وہ آپ کے علم میں نہیں۔"

"آپ کچھ فرمائیں تو......" ثاقب بولا۔ "ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی آئی جو انسپکٹر سلیم کے اندازے کے مطابق "جبری مسکراہٹ" تھی اور ثاقب ذہنی طور سے منتشر ہو چکا تھا۔

"میرا یہ ارادہ بدل چکا ہے کہ آپ سے اس بارے میں پوچھوں لیکن آپ کا اصرار ہے تو پوچھے لیتا ہوں۔"

ثاقب سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"جنید کا...... یا شیبا کا......" انسپکٹر سلیم رک رک کر بولنے لگا۔ "ماضی میں بھی...... کسی بھی نوعیت کا تعلق رہا ہے...... باقر سلمان صاحب سے؟"

ثاقب نے ایک طویل سانس لی، پھر اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "آپ کا خیال درست ہے۔ اگر کوئی تعلق رہا بھی ہے تو وہ میرے علم میں نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کا کوئی تعلق ہونا تو نہیں چاہیے۔ آخر آپ کو یہ خیال آیا کیوں؟"

"ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ ہمیں ہر پہلو پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔" انسپکٹر سلیم نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ ثاقب کے جواب سے مطمئن ہو لیکن یہ اس نے بہرحال سوچا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اتنی باتوں کے باوجود ثاقب نے شیبا سے اپنی واقفیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔

انسپکٹر سلیم نے ایک اچٹتی سے نظر میز پر رکھے ہوئے، ثاقب کے موبائل فون پر ڈالی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ثاقب نے آخری کال کس وقت اور کسے کی تھی لیکن یہ جاننے کی کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آسکی۔

"روحی صاحبہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" انسپکٹر سلیم نے گفتگو کا رخ ہی تبدیل کر دیا۔ "کچھ سنبھالا انہوں نے خود کو؟"

"نہیں۔" ثاقب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بہت پہلے جب اسے اپنے والدین کی ہلاکت کا علم ہوا تھا، تب بھی میں اسے بمشکل سنبھال سکا تھا اور اب وہ پھر اس کیفیت میں ہے۔ مجھے دفتر میں کچھ بہت ہی ضروری چند کام دیکھنا تھے ورنہ میں اس کے پاس گھر پر ہی رہتا۔ ابھی اگر آپ دو تین منٹ کی تاخیر سے آتے تو میں آپ کو یہاں نہ ملتا، گھر جا چکا ہوتا۔"

"مجھے کچھ اندازہ ہے۔" انسپکٹر سلیم نے کہا۔ "آپ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ شادی سے بہت پہلے ہی ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا اور ہمارے والدین بھی اس سے بے خبر نہیں تھے۔"

"اوہ، اگر آپ کو ابھی گھر جانا تھا تو میں یقیناً مخل ہوا ہوں۔ آپ فوراً جائیے، میں بھی......" انسپکٹر سلیم نے اٹھنا چاہا۔

"ارے نہیں۔" ثاقب جلدی سے بولا۔ "چائے آتی ہی ہوگی، پی کر جائیے گا۔ پانچ دس منٹ اور سہی، لیجیے چائے آ ہی گئی۔"

چپراسی ایک ٹرے سنبھالے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

پرویز اپنے دفتر میں بیٹھا، میز پر سامنے کھلی ایک فائل پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، پھر دروازہ کھلتا نظر آیا۔ پرویز کی نظریں اس طرف اٹھ گئی تھیں۔ چالیس پینتالیس سال کا ایک شخص اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ پرویز کو سلام کرتا ہوا آگے آیا۔

پرویز نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھیے...... بینک کے بارے میں آپ کی رپورٹ دیکھ لی ہے۔ اس کے بارے میں کچھ بات کرنے کے لیے بلایا تھا آپ کو...... دراصل کسی وجہ سے میں ذہنی طور پر منتشر ہوں اس لیے بعض پوائنٹس میری سمجھ میں نہیں آسکے۔"

"میں حاضر ہوں سر۔"

ان دونوں میں بیس منٹ تک گفتگو ہوتی رہی۔ آخر پرویز نے اس شخص کو رخصت کیا جسے بلایا تھا، پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ اب اسے اپنے دفتر سے اٹھنا تھا۔ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ پرویز نے فون ریسیور اٹھایا۔ کال انسپکٹر سلیم کی تھی جو اس نے بے تابی سے ریسیو کی۔

"ہاں سلیم۔" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"میں ابھی آپ سے مل سکتا ہوں سر؟"

"میں دفتر سے روانہ ہو رہا ہوں۔ اگر ٹریفک میں نہ پھنسا تو آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ وہیں آجاؤ۔ کوئی خاص بات؟"

"جی ہاں سر، دو ایک اہم باتیں سامنے آئی ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ جو بھی پروگریس ہو، اس سے آپ کو آگاہ

رکھوں۔"

"ابھی بتادو۔" پرویز نے بے تابی سے کہا۔

"تفصیل سے بتانا ہے سر، بہتر ہوگا کہ......"

"اچھا ٹھیک ہے۔" پرویز نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "گھر آجاؤ۔" پھر اس نے جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

چالیس منٹ بعد وہ اپنے گھر میں بیٹھا انسپکٹر سلیم سے اس کی پروگریس سن رہا تھا۔

"چائے پی کر میں ثاقب صاحب کے دفتر سے اٹھ گیا۔" انسپکٹر سلیم کہہ رہا تھا۔ "اور یہ بات تو طے ہوگئی سر کہ شیبا سے ثاقب صاحب کا کسی نہ کسی قسم کا تعلق ہے۔"

"یہ سن کر مجھے افسوس ہوا ہے۔ اگر بات کھل گئی تو روجی پر کیا گزرے گی۔" پرویز کے لہجے میں تشویش تھی۔

"دوسری اہم بات یہ ہے سر کہ شیبا کی موجودہ پُرشکوہ زندگی بھی ثاقب صاحب ہی کی مرہونِ منت ہوگی۔"

"اس خیال کا سبب؟" پرویز نے غور سے انسپکٹر سلیم کی طرف دیکھا۔

"ثاقب صاحب کے بعد میں شیبا سے ملنے بھی گیا تھا۔ اس کا پتا جو باقر سلمان صاحب کے کیس کی فائل میں تھا، اسی پتے پر گیا تھا میں۔" انسپکٹر سلیم نے بتایا۔ "لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پانچ مہینے پہلے شیبا نے وہ گھر چھوڑ دیا تھا۔"

"لیکن تمہارا ماتحت؟ وہ ثاقب صاحب کے تعاقب میں شیبا کے گھر تک گیا تھا۔ ابھی تم بتا چکے ہو۔"

"جی ہاں، لیکن وہ بنگلا پی ای سی ایچ ایس میں ہے جہاں شیبا اب رہتی ہے۔" انسپکٹر سلیم نے جواب دیا۔ "میں تو وہاں پہنچا تھا جس گھر میں شیبا پہلے رہتی تھی۔ جب مجھے وہاں سے اس کی منتقلی کا علم ہوا تو میں نے فون پر اپنے ماتحت سے رابطہ کیا اور اس سے پوچھا کہ شیبا کا وہ گھر کہاں ہے جہاں وہ ثاقب صاحب کے تعاقب میں گیا تھا۔ مجھے اسی سے شیبا کے نئے گھر کا پتا معلوم ہوا۔"

"تو تم وہاں بھی پہنچے؟" پرویز نے بے اختیار پوچھا۔

"جی ہاں، لیکن شیبا کسی شوٹنگ کے سلسلے میں شہر سے باہر کہیں گئی ہوئی ہے اور کل سے پہلے واپس نہیں آئے گی۔"

"تو ثاقب جو اس کے گھر گیا تھا؟"

"چوکیدار کے بیان کے مطابق وہ اس وقت سے گھنٹا بھر پہلے گئی تھی جب میں اس سے ملنے پہنچا تھا۔"

"یعنی ثاقب سے ملنے کے بعد؟" اس وقت پرویز نے ثاقب کے نام کے ساتھ "صاحب" کا لاحقہ نہیں لگایا کیونکہ شیبا سے ثاقب کا تعلق جاننے کے بعد ثاقب کی شخصیت اس کی نظر [illegible] گئی تھی۔

[illegible]

پرویز نے پوچھا۔ "تم نے چوکیدار کو بتادیا تھا کہ تم کون ہو؟"

"جی نہیں۔ یہ میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔"

"یہی بہتر ہوا۔ شیبا پہلے سے ہوشیار نہ ہوجائے۔"

"جی ہاں، یہی خیال تھا مجھے۔ میں نے چوکیدار کو صرف اتنا بتایا کہ میں شیبا کا ایک واقف کار ہوں۔"

"یہی مناسب تھا۔ تم نے جنید کی کوئی بات بھی نہیں کی ہوگی۔" پرویز نے کہا۔

"جی ہاں، میں نے سوچا تھا کہ پہلے شیبا ہی سے ملوں۔" انسپکٹر سلیم نے جواب دیا۔ پھر بولا۔ "شیبا کا یہ بنگلا خاصا مہنگا ہوگا سر! اور یہ شیبا نے پانچ ماہ قبل خریدا ہے۔"

"ثاقب اور روجی ساڑھے پانچ ماہ پہلے لندن سے آئے ہیں۔" پرویز نے کہا۔ "اسی لیے تمہیں خیال آیا ہے کہ شیبا کی اس کایا کلپ میں ثاقب کا ہاتھ ہوگا۔"

"جی ہاں سر! لیکن ابھی اس پر سو فیصد یقین نہیں کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان ماڈل گرلز میں شاید ہی کوئی ایسی ہو جو کال گرل نہ ہو۔"

"ہوں۔" پرویز نے سوچنے کے انداز میں سر ہلایا۔

"بس سر۔" انسپکٹر سلیم نے کہا۔ "بس یہی سب کچھ بتانا تھا آپ کو۔ اب شیبا سے میں کل ملوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب ایک اہم بات تم کو بھی بتادوں۔" پرویز نے کہا۔ "ثاقب کا باپ طاہر سلمان ایک لالچی شخص ہے۔"

انسپکٹر سلیم چونکا۔

"ہاں۔" پرویز نے سر ہلا کر کہا۔ "بعض اوقات بڑے غیر معمولی اتفاقات ہوتے ہیں۔ روجی میری دوست ہے اور طاہر سلمان اس کے شوہر کا باپ۔" کچھ رک کر پرویز نے اضافہ کیا۔ "ان دنوں میرا محکمہ کچھ بینکوں کے بارے میں تحقیقات کر رہا ہے۔ ایک بینک کے لیے میں نے جس آفیسر کو مامور کیا تھا، اس کی رپورٹ آج ہی میری نظروں سے گزری ہے۔ اس رپورٹ سے ہی مجھے معلوم ہوا کہ اس بینک کے کچھ شیئرز باقر سلمان صاحب کے پاس بھی تھے۔ ان کے بعد وہ شیئرز روجی کے نام پر منتقل ہونا چاہیے تھے لیکن اس کے برخلاف وہ طاہر سلمان کے نام پر منتقل

ہوئے ہیں۔"

"اوہ۔" انسپکٹر سلیم کے منہ سے نکلا۔

"ظاہر ہے کہ طاہر سلمان نے یہ شیئرز اپنے نام کروا کے ایک فراڈ کیا ہے۔ اس فراڈ میں بینک کے دو ایک افسر ضرور شامل ہوں گے۔ تفتیش کرنے پر ان افسروں کا نام بھی معلوم ہو جائے گا لیکن اگر ان کے نام تفتیش سے نہ معلوم ہو سکیں تو طاہر سلمان سے معلوم ہو جائیں گے اگر طاہر سلمان کو اس فراڈ کے جرم میں گرفتار کیا جائے لیکن میں چاہوں گا کہ اس کی گرفتاری سے پہلے باقر سلمان صاحب اور ان کی اہلیہ کے قتل کا معاملہ حل کر لیا جائے۔ خاصا امکان نظر آتا ہے کہ دولت کے لالچ میں اسی نے اپنے بڑے بھائی اور بھاوج کو قتل کیا ہو یا کسی سے قتل کروایا ہو۔"

"یہ تو اس کیس کا بہت ہی اہم موڑ ہے سر۔" انسپکٹر سلیم نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" پرویز نے جواب دیا۔ "تم اس قتل کی تفتیش کر رہے ہو، اسی لیے میں یہ بات تمہارے علم میں لایا ہوں۔"

"بلاشبہ یہ بہت اہم بات معلوم ہوئی ہے مجھے آپ سے۔"

"اب جو قدم بھی اٹھانا، بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا۔ فراڈ کے جرم میں تو طاہر سلمان پر ہاتھ ڈالا ہی جا سکتا ہے۔"

انسپکٹر سلیم نے سر ہلایا۔ پرویز نے اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"مجھے اجازت ہے سر؟" انسپکٹر سلیم نے قدرے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" پرویز بھی اٹھا۔ "کہیں جانا ہے مجھے بھی...... اگر تمہارا فون نہ آتا تو میں دفتر سے سیدھا وہیں جاتا۔"

اس نے سلیم کو یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ اسے روحی کے گھر جانا تھا۔

سلیم کو رخصت کر کے اس نے روحی کو فون کیا۔

"ہاں پرویز!" دوسری طرف سے روحی کی ایسی آواز آئی جیسے اس نے سرد آہ کھینچی ہو۔

"تمہاری طرف آنے کا ارادہ ہے میرا۔"

"کوئی خاص بات؟"

"تمہارے لیے شاید وہ خاص بات نہ ہو لیکن میرے لیے ہے۔"

"آ جاؤ۔" اس مرتبہ روحی کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

"ثاقب تو ہوں گے گھر پر؟"

"ہاں، کیوں؟"

"ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ بس نکلتا ہوں گھر سے۔"

پرویز نے رابطہ منقطع کر دیا۔ روحی کے گھر جانے کی بے تابی اسے اس لیے تھی کہ رات کو شیبا ہی کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ سویا تھا تو خواب میں اسے شیبا کی تصویر دکھائی دی تھی جو روحی کے گھر کے ڈرائنگ روم میں رکھی تھی۔

صبح اٹھنے کے بعد بھی اسے وہ خواب یاد رہا تھا اور اسے شدید الجھن لاحق ہو گئی تھی۔ یہ اس کے لیے ایک عجیب اور غیر معمولی بات تھی کہ شیبا کی تصویر اس نے روحی کے ڈرائنگ روم میں دیکھی تھی اور اب تو اس پر یہ بھی آشکارا ہوا تھا کہ شیبا سے ثاقب کا کوئی تعلق ہے۔

روحی کے گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچتا رہا کہ گزشتہ مرتبہ روحی کے گھر پر کیا اس نے وہاں شیبا کی تصویر دیکھی تھی؟ اس کے خیال میں یہ بات ممکن نہیں تھی لیکن خواب کی وجہ سے وہ بے چین ہو گیا تھا۔ آخر وہ تصویر اسے روحی کے گھر میں کیوں نظر آئی۔ وہ شیبا ہی کے بارے میں سوچتے سوچتے سویا تھا اس لیے اگر خواب میں صرف شیبا نظر آتی یا شیبا کی تصویر دکھائی دیتی تو پرویز ذہنی طور پر اتنا منتشر ہرگز نہ ہوتا لیکن وہ روحی کے گھر میں کیوں دکھائی دی؟ وہ اس سوال پر بری طرح الجھ رہا تھا۔

روحی نے اس کا استقبال برآمدے میں آ کر کیا۔ ثاقب بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں اسے ڈرائنگ روم کی طرف لے چلے۔

"ایسی کیا خاص بات ہے پرویز صاحب؟" ثاقب نے پوچھا۔ "ایسی بات جو ہمارے لیے خاص ہو یا نہ ہو لیکن آپ کے لیے......"

"تو روحی نے بتا دیا آپ کو۔" پرویز نے مسکراتے ہوئے ثاقب کی بات کاٹی۔

"روحی مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔"

"اور آپ؟...... آپ بھی روحی سے کوئی بات نہیں چھپاتے۔" پرویز کے ہونٹوں پر اب بھی ہلکی سی مسکراہٹ تھی جیسے اس نے وہ بات رواروی میں کہی ہو لیکن ثاقب پل بھر کے لیے اتنا سنجیدہ ہو گیا جیسے اس کے دماغ کو جھٹکا لگا ہو۔ دوسرے ہی پل اس نے خود کو سنبھال بھی لیا اور ہنستے ہوئے بولا۔

"میں بھی روحی سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔"

اس وقت وہ تینوں ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہے تھے۔ روحی نہ صرف کھوئی کھوئی سی بلکہ اجڑی اجڑی سی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی سرخی تھی جیسے رات کو جاگتی رہی ہو یا تھوڑی دیر پہلے بہت زیادہ رو چکی ہو۔ شاید اس کا دھیان اس طرف بھی نہ ہو کہ پرویز اور ثاقب میں کیا باتیں ہوئی تھیں۔

''دراصل۔'' پرویز بولا۔ ''رات کو میں نے خواب میں آپ کا ڈرائنگ روم دیکھا تھا۔ اب میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا سب کچھ اسی طرح ہے جیسا میں نے خواب میں دیکھا تھا۔'' اس نے ڈرائنگ روم پر ایک طائرانہ نظر بھی ڈالی۔

''تشریف رکھیے۔'' ثاقب نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور دیکھیے کہ یہ آپ کے خواب جیسا ہی ڈرائنگ روم ہے یا نہیں۔''

''وہی دیکھ رہا ہوں۔''

اسی وقت موبائل فون کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ ثاقب نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا۔ اس کی اسکرین پر کوئی نمبر دیکھنے کے بعد وہ کھڑا ہوتا ہوا پرویز سے بولا۔

''ایکسکیوزمی۔''

پرویز نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ثاقب کال ریسیو کرتے ہوئے روحی اور پرویز سے کچھ دور چلا گیا لیکن ڈرائنگ روم ہی میں رہا۔

''خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو روحی۔'' پرویز نے کہا۔ ''ایک اچھے دوست کی حیثیت سے تمہاری اس وقت کی حالت دیکھ کر مجھے بھی رنج ہو رہا ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں پرویز!'' روحی کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

اس مختصر دورانیے میں بھی پرویز کی طائرانہ نظریں ڈرائنگ روم میں چکراتی رہی تھیں۔ اسے یہ یاد نہیں تھا کہ خواب میں اس نے شیبا کی تصویر کس جگہ رکھی دیکھی تھی۔

''تمہیں پینٹنگز اور فوٹو گرافی کا بہت شوق ہے روحی۔''

''پینٹنگز کا شوق تو ثاقب کا ہے۔ فوٹو گرافی کا شوق مجھے بچپن ہی سے ہے۔'' اس نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تصویر تو میں نے اس وقت کھینچی تھی جب میں آٹھ سال کی تھی۔ بس اتفاق ہے کہ یہ تصویر اتنی اچھی آئی ہے، معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ میں نے بہت کم عمری میں کھینچی تھی۔''

اس تصویر پر نظر پڑتے ہی پرویز بے اختیار اٹھا۔

''کیا میں یہ تصویر قریب سے دیکھ لوں؟''

''دیکھ لو، اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

پرویز تیزی سے اس تصویر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہ دو عورتوں کی تصویر تھی جن میں سے ایک کے بارے میں اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ اسے کہیں دیکھ چکا ہے۔ تصویر کے قریب پہنچ کر اس نے اعصابی تناؤ محسوس کیا۔ اس تصویر میں شیبا کی شباہت تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شیبا جب لگ بھگ پینتیس سال کی ہوتی تو بالکل ویسی ہی ہو جاتی۔ تصویر سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ دونوں خواتین بے خبر تھیں کہ ان کی تصویر کھینچ لی گئی ہے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

روحی بھی اٹھ کر پرویز کے قریب آ گئی۔

''یہ میری والدہ ہیں۔'' روحی نے دوسری خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز غم زدگی سے بھرا گئی تھی۔

اس وقت ان کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔''

''ہاں اتنی ہی ہوگی۔'' روحی نے کہا۔ ''میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں مگر ان کی شادی کے بارہ چودہ سال بعد پیدا ہوئی تھی۔'' پرویز نے محسوس کیا کہ روحی کی آواز پہلے سے زیادہ بھرا گئی تھی بلکہ رندھ گئی تھی۔ پرویز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ روحی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

اسی وقت ثاقب تیزی سے قریب آیا۔ ''یہاں سے ہٹو روحی۔'' اس نے تیزی سے کہا۔ ''ممی کی تصویریں دیکھ کر تم اور بوجھل ہو جاتی ہو۔'' اس نے اس طرح روحی کا بازو پکڑا جیسے اسے وہاں سے ہٹا لے جانا چاہتا ہو۔ ساتھ ہی اس نے پرویز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''معاف کیجیے گا پرویز صاحب۔''

''نہیں آپ ٹھیک کر رہے ہیں۔'' پرویز نے کہا۔ ''میں بھی محسوس کر چکا ہوں کہ یہ تصویر دیکھتے دیکھتے جذباتی ہو گئی ہیں۔''

ثاقب، روحی کا بازو پکڑے ہوئے صوفوں کی طرف لے جانے لگا۔ روحی ساڑی کے آنچل سے اپنی آنکھیں خشک کر رہی تھی۔

پرویز اس تصویر کے بارے میں وضاحت سے جاننے کے لیے بے چین ہو گیا تھا لیکن روحی کی حالت متقاضی تھی کہ اس سے اس بارے میں زیادہ بات نہ کی جائے۔ وہ ان دونوں کے ساتھ صوفوں کی طرف آیا اور ایک

صوفے پر بیٹھ گیا۔

ملازم ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا ان کے قریب لایا۔ غالباً پرویز کی خاطر مدارات کے لیے پہلے ہی ہدایات دی جا چکی تھیں۔

''آئی ایم سوری روحی۔'' وہ بولا۔

''کیوں پرویز؟''

''میری وجہ سے تم پھر جذبات کے بھنور میں چلی گئیں۔''

''ارے نہیں۔'' روحی نے جبراً ہنسنے کی کوشش کی۔ پرویز نے محسوس کیا کہ اس کی وہ ہنسی بھی آنسوؤں سے تر تھی۔

☆☆☆

''سر!'' انسپکٹر سلیم موبائل فون پر دوسری طرف سے بولنے والے ایک ماتحت کی آواز سن رہا تھا۔ ''آج میں نے طاہر سلمان صاحب کی بیوی کو دیکھ لیا ہے۔''

''کہاں؟'' انسپکٹر سلیم نے تیزی سے پوچھا۔

''کچھ دیر پہلے میں دوسری مرتبہ طاہر سلمان صاحب کا تعاقب کرتے ہوئے اس بنگلے تک پہنچا ہوں۔ بنگلے پر مسز پروین طاہر کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ یہ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ میں بنگلے کے سامنے انتظار کرتا رہا۔ آپ یہ جاننا چاہتے ہیں نا کہ طاہر صاحب وہاں کتنا وقت گزارتے ہیں؟''

''ہاں، ہاں، آگے کہو۔''

''طاہر صاحب کے وہاں پہنچنے کے دس منٹ بعد ایک کار اس بنگلے میں گئی۔ وہ کار جو خاتون ڈرائیو کر رہی تھیں، ان کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ وہ بھی مسز پروین طاہر کہلاتی ہیں لیکن جب میں نے پہلی مرتبہ اس بنگلے پر مسز پروین طاہر کی نیم پلیٹ دیکھی تھی، اس وقت مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ یہ انہی مسز پروین کا بنگلا ہوگا جن کو میں جانتا ہوں۔ اس نام کی کئی عورتیں بھی ہوسکتی ہیں ناسر۔''

''ان سے تمہارے تعلقات کی نوعیت؟''

''تعلقات نہیں ہیں سر، بس میں انہیں جانتا ہوں، وہ مجھے نہیں جانتیں۔ دراصل وہ خاصی سوشل خاتون ہیں۔ تقریبات میں جاتی رہتی ہیں۔ بعض تقریبات میں کچھ اہم سرکاری شخصیات بھی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ہمارے محکمے کو وہاں سیکیورٹی کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ ایسے کئی موقعوں پر میری ڈیوٹی بھی لگ چکی ہے۔ میں انہیں دو تقریبات میں دیکھ چکا ہوں۔''

"بھی کیوں یاد رہ گئی تھیں؟ بہت سی عورتیں شریک ہوتی ہوں گی ان تقریبات میں۔"

"جی ہاں سر۔" ماتحت نے جواب دیا۔ "وہ مجھے اس لیے یاد رہ گئیں کہ وہ ماڈل گرل شیبا سے خاصی مشابہ ہیں۔"

"اوہ۔" انسپکٹر سلیم چونکا پھر بولا۔ "لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ طاہر سلمان وہاں پہلے پہنچے اور وہ بعد میں؟"

"میں نے بھی اس بارے میں سوچا تھا سر، ہوسکتا ہے جب طاہر سلمان صاحب وہاں پہنچے ہوں تو وہ وہاں نہ ہوں اور طاہر سلمان کے فون کرنے پر وہاں پہنچی ہوں یا ایسی ہی کوئی اور بات ہوسکتی ہے۔"

"کوئی اور بات کیا ہوسکتی ہے؟" انسپکٹر سلیم کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا جیسے وہ خود بھی کسی دوسرے امکان پر غور کررہا ہو۔

دوسری طرف سے ماتحت بولا۔ "طاہر صاحب نے شاید انہیں فون کیا ہو کہ وہ پہنچ رہے ہیں۔ مسز پروین طاہر اس وقت کہیں اور رہی ہوں اور طاہر صاحب کا فون ملنے کے بعد وہاں سے چل پڑی ہوں لیکن طاہر صاحب پہلے پہنچ گئے ہوں۔"

"کسی طرح ان خاتون کی تصویر حاصل کرو۔" انسپکٹر سلیم کے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کیونکہ شیبا سے مشابہت کی بات سامنے آگئی تھی۔

"اب تو رات ہوگئی ہے سر، میں کل دوپہر تک تصویر حاصل کرلوں گا۔"

"کل دوپہر تک؟ بہت پُریقین انداز میں کہا ہے تم نے؟"

"جی ہاں سر، اس کی وجہ ہے۔ مسز طاہر ایک کلچرل ادارے کی تقریب میں بھی شریک ہوچکی ہیں۔ وہ ادارہ اپنے ہال میں ہونے والی ہر تقریب کی مووی بھی بناتا ہے اور فوٹوگرافی کی جاتی ہے۔ ہر تقریب کے فوٹوگرافس کا البم بھی بنایا جاتا ہے۔ اس ادارے کے ایک ذمے دار شخص سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ میں اس سے ملاقات کرکے اس تقریب کا البم نکلوا لوں گا۔ اس میں مسز طاہر سلمان کی تصویر ضرور ہوگی۔ میں اس تصویر سے دوسری تصویر کھینچ لوں گا۔"

"گڈ! یہ کام بہت ضروری ہے اور بنگلے کی نگرانی جاری رکھو۔ میں یہ جاننا چاہوں گا کہ طاہر سلمان کا کتنا وقت وہاں گزرتا ہے۔ ساری رات یا......" انسپکٹر سلیم نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جی بہتر۔"

"طاہر سلمان وہاں سے اگر جلدی نکل پڑیں تو تم مجھے کل رپورٹ دینا۔ اب تو رات خاصی گزر چکی ہے اور میں بہت تھکا ہوا بھی ہوں۔ جلدی سو جاؤں گا۔"

"بہتر ہے۔"

انسپکٹر سلیم نے رابطہ منقطع کردیا۔ کال اس نے بستر پر لیٹے لیٹے ریسیو کی تھی۔ رابطہ منقطع کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ مسز طاہر سلمان کی شیبا سے مشابہت کی اطلاع فوراً پرویز کو دے لیکن گھڑی پر نظر ڈالنے کے بعد اس نے ارادہ ملتوی کردیا۔ اتنی رات گئے فون کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے خیال کے مطابق فوری اطلاع دینے سے کوئی فائدہ بھی نہیں۔

یہ اطلاع اس نے دوسرے دن اپنے دفتر سے پرویز کو فون پر دی۔

اطلاع سن کر دوسری طرف پرویز نے ایک طویل سانس لی تھی اور پھر کہا تھا۔ "یہ معاملہ تو عجیب سے عجیب تر ہوتا جارہا ہے۔ میں روحی کے ڈرائنگ روم میں بھی ایک ایسی عورت کی تصویر دیکھ چکا ہوں جو شیبا سے مشابہ ہے۔"

"اوہ!"

"تمہارا ماتحت تصویر لے آئے تو مجھے ضرور دکھانا۔"

"اس نے بڑے یقین سے کہا ہے کہ وہ دوپہر تک تصویر لے آئے گا۔"

"میں اپنے دفتر ہی میں ملوں گا، یہیں آجانا۔"

"جی، میں حاضر ہوجاؤں گا۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوا تو انسپکٹر سلیم نے بھی اپنا موبائل بند کیا اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے دماغ میں خیالات کا ایک دریا سا بہہ رہا تھا۔ آج ہی اسے شیبا سے بھی ملاقات کرنی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مسز طاہر سلمان کی تصویر ملنے کے بعد ہی شیبا سے ملے گا۔

تصویر اسے ساڑھے گیارہ بجے کے قریب مل گئی۔ اس کا ماتحت خود لے کر آیا تھا۔

"طاہر سلمان کی نگرانی اس وقت جعفری کررہا ہوگا۔" اس نے تصویر انسپکٹر سلیم کو دیتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر سلیم نے سر ہلا کر تصویر پر نظریں جمادیں۔ وہ تصویر شیبا سے تقریباً تیس فیصد مشابہت رکھتی تھی۔

"یہ پینتالیس سال کی تو ہوگی۔" ماتحت بولا۔

"زیادہ ہوگی۔" انسپکٹر سلیم نے کہا۔ "اس نے بہت

گھر امیک اپ کیا ہوا ہے جس کے باعث چہرے سے زیادہ عمر ظاہر نہیں ہو رہی ہے۔ تم نے شاید اس کے ہاتھوں پر غور نہیں کیا۔ یہ ہاتھ کسی ایسی ہی عورت کے ہو سکتے ہیں جو پچپن کے قریب ہو۔"

"جی سر...... آپ کا اندازہ درست ہوگا۔"

"یہ تم نے اچھا کیا کہ تصویر انلارج کروا کے لائے۔"

"اپنے محکمے ہی کے ڈارک روم میں بڑی کروائی ہے۔"

"یہ بتانا شاید تم بھول گئے ہو کہ طاہر سلمان وہاں کب تک رہا؟ میرا مطلب ہے، مسز پروین کے گھر پر؟"

"وہ بالکل صبح وہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ بہت ہلکا سا اجالا ہوا تھا۔"

"یہ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔" انسپکٹر سلیم تصویر پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ "اب تم جاؤ، آرام کرو۔ رات بھر کے جاگے ہوئے ہو۔"

"جی سر! صبح جب جعفری نے میری جگہ لے لی تھی، تبھی میں گھر گیا تھا۔ ناشتا کر کے میں کلچرل ادارے کے اپنے دوست سے ملا۔ میرا خیال ٹھیک نکلا۔ اس تقریب کا البم موجود تھا اور اس میں پروین طاہر کی تصویر بھی تھی۔ اس کا فوٹو بنا کر میں دفتر آیا۔ ڈارک روم سے اس فوٹو کے دو انلارجمنٹ بنوائے اور آپ کے پاس آگیا۔"

"دو؟" انسپکٹر سلیم جلدی سے بولا۔ "دوسرا کہاں ہے؟"

ماتحت نے ایک اور لفافہ انسپکٹر سلیم کی طرف بڑھایا۔

"گڈ!" سلیم نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اب اجازت سر۔" ماتحت نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں جاؤ۔"

ماتحت کو رخصت کرنے کے بعد انسپکٹر سلیم نے ذرا بھی دیر نہیں کی اور پرویز کے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ فون کرنے کی اس نے ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ پرویز کہہ چکا تھا کہ دفتر ہی میں ملے گا۔

اور وہ دفتر میں تھا۔

سلیم سے تصویر لے کر وہ اسے چند سیکنڈ دیکھتا رہا، پھر بولا۔ "یہ وہی عورت معلوم ہوتی ہے جس کی تصویر میں نے روحی کے گھر میں دیکھی تھی۔ بس عمر کا فرق ہے۔ وہ تصویر پندرہ، سولہ سال پہلے کی ہے۔"

"اور یہ ابھی چند مہینے پہلے کی ہے سر۔"

"اب تم کس طرح آگے بڑھو گے؟"

"میں ابھی شیبا سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ یہ تصویر میرے ساتھ ہوگی۔ میں شیبا کو یہ تصویر دکھاؤں گا یا اس طرح گراؤں گا جیسے بے خیالی میں گری ہو، اور شیبا کے تاثرات دیکھوں گا۔ یہ فیصلہ اس سے گفتگو کے بعد کروں گا کہ مجھے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔"

"کس حیثیت سے ملو گے اس سے؟"

"آپ کی دی ہوئی تربیت کا نتیجہ ہے کہ میں نے اپنے نام کے ساتھ بہت سے، اور مختلف اداروں کے وزیٹنگ کارڈ چھپوا رکھے ہیں۔ انہی میں سے کوئی کارڈ استعمال کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس کمپنی کے نمائندے کی حیثیت سے اسے کمپنی کے ایک اشتہار میں کام کرنے کی پیشکش کی جائے۔"

پرویز چند لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔ "میں آج پھر روحی سے ملوں گا یا شاید فون پر بات کروں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے گھر میں اس کی والدہ کے ساتھ دوسری خاتون کون ہے اس تصویر میں۔"

"مجھے آپ نے مشورہ نہیں دیا...... میں اسی حیثیت سے ملوں نا شیبا سے؟" انسپکٹر سلیم نے پوچھا۔

"نہیں۔" پرویز نے کہا۔ "تم نہ پوچھتے تو میں ابھی خود تم سے کہتا کہ تم اس سے پولیس آفیسر ہی کی حیثیت سے ملو۔ اب کئی الجھی ہوئی ڈوریں سامنے آچکی ہیں۔ انہیں سلجھانے کے لیے اب کھل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ روحی کی حالت ابھی ٹھیک نہیں ہے لیکن میں بھی اس سے ایک آدھ بات اور کروں گا۔"

"آپ کی دلچسپی کے باعث مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ معاملہ جلد ہی اپنے منطقی انجام تک پہنچ جائے گا۔"

"دیکھو کیا ہوتا ہے۔" پرویز نے کہتے ہوئے پروین طاہر کی تصویر انسپکٹر سلیم کی طرف بڑھائی۔

"آپ چاہیں تو یہ تصویر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔" انسپکٹر سلیم نے کہا۔ "میرے پاس اس کی ایک اور کاپی ہے۔"

"اچھا، تو یہ چھوڑ جاؤ میرے پاس، لیکن ابھی میرے ذہن میں نہیں ہے کہ میں اس تصویر سے کس طرح، کیا فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔"

انسپکٹر سلیم وہاں سے رخصت ہو کر اپنے دفتر واپس گیا۔ وہاں اس نے اپنی وردی پہنی۔ دو کانسٹیبلو اور ایک

اے ایس آئی کے ساتھ پولیس موبائل میں شیبا کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس سارے دورانیے میں وہ سوچتا رہا تھا کہ اسے شیبا سے کس طرح بات کرنی ہے۔

شیبا کے گھر کا چوکیدار پولیس موبائل دیکھ کر تو پریشان ہوا ہی تھا لیکن انسپکٹر سلیم کو دیکھ کر چونکا بھی تھا کیونکہ اس سے پہلے سلیم جب وہاں آیا تھا تو سادہ لباس میں تھا۔

''سنو۔'' انسپکٹر سلیم نے اس سے درشت لہجے میں کہا۔ ''یہ مت کہنا کہ تمہاری مالکہ گھر پر نہیں ہیں۔''

''جی صاب جی!'' چوکیدار سٹپٹایا۔ ''وہ گھر میں ہیں۔ میں انٹرکام پر انہیں اطلاع دیتا ہوں صاب جی!''

وہ پھاٹک کی ذیلی کھڑکی سے واپس چلا گیا۔ اس نے پھاٹک نہیں کھولا تھا۔

انسپکٹر سلیم کو تین چار منٹ انتظار کرنا پڑا۔ چوکیدار نے واپس آکر پھاٹک کھولا۔ انسپکٹر سلیم جو اے ایس آئی کے ساتھ موبائل سے باہر کھڑا تھا، موبائل میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا کانسٹیبل موبائل حرکت میں لے آیا۔

برآمدے کے سامنے ایک قیمتی کار کھڑی تھی۔ پولیس موبائل اس کے پیچھے رک گئی۔ برآمدے میں جو شخص موجود تھا، وہ شیبا کا بھائی جنید تھا۔ انسپکٹر سلیم نے اسے پہچان لیا۔ اس کی تصویر باقر سلمان کے اغوا کے کیس کی فائل میں موجود تھی۔

''فرمائیے جناب!'' وہ مہذب لہجے میں انسپکٹر سلیم سے بولا۔ ''آپ...... میرا مطلب ہے...... پولیس کو...... یہاں آنے کی زحمت کیوں کرنی پڑی؟''

''آپ کون ہیں؟'' سلیم نے پوچھا۔

''میں ان کا چھوٹا بھائی بھی ہوں اور ان کے سیکریٹری کی حیثیت بھی ہے میری!''

''گویا آپ جنید صاحب ہیں؟''

وہ چونکا۔ ''آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟''

''کبھی ایک کیس کے سلسلے میں پوچھ گچھ کی جا چکی ہے۔ یاد ہوگا آپ کو۔''

جنید کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کے گزر گیا۔

''باقر سلمان کی لاش مل جانے کے باعث تفتیش دوبارہ شروع ہوئی ہے۔'' انسپکٹر سلیم نے کہا۔ ''آپ سے بھی کچھ سوالات کروں گا میں لیکن پہلے شیبا صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''آئیے...... آئیے، ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیے۔ قانون سے تعاون کرنا تو ہر شہری کا فرض ہے۔ آپ لوگ بیٹھیں، میں آپا کو اطلاع دیتا ہوں۔''

انسپکٹر سلیم مسکرا کر رہ گیا۔ اسے یقین تھا کہ جنید نے شیبا کو پہلے ہی پولیس کی آمد سے آگاہ کر دیا ہوگا۔

ڈرائنگ روم میں سلیم اکیلا ہی آیا۔ اپنے ساتھ آنے والوں کو اس نے پولیس موبائل ہی میں چھوڑ دیا تھا۔

اسے بٹھا کر جنید چلا گیا۔

سلیم کو دو تین منٹ انتظار کرنا پڑا۔ شیبا آئی تو گھریے میک اپ میں تھی اور خاصی سنجیدہ نظر آرہی تھی۔

''فرمائیے انسپکٹر صاحب۔'' وہ بولی۔ ''اب پولیس کو ہم سے کیا پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت پیش آگئی؟''

انسپکٹر سلیم نے راستے میں سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا اور شیبا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''تم کیسے اندر آ گئے فری۔'' شیبا نے بچے کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ پھر بلند آواز میں جنید کو پکارا اور اس سے کہا کہ وہ فری کو اس کی ماں کے پاس لے جائے۔

اس سے پہلے کہ انسپکٹر اس بچے کے بارے میں کچھ کہتا، شیبا نے خود ہی کہا۔ ''یہ میری ملازمہ کا بچہ ہے۔ نہ جانے کیوں مجھ سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔ فرید نام ہے اس کا۔ میں اسے پیار سے فری کہتی ہوں۔''

انسپکٹر سلیم کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی۔ بچے کے جسم پر نہایت معقول لباس تھا جو کسی ملازمہ کے بچے کے جسم پر نہیں ہونا چاہیے تھا۔

جنید ڈرائنگ روم میں آیا۔ فرید نامی بچہ منمناتا ہوا شیبا سے کچھ کہہ رہا تھا۔

شیبا نے جنید سے کہا۔ ''تم نے باہر کا دروازہ بند نہیں کیا ہوگا۔ یہ فری اندر آ گیا ہے۔ اسے اس کی ماں کے پاس پہنچاؤ۔ کسی وقت اسے مشینی کار کھلونا لا دینا۔ اسی کی ضد کر رہا ہے۔''

بچہ خاصا مچل رہا تھا لیکن جنید کسی طرح اسے لے ہی گیا۔

شیبا نے زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ انسپکٹر سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس نے پڑوس کے کسی بچے کے پاس مشینی کار دیکھ لی تھی۔ اسی کے لیے ضد کر رہا ہے۔''

''بہت اچھی بات ہے کہ ملازموں کے ساتھ آپ کا برتاؤ بہت مثالی ہے۔'' انسپکٹر سلیم نے کچھ ایسے لہجے میں کہا جیسے اتنا ناطہ چبا رہا ہو۔

"ملازم بھی آخر انسان ہوتے ہیں۔" شیبا نے کہا۔

"بے شک۔" انسپکٹر سلیم نے کہا، پھر بولا۔ "میں آپ سے ایک خاتون کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

شیبا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

تصویر کا لفافہ انسپکٹر سلیم کے ہاتھ ہی میں تھا۔ اس نے تصویر نکال کر شیبا کو دی۔

"آپ سے ان کی مشابہت کی وجہ سے میں جاننا چاہتا ہوں کہ ان سے آپ کا کوئی تعلق ہے یا اسے اتفاق سمجھا جائے؟" سوال کرتے ہوئے وہ بہت غور سے شیبا کو دیکھتا رہا۔

تصویر دیکھتے ہوئے شیبا کے چہرے کی رنگت میں فرق آیا تھا۔

"یہ...... مشابہت......" شیبا اٹک اٹک کر بولی۔ "دراصل یہ میری...... والدہ ہیں۔"

"ہوں۔" انسپکٹر سلیم نے طویل سانس لی۔ اس کے اندازے کے مطابق شیبا نے سمجھ لیا تھا کہ پولیس اس بارے میں چھان بین کر چکی ہوگی اس لیے اس نے جھوٹ بولنا، یعنی پروین طاہر سے لاتعلقی ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔

"آپ...... میرا مطلب ہے۔" انسپکٹر سلیم نے رک کر کہا۔ "طاہر سلمان صاحب تو آپ کے والد نہیں ہوں گے۔ آپ کی والدہ کی شادی ان سے بیس سال پہلے ہوئی تھی جبکہ آپ کی عمر...... میرا خیال ہے کہ پچیس سال سے بھی زیادہ ہوگی۔"

"جی۔" شیبا نے کہا۔ "میرے والد کا انتقال ہونے کے بعد میری والدہ نے دوسری شادی کی تھی۔"

"آپ اپنی والدہ سے الگ کیوں رہتی ہیں؟"

"مجھے ماڈلنگ کا شوق تھا۔ والدہ اور...... میرے دوسرے والد بھی نہیں چاہتے تھے کہ میں اس لائن میں آؤں لیکن جب میں ان کی مخالفت کے باوجود اس لائن میں آگئی تو انہوں نے مجھے الگ کر دیا۔ آپ غالباً باقر سلمان صاحب کے قتل کی تحقیقات کے باعث مجھ تک پہنچے ہیں۔"

"جی ہاں، جب ان کے اغوا کا معاملہ اٹھا تھا تو اس سلسلے میں آپ کے بھائی جنید کا نام بھی آیا تھا۔ اس وقت اس کیس کی تحقیقات جس پولیس آفیسر نے کی تھی، وہ آپ کے بھائی اور آپ سے بھی ملا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے اس کیس کی فائل پڑھنے سے معلوم ہوا ہے۔ جب میں نے تحقیقات

بوڑھی گھوڑی لال لگام

شروع کیں تو مجھے سلمان صاحب کی دوسری بیوی...... یعنی آپ کی والدہ کے بارے میں علم ہوا۔ ان کی آپ سے مشابہت کے باعث میں آپ سے ملا تھا۔ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ مشابہت اتفاقی امر تو نہیں۔"

"جی۔" شیبا نے اتنا ہی کہا۔

"جنید، آپ کے بھائی، ان سے بھی علیحدگی اختیار کر لی تھی آپ کی والدہ نے؟"

"جی ہاں۔ جنید مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ والدہ سے اختلاف کے معاملے میں اس نے میری حمایت کی تھی لہٰذا وہ بھی میرے ساتھ ان سے الگ ہو گیا۔"

"تو آپ لوگ ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملتے؟"

"مہینوں میں کبھی فون پر بات ہو جاتی ہے، ملاقات نہیں ہوئی لیکن جنید کبھی کبھی ان سے ملنے چلا جاتا ہے۔"

"طاہر صاحب کی پہلی بیوی کا بیٹا اپنے والد کی دوسری شادی سے بے خبر ہے؟"

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ تو آپ انہی سے پوچھیے۔"

"آپ ان سے ناواقف ہیں؟ یعنی ثاقب صاحب سے؟"

"جی...... جی...... بس......" شیبا جواب دیتے ہوئے متذبذب تھی۔ "بس نام سنا ہے ان کا اپنی والدہ سے جب میں ان کے ساتھ رہتی تھی۔"

اس نے صریحاً جھوٹ بولا تھا لیکن انسپکٹر سلیم نے فوری طور پر اس کے جھوٹ کی گرفت مناسب نہیں سمجھی۔

"جنید ...... آپ کے بھائی کیا کرتے ہیں؟"
"میری آمدنی اتنی ہے کہ اسے ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ہی اس سے وہ کام لیتی ہوں جو سیکریٹری کرتا ہے۔ کیا آپ اس سے بھی کسی قسم کی پوچھ گچھ کرنا چاہیں گے؟"
"فی الحال کوئی ضرورت نہیں۔" انسپکٹر سلیم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں اب چلتا ہوں۔"
شیبا اسے چھوڑنے کے لیے برآمدے تک آئی۔ برآمدے کے سامنے وہی بچہ کھیل رہا تھا جس کو شیبا نے "فری" کہا تھا۔ وہ جلدی جلدی چلتا ان کی طرف آنے لگا۔ وہ یقیناً قریب آکر پھر شیبا سے لپٹتا لیکن اسی وقت کسی طرف سے ایک عورت آئی اور بچے کو اٹھا کر اس طرف جانے لگی جہاں ایک سرونٹ کوارٹر بنا ہوا تھا۔ اس وقت انسپکٹر سلیم کی نظریں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔
"یہ میری ملازمہ ہے۔" شیبا بولی۔ "اسی کا بچہ ہے یہ۔"
انسپکٹر سلیم چونک پڑا۔ وہ اس سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ کیا کسی گھریلو ملازمہ کا لباس ایسا ہو سکتا ہے جیسا وہ عورت پہنے ہوئے تھی؟
"اچھا اچھا ...... ملازمہ۔" انسپکٹر سلیم بڑبڑا کر رہ گیا اور پھر تیزی سے قدم بڑھا کر پولیس موبائل میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ کرنے والا کانسٹیبل انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔

☆☆☆

ثاقب دفتر میں تھا جب پرویز، روحی سے اس کے گھر پر ملا۔ روحی قدرے بہتر نظر آ رہی تھی۔ وہ پرویز کے سوال کے جواب میں بولی۔
"تم ان خاتون میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"
"مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں انہیں پہلے کہیں دیکھ چکا ہوں۔ بس ایسے ہی روا روی میں پوچھ بیٹھا ہوں۔ اگر تم نہیں بتانا چاہتیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"
"نہیں، مجھے بتانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ ممی انہیں پروین کے نام سے مخاطب کرتی تھیں۔ کوئی شناسا تھیں یہ ممی کی۔ مہینے میں ایک آدھ بار آیا کرتی تھیں ممی سے ملنے۔"
"پروین۔" پرویز زیر لب بڑبڑایا۔ "میں اس نام کی کسی خاتون کو بھی نہیں جانتا۔ ہاں انہیں کہیں دیکھا ضرور ہے۔ خیر، چھوڑو یوں ہی پوچھ بیٹھا تھا۔ ابھی تمہارے گھر کے قریب سے گزر رہا تھا کہ تم سے ملنے کا خیال آ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم نے خود کو خاصا سنبھال لیا ہے۔"
"انسان کا گرنا اور سنبھلنا، سب کچھ قدرتی طور پر ہوتا ہے۔" روحی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔
پرویز کی جیب میں پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ پرویز نے موبائل نکال کر کال ریسیو کی جو انسپکٹر سلیم کی تھی۔
"ہاں، بولو۔" پرویز نے ماؤتھ پیس میں کہا۔
"کچھ اطلاعات ہیں سر! میں نے سوچا کہ آپ کو فوراً ......"
"بہتر ہوگا کہ تم تیس چالیس منٹ بعد میرے دفتر آکر بتاؤ۔ میں کسی سے ملنے آیا ہوا ہوں۔ اب یہاں سے اٹھ کر پھر دفتر پہنچوں گا۔"
"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"
پرویز رابطہ منقطع کرتے ہوئے کھڑا ہوا۔ "اچھا روحی ...... اب میں چلتا ہوں۔"
"ارے، اتنی جلدی؟ پانچ منٹ بھی تو نہیں گزرے۔"
"ابھی جو ایک کال آ گئی، اس کی وجہ سے مجھے فوراً دفتر پہنچنا چاہیے۔"
"اچھا!" روحی بھی کھڑی ہو گئی، پھر اس کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "ڈیڈی کی لائبریری کا کمرا انسپکٹر سلیم نے سیل کروا دیا تھا۔ وہ سیل کب تک رہے گی؟"
"دراصل اس قسم کے واقعات میں کوئی جگہ اس لیے سیل کر دی جاتی ہے کہ بعد میں کوئی بات معلوم ہونے پر اس جگہ کا دوبارہ جائزہ لینے کی ضرورت پڑے۔ میں انسپکٹر سلیم سے بات کروں اس سلسلے میں۔"
پرویز وہاں سے سیدھا اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ روحی سے ملاقات کے باعث یہ معلوم ہو گیا تھا کہ پروین طاہر کا روحی کے گھر میں آنا جانا تھا اور اس کا مطلب تھا کہ باقر سلمان اپنے بھائی کی دوسری شادی سے واقف تھے لیکن کسی باعث روحی سے یہ معاملہ چھپا لیا گیا تھا۔ چھپانے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟
دفتر پہنچ کر اسے انسپکٹر سلیم کا کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ انسپکٹر سلیم نے شیبا سے اپنی ملاقات کی تفصیل بیان کی۔ اس میں ایک اہم بات تو یہ تھی کہ شیبا نے پروین طاہر کی بیٹی ہونے کا اعتراف کیا تھا اور یہ بھی کہ ان ماں بیٹی کی علیحدگی کا سبب کیا تھا۔ دوسری بات اس بچے کے بارے میں تھی جو

آ کر شیبا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا اور شیبا کے بیان کے مطابق وہ اس کی ملازمہ کا بچہ تھا۔

”یہ میرے خیال میں بہت ہی عجیب بات ہے سر۔“ انسپکٹر سلیم نے کہا۔ ”اس بچے کے جسم پر ایسا لباس تھا جو کسی آسودہ حال گھرانے ہی کے بچے کے جسم پر ہوتا ہے اور اس کی ماں بھی اپنے لباس سے ملازمہ نہیں معلوم ہو رہی تھی حالانکہ بچے کو اٹھا کر وہ سرونٹ کوارٹر میں گئی تھی۔“

اس وقت پرویز کے چہرے پر غور و فکر کے گہرے تاثرات نمایاں ہو چکے تھے۔ وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ ”ثاقب کا ماضی کھنگالنا پڑے گا سلیم! یعنی اس وقت کا جب ثاقب اور روحی بہ غرض تعلیم انگلینڈ جانے والے تھے۔“

انسپکٹر سلیم کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے کہا۔ ”گویا آپ کے ذہن میں بھی وہ شبہ چکرا گیا جو میرے ذہن میں ابھرا ہے۔“

”ہاں۔“ پرویز نے کہا۔ ”تمہارے ذہن میں وہ شبہ ابھرنا ہی چاہیے۔ اس امکان کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ وہ بچہ کہیں شیبا اور ثاقب کے ناجائز تعلق کا نتیجہ تو نہیں؟ اگر یہ حقیقت ہوئی تو یہ بات طے پا جائے گی کہ شیبا نے اس ناجائز بچے کی بنیاد پر ثاقب کو بلیک میل کیا ہو اور کوئی بہت بڑی رقم وصول کر کے اپنی زندگی میں مالی انقلاب لائی ہو۔“

”اور ثاقب اب بھی اس سے ملتا ہے۔“

”ممکن ہے کہ وہ اب بھی ثاقب کو بلیک میل کر رہی ہو۔“

”وہ شیبا کے گھر صرف پندرہ منٹ کے لیے گیا تھا۔“

”شیبا کا کوئی اور مطالبہ پورا کرنے کے لیے جا سکتا ہے۔“ پرویز نے کہا۔ ”ذرا دیر کے لیے بچے کو دیکھنے کی خواہش بھی ہو سکتی ہے۔ بچہ جائز ہو یا ناجائز، باپ کو اسے دیکھنے کی خواہش تو ہو سکتی ہے۔“ پرویز نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کاش یہ شبہ غلط ثابت ہو۔“

”یہ آپ روحی صاحبہ کی وجہ سے کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں۔“ پرویز نے کہا۔ ”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ روحی میری بہت ہی اچھی دوست ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اس کا دکھ میرا دکھ ہے۔“

”جی۔“ انسپکٹر سلیم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”سر! کیا یہ ممکن نہیں کہ باقر سلمان صاحب کا قتل اور شیبا سے ثاقب کا تعلق، دو الگ الگ معاملے ہوں۔“

”ایسا ہوتا تو ہے سلیم۔ ایک جرم کی تفتیش کرتے کرتے کوئی دوسرا جرم بھی سامنے آ جاتا ہے۔ اچھا ہاں، ایک اور بات تمہیں بتا دوں۔ ممکن ہے اس کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو۔ مجھے روحی سے باتیں کر کے اس کا علم ہوا ہے کہ پروین طاہر، روحی کے والدین کی زندگی میں ان کے گھر آتی جاتی رہی ہیں۔“

”پھر تو روحی صاحبہ کو علم ہونا چاہیے کہ طاہر سلمان صاحب نے دوسری شادی کی تھی۔“

”نہیں، وہ بے خبر ہے۔“

”تو پھر یہ بات آپ کے علم میں کیسے آئی؟“

پرویز خفیف سا مسکرایا۔ اس نے اپنے خواب سے لے کر روحی سے ملاقات اور پروین طاہر کی تصویر کے بارے میں وضاحت سے بتا دیا۔

”سر! آپ کا خواب اور یہ سب کچھ بڑا عجیب ہے۔“

”نہیں سلیم! میں اس کا تجزیہ کر چکا ہوں۔“ پرویز نے کہا۔ ”میں نے پہلی ملاقات میں ہی روحی کے ڈرائنگ روم میں وہ تصویر دیکھ لی ہو گی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میری نظر اس تصویر پر پڑ چکی ہو گی اور کیونکہ میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا تھا اس لیے شیبا سے اس کی مشابہت میرے لاشعور میں کہیں ہو گی۔ پھر اس رات میں شیبا ہی کے بارے میں سوچتا ہوا سویا تھا اس لیے خواب میں مجھے روحی کے ڈرائنگ روم میں شیبا کی ماں کی تصویر کے بجائے شیبا ہی کی تصویر دکھائی دی۔ انسان کا لاشعور بعض اوقات بڑے عجیب گل کھلاتا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ انسپکٹر سلیم نے کہا۔ ”آپ نے تجزیہ بھی بہت صحیح کیا ہے۔ بہرحال یہ کیس ابھی الجھتا ہی جا رہا ہے۔ ایک الجھی ہوئی ڈور ہاتھ میں ہے جس کا سرا نہیں مل رہا ہے۔“

”یکایک ملے گا اس کا سرا۔ تمہیں تجربہ تو ہو گا اس کا۔ ایسا ہوتا ہے کہ کبھی کبھی کہ انسان اندھیرے سے یکایک روشنی میں آ جاتا ہے جو کردار سامنے ہیں، ان سب کی نگرانی جاری رکھنے ہی سے اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا ہاتھ میں آئے گا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ سر! صبر سے ہی کام لینا پڑے گا۔ کیا اب مجھے اجازت ہے۔“

”جاؤ!“ پرویز نے کہا۔ ”اور ہاں، باقر سلمان کا

کمرا کب تک سیل رکھنے کا ارادہ ہے؟ دراصل وہ روحی کے ذہن پر ایک بوجھ بنا ہوا ہے۔"

"وہاں بدبو بہت تھی اس لیے وہ سیل کرنے سے پہلے وہاں بہت اچھی طرح اسپرے کروا دیا تھا۔ وہ بو بالکل ختم ہو گئی تھی جب اسے سیل کیا گیا۔ خیر! اب آج تو نہیں، کل میں ٹوٹی ہوئی دیوار کا سارا ملبا ہٹانے کے بعد اسے سیل نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

انسپکٹر سلیم سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن روحی کے گھر سے ٹوٹی ہوئی دیوار کا ملبا ہٹانے کا کام شروع ہوا۔ سلیم نے اپنے ایک خاص ماتحت کو ملبا ہٹانے کے کام کی نگرانی پر مامور کیا اور خود ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر روحی اور ثاقب سے ادھر اُدھر کی باتوں میں وقت گزارنے لگا۔

مزدور ملبے کی پراتیں اٹھا اٹھا کر ڈرائنگ روم ہی سے باہر جا رہے تھے اور پراتوں کا ملبا ایک ٹرک میں ڈال رہے تھے۔

یہ کام بہت تیزی سے کیا جا رہا تھا لیکن دس منٹ بعد انسپکٹر سلیم نے محسوس کیا کہ مزدوروں کا آنا جانا بہت سست ہو گیا۔

انسپکٹر سلیم فوراً اٹھ کر اس کمرے میں پہنچا۔

"کیا بات ہے؟ کام سست کیوں ہو گیا؟"

ماتحت نے اسے دو چھوٹی چھوٹی سیپیاں دکھائیں۔" یہ ملبے سے نکلی ہیں صاحب! پہلی سیپ ملتے ہی میں نے مزدوروں کو ہدایت کی تھی کہ وہ ملبا بہت دیکھ دیکھ کر اٹھائیں۔ ابھی ابھی دوسری سیپ بھی ملی ہے۔ ممکن ہے اور ملیں۔ یہ بات بہت عجیب ہے صاحب کہ جو دیوار توڑی گئی ہے، اس میں سیپیاں بھی ہیں۔"

اسی وقت ایک مزدور نے ایک اور سیپ لا کر انسپکٹر سلیم کے ماتحت کو دی۔

"تم ٹھیک کر رہے ہو۔" انسپکٹر سلیم نے کہا۔ "بالکل ضروری ہے کہ ملبا بہت دیکھ بھال کر اٹھایا جائے بلکہ ایک مزدور کو ٹرک پر بھیج دو۔ جو ملبا ٹرک میں پہلے ڈالا جا چکا ہے، اسے بھی دیکھا جانا چاہیے۔"

"جی۔"

ماتحت نے فوراً ایک مزدور کو بھیج دیا۔ اس کو یہ لالچ بھی دیا گیا تھا کہ اس کی تلاش کردہ ہر سیپ پر دس روپے، مزدوری کے علاوہ دیے جائیں گے۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" انسپکٹر سلیم نے ہنس کر کہا۔ "اس لالچ میں وہ ملبے کا ذرہ ذرہ دیکھ ڈالے گا۔"

"یہ سارا ملبا ہٹانے میں اب خاصا وقت لگ سکتا ہے۔" ماتحت نے کہا۔

پرویز نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ "ایک سیپ مجھے دو۔"

سیپ لے کر وہ واپس ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ ثاقب اور روحی اب بھی وہیں تھے۔ اس دن ثاقب دفتر نہیں گیا تھا۔ انسپکٹر سلیم نے اسے صبح ہی فون کر کے بتا دیا تھا کہ آج کمرے کی سیل توڑ دی جائے گی اور وہاں سے ملبا بھی ہٹا دیا جائے گا۔

"روحی صاحبہ!" انسپکٹر سلیم نے پوچھا۔" آپ کے والد کو نوادر جمع کرنے کا شوق تھا۔ کیا ان کے پاس سیپیاں بھی تھیں؟"

"ایک سیپ تھی جو وہ اپنی میز پر پیپرویٹ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ غیر معمولی طور پر بڑی سیپ تھی۔ میں نے اس سے بڑی سیپ کبھی نہیں دیکھی۔ اس کے غیر معمولی طور پر بڑے ہونے ہی کی وجہ سے ڈیڈی نے وہ اپنے پاس رکھی تھی۔"

"ایسی سیپیاں نہیں تھیں اُن کے پاس؟" انسپکٹر سلیم نے مٹھی کھول کر سیپ نہ صرف دکھائی بلکہ روحی کی طرف بڑھا بھی دی۔ اس وقت اس نے بڑے غور سے ثاقب کی طرف بھی دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر نہیں ابھرا جس سے ظاہر ہوتا کہ سیپ اس کے چونکنے کا سبب بنی ہو۔

"یہ سیپ آپ کو کہاں سے ملی؟" اس نے کسی قدر الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

انسپکٹر سلیم کے جواب دینے سے پہلے روحی بول پڑی۔ "یہ تو بہت معمولی سیپ ہے۔ ساحل سمندر پر کبھی کبھی تو مل ہی جاتی ہیں۔ ایسی سیپ ڈیڈی کیوں رکھتے؟" پھر فوراً ہی اس نے یہ سوال بھی کر ڈالا۔ "یہ آپ نے مجھے کیوں دکھائی ہے اور یہ......"

"یہ دیوار کے ملبے سے ملی ہے، بلکہ اب تک تین مل چکی ہیں۔ شاید اور بھی ملیں۔" انسپکٹر سلیم نے جواب دیا۔

"عجیب بات ہے۔" ثاقب بولا۔ "دیوار کے ملبے میں سیپیاں کہاں سے آ گئیں؟"

"یہی تو جاننا پڑے گا۔" انسپکٹر سلیم نے روحی سے واپس لی ہوئی سیپ پر نظر جماتے ہوئے بڑبڑانے والے

انداز میں کہا۔

ملازم چائے کی ٹرے لے آیا۔

''تو یہ ملبا ہٹانے کا کام کب ہوگا؟'' ثاقب نے پوچھا۔

''اس میں زیادہ وقت تو نہ لگتا لیکن جیسے ہی ایک سیپ ملی، میرے ماتحت نے کام کی رفتار اس لیے سست کروا دی کہ شاید اور سیپیاں بھی ملیں اور اس کا خیال ٹھیک ثابت ہوا۔ دو سیپیاں اور ملی ہیں۔''

''عجیب سی بات ہے۔'' ثاقب نے اپنا سر آہستہ سے جھٹکا۔

روحی اس وقت پیالیوں میں چائے بنا رہی تھی۔

''جا کے دیکھتا ہوں، اور کیا نکلا؟'' انسپکٹر سلیم کھڑا ہوا۔

''چائے تو پی لیجیے۔'' روحی بول پڑی۔ ''بنا لی ہے۔'' انسپکٹر سلیم رک گیا۔

ابھی اس نے دوسرا ہی گھونٹ لیا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ انسپکٹر سلیم نے موبائل نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ کال اس کے ان ماتحتوں میں سے ایک کی تھی جنہیں جنید کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔

''معاف کیجیے گا۔'' انسپکٹر سلیم نے روحی اور ثاقب سے کہا اور اٹھ کر ان سے چند قدم دور جا کر کال ریسیو کی۔

''ہاں، کوئی خاص اطلاع؟''

''جی صاحب!'' جواب ملا۔ ''میں جب جنید کی نگرانی کے لیے پہنچا، اس وقت رافع کی ڈیوٹی ختم ہو رہی تھی۔ اس وقت جنید ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں ایک نوجوان کے ساتھ تھا۔ رافع نے مجھ سے کہا کہ اگر ریسٹورنٹ سے ان دونوں کی میرا مطلب ہے جنید اور اس نوجوان کی، تو اس نوجوان کے پیچھے جاؤں۔ رافع بہ دستور جنید کے تعاقب میں رہے گا۔ پھر ہوا بھی ایسا ہی۔ نوجوان جنید سے پہلے نکلا ریسٹورنٹ سے، اس لیے میں اس کے پیچھے لگ گیا۔ کئی گلیوں سے گزر کر وہ ایک سڑک پر پہنچا جہاں وہ ایک قیمتی کار میں بیٹھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شوفر تھا۔ میں نے کار کا تعاقب کیا۔''

انسپکٹر سلیم بے تابی سے پوچھ بیٹھا۔ ''یہ معلوم کر لیا کہ وہ لڑکا کون ہے؟''

''جی ہاں صاحب! ایاز نام ہے اس کا۔ انیس بیس سال کا ہوگا وہ، لیکن اتنی کم عمری میں وہ اسکائی رینج جیسی بڑی کمپنی کا مالک ہے۔''

ایاز کا نام سنتے ہی انسپکٹر سلیم چونک گیا۔ یہ بات اس کے علم میں پہلے ہی آ چکی تھی کہ طاہر سلمان اور پروین طاہر کے انیس سالہ بیٹے کا نام ایاز ہے اور طاہر سلمان نے ''اسکائی رینج'' کے نام سے جو کمپنی قائم کی ہے، وہ ایاز ہی کے نام ہے۔

دوسری طرف سے اس کا ماتحت بول رہا تھا۔ ''اس کی قیمتی کار اور اس کے اسکائی رینج کی پانچ منزلہ عمارت کی وجہ سے پہلے تو میں اپنے اس خیال سے حیران تھا کہ اتنی کم عمری میں وہ اس بڑی کمپنی میں کسی بڑے منصب پر ہوگا لیکن چھان بین کرنے میں میری حیرت اور بڑھ گئی۔ وہ اس کمپنی

کا مالک ہے۔"

"اس کی کوئی تصویر لی تم نے اپنے موبائل سے؟" انسپکٹر سلیم کے لہجے میں اب بھی بے تابی تھی۔

"جی ہاں۔ کئی تصویریں لی ہیں لیکن دور سے۔ کلوز اپ نہیں ہے کوئی۔"

"ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ تم اس کے قریب جا کر اس کی تصویر کیسے کھینچ سکتے تھے۔ خیر، وہ تصویریں تم میرے موبائل پر بھیج دو۔ میں انتظار کرتا ہوں۔"

"تصویریں میں ابھی بھیج دیتا ہوں، لیکن اس کے بعد...... کیا میں یہاں رکوں؟ ایاز کی نگرانی جاری رکھنے کے لیے؟"

"نہیں۔" انسپکٹر سلیم نے کہا۔ "اگر میں نے اس کی نگرانی کروانا ضروری سمجھا تو کسی اور کو مامور کروں گا اس ڈیوٹی پر...... تم تو جنید کی نگرانی کے بعد یہ دوسرا کام بھی کر چکے ہو۔ یقیناً تھک گئے ہو گے۔ مجھے تصویریں بھیج دو اور اپنے گھر جاؤ۔"

"میں تصویریں ابھی بھیجتا ہوں۔"

انسپکٹر سلیم نے رابطہ منقطع کیا اور واپس ثاقب اور روحی کے قریب گیا۔

"آپ کی چائے کچھ ٹھنڈی ہو گئی ہو گی۔" روحی بولی۔ "میں دوسری بناتی ہوں۔"

"ارے نہیں۔" انسپکٹر سلیم نے اپنی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اتنی جلدی زیادہ ٹھنڈی نہیں ہوئی ہو گی۔" وہ بیٹھ کر چائے کے گھونٹ لینے لگا۔ اس کا دماغ اس خیال میں الجھا ہوا تھا کہ جنید اور ایاز کی اس ملاقات سے کیا نتیجہ اخذ کیا جائے۔ وہ دونوں سوتیلے بھائی تو تھے لیکن بھائیوں کو اس طرح ملنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جنید سے ایاز ایک معمولی ریسٹورنٹ میں ملا تھا جو اس کے شایانِ شان نہیں تھا اور اس لیے اس نے اپنی قیمتی کار بھی ریسٹورنٹ سے کچھ دور کھڑی کروائی تھی۔

"آپ کسی گہری سوچ میں ہیں۔" روحی نے اس سے کہا۔ "کیا کوئی اہم اطلاع ملی ہے فون پر؟ معاف کیجیے گا، یہ سوال میں اس لیے کر بیٹھی کہ شاید اس اطلاع کا کوئی تعلق میرے والدین کے قتل سے ہو۔" آخری الفاظ کہتے ہوئے روحی کی آواز کچھ بھرا گئی تھی۔

"جی نہیں روحی صاحبہ!" انسپکٹر سلیم کے لیے جھوٹ بولنا ضروری تھا۔ "وہ ایک اور معاملہ ہے۔" پھر وہ اٹھا۔ "میں جا کر ذرا دیکھوں اور سیپیاں ملیں یا نہیں۔"

روحی اور ثاقب بدستور اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

انسپکٹر سلیم کو اس کے ماتحت نے مزید سیپیاں دکھاتے ہوئے کہا۔ "سات اور مل چکی ہیں۔"

"دس سیپیاں ہو گئیں۔" انسپکٹر سلیم بڑبڑایا۔

"جی۔"

انسپکٹر سلیم کے دماغ میں یہ خیال چکرانے لگا کہ کیا یہ سیپیاں مجرم تک پہنچنے میں مدد دے سکیں گی؟

ملبا اٹھانے کا کام جاری رہا۔ تین سیپیاں اور ملیں۔ دو اس ملبے سے ملیں جو ٹرک میں پہلے ہی ڈال دیا گیا تھا۔

اسی دوران میں انسپکٹر سلیم کو موبائل پر ایاز کی تصاویر بھی مل گئیں۔

☆☆☆

اسی شام پرویز اپنے گھر پر انسپکٹر سلیم سے ساری رُوداد سن رہا تھا۔ انسپکٹر سلیم نے اسے ایاز کی تصویریں بھی دکھائیں۔

پرویز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جنید اور ایاز کی ملاقات کے بارے میں جاننے کی ضرورت ہے سلیم۔ ان دونوں کا ایک ریسٹورنٹ میں ملنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایاز اس کے گھر نہیں جاتا اور اس کا سبب یہ ہی سکتا ہے کہ وہ دونوں اپنے تعلق کو شیبا سے پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں۔"

"پوشیدہ رکھنے کی ضرورت کیوں ہو سکتی ہے انہیں؟"

"یہی تو تمہیں معلوم کرنا ہوگا۔"

"اور ان سیپیوں کے بارے میں کیا قیاس کر سکتے ہیں سر۔" انسپکٹر سلیم نے کہا۔ ملبے سے ان کا ملنا...... کیا سمجھا جائے اس سے۔"

"ایک بات تو یہ ہو سکتی ہے کہ جن مزدوروں نے وہ دیوار تعمیر کی تھی اور دیوار میں لاشیں چنی تھیں، یہ سیپیاں انہی میں سے کسی کے پاس ہوں گی جو اس گارے میں گر پڑیں جو دیوار کے لیے بنایا گیا ہوگا۔ ریت اور سیمنٹ کا گارا۔"

"تو وہ گری ہوئی سیپیاں اٹھا بھی سکتا تھا؟"

"ممکن ہے گھبراہٹ میں نہ اٹھا سکا ہو۔ امکان تو یہی ہے نا کہ ان مزدوروں سے زبردستی یہ کام کروایا گیا ہوگا، ریوالور یا پستول دکھا کر۔"

انسپکٹر سلیم نے متفکر انداز میں سر ہلایا۔ پھر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پرویز پھر بول پڑا۔ "جب تم شیبا سے ملنے جا رہے تھے تو میں نے کہا تھا کہ اب کھل کر کام کرنے کی ضرورت ہے لیکن تم نے شیبا سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ خاصے کردار سامنے آ چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ انہی میں سے کوئی

باقر سلمان اور ان کی اہلیہ کا قاتل ہو یا اس قتل کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ بات اب اسی طرح آگے بڑھ سکے گی۔ کراس کوئسچننگ سے بوکھلاہٹ میں کوئی ایسی بات کسی کے منہ سے نکل سکتی ہے جس سے یہ معاملہ کھل سکے۔"

"بس وہ بچہ سامنے آنے کے باعث میں نے سوچا کہ پہلے آپ کو اس بارے میں بتا دوں اور مشورہ کر سکوں۔"

"تم اپنی ذہانت سے بہت سے کیس حل کر چکے ہو سلیم۔ اس معاملے میں کیونکہ میں نے دلچسپی لی ہے اس لیے تم لاشعوری طور سے مجھ پر انحصار کرنے لگے ہو۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنی خود اعتمادی بحال کرو۔ خود فیصلے کرو اور اقدامات کرو۔"

"جی۔" انسپکٹر سلیم شرمندگی سے مسکرایا۔ "غالباً ایسا ہی ہے کہ میں سب کچھ آپ پر چھوڑ بیٹھا ہوں۔"

"یہ بہت غلط ہے۔" شیبا کے گھر میں تمہیں جو بچہ نظر آیا تھا، تم اس بارے میں بھی شیبا سے سوالات کر سکتے تھے۔"

انسپکٹر سلیم کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس نے موبائل نکال کر کال ریسیو کی۔

"صاحب!" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق دو سیپیاں دھلوالی ہیں۔"

"صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے؟" انسپکٹر سلیم نے منہ بنایا۔

"جی نہیں سر! سیپیاں دھلوانے سے ایک خاص بات سامنے آئی ہے۔ ہر سیپی میں ایک باریک سوراخ ہے۔"

"اوہ!" انسپکٹر سلیم کے منہ سے نکلا۔ "یہ بات تو قابلِ غور ہے۔"

"اسی لیے تو میں نے آپ کو فون کیا۔ سیپیاں کیونکہ مٹی میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ سوراخ دھونے کے بعد ہی نظر آئے۔"

"میں ابھی آ کے دیکھتا ہوں۔" انسپکٹر سلیم نے فون بند کیا۔

پرویز اس کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ سلیم نے اسے بتایا جو اسے ان سیپیوں کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔

پرویز بولا۔ "تم خود ہی سمجھنے کی کوشش کرو۔ سیپیوں میں سوراخ کروائے گئے ہوں گے، قدرتی طور پر تو یہ نہیں ہو سکتا۔ اب میں اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں لوں گا۔ اس طرح تو تمہاری ذہانت کو زنگ لگتا چلا جائے گا۔ تم اپنی خود اعتمادی مجروح کر رہے ہو۔ اب تم اس معاملے میں مجھ سے اسی وقت بات کرنا جب قاتل یا قاتلوں کو ہتھکڑیاں لگا چکے ہو۔"

"بہتر ہے سر۔" انسپکٹر سلیم پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

پرویز کے گھر سے وہ سیدھا اپنے دفتر پہنچا جہاں اس کا وہ ماتحت موجود تھا جس نے اسے سیپیوں کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ انسپکٹر سلیم نے وہ سیپیاں دیکھیں اور سوچنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ سیپیاں شاید کسی مضبوط دھاگے میں پرو کر ہار بنایا گیا ہو اور وہ ان مزدوروں میں سے کوئی ہو جنہوں نے وہ دیوار بنائی تھی۔ مزدور قسم کے لوگوں سے اس قسم کی کسی بھی حرکت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ گارا بناتے ہوئے وہ ہار کسی وجہ سے ٹوٹ سکتا تھا۔ اس صورت میں سیپیاں گارے میں مل سکتی تھیں۔

انسپکٹر سلیم کچھ سوچتا رہا، پھر اپنے ماتحت سے بولا۔ "کسی پولیس اسٹیشن سے اب تک کوئی خاص رپورٹ نہیں آئی جو رپورٹیں آ رہی ہیں، ان پر تو تم نظر رکھے ہوئے ہو نا؟"

"جی ہاں صاحب! اول تو رپورٹیں بھی بہت کم تھانوں کی آئی ہیں اور ایسی کوئی رپورٹ نہیں جس سے وہ معلومات حاصل ہو سکیں جو ہمیں مطلوب ہیں۔"

"اچھا یہ سیپیاں تو تم ہمیں محفوظ کر دو۔ میں اب گھر جاؤں گا۔"

سلیم ملبا ہٹوا کر وہاں کی مکمل صفائی کروانے کے بعد سیدھا پرویز کے پاس چلا گیا تھا اس لیے بہت تھکا ہوا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح ہوئی۔ انسپکٹر سلیم، شیبا کے گھر کی طرف روانہ ہوا ہی تھا کہ موبائل پر دفتر سے اس کے خصوصی ماتحت کی کال آ گئی۔

"آج ایک رپورٹ آئی ہے صاحب! اس میں ایک بات ایسی ہے جس پر توجہ دی جا سکتی ہے۔ وہ اسی علاقے کے ایس ایچ او کی ہے جہاں روحی صاحبہ کا گھر ہے۔"

"کیا رپورٹ ہے؟" انسپکٹر سلیم نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں فون پر بتا تو دوں لیکن آپ اگر خود دیکھ لیتے تو بہتر تھا، آپ کب تک دفتر آئیں گے؟"

"میں کچھ دیر سے آتا لیکن اب فوراً آتا ہوں۔" انسپکٹر سلیم نے کہا اور شیبا کے گھر جانے کے بجائے سیدھا دفتر

روانہ ہو گیا۔

دفتر پہنچ کر اس نے رپورٹ دیکھی۔ اس میں تین مزدوروں کے اچانک غائب ہونے کی خبر تو تھی لیکن غائب ہونے کی تاریخوں میں اختلاف تھا۔ پوچھ گچھ کرنے پر کسی مزدور نے پانچ مہینے اور کسی نے چھ مہینے بتائی تھی۔ مزدور تو کیا، کوئی بھی ایسی باتوں کی تاریخ یاد نہیں رکھتا لیکن رپورٹ میں چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ ان تینوں مزدوروں میں سے ایک کا اصل نام کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہاں بیٹھنے والے بھی مزدور اسے ''سیپیا'' کہتے تھے۔

اگر گزشتہ روز ملبے سے سیپیاں نہ ملی ہوتیں تو یہ بات سلیم کو ہرگز نہیں چونکاتی۔

رپورٹ میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ وہ تینوں مزدور سگے بھائی تھے۔ بڑے کا نام غفار تھا، اس سے چھوٹے کا انوار اور اس سے چھوٹے کو سیپیا اس لیے کہا جاتا تھا کہ اسے سیپیوں کا اتنا شوق تھا کہ وہ سیپیوں کا ہار پہنے رہتا تھا جو اس نے خود بنایا تھا۔ غفار اور انوار تعمیرات کے اچھے خاصے ماہر تھے۔ سیپیا ان کا صرف ہاتھ بٹایا کرتا تھا اکثر انہیں کوئی ایسا کام مل جاتا تھا جس میں تینوں ہی کو جانا پڑتا تھا۔ چھوٹے موٹے کام کے لیے غفار اور سیپیا یا انوار اور سیپیا چلے جاتے تھے۔ رپورٹ میں ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ اب تینوں نے شہر کے ایک متوسط درجے کے علاقے میں ایک چھوٹی سی اسٹیٹ ایجنسی کھول لی تھی، مزدوری کا کام چھوڑ دیا تھا۔

اس اسٹیٹ ایجنسی کا پتا صرف ایک مزدور نے بتایا تھا کیونکہ اس بات سے صرف وہی واقف تھا۔ اس کا گزر اتفاق سے اس علاقے میں ہوا تھا جہاں ان بھائیوں نے اسٹیٹ ایجنسی کھولی تھی۔ اس نے انوار کو اسٹیٹ ایجنسی سے نکلتے دیکھا تھا تو اسے مخاطب کر بیٹھا تھا اور اسی سے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ وہ اسٹیٹ ایجنسی انہی تینوں بھائیوں کی تھی۔

رپورٹ میں اسٹیٹ ایجنسی کا پتا بھی تھا۔

''اب تو......'' انسپکٹر سلیم نے پُرجوش انداز میں گھونسا مارا۔

''جی صاحب!'' اس کا ماتحت چونکا۔

انسپکٹر سلیم ہنس پڑا۔ ''میں سوچنے لگا تھا کہ اب تو اس کیس کا تالا کھل جائے گا۔ چابی ہاتھ لگ گئی ہے۔ تم تو فوراً اپنے گھر جاؤ اور سادہ لباس پہن کر میرے گھر آؤ۔ میں بھی گھر جا کے وردی اتارتا ہوں۔ ہم سادہ لباس میں اسٹیٹ ایجنسی جائیں گے۔''

''جی بہتر۔''

اس روز انسپکٹر سلیم نے بہت تیزی سے کارروائی۔ اس کے ساتھ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا جب کسی کیس کے سلسلے میں اچانک کوئی ایسا سراغ ملتا تھا کہ منزل چند قدم کے فاصلے پر نظر آنے لگتی تھی۔

گھر پہنچ کر اس نے وردی سے چھٹکارا پایا اور معمولی قمیص پتلون پہن لی۔ دس منٹ بعد اس کا ماتحت بھی آ گیا۔

''تم اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دو۔'' سلیم نے ماتحت سے کہا۔ ''ہم یہاں سے ٹیکسی میں چلیں گے۔ ابھی کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہمیں اسی علاقے میں ایک مکان کرائے پر درکار ہے۔ ابھی بس باتوں باتوں میں یہ اندازہ لگانا ہے کہ ہم مطلوبہ آدمیوں تک ہی پہنچے ہیں یا یہ محض اتفاق ہے کہ ان میں سے ایک کا نام سیپیا ہے اور وہ سیپیوں کا ہار پہنے رہتا ہے یا پہنے رہتا تھا۔ میرے خیال میں یہ اتفاق ہونا تو نہیں چاہیے لیکن میں نے یہی سیکھا ہے کہ سو فیصد یقین کر لینے سے پہلے کوئی فیصلہ کن قدم ہرگز نہیں اٹھانا چاہیے۔''

''جی، مناسب۔'' ماتحت نے کہا۔

وہ دونوں ٹیکسی کر کے روانہ ہوئے لیکن منزل مقصود پر پہنچ کر انہیں وقتی طور پر تو مایوسی ہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسٹیٹ ایجنسی میں بیٹھے ہوئے شخص نے مسکرا کر کہا تھا۔ ''میرا نام سہیل ہے جناب، غفار صاحب تو دو مہینے پہلے ہی اسٹیٹ ایجنسی مجھے بیچ چکے ہیں۔''

شدید مایوسی سے انسپکٹر سلیم نے اپنے ماتحت کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''آپ مجھ سے کہیے نا جناب۔'' اسٹیٹ ایجنسی والا بولا۔ ''یہ ایجنسی میں نے آپ ہی جیسے لوگوں کی خدمت کے لیے خریدی ہے۔''

''وہ بات نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔'' انسپکٹر سلیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہمیں نہ کوئی مکان خریدنا ہے، نہ کرائے پر لینا ہے۔ غفار صاحب سے میں ایک اور کام کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہوں۔''

''تو مل لیجیے۔ دفتر تو اُن کا اب بھی اسی علاقے میں ہے۔''

انسپکٹر سلیم چونکا۔

''لیکن اب وہ بلڈر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔'' اسٹیٹ ایجنسی والے نے بتایا۔ ''چھوٹے موٹے تعمیراتی کام کا ٹھیکا لیتے ہیں۔ یہاں سے بائیں جانب تین گلیاں

''یہ جاسوسی ناول مصنف نے واقعی نئے انداز میں لکھا ہے۔ اس میں قاتل آخر میں وہی نکلتا ہے جس پر آپ کو شروع سے شک ہوتا ہے۔''

''بولیں جی صاب! کیا خدمت کروں آپ کی؟'' پھر جواب کا انتظار کیے بغیر چپراسی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اوجلدی سے ٹھنڈی بوتلیں تو پکڑ لا تین۔''

''ارے اس تکلف کی ضرورت نہیں۔'' انسپکٹر سلیم نے کہا۔

''تکلف کیا جی! آپ ہمارے آفس میں آئے ہو تو...... کچھ تو......'' وہ ہنسا۔

''آپ اکیلے ہی ہوتے ہیں یہاں؟ میزیں تو دو اور ہیں؟'' انسپکٹر سلیم نے کہا۔

''جی وہ میرے دونوں بھائیوں کی ہیں۔ وہ ذرا ایک کام سے گئے ہوئے ہیں۔''

''میں آپ کو کیا کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں۔'' انسپکٹر سلیم نے کہا۔ ''ویسے میرا نام سلیم ہے۔ یہ میرے ساتھ میرے ایک دوست ہیں۔ ان کا نام بختیار ہے۔''

''مجھے غفار کہتے ہیں جی۔'' اس نے پھر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ''میرے دونوں بھائیوں کے نام اشفاق اور انوار ہیں۔''

انسپکٹر سلیم کو جو رپورٹ پولیس اسٹیشن سے ملی تھی، اس میں تیسرا نام سپیا تھا لیکن غفار، اشفاق بتا رہا تھا۔ اس سے یہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ ان تینوں بھائیوں کے ساتھ بیٹھنے والے مزدوروں نے اس کا نام سپیار کھ دیا ہوگا۔ اصل نام اشفاق تھا۔

چھوڑ کر مین روڈ ہے۔ آپ سیدھے ہاتھ کو مڑ جایئے گا۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ چلیں گے تو آپ کو ان کا دفتر مل جائے گا۔ بورڈ لگا ہوا ہے وہاں، سیپ بلڈرز۔''

انسپکٹر سلیم کی امید کی بجھتی ہوئی شمع پھر جل گئی۔

''بہت شکریہ آپ کا۔'' انسپکٹر سلیم نے اٹھتے ہوئے اسٹیٹ ایجنسی والے سے ہاتھ ملایا۔

وہاں سے نکل کر وہ ٹیکسی کی طرف بڑھے۔

''ایک خیال آیا ہے مجھے ابھی۔'' انسپکٹر سلیم نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اگر یہی تینوں ہمارے مطلوبہ آدمی ہیں تو یہ حیرت کی بات اس لیے ہے کہ ان سے کام لینے والے یا کام لینے والوں نے انہیں زندہ کیسے چھوڑ دیا۔''

''جی صاحب!'' ماتحت نے کہا۔ ''یہ بات سوچنے کی تو ہے۔''

وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

''ان کو سیپ بلڈرز'' تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس مختصر دورانیے میں سلیم نے سوچا، جن لوگوں نے باقر سلمان اور ان کی بیوی کو قتل کیا تھا، وہ پیشہ ور قاتل نہ ہونے کے سبب مزید قتل کرنے سے بچنا چاہتے ہوں گے۔ ان مزدوروں کو رازداری کے عوض وہ انہیں کوئی بڑی رقم دے سکتے تھے۔

جب وہ سیپ بلڈرز کے دفتر میں داخل ہوئے تو وہاں صرف دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک چپراسی معلوم ہوتا تھا۔

برابر برابر تین میزیں لگی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھا ہوا آدمی شلوار سوٹ اور واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ہو سکتی تھی۔ چہرے کے نقش و نگار بہت معمولی تھے۔ وہ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے خوش گوار انداز میں مسکرایا اور بولا۔

''آؤ جی صاحب! اِدھر تشریف رکھو جی۔'' اس کے بولنے کے انداز سے ظاہر ہو گیا کہ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھا۔

ہر میز کے سامنے دو دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ انسپکٹر سلیم اور اس کا ماتحت اس شخص کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ رہے تھے تو اس شخص نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

انسپکٹر سلیم نے مصافحہ کیا تو اسے محسوس ہوا کہ اس شخص کا ہاتھ کھردرا اور سخت تھا۔

'کسی مزدور کا ہاتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔' سلیم نے سوچا۔

''مجھے ایک سو بیس گز کے پلاٹ پر دو منزلہ مکان بنوانا ہے۔'' انسپکٹر سلیم نے کہا۔ ''اسی سلسلے میں ہم آئے ہیں آپ کے پاس۔ پلاٹ آپ ہی کے علاقے میں ہے۔''

''یہ سب باتیں تو لکھ پڑھ کر ہوں گی نا صاب! میں اور انوار تو بالکل پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ نہ پتا لکھ سکتے ہیں نہ نام۔'' غفار بے ڈھنگے انداز میں ہنسا۔ ''اشفاق بھی میری طرح ہے۔ بس انوار نے ساتویں جماعت تک پڑھا ہے۔ انگریزی کی لکھت پڑھت کے لیے ہمارا منیجر ہے۔ وہ آج بیمار ہو گیا۔ کل آجائے گا۔ آج تو بس تھوڑی سی بات ہو گی۔ وہ انوار لکھ لے گا۔ وہ دونوں اب آتے ہی ہوں گے۔ آپ اتنے ٹھنڈا پئیں۔ لیں جی، آ ہی گیا۔''

چپراسی کولڈ ڈرنک لیے اندر آرہا تھا۔ کولڈ ڈرنک کی دکان برابر ہی میں تھی۔

انسپکٹر سلیم اس دوران میں اچٹتی نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ بھی لیتا رہا تھا اور اسے ایک خاص چیز نظر بھی آگئی تھی۔ وہ ایک سیپ تھی جسے ایک میز پر پیپر ویٹ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے کچھ کاغذات دبے ہوئے تھے۔

انسپکٹر سلیم نے اسٹرا سے کولڈ ڈرنک کی چسکی لے کر کہا۔ ''کوئی حرج نہیں۔ ہم کچھ دیر انتظار کر سکتے ہیں آپ کے بھائی کا۔ ہم بہت خوش ہوئے ہیں کہ آپ کا دفتر اسی علاقے میں ہے جہاں ہم نے پلاٹ خریدا ہے۔''

''بات چیت ہو جائے گی نا جی، تو آپ اور خوش ہوں گے صاب!'' غفار نے کہا۔ ''ہم بہت کم منافع پر کام کرتے ہیں۔''

''یہ بہت اچھی بات ہے۔ آپ جلدی ترقی کریں گے۔'' انسپکٹر سلیم نے کہا، پھر اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ سیپ بڑی اچھی رکھی ہے۔ پیپر ویٹ بنا لیا ہے آپ نے اس کا۔''

''ہاں جی، وہ میرے سب سے چھوٹے بھائی کا شوق ہے۔''

''اشفاق نام بتایا ہے نا آپ نے اس کا؟''

''ہاں جی، اس کا بس چلے تو سارا گھر سیپیوں سے بھر لے۔ بہت دن ہو گئے، اس کا سیپیوں کا ہار کہیں کھو گیا۔ چھوٹی چھوٹی سیپیاں جمع کی تھیں اس نے اور ان کا ہار بنا لیا تھا۔ ہر وقت گلے میں ڈالے رہتا تھا۔ جانے کدھر...... وہ کہیں کھو گیا۔ پھر اسے اتنی چھوٹی چھوٹی سیپیاں ملیں نہیں۔ مل جاتیں تو وہ پھر ہار بنا لیتا اس کا۔ لیں جی، وہ دونوں آ ہی گئے۔''

انسپکٹر سلیم نے جن دو افراد کو اندر آتے دیکھا، ان کی عمروں میں بہت زیادہ فرق بالکل واضح تھا۔

''یہ آپ کے سگے بھائی ہیں؟'' انسپکٹر سلیم نے پوچھا۔

''ہاں جی، کیوں؟''

''عمروں میں بہت فرق ہے۔''

وہ دونوں قریب آکر رک گئے تھے۔

''ہاں جی، فرق تو ہے۔ انوار مجھ سے...... یہ......'' اس نے اشارے سے بتایا۔ ''یہ انوار مجھ سے دس سال چھوٹا ہے اور اشفاق اس سے بھی آٹھ سال چھوٹا ہے۔''

انسپکٹر سلیم اندازہ لگا چکا تھا کہ اشفاق کی عمر پچیس سے اٹھائیس سال کے درمیان ہو سکتی تھی۔

''کیا معاملہ ہے بھائی جی؟'' انوار نے اشفاق سے پوچھا۔

''ہمیں ایک مکان بنوانا ہے۔'' انسپکٹر سلیم بول پڑا۔

''ادھر...... آپ میری میز پر آجائیں۔'' انوار نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا۔ اشفاق اس کے برابر کی میز کی طرف بڑھا۔

''تم ان سے بات کرو۔'' انسپکٹر سلیم نے اپنے ماتحت سے کہا۔ ''میں ایک ضروری فون کر لوں۔ بھول ہی گیا تھا۔''

سلیم نے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور نمبر ملاتا ہوا دروازے تک چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ قدرت نے اسے بالکل صحیح جگہ پہنچا دیا تھا۔

فون پر بات کر کے وہ اپنے ماتحت کے برابر میں کرسی پر آبیٹھا۔ اس کا ماتحت بڑی ذہانت سے ایک پلاٹ پر مکان بنوانے کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ انوار ایک کاغذ پر کچھ لکھتا بھی جا رہا تھا۔ اشفاق اپنی کرسی پر خاموش بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

اب گفتگو میں انسپکٹر سلیم نے بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ وہ گفتگو کو طول دینا چاہتا تھا۔ اپنے اس مقصد میں اسے ناکامی بھی نہیں ہوئی۔

اس وقت تینوں بھائی چونک پڑے جب تین کانسٹیبل اور ایک اے ایس آئی تیزی سے اندر آئے تھے۔

''ان تینوں کے ہتھکڑیاں لگا دو۔'' انسپکٹر سلیم نے اے ایس آئی کو حکم دیا۔ اس نے موبائل فون پر ہدایت کر دی تھی کہ تین ہتھکڑیاں لائی جائیں۔

''ہم نے کیا کیا ہے جی؟'' غفار بوکھلا کر بولا۔

اشفاق اور انوار کے چہروں پر بھی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

انسپکٹر سلیم نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم تینوں نے دو لاشیں ایک دیوار میں چنی تھیں۔“

سپاہیوں نے بڑی پھرتی سے ان تینوں کو ہتھکڑیاں لگا دیں۔ انہوں نے مزاحمت بھی نہیں کی تھی۔ اُن کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔

☆☆☆

ثاقب دفتر میں تھا۔ پرویز نے چپراسی کے ذریعے اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھجوایا۔ ثاقب نے اسے فوراً ہی اندر بلوا لیا۔

”خیریت تو ہے پرویز صاحب!“ ثاقب چھوٹتے ہی بولا۔ ”اچانک یہاں آنے کی زحمت کر ڈالی آپ نے! کوئی خاص بات؟“ وہ علیک سلیک کرنا بھی بھول گیا تھا۔

”بس کچھ باتیں کرنی ہیں آپ سے۔“ پرویز نے خود ہی مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”اوہ، سوری۔“ ثاقب جلدی سے بولا۔ ”اچانک آپ آئے تو میں سب کچھ بھول ہی گیا تھا۔ تشریف رکھیے۔“

”شکریہ۔“ پرویز بیٹھ گیا۔

ثاقب نے چپراسی کو بلا کر پرویز سے پوچھا۔ ”کیا پینا پسند کریں گے؟“

”کچھ بھی پلا دیجیے۔“

ثاقب نے چپراسی سے چائے لانے کے لیے کہا اور پھر پرویز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”فرمایئے پرویز صاحب! کیا باتیں ہیں کہ آپ دفتر ہی آ گئے؟“

”بہت نازک معاملہ ہے ثاقب صاحب۔“ پرویز کا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔ ”میرے لیے تو صدمے کا سبب بھی بنا ہے۔“

”آپ کے لیے، صدمے کا سبب؟“ ثاقب کچھ پریشان نظر آیا۔

”جی ہاں۔“ پرویز نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ کو روحی نے بتا ہی دیا ہے لیکن آج میں خود بھی آپ کے سامنے اعتراف کروں گا کہ میں روحی سے محبت کرتا ہوں لیکن وہ چونکہ آپ کو چاہتی ہے اور آپ سے اس کی شادی بھی ہو چکی ہے، لہٰذا مجھے تو اب اپنی محبت کا جنازہ اپنے دل ہی میں دفن کر کے جینا ہے۔ میں مختلف قسم کا آدمی ہوں ثاقب صاحب! میں اب ساری زندگی صرف یہ دیکھنا چاہوں گا کہ روحی خوش رہے اور اس کی خوشی آپ ہی کے دم سے ہے۔“

ثاقب کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی تھی۔ وہ خاموشی سے پرویز کی طرف دیکھتا رہا۔

”اگر......“ پرویز کہتا رہا۔ ”کبھی آپ کی وجہ سے...... یا کسی بھی وجہ سے روحی کو کسی قسم کی تکلیف ہوئی، یا صدمہ ہوگا تو اس کا مجھ پر شدید اثر ہوگا۔“

”میری وجہ سے تو روحی کو صدمہ نہیں پہنچ سکتا پرویز صاحب۔“ ثاقب نے کہا۔ ”جتنی شدت سے روحی مجھے چاہتی ہے، اتنی ہی شدت سے میں بھی اسے چاہتا ہوں۔“

”لیکن آپ کی کوئی غلطی اس کے صدمے کا سبب بن سکتی ہے۔“

”میں ایسی غلطی کروں گا ہی کیوں؟“

”وہ تو آپ کر ہی چکے ہیں ثاقب صاحب!“

”جی؟“ ثاقب کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔ ”پرویز کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

”جی ہاں۔“ پرویز نے کہا اور اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر پرویز کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ”ایک نظر دیکھ لیجیے کہ اس لفافے میں کیا ہے۔ میں کیونکہ ایک اہم سرکاری ادارے میں کام کرتا ہوں اس لیے یہ حاصل کرنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔“

ثاقب نے لفافے میں سے جو کچھ نکال کر دیکھا، وہ ایسا ہی تھا کہ اس کا چہرہ فق پڑ گیا۔

”یہ فوٹو اسٹیٹ ہیں۔“ پرویز بولا۔ ”ان چیکس کی جو آپ شیبا کو دیتے رہے ہیں۔ پہلا چیک ایک نہایت کثیر رقم کا ہے جو آپ نے روحی سے شادی کرنے کے بعد شیبا کو دیا تھا۔ باقی چیکس وہ ہیں جو آپ شیبا کو ہر ماہ دیتے رہے ہیں۔“

اس وقت ثاقب کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کانپنے لگے تھے جن میں وہ فوٹو اسٹیٹ لیے ہوئے تھا۔

”کچھ اندازہ تو میں لگا چکا ہوں۔“ پرویز بولا۔ ”لیکن میں چاہوں گا کہ سب کچھ آپ خود بیان کریں۔“

اس وقت چپراسی چائے اور اس کے ساتھ کچھ لوازمات لیے اندر آیا۔

”ٹرے یہاں میز پر رکھ دو۔“ ثاقب نے اس سے کہا۔ ”اور تم جاؤ۔ چائے میں خود بنا لوں گا۔ اور ہاں! اگر کوئی مجھ سے ملنے آئے تو کہہ دینا کہ میں نہیں ہوں اور آپریٹر سے بھی کہہ دو کہ اگر میرے لیے کوئی فون کال آئے تو

وہ دفتر میں میری عدم موجودگی ظاہر کرے۔''
چپراسی نے ادب سے سرہلایا اور چلا گیا۔
ثاقب، پرویز سے نظریں چراتے ہوئے چائے بنانے لگا۔ وہ یقیناً اس وقت سوچنے کی مہلت چاہ رہا ہوگا۔
چائے بنا کر ثاقب نے ایک پیالی پرویز کے سامنے رکھی اور اس کے ساتھ ہی اسنیکس کی پلیٹ بھی۔
پرویز جو اس دوران میں خاموش اور سنجیدہ رہا تھا، دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں منتظر ہوں ثاقب صاحب۔''
''مجھ سے کچھ غلطی ہوئی تھی۔'' ثاقب نے دبے دبے سے لہجے میں کہا۔ ''اسی کی وجہ سے شیبا مجھے بلیک میل کررہی ہے۔''
''غلطی کیا ہوئی تھی؟'' پرویز نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''اگر آپ وہ نہ پوچھیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔''
''آپ مجھ پر احسان کریں کہ سب کچھ خود بیان کر دیں ورنہ......'' پرویز نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کا لہجہ خاصا سخت تھا۔
''کیا آپ کو معلوم ہو چکا ہے؟'' ثاقب متذبذب تھا۔
''شبہ ہے مجھے ایک۔'' پرویز نے کہا۔ ''اور نوے فیصد اس شبے پر یقین بھی ہے۔ سو فیصد یقین کرنے کے لیے مجھے آپ کا اور ایک بچے کا ڈی این اے کروانا ہوگا۔''
''بچے'' کا لفظ سنتے ہی ثاقب کا منہ اتر گیا۔
پرویز بولا۔ ''شیبا کی ملازمہ جس بچے کی پرورش کررہی ہے، وہ آپ کا اور شیبا ہی کا ہے نا؟''
ثاقب نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ٹشو نکالا اور اپنی پیشانی پر چمک آنے والا پسینا خشک کرنے لگا۔
پرویز بولا۔ ''میں شیبا سے بھی پوچھ گچھ کرسکتا تھا۔ وہ تو بہت آسانی سے سب کچھ اگل دیتی لیکن اس طرح اندیشہ ہے کہ بات مشہور بھی ہوجائے گی جس سے روحی کو صدمہ پہنچے گا جو میں نہیں چاہتا۔ آپ کو اس معاملے میں مجھ سے تعاون کرنا چاہیے۔''
''بات میرے اور آپ کے درمیان ہی رہے گی؟'' ثاقب نے اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔
گفتگو ایسی چھڑ گئی تھی کہ ان دونوں ہی کو چائے کا خیال نہیں آیا اور وہ ٹھنڈی ہوتی رہی۔
''ہاں۔'' پرویز نے ثاقب کو جواب دیا۔ ''بات کسی تیسرے تک نہیں جائے گی۔ اگر آپ نے سب کچھ بیان کرنے کے بعد میری ایک شرط مان لی۔
''شرط؟'' ثاقب نے پوچھا۔ ''وہ شرط کیا ہے؟''
''وہ میں بعد میں بتاؤں گا لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس شرط کو مان لینے سے فائدہ آپ ہی کو ہوگا۔ پھر شیبا آپ سے ہر ماہ وہ بڑی رقم وصول نہیں کرسکے گی جو آپ اسے دیتے رہے ہیں۔''
''یہ کیسے ہوگا؟'' ثاقب کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔
''آپ سب کچھ بیان کرنے کے بجائے وقت ضائع کررہے ہیں۔'' اس مرتبہ پرویز کا لہجہ بہت کھردرا ہوگیا تھا۔
ثاقب نظریں جھکا کر میز پر رکھی ایک فائل کی طرف دیکھنے لگا لیکن صاف ظاہر ہورہا تھا کہ فائل پر اس کی توجہ نہیں تھی۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا لیکن بولنے میں اس نے زیادہ دیر نہیں کی۔
''جوانی میں قدم کبھی کبھی بہک بھی جاتے ہیں۔'' اس نے دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا۔ ''میں شادی سے پہلے کبھی کبھی اور بہت چوری چھپے شراب پی لیا کرتا تھا جس کا علم روحی کو بھی تھا۔ اس نے مجھ سے بس اتنا وعدہ لیا تھا کہ میں گھر سے باہر کبھی نہیں پیوں گا لیکن ہوا یہ کہ شادی کے بعد اس کے سامنے پیتے ہوئے مجھے خجالت کا احساس ہوتا تھا اس لیے میں نے پینا چھوڑ دی۔ عرصہ ہوگیا کہ میں نے شراب کا ایک قطرہ بھی نہیں چکھا۔''
''اصل معاملے کی طرف آیئے ثاقب صاحب!'' اس مرتبہ پرویز کا لہجہ نرم تھا۔
ثاقب نے بڑی بے بسی کی نظروں سے پرویز کی طرف دیکھا، پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ''پہلے تو میں آپ کو یہ بتادوں کہ شیبا میری سوتیلی بہن ہے۔''
''اس کا علم ہے مجھے۔''
''اوہ!''
''آپ وہ سب کچھ بیان کیجیے جسے بیان کرنے میں آپ ہچکچاہٹ محسوس کررہے ہیں۔''
''میں آپ کو اصل واقعہ ہی بتاؤں گا۔'' ثاقب نے بولنا شروع کیا۔ ''وہ میری سوتیلی بہن سہی دوسروں کی طرح میں بھی چاہتا تھا کہ وہ ماڈل گرل کا پیشہ ترک کردے۔ اسی سلسلے میں ایک مرتبہ اس کے گھر گیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں اور روحی انگلینڈ نہیں گئے تھے مگر کچھ دن میں جانے والے تھے۔ جب میں اسے سمجھانے گیا تھا تو پہلے اسے فون پر بتا چکا تھا۔ جب میں اس کے گھر پہنچا تو وہ پی

رہی تھی۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے بھی وہ نہ صرف پیتی رہی بلکہ اس نے ایک پیگ مجھے بھی دیا۔ میرے سمجھانے پر وہ جرح کرنے لگی۔ اس طرح وہ زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی تاکہ میں اس دوران میں زیادہ شراب پی لوں۔ کیونکہ میں بھی کبھی پیتا تھا اس لیے دو ہی پیگ میں اچھا خاصا نشہ ہو گیا، لیکن اس نے میرے لیے تیسرا پیگ بھی بنا دیا۔ اس نے کہا کہ وہ میری بات اسی شرط پر مان سکتی ہے کہ میں تیسرا بھی پیوں۔ یہ بڑی بے تکی سی شرط تھی لیکن نشہ ہو جانے کی وجہ سے میں نے اس کی یہ شرط بھی مان لی۔ اس نے یقیناً پہلے سے منصوبہ بندی کرلی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسی لیے وہ ایک بے ہودہ سے لباس میں تھی۔ تیسرے پیگ کے دوران میرے ساتھ وہ بھی پیتی رہی اور میرے پہلو میں آبیٹھی۔ اس نے ایسی باتیں شروع کردیں جیسے مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اس نے اپنا ایک بازو بھی میری گردن میں حمائل کر دیا اور......'' ثاقب چپ ہو کر اپنے چہرے سے پسینا خشک کرنے لگا۔

''آپ یہ سب کچھ بیان کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کررہے ہیں۔'' پرویز بولا۔ ''اس لیے میں اندازے سے بات مکمل کیے دیتا ہوں۔''

ثاقب کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

پرویز ذرا سا رک کر بولا۔ ''شیبا کے نیم عریاں جسم کی قربت، اس کا انداز خود سپردگی اور آپ کے نشے کے سبب وہ غلطی ہوگئی جس کے نتیجے میں آج آپ ایک ناجائز بچے کے باپ ہیں۔''

''جی۔'' ثاقب کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ پرویز بمشکل سن سکا۔

''اب اس کے بعد کی باتیں بتایئے۔'' پرویز نے کہا۔

''میں کئی گھنٹے شیبا کے گھر میں مدہوش پڑا رہا، پھر جب ہوش وحواس درست ہوئے تو میں اسے برا بھلا کہہ کر اپنے گھر چلا آیا۔ اس کے بعد میں انگلینڈ روانگی تک اس سے نہیں ملا اور نہ اس نے مجھ سے رابطہ کیا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ وہ ملاقات گل کھلا چکی ہے۔''

''یعنی اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ حاملہ ہو چکی ہے۔''

''جی۔'' ثاقب کی نظریں جھکی ہی رہیں۔ ''یہ میری بدقسمتی ہے ورنہ ضروری نہیں ہوتا کہ مرد عورت کی پہلی ہی ملاقات میں یہ گل کھل جائے۔ روحی سے میری شادی کو کئی مہینے گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک اس کے آثار نہیں ہیں کہ وہ ماں بننے والی ہو۔''

''بلیک میلنگ کا آغاز آپ کی شادی کے بعد ہوا؟''

''جی ہاں۔'' ثاقب نے پرویز کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔ ''اگرچہ میں تعلیم کے دوران میں ہی ایک مرتبہ انگلینڈ سے آیا بھی تھا جب میری والدہ کا انتقال ہوا تھا لیکن چند روز کے لیے آیا تھا۔ شیبا کو اس کا علم نہیں ہوا ہوگا۔ اس نے مجھ سے رابطہ اس وقت کیا جب روحی سے میری شادی ہو چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مجھے اپنے جال میں اس لیے پھنسایا تھا کہ مجھے بلیک میل کر سکے۔''

''حاملہ ہونے سے پہلے ہی اُسے علم ہو گیا تھا کہ وہ ماں بن جائے گی؟''

''نہیں یہ تو ممکن ہی نہیں۔'' ثاقب نے جواب دیا۔ ''اس نے مجھے بلیک میل کرنے کے لیے دوسرا منصوبہ بنایا تھا۔ اپنے گھر کے جس حصے میں اس نے مجھ سے ملاقات کی تھی، وہاں.... ایک خفیہ وڈیو کیمرا پہلے ہی لگا دیا تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے جب تیسرا پیگ شروع کیا تھا، اس وقت وہ ذرا دیر کے لیے میرے پاس سے اٹھی تھی۔ غالباً اس وقت اس نے کیمرا اسٹارٹ کیا ہوگا۔ وہ سمجھ گئی ہوگی کہ وہ وقت بالکل قریب آگیا ہے جب اس کا منصوبہ تکمیل کا مرحلہ طے کرے گا۔'' پھر اس نے چونک کر کہا۔ ''اوہ! چائے تو ٹھنڈی ہوگئی۔''

''چھوڑیے چائے وائے کو۔'' پرویز نے کہا۔ ''آپ اپنا بیان مکمل کریں۔''

ثاقب نے چند لمحے خاموش رہ کر پھر بولنا شروع کیا۔ ''اس نے مجھ سے فون پر رابطہ کیا تھا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ جب میں نے ملنے سے انکار کیا تو اس نے مجھے اس وڈیو کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ وہ میرے بچے کی ماں بن چکی ہے۔ یہ سن کر تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں اس سے ملنے گیا اور اس نے مجھے وڈیو دکھائی۔ مجھے اس بچے سے بھی ملوایا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر میں اس بچے کا باپ ہونے سے انکار کروں گا تو وہ بات عدالت تک لے جائے گی۔ میرے اور اس بچے کے ڈی این اے ٹیسٹ سے ثابت ہو جائے گا کہ میں ہی اس بچے کا باپ ہوں۔ آخر میں اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس بات کو ہمیشہ راز میں رکھ سکتی ہے اگر میں اسے .... اتنی کثیر رقم دے دوں جس سے وہ ایک اچھا بنگلا اور ایک اعلیٰ کار خرید سکے۔ اس کے علاوہ بچے کی پرورش وغیرہ کے لیے ماہانہ ایک

رقم دیتا رہوں۔ آپ نے یہ چیکس دیکھ لیے ہوں گے کہ میں اسے کیا دیتا رہا ہوں۔"

"کیا اس نے بلیک میل کرنے کے بجائے آپ سے شادی نہیں کرنا چاہی؟"

"نہیں، وہ شادی کے بندھن میں بندھنا ہی نہیں چاہتی۔ غالباً وہ اپنے آزادانہ رجحان پر کوئی بندش برداشت نہیں کرسکتی۔ اگر اس نے مجھ پر شادی کے لیے دباؤ ڈالا ہوتا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کیا کرتا۔ مجھے روحی سے اتنی ہی محبت ہے کہ میں اسے کوئی صدمہ نہیں پہنچا سکتا۔"

"اس نے بچے کو اپنی ملازمہ کے سپرد کیوں کردیا؟"

"اس لیے کہ پھر تو لوگ بچے کے باپ کا نام بھی پوچھتے۔ دوسرے وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ اس کی پیشہ ورانہ زندگی متاثر ہو۔ یہ ماڈل گرلز یا اداکارائیں وغیرہ شادی کر لیتی ہیں تو ان کی مقبولیت میں کمی تو آتی ہے۔" اب ثاقب دھیرے دھیرے پرویز سے آنکھیں ملا کر بھی بات کررہا تھا۔ اس نے مزید کہا۔ "جب اس کا پیٹ بڑھنے لگا تھا تو وہ اپنی ایک ملازمہ کو لے کر پاکستان سے چلی گئی تھی اور بچے کی پیدائش کے ایک ماہ بعد واپس لوٹی تھی۔ بچہ اس نے اپنی ملازمہ کو دے دیا تھا۔ وہ ملازمہ بانجھ ہے۔ اس کا شوہر بھی شیبا کا ملازم ہے۔ ان دونوں ہی نے بچے کو خوشی سے قبول کر لیا تھا۔ شیبا انہیں ماہانہ اچھی رقم بھی دیتی ہے اور بچے کی تمام ضروریات کا بھی خیال رکھتی ہے۔ بچے کو اس نے ایک اچھے اسکول میں بھی داخل کروا دیا ہے اور اسے خود سے مانوس بھی کرلیا ہے۔"

"جب بچے کا شیبا سے مانوس ہونا میرے علم میں آیا تھا، تبھی یہ شبہ میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ آپ شیبا سے پہلے ہی شادی کرچکے تھے اور روحی آپ کی دوسری بیوی ہے... آپ نے خاصی بڑی رقم خرچ کرکے اس کے لیے بنگلا اور کار خریدی ہے۔ اس کے بعد ہی میں نے آپ کے بارے میں چھان بین کی تھی۔ خاص طور سے آپ کا بینک اکاؤنٹ۔"

"میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔ مجھے امید کرنا چاہیے کہ آپ کے وعدے کے مطابق ان باتوں کا علم کسی تیسرے شخص کو نہیں ہوگا۔"

"میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میری ایک شرط بھی ہوگی۔"

ثاقب نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا، پھر کہا۔ "اب جبکہ میں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں، آپ مجھے کیا مشورہ دے سکتے ہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

> اسپتال میں ایک مریض نے اپنی بلا کی دل کش نرس کے جانے کے بعد ڈاکٹر سے کہا۔ "بہت ہی اچھی نرس ہے۔ اس کے ہاتھ کے ایک لمس سے ہی میرا بخار کافور ہوگیا۔"
> ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "ہمیں پتا ہے برآمدے کے آخر تک اس کے تھپڑ کی صاف آواز آئی تھی۔"

"شیبا سے نکاح۔"

"جی!" ثاقب شدت سے چونک پڑا۔

"ہاں۔" پرویز نے کہا۔ "اب میں اس بچے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس نے کوئی قصور نہیں کیا۔ اس معصوم کو یہ سزا کیوں ملے کہ وہ ساری زندگی اپنے حقیقی باپ کے نام سے محروم رہے۔"

"لیکن......"

"پوری بات سنیے!" پرویز نے ثاقب کو خاموش کر دیا۔ "نکاح کرنے کے بعد آپ اسے طلاق دیں گے۔ اس طرح اس معصوم بچے کو اپنے باپ کا نام بھی مل جائے گا۔ شیبا کو ایک بڑی رقم دے کر بیرون ملک سیٹل کروایا جاسکتا ہے۔ بچے کو بھی بیرون ملک کسی ہوسٹل میں داخل کروایا جاسکتا ہے جہاں اس کے باپ کا نام ثاقب ہی لکھوایا جائے گا۔ شیبا بھی اسی شہر میں رہے گی اور بچے کا خیال رکھے گی۔"

"ممکن ہے وہ اس کے لیے تیار نہ ہو۔"

"اس کے فرشتے بھی تیار ہوں گے۔ میری یہ دھمکی کافی ہوگی کہ میں اسے بلیک میلنگ کے جرم میں گرفتار کروا سکتا ہوں۔ وہ دس بارہ سال کے لیے جیل جاسکتی ہے۔"

"لیکن جب بچہ جوان ہوگا؟ یہ راز اس وقت بھی کھل سکتا ہے؟"

پرویز نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بیس پچیس سال تو گزر ہی جائیں گے، اس وقت جو حالات ہوں گے، اس کے مطابق کچھ سوچنا ہوگا۔ فی الحال تو روحی کو اس صدمے سے بچایا جاسکتا ہے۔ اگر شیبا یہاں رہی تو یہ راز کسی وقت بھی روحی پر آشکارا ہوسکتا ہے۔"

ثاقب خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔

"آپ کو منظور ہے یا نہیں؟" پرویز نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"منظور کیوں نہیں ہوگا پرویز صاحب۔" ثاقب نے کہا۔ "اس طرح تو میں ایک عذاب سے چھٹکارا پا جاؤں گا۔"

"ٹھیک۔" پرویز نے کہا۔ "اس منصوبے پر چند دن

بعد عمل کیا جائے گا کیونکہ فی الحال تو شاید آپ کو ایک صدمے سے دو چار ہونا پڑے۔"

"صدمہ؟" ثاقب چونکا۔

"جی۔" پرویز نے کہا۔ "میں جب یہاں آیا ہوں، اس سے ذرا دیر پہلے تین افراد کو گرفتار کیا جا چکا تھا۔ انہوں نے وہ دیوار بنائی تھی جس میں باقر سلمان صاحب اور ان کی اہلیہ کی لاشیں چھپائی گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے اس جرم کا اعتراف کرلیا ہے لیکن وہ قاتل نہیں ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق ایک آدمی انہیں کام کے لیے باقر سلمان صاحب کے بنگلے میں لے گیا تھا۔ اندر داخل ہونے کے لیے پچھلا دروازہ استعمال کیا گیا تھا۔ بنگلے میں پہلے سے موجود کسی شخص نے دروازہ کھولا تھا۔ بنگلے کے اندر پہنچنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ ایک سنگین معاملے میں پھنس گئے ہیں۔ وہاں باقر سلمان صاحب اور ان کی اہلیہ کی لاشیں پڑی تھیں۔ تین زندہ افراد بھی تھے۔ ایک نوجوان تھا، ایک ادھیڑ عمر عورت اور ایک ادھیڑ عمر مرد۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں ثاقب صاحب کہ وہ کون تھے۔"

ثاقب جو پلکیں جھپکائے بغیر پرویز کی طرف دیکھ رہا تھا، نفی میں سر ہلانے لگا۔

"آپ نے یہ بات کیوں چھپائی تھی ثاقب صاحب کہ آپ کے والد طاہر سلمان نے بیس سال پہلے دوسری شادی کرلی تھی۔"

"آ...... آ...... آپ کو...... معلوم ہوگیا؟" ثاقب نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، انسپکٹر سلیم نے معلوم کرلیا تھا۔ آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"دراصل یہ بات روحی سے چھپائی تھی۔" ثاقب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ ایسے لوگوں کو سخت ناپسند کرتی ہے، بلکہ ان سے نفرت کرتی ہے جو دوسری شادی کرتے ہیں۔ وہ اس وقت چھوٹی سی بچی تھی لیکن والدین کو اس کے مزاج کا اندازہ ہوگیا تھا۔ میری عمر بھی اس وقت کم ہی تھی۔ مجھے کافی عرصے بعد اپنی مرحومہ والدہ سے اس کا علم ہوا تھا۔"

"باقر سلمان صاحب اور ان کی اہلیہ بھی اس شادی سے واقف تھے۔ تمہاری وہ سوتیلی والدہ باقر سلمان صاحب کے گھر بھی آیا جایا کرتی تھیں۔"

"جی ہاں۔ بس روحی کو آج تک اس کا علم نہیں۔"

پرویز بولا۔ "انسپکٹر سلیم کے ماتحتوں نے ان سب کی تصویریں بنائی تھیں۔ اس کے خیال کے مطابق ان میں سے بھی کوئی قاتل ہو سکتا ہے۔ یہاں تک تمہاری اور شیبا کی تصویریں بھی لے لی گئی تھیں لیکن اس طرح کہ تم دونوں کو اس کا شبہ بھی نہیں ہو سکا۔ وہ ساری تصویریں ان تینوں مزدوروں کو دکھائی گئیں اور انہوں نے چار افراد کو پہچان لیا......"

"کیا...... کیا ڈیڈی؟" ثاقب تھوڑا سا ہکلا گیا۔

"ہاں۔" پرویز نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اور تمہاری سوتیلی والدہ بھی اور ان کا بیٹا ایاز بھی! ایاز کو بھی جانتے تو ہوں گے آپ؟"

ثاقب کا چہرہ فق پڑ گیا۔ اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پرویز نے بتایا۔ "شاید تمہیں یہ بھی بہت عجیب سا لگے کہ ان مزدوروں کو بنگلے میں لے جانے والا شیبا کا بھائی جنید تھا۔"

حیرت سے ثاقب کا منہ تھوڑا سا کھلا اور پھر بند ہو گیا۔

"مجھے فی الحال اس سے زیادہ نہیں معلوم۔" پرویز نے کہا۔ "میں جب یہاں آیا ہوں، اس سے بیس منٹ پہلے سلیم نے مجھے ان سب کے بارے میں بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ آج ہی ان چاروں کو حراست میں لے لے گا۔ ممکن ہے وہ انہیں اب تک حراست میں لے بھی چکا ہو۔"

☆☆☆

پرویز کا خیال بڑی حد تک درست تھا۔ کیونکہ انسپکٹر سلیم ان سب کی نگرانی کروا رہا تھا اس لیے اسے علم تھا کہ ان میں سے کون اس وقت کہاں تھا۔ اس وقت تک طاہر سلمان، ان کی بیوی پروین اور ان کا بیٹا پولیس ہیڈ کوارٹر میں تھے۔ جو ٹیم انسپکٹر سلیم کی ہدایت کے مطابق جنید کو حراست میں لینے گئی تھی، وہ ابھی پولیس ہیڈ کوارٹر نہیں پہنچی تھی لیکن پہنچنے والی تھی۔ انسپکٹر سلیم کو فون پر بتایا جا چکا تھا کہ جنید کو حراست میں لے کر پولیس ہیڈ کوارٹر لایا جا رہا تھا۔

"آخر معاملہ کیا ہے انسپکٹر؟" طاہر سلمان نے احتجاج کرنے والے انداز میں کہا۔ "کیا پولیس اب اتنی بااختیار ہو چکی ہے کہ بغیر کسی وجہ کے باعزت شہریوں کو زبردستی پولیس ہیڈ کوارٹر......"

"بلاوجہ نہیں لایا گیا ہے آپ لوگوں کو۔" انسپکٹر سلیم نے پُراطمینان لہجے میں جواب دیا۔ "ان تینوں مزدوروں کو گرفتار کیا جا چکا ہے جنہوں نے باقر سلمان اور ان کی اہلیہ کی

لاشیں دیوار میں چنی تھیں۔ وہ آپ تینوں کی تصویریں تو پہچان چکے ہیں۔"

یہ جواب سن کر ان تینوں کو ایسا ہی محسوس ہوا ہوگا جیسے ان پر بم پھٹ گیا ہو۔ تینوں ہی کے چہرے فق پڑ گئے۔

انسپکٹر سلیم کہہ رہا تھا۔ "انہوں نے آپ لوگوں کی تصویریں تو شناخت کرلی ہیں، پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ تینوں کو دیکھ بھی لیں۔ میں ہدایت کرچکا ہوں کہ ان تینوں کو یہاں لایا جائے۔ لیجیے، وہ آ بھی گئے۔"

غفار، انوار اور اشفاق اس عالم میں اندر آئے تھے کہ انہیں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ انہیں دو سپاہی لے کر آئے تھے۔

"تصویریں تو تم تینوں دیکھ چکے ہو۔" انسپکٹر سلیم نے ان سے کہا۔ "اب ان لوگوں کو بھی دیکھ لو۔"

"جی صاحب!" غفار نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔ "یہی ہیں۔"

پروین طاہر چکرا کر، کرسی سے فرش پر گری۔

"کسی لیڈی کانسٹیبل کو بلاؤ۔" انسپکٹر سلیم نے جلدی سے کہا۔ اس نے اپنے خصوصی ماتحت کو مخاطب کیا۔

طاہر سلمان کرسی سے اٹھ کر اپنی بیوی پر جھکا۔

"پروین، پروین!" اس نے آوازیں دیں۔

"یہ شاید دہشت سے بے ہوش ہوگئی ہیں۔" انسپکٹر سلیم بولا۔

اس وقت ایاز اس طرح کرسی پر بیٹھا رہ گیا تھا جیسے پتھر کا ہوگیا ہو۔ آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھیں۔

"میری بیوی بے ہوش ہوگئی ہے۔" طاہر سلمان نے انسپکٹر سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ نے کیا ڈراما رچایا ہے۔ ہم لوگوں کو پھانسنے کا؟"

"ڈراما!" انسپکٹر سلیم نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ "آپ کی بیگم صاحبہ خوامخواہ بے ہوش ہوگئیں؟"

"عورت تو دہشت زدہ ہو ہی جائے گی آپ کی باتوں سے۔" طاہر سلمان نے خود کو ابتدائی ذہنی جھٹکے سے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ میرے بھائی کے قتل میں ہم تینوں کو پھنسانا چاہ رہے ہیں؟"

انسپکٹر سلیم نے منہ بنا کر کچھ کہنا چاہا تھا کہ دو لیڈی کانسٹیبل دوڑتی ہوئی اندر آئیں۔

"ان خاتون کو کسی خالی کمرے میں لے جاؤ۔" انسپکٹر سلیم نے پروین طاہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بے ہوش ہوگئی ہیں۔ ان کے منہ پر پانی چھڑکو۔ آجائے گا ہوش۔ یہ خیال رکھنا کہ یہ حراست میں ہیں۔ ہوش میں آتے ہی شاید بھاگنے کی کوشش کریں۔"

دونوں لیڈی کانسٹیبل پروین طاہر کو فرش سے اٹھانے لگیں۔

"میں بھی جاؤں گا اپنی بیوی کے ساتھ۔" طاہر سلمان بولا۔

"آپ ان کے ساتھ نہیں جائیں گے۔" انسپکٹر سلیم نے سخت لہجے میں کہا اور پھر دو کانسٹیبلوں سے بولا۔ "انہیں یہاں سے لے جاؤ۔ فی الحال کسی بھی خالی کمرے میں بند کردو۔" پھر اس نے طاہر سلمان سے کہا۔ "چلے جایئے ان کے ساتھ ورنہ یہ زبردستی بھی کرسکتے ہیں۔"

"یہ سراسر زیادتی ہے۔" طاہر سلمان چیخا۔ "آپ کو بھگتنا پڑے گا۔"

"بھگت لوں گا۔" انسپکٹر سلیم نے اطمینان سے کہا۔

دونوں کانسٹیبل طاہر سلمان کو لے جانے لگے تو ایاز بھی کھڑا ہوا۔

"تم بیٹھو یہیں۔" انسپکٹر سلیم نے ڈپٹ کر اس سے کہا۔

ایاز کرسی پر اس طرح بیٹھا جیسے گر پڑا ہو۔

"کسی بات کا جواب نہ دینا تم۔" طاہر سلمان نے کانسٹیبلوں کے ساتھ جاتے جاتے پلٹ کر ایاز سے کہا۔ پھر سلیم سے بولا۔ "ہم اپنے وکیل کے سامنے ہی کسی بات کا جواب دیں گے۔"

"آپ خود کو یورپ، امریکا میں نہ سمجھیں۔" انسپکٹر سلیم نے کہا۔ "آپ جس وکیل کو کہیں گے، بلوا لیا جائے گا لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب میں مناسب سمجھوں گا۔"

طاہر سلمان نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن دونوں کانسٹیبلوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹا اور کمرے سے لے گئے۔

غفار، اشفاق اور انوار دم بخود سے کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

"اب تم کو میرے سوالوں کا جواب دینا ہے۔" انسپکٹر سلیم نے ایاز کو گھورتے ہوئے کہا۔

اسی وقت دروازے کی طرف سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ انسپکٹر سلیم نے اس طرف دیکھا۔ جنید کو اندر لایا جارہا تھا۔ وہ وہاں ایاز کو دیکھ کر چونکا، پھر اشفاق، انوار اور غفار کو دیکھ کر اس کا منہ کھلا اور کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کیوں؟" انسپکٹر سلیم نے غفار، اشتیاق اور انوار کی طرف دیکھا۔

"جی صاب!" اس مرتبہ بھی غفار نے جواب دیا تھا۔ "یہ لے گئے تھے ہم تینوں کو اس بنگلے میں۔"

جو پولیس والے جنید کو لے کر آئے تھے، ان کی طرف دیکھتے ہوئے سلیم نے کہا۔ "اسے لے جاؤ۔ کسی خالی کمرے میں بند کردو۔" پھر اس نے ان کانسٹیبلوں کی طرف دیکھا جو غفار اور اس کے بھائیوں کو لائے تھے۔ "ان تینوں کو بھی لے جاؤ۔" اس نے کہا۔ "وہیں بند کردو۔"

کانسٹیبلوں سے پہلے وہ تینوں خود ہی دروازے کی طرف مڑ گئے۔ جنید کو بھی لے جایا جاچکا تھا۔

اب پھر انسپکٹر سلیم، ایاز کی طرف متوجہ ہوا لیکن وہ کوئی سوال نہیں کر پایا تھا کہ ایک لیڈی کانسٹیبل اندر آئی۔

"انہیں ہوش آگیا ہے سر۔" اس نے پروین طاہر کے بارے میں بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ اسے وہیں روکے رکھو اور اس کے قریب رہو۔"

لیڈی کانسٹیبل سر ہلا کر چلی گئی۔

انسپکٹر سلیم نے فیصلہ کیا تھا کہ ان سب سے الگ الگ پوچھ گچھ کرے گا۔ اب وہ پھر ایاز کی طرف متوجہ ہوا جو دم سادھے بیٹھا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

انسپکٹر سلیم کا خیال تھا کہ وہ ان سبھی سے بہ آسانی سب کچھ اگلوا لے گا۔ کیونکہ وہ عادی جرائم پیشہ نہیں تھے، البتہ جنید کے ساتھ کچھ سختی کرنا پڑ سکتی تھی۔

"دیکھو لڑکے!" انسپکٹر سلیم نے ایاز سے کہا۔ "تم ابھی کم عمر ہو۔ عدالت سے تمہیں کم سزا ملے گی اور اگر تم نے مجھے سختی کرنے پر مجبور نہ کیا اور میرے سوالوں کا جواب دے دیا تو میں تمہیں مزید رعایت دلوانے کی کوشش کروں گا۔"

ایاز اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"جن مزدوروں نے لاشیں دیوار میں چنی تھیں، انہوں نے بتایا ہے کہ تم نے ان کی اس وقت کی وڈیو بنائی تھی جب وہ یہ کام کررہے تھے۔ وہ وڈیو کہاں ہے؟"

"گھر......" ایاز نے تھوک نگلا۔ "گھر پر ہے۔"

"گڈ!" انسپکٹر سلیم نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ "میں ضرور تمہیں عدالت سے زیادہ سے زیادہ رعایت دلوانے کی کوشش کروں گا۔"

ایاز کچھ نہیں بولا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

☆☆☆

اسی رات گیارہ بجے کے قریب پرویز نے اپنے گھر پر انسپکٹر سلیم کی کال ریسیو کی۔

"میں بڑا سکون محسوس کررہا ہوں سر۔" سلیم کہہ رہا تھا۔ "آج ہی آج سارا کھیل ختم ہوگیا ہے۔ سب اس وقت حوالات میں ہیں۔"

"تم سے یہ سن کر مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی۔" پرویز نے کہا۔ "جب تم نے مجھے ان تینوں کی گرفتاری اور ان کے بیان کے بارے میں اطلاع دی تھی، میں نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ آج ہی سب کام مکمل ہوجائے گا۔"

"میں کل صبح آپ کے دفتر آکر تفصیلات سے آگاہ کردوں گا۔"

"سنو سلیم! مجھے اندازہ ہے کہ آج کی مصروفیت نے تمہیں بہت زیادہ تھکا دیا ہوگا لیکن میں تم سے درخواست کروں گا کہ......"

"سر! پلیز۔" دوسری طرف سے سلیم بول پڑا۔ "آج آپ مجھے پھر شرمندہ کررہے ہیں۔ یہ لفظ درخواست قطعی مناسب نہیں ہے۔"

پرویز خفیف سا مسکرایا۔ "یہ میری عادت ہے سلیم! جب میں تمہارے ہی محکمے میں تھا تو تم نے دیکھا ہوگا کہ میں اپنے ماتحتوں سے بھی اسی طرح بات کیا کرتا تھا۔ تم تو اب میرے ماتحت بھی نہیں ہو۔"

"میں آپ کا خادم ہوں سر۔"

"اس کے جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ تم بڑے ظرف کے مالک ہو۔ خیر، میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر تم اپنی تھکن کے باوجود ہمت کرو اور ابھی آکر مجھے سب کچھ بتا دو تو مجھے آسانی سے نیند آجائے گی ورنہ میں خلجان میں مبتلا رہوں گا کہ نہ جانے کیا ہوا ہوگا۔"

"میں ابھی حاضر ہوجاتا ہوں سر، میں نے کل کی بات تو اس لیے کی تھی کہ اس وقت آپ کے آرام میں خلل نہ ڈالوں۔"

"آرام مجھے اسی صورت میں ملے گا جب سب کچھ جان لوں گا۔"

"میں حاضر ہوتا ہوں سر۔"

پرویز نے رابطہ منقطع کردیا۔

آدھے گھنٹے بعد انسپکٹر سلیم اس کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔ "ایاز ایک بڑے دفتر میں بیٹھتا ضرور ہے لیکن ذہنی طور پر پختگی نہیں آئی ہے اس میں، بنیادی باتیں تو مجھے اسی سے

معلوم ہوگئی تھیں۔ پھر باقی سب سے بھی پوچھ گچھ کی اور سارا معاملہ صاف ہوگیا۔''

''بس اب شروع ہوجاؤ۔''

''جی سر! سارا معاملہ دولت کی ہوس کا ہے۔ آپ مجھے بتا چکے ہیں کہ طاہر سلمان .... ایک لالچی شخص ہے جس نے روحی صاحبہ کو بینک سے ملنے والے شیئرز ہڑپ کرلیے لیکن اس معاملے میں بنیادی کردار پروین طاہر کا ہے۔ اس کا پہلا شوہر جو مرگیا، معمولی آدمی تھا۔ طاہر سلمان سے شادی کرکے وہ عیش و عشرت کی زندگی میں آگئی لیکن اسے یہ حسد رہا کہ اس کے شوہر سے زیادہ دولت باقر سلمان صاحب کے پاس تھی۔ پھر یہ حسد اس وقت بری طرح بھڑک اٹھا جب کسی بات پر باقر سلمان صاحب کی اہلیہ نے اسے کچھ سخت سست کہہ ڈالا۔ پروین طاہر کے خیال کے مطابق یہ باقر صاحب کی اہلیہ کا غرور تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ کسی طرح ان میاں بیوی، دونوں ہی کو ہلاک کردیا جائے تو روحی کی موجودگی کے باوجود اس کے شوہر کو اپنے بھائی کی دولت میں سے بہت کچھ مل جائے گا۔ اس کی سوچ غلط ہو یا درست، اس نے فیصلہ یہی کیا کہ ان دونوں کو ہلاک کردیا جائے لیکن فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ وہ گرمیوں کے موسم میں کچھ دن پہاڑی علاقوں میں ضرور گزارا کرتی تھی۔ اس مرتبہ جب وہ وہاں گئی تو اسے ایک سپیرا مل گیا۔ باتوں باتوں میں پروین کو معلوم ہوا کہ سپیرے کے پاس کئی اقسام کے زہر ہیں۔ اسی وقت اس کے ذہن میں آیا کہ باقر صاحب اور ان کی اہلیہ کو زہر دے کر مارا جاسکتا ہے۔ اس نے سپیرے سے اس کے منہ مانگے داموں زہر خرید لیا جو سپیرے کے بیان کے مطابق نہایت سریع الاثر تھا۔ واپس گھر آکر اس نے ایک بلی پر تجربہ بھی کر ڈالا اور بہت خوش ہوئی۔ بلی فوراً ہی مرگئی تھی۔ اس کے بعد پروین موقع کی تاک میں رہی۔''

''اور یہ موقع اسے اس رات ملا جب طاہر سلمان نے باقر صاحب کے اغوا کا ڈراما رچایا۔''

''جی ہاں۔ اس شام وہ باقر صاحب کے گھر گئی تھی اور خود ہی ان سے کہا تھا کہ وہ اس رات کھانا انہی کے ساتھ کھائے گی۔ طاہر سلمان بھی اس کے ساتھ تھا۔ کھانے کی وجہ سے اسے بھی رکنا پڑا۔ لیکن اسے علم نہیں تھا کہ اس رات اس کی بیوی کے عزائم کیا ہیں۔ جب وہ چاروں کھانے کی میز پر بیٹھے تو پروین نے سب کی نظر بچا کر وہ زہر کسی قسم کے میٹھے کی ڈش میں ڈال دیا۔ اسے یہ اطمینان پہلے ہی حاصل تھا کہ طاہر سلمان ذیابیطس کا مریض ہونے کے سبب میٹھا نہیں کھاتا۔ خود اس نے اپنے کھانے کی رفتار اتنی سست رکھی کہ باقر سلمان اور ان کی بیوی سے پہلے فارغ نہ ہو۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔ اس نے ان دونوں میاں بیوی کے ساتھ ہی نیپکن سے اپنے ہاتھ صاف کیے اور خود ہی میٹھے کی ڈش اٹھا کر ان دونوں کے پیالوں میں ڈالنے لگی۔ پھر اپنے لیے بھی نکالا لیکن وہ کھانے میں پہل نہیں کرسکتی تھی۔''

''ظاہر ہے۔ وہ اس میں زہر جو ملا چکی تھی۔''

''جی۔ پہل باقر صاحب اور ان کی اہلیہ ہی نے کی لیکن ایک ایک ہی چمچہ کھا سکے۔ دوسرا چمچہ ان کے ہاتھ میں ہی تھا کہ وہ تڑپ کر اپنی اپنی کرسیوں سے گرے اور فوراً ہی ٹھنڈے ہوگئے۔ طاہر سلمان بوکھلا گیا کہ یہ کیا ہوا اور کیوں ہوا لیکن پروین نے انہیں فوراً ہی بتادیا کہ اس نے میٹھے کی ڈش میں زہر ملادیا تھا۔ اس وقت طاہر سلمان پر کیا گزری ہوگی، اس بارے میں بس قیاس ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد پروین طاہر نے اپنے شوہر سے کہا کہ بس اب یہاں سے نکل چلو۔ اس بات پر طاہر سلمان بہت جھنجلایا۔ اس نے بیوی سے کہا کہ جب پولیس آئے گی تو اسے ملازمین سے معلوم ہوجائے گا کہ کھانے کی میز پر وہ دونوں بھی تھے۔ اس طرح وہ پھنس جائیں گے۔ یہ بات سن کر پروین کے ہاتھوں کے طوطے ... اڑ گئے۔ اس نے باقر صاحب اور ان کی اہلیہ کو زہر دینے کا فیصلہ تو کرلیا تھا لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کے بعد کیا کرنا ہوگا کہ وہ اس معاملے میں نہ پھنس سکے۔''

''طاہر سلمان اپنی بیوی پر بگڑا نہیں؟''

''آپ خود بتا چکے ہیں کہ وہ ایک لالچی شخص ہے۔ بڑے بھائی سے اسے کوئی خاص لگاؤ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اپنی بیوی پر جھنجلایا بہت اور پریشان ہوا تو قدرتی بات تھی لیکن پروین نے سوچا کہ اس معاملے میں اپنے بیٹے سے مشورہ کرے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا بیٹا بہت ذہین ہے۔ وہ ضرور بچاؤ کی کوئی اچھی تدبیر سوچ لے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ واقعی ذہین ہو لیکن قتل جیسا معاملہ اس کی ذہانت کو بھی ہوا میں اڑا سکتا تھا۔ بہرحال اس نے فون کرکے ایاز کو بلایا اور طاہر سلمان کی ہدایت کے مطابق بیٹے سے یہ بھی کہا کہ وہ پچھلے دروازے سے آئے تاکہ کوئی ملازم اسے آتے نہ دیکھ سکے۔''

''مگر ان دونوں کو تو ملازمین دیکھ چکے ہوں گے۔''

''اس بارے میں بھی بتاؤں گا سر...... دراصل میں آپ کو سب کچھ ترتیب سے سنا رہا ہوں۔''

''ہوں۔'' پرویز خفیف سا مسکرایا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ بتاتے رہو۔''

انسپکٹر سلیم نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''ایاز وہاں پہنچ تو گیا لیکن صورت حال جاننے کے بعد وہ بھی حواس باختہ ہو گیا تاہم کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں جنید کی مدد لی جاسکتی ہے۔ دراصل جنید سے ہی نہیں بلکہ شیبا سے بھی اس کا ملنا جلنا تھا۔ وہ خود اس کا اقرار کر چکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جنید کے تعلقات بعض جرائم پیشہ افراد سے بھی ہیں اس لیے اس کا خیال تھا کہ کسی بڑی رقم کے لالچ میں کوئی جرائم پیشہ شخص جنید کے توسط سے اس معاملے میں ان کی مدد کر سکے گا لہٰذا فون کر کے جنید کو بھی بلایا گیا۔''

''اسے بھی پچھلے دروازے سے بلایا گیا ہو گا؟''

''جی ہاں، وہ بھی پچھلے ہی دروازے سے وہاں پہنچا تھا۔ سب کچھ جاننے کے بعد اس نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ کسی کی مدد نہیں لے گا اور خود ہی سب کچھ کرے گا۔ ایک بڑی رقم کا لالچ اسے بھی دیا گیا تھا۔ اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ فی الحال دونوں کی لاشیں کسی کمرے میں ڈال کر کمرا بند کر دیا جائے اور ان کے اغوا کا ڈراما کھیلا جائے۔ دو چار دن کے بعد طاہر سلمان یہ کہہ کر ملازمین کی چھٹی کر دیں کہ اب گھر میں کوئی رہتا نہیں ہے لہٰذا ان کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ منصوبہ طاہر سلمان کے لیے کچھ اطمینان بخش نہیں تھا لیکن کوئی اور صورت سمجھ میں بھی نہیں آرہی تھی۔ چنانچہ اسی کے مطابق عمل کیا گیا۔ لاشیں ایک ایسے کمرے میں ڈال دی گئیں جو عموماً بند رہتا تھا، اگر کوئی مہمان ایک دو دن کے لیے آتا تھا تو اسے اسی کمرے میں ٹھہرایا جاتا تھا۔''

''گویا گیسٹ روم۔''

''جی۔'' انسپکٹر سلیم نے جواب دے کر اپنا بیان جاری رکھا۔ لاشیں اس کمرے میں ڈال کر کمرا مقفل کر دیا گیا۔ جنید نے کسی طرح پچھلے دروازے کی کنڈی کاٹ دی۔ اس طرح یہ باور کرانا مقصود تھا کہ اغوا کرنے والے اس طرف سے بنگلے میں آئے تھے۔ اس کے بعد ایاز اور جنید پچھلے ہی دروازے سے رخصت بھی ہو گئے۔ طاہر سلمان اپنی بیوی کے ساتھ سامنے ہی سے رخصت ہوا تاکہ ملازمین ان دونوں کو گھر سے جاتے ہوئے دیکھ لیں۔ اس رخصتی سے پہلے جنید نے اغوا کنندگان کی طرف سے ٹیلی فون کرنے کا ڈراما بھی طاہر سلمان کو سمجھا دیا تھا۔ جنید اس قسم کے معاملات میں خاصا عیار ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ پولیس کو جب یہ بیان دیا جائے گا کہ اغوا کرنے والوں نے دو مرتبہ فون کیا تھا تو پولیس طاہر سلمان کے موبائل میں وہ نمبر ضرور دیکھے گی جہاں سے فون کیا گیا ہو۔ اس کے بعد بھی ڈراما کیا گیا۔ جنید کو تھوڑا سا خدشہ تھا کہ شاید پولیس اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائے لہٰذا اس نے اپنے گھر جا کر اپنی بہن کو اعتماد میں لیا۔ اس نے شیبا کو پوری بات تو نہیں بتائی، بس یہ کہا کہ وہ اپنے کسی دوست کی وجہ سے ایک معاملے میں پھنس سکتا ہے اس لیے اگر بعد میں پولیس اس سے اس بارے میں پوچھ گچھ کرے تو وہ وہی بیان دے جو اس نے پولیس کو دیا تھا۔''

''بات اب پوری طرح میری سمجھ میں آنے لگی ہے۔'' پرویز بول پڑا۔ ''لیکن جزئیات کا اندازہ نہیں۔''

''جی جزئیات کا حتمی اندازہ تو نہیں لگایا جاسکتا۔ میں آپ کو بھی کچھ بتا رہا ہوں۔'' انسپکٹر سلیم نے کہا۔ ''چند دن بعد طاہر سلمان نے ملازمین کی چھٹی کر دی۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ دیوار کی تعمیر کے وقت کوئی ملازم ادھر نہ آنکلے۔ اگر زیادہ دن گزارے جاتے تو لاشوں کی بو باہر تک پھیلنے کا اندیشہ تھا اس لیے اس میں زیادہ تاخیر نہیں کی گئی۔ پھر جنید ہی تین مزدوروں کو وہاں لایا۔ اس سے قبل وہ سب آپس میں مشورے بھی کر چکے تھے۔ یہ تو سوچا ہی جا سکتا تھا کہ ان مزدوروں سے یہ کام زبردستی لینا ہو گا۔ جنید کے پاس ریوالور تھا جس کے زور پر ان سے یہ کام لیا جا سکتا تھا اور لیا بھی گیا لیکن اس بارے میں بھی سوچا گیا کہ وہ مزدور بعد میں پولیس کو اس بارے میں اطلاع دے سکتے تھے۔ پروین نے اس پر یہ تجویز پیش کی تھی کہ کام کروانے کے بعد ان مزدوروں کو بھی قتل کر دیا جائے۔ اس پر طاہر سلمان نے اسے ڈانٹ پلا دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ پھر ان مزدوروں کی لاشیں کیسے غائب کی جائیں گی اور جنید نے بھی کہا تھا کہ زیادہ قتل و غارت مناسب نہیں رہے گا۔ اس کے بعد یہ تدبیر بھی جنید ہی نے سوچی تھی کہ جب مزدور لاشیں دیوار میں چن رہے ہوں، اس وقت ان کی وڈیو بنالی جائے اور اس سنگین کام کے عوض انہیں کوئی کثیر رقم دیتے ہوئے انہیں یہ بھی جتا دیا جائے کہ اگر انہوں نے یہ راز فاش کیا تو جرم کی اعانت میں وہ بھی پھنس جائیں گے۔ وہ وڈیو ان کے خلاف ایک ٹھوس ثبوت ہو گی چنانچہ اسی منصوبے کے تحت سارا کام انجام کو پہنچایا گیا۔ ایاز

''کاش......'' روحی ٹھنڈی سانس لے کر اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔

''مجھے اندازہ ہے تم دونوں کی حالت کا روحی، ثاقب بظاہر تو خود کو کسی حد تک سنبھالے ہوئے ہیں لیکن مجھے اندازہ ہے کہ ان کے دل پر کیسی قیامت گزر رہی ہوگی۔ تم خود کو ان کی نسبت زیادہ سنبھال سکتی ہو اگر کوشش کرو اور یہ کوشش تمہیں کرنا چاہیے تاکہ ثاقب کو سنبھال لو۔''

ثاقب نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ شاید وہ اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو چھپانا چاہتا ہو۔

پرویز بولا۔ ''ایک تو میں اس لیے آیا تھا کہ تم لوگوں کو کچھ دلاسا دینے کی کوشش کروں، دوسرے یہ کہ تم لوگوں کو اطلاع بھی دے دوں۔ میں اسی ہفتے میں دو سال کے لیے امریکا جا رہا ہوں۔ جا نہیں رہا ہوں بلکہ بھیجا جا رہا ہوں۔ کچھ ٹریننگ لینا ہے مجھے۔ میرا محکمہ بھیج رہا ہے مجھے۔''

''اچھا!'' روحی نے کچھ افسردگی سے کہا۔ ''اگر محکمہ تمہیں بھیج رہا ہے تو مجبوری ہے ورنہ میں تم سے کہتی کہ نہ جاؤ۔ اس وقت میں اور ثاقب جس صورت حال سے گزر رہے ہیں، اس میں ہمیں ایک اچھے دوست کی ضرورت ہے۔''

''تم نے ٹھیک کہا روحی۔'' پرویز بولا۔ ''اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں ان حالات میں نہ جاتا۔''

''کافی بنواتی ہوں تمہارے لیے۔''

''یہ کیا ہے روحی؟ میں جب آتا ہوں، تم تکلفات میں پڑ جاتی ہو۔''

''بات کچھ اور ہے پرویز۔'' روحی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ثاقب نے آج ناشتا اب تک نہیں کیا ہے۔ ان کی وجہ سے میں نے بھی نہیں کیا۔ تم پیو گے کافی تو یہ تمہارا ساتھ تو دیں گے۔''

''اوہ! تب تو ضرور پیوں گا۔ یہ تو مناسب بات نہیں ہے ثاقب...... مرد کو دنیا میں ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔''

ثاقب پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

ذرا دیر بعد وہ ناشتا کر رہے تھے۔ اسی دوران میں روحی نے کہا۔ ''جب تم امریکا سے واپس آؤ گے تو میں ایک اچھی سی لڑکی ڈھونڈ کر رکھوں گی۔ تمہیں اب شادی کر لینا چاہیے۔''

پرویز نے بات ٹالنے کے لیے ہنس کر کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم نے خود کو سنبھالنے کے لیے اس قسم کی باتیں شروع

اعتراف کر چکا تھا کہ وہ وڈیو اسی نے بنائی تھی اور گھر پر اب بھی اس کے پاس محفوظ تھی۔ میں نے اسی وقت اس کے گھر جا کر وہ وڈیو بھی لے لی تھی۔''

''اس وڈیو پر ایاز کی انگلیوں کے نشانات بھی ہوں گے۔''

''جی ہاں۔ وہ بھی ایک ثبوت ہے ان لوگوں کے خلاف۔ بس یہی سارا معاملہ ہے جو میں نے آپ کے گوش گزار دیا۔ ہاں ایک بات یہ رہ گئی کہ ان مزدوروں نے کیا سوچا۔ ان تینوں بھائیوں میں انوار کچھ ذہین ہے۔ اس نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ اب مزدوری چھوڑ کر اس کثیر رقم سے کوئی اچھا کاروبار شروع کیا جا سکتا ہے لیکن بہتر ہوگا کہ فوری طور پر خود کو اتنا پیسے والا ظاہر نہ کیا جائے چنانچہ انہوں نے وہ پیسا محفوظ رکھتے ہوئے ایک چھوٹی سی اسٹیٹ ایجنسی کھول لی۔ کچھ عرصے وہ چلائی، پھر بلڈر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ اس کے بعد ان کا ارادہ مزید آگے بڑھنے کا تھا لیکن اب انہیں کچھ عرصے کی جیل تو بھگتنی ہی پڑے گی۔ بس سر! یہ ہیں سارے واقعات......''

''ٹھیک ہے سلیم! اب مجھے سکون سے نیند آجائے گی۔''

''تو اب میں...... جاؤں سر؟''

''ہاں اب جا کے آرام کرو۔''

سلیم کو رخصت کرنے کے بعد پرویز اپنی خواب گاہ میں جا کر لیٹا۔ سب کچھ معلوم ہو جانے کے بعد بھی اسے فوری طور پر نیند نہیں آسکی۔ سلیم کے بیان کردہ سارے واقعات اس کے ذہن میں چکراتے رہے اور اسے یہ خیال بھی آیا کہ روحی کو جب یہ سب کچھ معلوم ہوگا تو اس پر کیا گزرے گی۔ ثاقب کو تو اس نے بتا ہی دیا تھا لیکن یہ اندازہ وہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ثاقب نے گھر جا کر روحی کو بتا دیا ہوگا یا نہیں۔

دوسرے دن دس بجے...... وہ روحی کے گھر پہنچا۔ پہنچنے سے پہلے فون پر اطلاع بھی دے دی تھی۔ ثاقب اس دن دفتر نہیں گیا تھا۔ پرویز نے اسے خاصا اداس دیکھا۔ طاہر سلمان بہرحال اس کا باپ تھا لیکن اس کے ساتھ روحی بھی بہت اداس نظر آئی۔

''یہ سب کیا ہو گیا پرویز؟'' یہ کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہو گئی۔

''جس نے جو کیا ہے، وہ اس کا خمیازہ تو بھگتے گا۔'' یہ کہتے ہوئے ثاقب کی آواز بھیگی بھیگی سی تھی۔

کیں۔''

''میں سنجیدہ ہوں پرویز۔''

''ٹھیک ہے۔'' پرویز نے ہنس کر کہا۔ ''جب امریکا سے آؤں گا تو بات کریں گے۔''

ان دونوں نے ناشتا کرلیا۔ پرویز نے صرف کافی پی اور پھر جانے کی اجازت چاہی۔ چلتے وقت پرویز نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ ''پرسوں شیبا کے گھر چلیں گے۔ میں فون کروں گا، وقت طے کرلیں گے۔''

ثاقب نے سر ہلا دیا۔

''یہ کیا چپکے چپکے باتیں ہونے لگیں؟'' روحی بولی۔

''تمہاری کچھ برائیاں کررہا تھا۔'' پرویز نے مسکرا کر کہا۔

''اول تو یہ جھوٹ ہے۔'' روحی نے ہنس کر کہا۔ ''اور اگر سچ بھی ہوتا تو ثاقب تمہاری کسی بات کا یقین ہی نہیں کرتے۔''

''تم ہنس پڑیں تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ تم نے خود کو سنبھالنے کی کوشش بہت تیزی سے شروع کردی ہے۔ یہ ثاقب کے حق میں بہت بہتر ہوگا۔''

''تم نے مشورہ دیا ہے تو اس پر عمل کرنا ہی پڑے گا۔''

پرویز مسکرا کر رہ گیا۔

ان دونوں سے رخصت ہونے کے بعد وہ اپنے دفتر جاتے ہوئے ثاقب، شیبا اور ان کے بچے کے بارے میں بہت کچھ سوچتا رہا۔

ایک دن چھوڑ کر اس نے ثاقب کو فون کیا۔ ''آج شیبا کے گھر چلنا ہے ثاقب۔''

''مجھے یاد ہے۔ منتظر تھا آپ کے فون کا۔''

''اپنی گھڑی میری گھڑی سے ملالو۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری کاریں ساتھ ساتھ ہی وہاں پہنچیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

ان دونوں نے اپنی گھڑیاں ملالیں۔

''ٹھیک چھ بجے پہنچیں گے۔'' پرویز نے کہا۔ ''شیبا کو فون کرکے اپنے آنے کی اطلاع دے دینا لیکن یہ نہ بتانا کہ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا۔''

''بہتر۔''

چنانچہ شام کو ٹھیک چھ بجے ان دونوں کی کاریں شیبا کے گھر پہنچیں۔ دونوں کی کاریں ساتھ ساتھ بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئیں۔ آگے پیچھے رکیں۔ دونوں کار سے اترے اور برآمدے کی طرف بڑھے جہاں شیبا، ثاقب کی منتظر تھی۔

پرویز نے جان بوجھ کر ثاقب کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ شیبا پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ اور ثاقب اچھے دوست ہیں۔

ثاقب کو تعجب ہوا کہ اس کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر شیبا کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے تھے، نہ الجھن کے۔

اس نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں ثاقب کا بہت گہرا دوست ہوں۔'' پرویز بولا۔ ''اور ایک تجویز لے کر آیا ہوں تمہارے پاس۔ تمہارے اور ثاقب کے بارے میں مجھے سب کچھ معلوم ہوچکا ہے۔ روحی کے لیے بہت بڑا صدمہ ہوگا اگر کبھی اس پر یہ راز کھل گیا۔ اسے اس صدمے سے بچانے کی ایک ہی صورت ہے۔ تم اس ملک سے کسی اور ملک میں چلی جاؤ۔ کسی ملک میں کیا، میں امریکا کا نام لوں گا۔ تم اپنے بہتر مستقبل کے لیے ثاقب سے جس رقم کا بھی مطالبہ کرو گی، وہ تمہیں مل جائے گی۔ تمہیں امریکا میں سیٹل کروانا میری ذمے داری ہوگی۔ اپنے بیٹے کو تم اپنے ساتھ لے جاسکتی ہو۔ اسے وہاں کسی اچھے ہوسٹل میں داخل کرادیا جائے گا۔''

ثاقب نے چونک کر پرویز کی طرف دیکھا۔ چونکنے کی بات ہی تھی۔ پرویز نے نکاح کی بات کی تھی، نہ طلاق کی۔

''مجھے منظور ہے۔'' شیبا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر ثاقب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم مجھے کتنی رقم دے سکتے ہو؟''

ثاقب کے بجائے پرویز بول پڑا۔ ''تمہیں ثاقب کا دستخط شدہ چیک مل جائے گا اور سادہ ہوگا۔ جو رقم چاہو تم اس میں بھر لینا۔''

ثاقب پھر پرویز کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

''ٹھیک ہے۔'' شیبا نے کہا۔

''اچھا اب ایک دوسری بات۔'' پرویز نے کہا۔ ''میں اسی ہفتے کسی دن امریکا روانہ ہونے والا ہوں۔ تم میرے ساتھ ہی چلو۔ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے لینا۔''

شیبا نے کچھ حیرت سے کہا۔ ''کیا اتنی جلدی مجھے وہاں شہریت مل جائے گی؟''

''وہاں کئی بڑے لوگوں سے میرے، بہت اچھے تعلقات ہیں۔ میں فوری طور پر اس کا بندوبست کرسکتا ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے۔''

''بس تو تم...... اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو تیاری شروع کر دو چلنے کی۔ ممکن ہے کہ مجھے دو تین روز میں ہی جانے کا حکم مل جائے۔ تمہارے ٹکٹ کا بندوبست میں آج ہی کرلوں گا۔ ثاقب کا چیک تمہیں آج نہیں تو کل مل جائے گا اور بیرر چیک ہوگا۔ جو کسی وقت بھی کیش کروایا جاسکتا ہے۔''

یہ سارے معاملات بڑی تیزی اور بڑی آسانی سے طے ہوگئے۔ ثاقب کو اس پر اور ایک دوسرے معاملے پر بھی بہت تعجب ہوا تھا۔

واپسی پر پرویز اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا اور عقب نما آئینے میں یہ دیکھ کر مسکرایا کہ ثاقب اپنے گھر جانے کے بجائے اس کی کار کے پیچھے آرہا تھا۔

پارکنگ لاٹ میں دونوں کاریں ساتھ ساتھ ہی رکیں۔ ثاقب کار سے اتر کر تیزی سے پرویز کی طرف آیا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم میرے پیچھے آؤ گے۔'' پرویز نے مسکرا کر کہا۔

''میں حیران ہوں کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے طے ہو گیا۔'' ثاقب بولا۔

''اسے میری جادوگری سمجھ لو۔'' پرویز مسکراتا رہا۔ اس نے ثاقب کو یہ نہیں بتایا کہ دراصل وہ ایک دن پہلے ہی شیبا سے مل کر سارے معاملات طے کرچکا تھا۔ اسی لیے اب اسے شیبا کو اپنا سرکاری کارڈ دکھانے کی ضرورت نہیں پیش آئی تھی۔

''اور وہ چیک۔'' ثاقب بولا۔ ''وہ اس پر نہ جانے کتنی رقم بھر لے۔''

''نہیں، میرا خیال ہے کہ وہ ایک کروڑ سے زیادہ رقم نہیں بھرے گی اور اب تک تم اسے اس سے زیادہ کہیں دے چکے ہو اور آئندہ بھی دیتے رہتے۔''

وہ باتیں کرتے ہوئے لفٹ میں سوار ہوگئے تھے۔ پرویز کا اپارٹمنٹ تیسری منزل پر تھا۔

لفٹ میں صرف وہی دونوں تھے اس لیے باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

''اب میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں ثاقب!''

ثاقب سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھے امید ہے کہ تم میری درخواست رد نہیں کرو گے کیونکہ اس طرح مستقبل میں بھی روحی پر یہ راز فاش نہیں ہوگا کہ شیبا تمہارے کسی بچے کی ماں بنی تھی۔''

''وہ کیا صورت ہے؟''

''اپنا بیٹا مجھے دے دو۔''

''کیا مطلب؟'' ثاقب چونکا۔

''امریکا میں جب میں اسے ہوسٹل میں داخل کراؤں گا تو اس کے باپ کی جگہ میرا نام ہوگا اور جب وہ بیس بائیس سال بعد یہاں آئے گا تو تم چچا کی حیثیت سے بھی اس پر اپنی محبت نچھاور کرسکو گے۔''

''لیکن ابھی تو......''

''جو دوسرا مسئلہ تمہارے ذہن میں آرہا ہے، وہ میں سمجھ گیا ہوں۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔''

ثاقب سوچ میں پڑ گیا۔ اس وقت لفٹ تیسری منزل پر رکی۔ لفٹ سے نکل کر پرویز کے قدم اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھے۔

''اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔'' پرویز نے کہا۔

''نہیں۔'' ثاقب نے فوراً جواب دیا۔ ''مستقبل میں بھی روحی کو صدمے سے بچانے کے لیے میں ہر بات کے لیے تیار ہوں۔''

''مجھے یہی امید تھی۔''

اب وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد پرویز نے کہا۔ ''دو سال بعد امریکا سے واپس آنے کے کچھ ہی عرصے بعد میں سفیر بن کر کسی ملک میں چلا جاؤں گا۔''

''سفیر بن کر۔'' ثاقب نے تعجب سے کہا۔ ''آپ تو ایک سرکاری محکمے......''

پرویز نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کیا تم یہ نہیں جانتے۔ اب تو یہ بات بہت سے لوگ جاننے لگے ہیں کہ بیشتر ممالک اپنا جو سفیر کسی دوسرے ملک میں بھیجتے ہیں، وہ جاسوسی کے فرائض بھی سرانجام دیتا ہے۔''

ثاقب نے سر ہلایا۔ ''اُڑتی پڑتی یہ بات میں نے سنی تو ہے۔''

''میرے بیس پچیس سال اسی طرح گزریں گے۔ میں کبھی کسی ملک میں سفیر بن کر جاؤں گا اور کبھی کسی ملک میں۔ مجھے امید ہے کہ تم اس کا ذکر روحی کے سوا کسی سے نہیں کرو گے۔''

''میں آپ کے اس اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔ دو سال بعد تو میں بہرحال آؤں گا۔ اس کے بعد کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میں کتنے عرصے تک باہر ہی رہوں۔ بیس پچیس سال بعد میں ریٹائر ہو جاؤں گا۔ اس وقت تک تمہارا بیٹا اپنی تعلیم بھی مکمل کرچکا ہوگا۔ اسی وقت

میں اسے اپنے ساتھ لے کر آؤں گا۔"

"ہوں۔" ثاقب سوچ میں ڈوب گیا۔ شیبا کا اتنی آسانی کے ساتھ پرویز کی بات مان لینا اس کے لیے قابل غور تھا اور وہ اس سلسلے میں جو اندازہ لگا رہا تھا وہ لگ بھگ وہی تھا جس کا اظہار پرویز نے نہیں کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ثاقب یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ وہ شیبا کو آج ہی کسی وقت چیک دے آئے گا۔

اس کے تیسرے دن پرویز کی امریکا روانگی تھی۔ وہ شیبا کا ٹکٹ بھی بنوا چکا تھا۔ اسے ائرپورٹ تک چھوڑنے کے لیے ثاقب کے ساتھ روحی بھی جانا چاہتی تھی لیکن ثاقب اسے کچھ بہانوں سے ٹال گیا۔ ان میں سے ایک بہانہ یہ بھی تھا کہ ائرپورٹ پر اس کے محکمے کے کچھ دوسرے افسر بھی ہوں گے۔ یہ کوئی مضبوط جواز نہیں تھا لیکن پرویز نے اس کی وضاحت نہیں کی کہ ان افسران کے سامنے روحی کا آنا کوئی مناسب بات نہیں ہوتی۔

روحی نے اپنے گھر سے ہی پرویز کو رخصت کیا۔ وہ اس وقت خاصی جذباتی نظر آرہی تھی۔ یقیناً اسے یہ احساس ہوگا کہ پرویز اسے شدت سے چاہتا تھا مگر اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی کہ اسے کسی طرح ثاقب سے بدظن کر کے اس سے خود شادی کرے۔ اس کے اقدامات تو اس کے برخلاف ہی رہے تھے۔

پرویز اسے اس لیے ائرپورٹ نہیں لے جانا چاہتا تھا کہ شیبا بھی اس کے ساتھ ہوتی اور اس کا قوی امکان تھا کہ وہ شیبا کو ماڈل گرل کی حیثیت سے جانتی ہو۔

اور اس طرح پرویز پاکستان سے رخصت ہو گیا۔

پھر دو سال اس طرح گزرے کہ شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا تھا جب روحی، پرویز کے بارے میں کوئی بات نہ کرتی۔ روحی ہی کیا، ثاقب بھی پرویز کی شخصیت سے بہت متاثر تھا۔

اسی دوران میں روحی ایک بچے کی ماں بھی بن گئی۔ وہ بچہ جب ایک سال کا تھا تو امریکا سے پرویز نے اطلاع دی کہ وہ فلاں دن، فلاں فلائٹ سے فلاں وقت پاکستان پہنچ رہا ہے۔

"کیا میں تمہیں ریسیو کرنے بھی نہ آؤں؟" روحی نے کچھ خفگی سے پوچھا۔

"نہیں۔" پرویز نے ہنس کر کہا۔ "ریسیو کرنے تم آسکتی ہو۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔"

چنانچہ مقررہ دن مقررہ وقت پر وہ دونوں میاں بیوی پرویز کو ریسیو کرنے ائرپورٹ پہنچ گئے۔

یہ دیکھ کر وہ دونوں ہی چونکے تھے کہ پرویز کے ساتھ شیبا بھی تھی اور بہت خوش نظر آرہی تھی۔

پرویز نے شیبا سے ان دونوں کا تعارف کرایا حالانکہ ثاقب کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دونوں تو ایک دوسرے کو جانتے ہی تھے لیکن روحی کو یہ باور کرانا ضروری تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔

پھر پرویز نے شیبا کا تعارف کرایا۔ "یہ شیبا پرویز ہیں۔ یعنی مسز پرویز، یعنی میری نصف بہتر۔"

ثاقب اور روحی دم بخود رہ گئے۔ روحی اس لیے کہ شیبا کو وہ ایک ماڈل گرل کی حیثیت سے جانتی تھی۔

وہ ائرپورٹ سے نکلے۔

"اس طرف۔" ثاقب نے کہتے ہوئے پرویز کو ایک طرف اشارہ کیا۔ "اس طرف کھڑی ہے تمہاری کار۔"

"نہیں۔" پرویز نے کہا۔ "محکمے نے میرے لیے کار بھیجی ہے۔ میں اسی میں جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ اسی کار میں چلو۔ کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے۔ اور روحی! شیبا کو تم ابھی کار میں لے جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ آرہے ہیں۔ وہاں کچھ دیر رک کر میں دفتر چلا جاؤں گا۔ شیبا تمہارے گھر میں ہی رہے گی۔ میں شام کو آؤں گا۔ رات کا کھانا ہم تمہارے ساتھ ہی کھائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" روحی نے کہا۔ "آؤ شیبا۔"

اس طرح دونوں کاریں آگے پیچھے روانہ ہوئیں۔

"تم بہت حیران ہو ثاقب؟" پرویز بولا۔

"کیا یہ حیرانی کی بات نہیں کہ شیبا......"

"میں تمہیں بتاؤں گا تو تمہاری حیرت ختم ہو جائے گی۔ دیکھو شیبا بہرحال اس بچے کی ماں ہے۔ بچے سے دور رہ کر وہ تڑپتی ہی رہتی۔ ضروری تھا کہ اسے اس کے بچے سے دور نہ کیا جائے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ وہ بھی اس بات سے بہت خوش ہے کہ مستقبل میں وہ ایک سفیر کی بیوی ہوگی۔"

"لیکن وہ......" ثاقب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ایک ماڈل گرل، ایک بگڑی ہوئی لڑکی۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم، لیکن ایک بات کا جواب دو۔ کیا کسی بھٹکی ہوئی لڑکی کو راہِ راست پر لانا ایک اچھا کام نہیں ہے؟"

ثاقب کوئی جواب نہیں دے سکا۔ وہ پرویز کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے کسی ایک عظیم انسان کو دیکھ رہا ہو۔

☆☆☆

یاقوتی فتنہ

جمال دستی

جرم کرنے والا ہر مجرم سمجھتا ہے کہ جو اس نے سوچا ہے... سب کچھ اس کے مطابق انجام پذیر ہوگا... جرم در جرم پہیلی ایک ایسی ہی کہانی... ایک کے پیچھے ایک مجرم گھات لگائے بیٹھا تھا... حصولِ جواہر کا سلسلہ تھمنے کے بجائے الجھتے ہوئے بڑھتا ہی جارہا تھا... ایک انوکھی واردات کی زہریلی روداد...

یاقوتی فتنے کی نذر ہوجانے والے مجرموں کا ہولناک احوال

وہ سنہری زلفوں والی ایک پُرکشش حسینہ تھی جو بارش کے باوجود تیز تیز دوڑ رہی تھی۔ جگہ جگہ بارش کے پانی کے گڑھے سے بن چکے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسی طرح پانی میں دوڑتی رہی تو اس کے پیر پانی میں تربتر اور اس کے جوتے تباہ ہوجائیں گے۔ لیکن وہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

میں گرے ہاؤنڈ بس ٹرمینل سے اس کا پیچھا کررہا تھا۔ اس حسینہ کے پاس تیس ملین ڈالر مالیت کے چوری شدہ

ہیرے تھے...... سرخ یاقوت! اور امریکا کی بارہ ریاستوں کا ہر ایک سپاہی اس کی تلاش میں تھا۔ اس حسینہ پر قتل کا الزام بھی تھا۔

مجھے بارش میں چلنا بُرا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے اپنا پرانا واٹر پروف کوٹ پہن رکھا تھا اور پیروں میں چمڑے کے فوجی جوتے تھے۔ اس کا تعاقب برقرار رکھنے کے لیے مجھے بھی تقریباً دوڑنا پڑ رہا تھا لیکن اگلی سڑک کے کراسنگ پر اسے رکنا پڑ گیا کیونکہ سڑک عبور کرنے والے زیبرا کراسنگ کی لائٹ سرخ تھی۔

اب میں اس کے برابر میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے اپنا بازو اس حسینہ کے بازو میں حمائل کر دیا۔ اس حسینہ نے اس طرح جھرجھری سی لی جیسے اسے اچانک بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ میں نے نہایت شائستہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''کیا یہ بیگ اٹھانے کے لیے مددگار ہے؟''

''نہیں، شکریہ۔'' اس نے سرد مہری سے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ساتھ ہی ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

اس دوران زیبرا کراسنگ کی روشنی سبز ہو چکی تھی۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تیزی سے سڑک عبور کرنے لگی۔ میں نے بھی لپک کر سڑک پار کر لی اور جا لیا۔ میں نے اس کے برابر میں پہنچ کر ایک بار پھر اس کا بازو تھام لیا۔

اس نے تیزی سے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور گھورنے لگی۔ اس کے فیلٹ ہیٹ کے حاشیے پر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کی بادامی آنکھیں سبز رنگ کی تھیں، گال اندر کو دھنسے ہوئے تھے اور ہونٹ بھرپور اور سرخ رنگ کے تھے۔ اس کے انداز سے خوف کے بجائے قدرے غصہ جھلک رہا تھا۔ وہ ڈانٹنے کے لہجے میں بولی۔ ''کیا میں اسے راہ زنی سمجھوں؟''

''کیا میں تمہیں اس قسم کا آدمی دکھائی دے رہا ہوں جو سنہری زلفوں والی خوب رو حسیناؤں سے راہ زنی کی کوشش کرتا ہو؟''

''ہاں!''

''کیا تم اس بات کو ترجیح دینا چاہتی ہو کہ تمہیں گرفتار کر لیا جائے...... گریشیا والٹ؟''

''کیوں......؟''

وہ اس بات پر چکرا گئی تھی کہ میں اس کے نام سے واقف ہوں۔

''تم کون ہو؟''

''میں رچرڈ فلیمنگ ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ہی وہ شخص ہوں جس سے تمہیں رابطہ کرنا تھا۔''

''دیکھنے میں تم ایسے لگ رہے ہو جیسے تمہیں کچھ رابطوں میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑ چکا ہو۔''

''مجھے اکثر خاصی مار پڑ چکی ہے...... خاص طور پر پولیس کے ہاتھوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔'' اس حسینہ نے کہا۔ لیکن اس کے لہجے میں ہمدردی کا ہلکا سا شائبہ تک نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے، ہم گھر چل کر بات کریں گے۔ میرا ٹھکانا صرف چند بلاک کے فاصلے پر ہے۔ کیا تمہیں پیدل چلنے میں کوئی عار تو نہیں؟''

''مجھے عار ہو تب بھی میں اس معاملے میں کیا کر سکتی ہوں؟'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

میں نے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے دالان کے دروازے کا تالا کھولا اور اس سے سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تھرڈ فلور!'' ساتھ ہی اسے خود سے پہلے سیڑھیاں چڑھنے کا موقع دے دیا۔

اوپر پہنچ کر میں نے چابی کی مدد سے اپنے کمرے کے دروازے کا تالا کھول دیا۔ ساتھ ہی اس بڑے سے اکلوتے کمرے کی لائٹ کا بٹن ایک کھٹکے سے آن کر دیا۔ اس کمرے کے ایک گوشے میں ایک چھوٹا سا کچن اور اس سے بھی چھوٹا ایک باتھ روم بنا ہوا تھا۔ ''یہ وہ جگہ ہے جہاں میں رہتا ہوں۔'' میں نے گریشیا کو بتایا۔

''اور تمہارا دھندا کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔''

''کسی بڑی ایجنسی میں؟'' اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں......'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر تم برا نہ مناؤ اور مجھے کہنے کی اجازت دو تو میں ایک تنہا بھیڑیا ہوں۔''

وہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کے لمبے سنہری بال کناروں پر سے الجھنا شروع ہو گئے تھے جنہیں بارش کے پانی نے چپکا دیا تھا۔ اس کے پلاسٹک رین کوٹ کی سلائی پر سے پانی کی ننھی بوندیں ٹپک کر میرے پتلے مصنوعی گھریلو قالین کو داغ دار کر رہی تھیں۔ اس نے اپنا سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔

''مجھے تمہارے اس ٹھکانے پر لانے کا آئیڈیا کس نے سوچا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ میرا آئیڈیا تھا۔ خیال یہی تھا کہ میں تمہیں کسی

ہوٹل میں لے جاؤں گا لیکن میں نے تمہیں بس سے اترتے ہوئے دیکھا تو اپنا خیال بدل دیا۔"

اس بات پر اس نے ان نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے وہ مجھ پر سنگ باری کر رہی ہو۔ "سو تم وہاں بس ٹرمینل پر موجود تھے! تم نے مجھے کوئی اشارہ کیوں نہیں کیا؟ جب کسی نے مجھ سے ملاقات نہیں کی تو میں گھبرا گئی۔ میں یہی سمجھی کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے۔"

"ان چیزوں کو نیچے رکھ دو۔" میں نے اس کے ہاتھوں میں موجود سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اپنا ہیٹ اور کوٹ اتار دو۔ میں تمہارے پینے کے لیے کچھ لاتا ہوں۔" میں نے اپنا واٹر پروف کوٹ اتارتے ہوئے کہا اور اپنے چھوٹے سے کچن کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ "تم کیا پینا پسند کرو گی؟"

"وہسکی!" اس نے دیدہ دلیری سے کہا۔

میں نے کچن ہی میں سے بلند آواز سے کہا۔ "میں نے جان لیا تھا کہ تم خوف زدہ تھیں لیکن تم نے حقیقت میں اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس کاروبار سے وابستہ ہونے کے ناتے میں لوگوں کی اندرونی کیفیت کو بھانپ لیتا ہوں اور اس بارے میں بتا سکتا ہوں۔"

میں وہسکی کے دو گلاس اور پانی لے کر واپس آ گیا۔ وہ اس وقت تک اپنے جوتے اور لمبی جرابیں اتار چکی تھی۔ وہ اس ٹائپ کے لوگوں میں سے تھی جنہیں بے تکلف ہونے اور خود کو اپنے ہی گھر میں محسوس کرنے کے لیے زیادہ اصرار کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

وہ بیٹھ گئی۔ اس نے وہسکی کا گلاس ہاتھ میں اٹھا لیا اور اپنے ننگے پیروں کو گرمائش پہنچانے کے لیے انہیں آپس میں رگڑنے لگی۔ "مجھے سکون پا کر اچھا لگ رہا ہے۔ مجھے گزشتہ ایک ہفتے سے ایک لمحے کا آرام نہیں ملا۔ میں تمہارے ساتھ خود کو مکمل طور پر محفوظ محسوس کر رہی ہوں۔"

"عورتوں کے ساتھ میری یہی تو مشکل ہے۔ وہ میرے ساتھ خود کو بہت زیادہ محفوظ محسوس کرتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"رینڈی اس بات کو اچھا محسوس نہیں کرے گا۔" گریشیا نے کہا۔

"وہ کس بات کو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کہ تم اس کے پلان کو تبدیل کر کے مجھے ہوٹل لے جانے کے بجائے یہاں لے آئے۔"

میں نے اپنے گلاس سے ایک گھونٹ بھرا اور اسے نیچے رکھ دیا۔ "جب تک ہمیں یہ عمدہ محسوس ہو رہا ہے تو پھر رینڈی کی پروا کس کو ہے؟" میری نگاہیں اس کے پیروں پر جمی ہوئی تھیں۔

"لاؤ، یہ کام میں کر دیتا ہوں۔" میں نے اس کے پیروں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر رگڑنا شروع کر دیا۔

"میرے پاس اس بارے میں کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔" گریشیا نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں صرف رینڈی جورڈن کے لیے کام کرتی ہوں۔"

"تم نے اس کے ساتھ کام کیا ہے۔" میں نے اس کے پیروں کی انگلیوں کو اس کی خواہش سے زیادہ سختی کے ساتھ رگڑنا شروع کیا تو اس نے اپنا ایک پیر پیچھے کی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ "تم اس کے ساتھ شادی کرنے جا رہی تھیں...... لیکن یہ واقعہ پیش آ گیا۔ چاہتی ہو کہ میں اس بارے میں ہلکے پھلکے انداز میں مزید کچھ بتاؤں؟"

وہ اپنا وہسکی کا گلاس اپنے ہونٹوں تک لے گئی اور ایک بڑا سا گھونٹ لینے کے بعد بولی۔ "تم بہت برے انداز میں مساج کرتے ہو۔ میں تمہارے بارے میں بس اتنا ہی جانتی ہوں۔"

"رینڈی جورڈن نے مجھ سے فون پر رابطہ کیا تھا اور مجھے اس معاملے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ رینڈی جورڈن ففتھ ایونیو کے ایک بڑے جیولر کی حیثیت سے کاروبار کرتا ہے اور اس کی آڑ میں اپنا مجرمانہ دھندا چلا رہا ہے۔ اس نے مجھے ایک پے بوتھ سے فون کیا تھا کیونکہ پولیس اس کی مسلسل نگرانی کر رہی ہے۔ انہوں نے اس کے پرائیویٹ ٹیلی فونز لائنوں پر بھی ٹیپ لگایا ہوا ہے اور اس کی تمام گفتگو ریکارڈ کی جا رہی ہے۔ لیکن پیغام رسانی کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔ بالکل اسی طریقے کے مانند جیسے تم اس سے اس وقت رابطہ کرتی تھیں جب تم پولیس کے لیے مفرور قرار پائی تھیں۔ یہ مشکل تو ہے لیکن ممکن ہے۔ رینڈی جورڈن نے مجھے بتایا کہ اس نے سنا ہے تم واپس آ رہی ہو۔ وہ تم سے نہیں مل سکتا کیونکہ جونہی تم دونوں یکجا ہو گے پولیس تم دونوں کو دھر لے گی۔ تم براہِ راست اس کے پاس نہیں جا سکتیں کیونکہ اس صورت میں بھی پولیس تم دونوں کو چھاپ لے گی۔ اسی لیے میں درمیانی واسطہ ہوں...... مڈل مین۔"

"اور یہ تمام آئیڈیاز تمہارے اپنے ہیں؟" اس نے کہا۔

"اور تمہارے لیے کوئی جائے فرار نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تم سخت مشکل میں

پھنس چکی ہو۔"

وہ خاموش رہی۔

"اس چیکوسلاوک باشندے کا کیا نام تھا؟" میں نے پوچھا۔

"جین بارڈی جوف!"

"وہ چیکوسلاوک باشندہ اپنے ... سرخ یاقوتوں کی وجہ سے قتل ہوا تھا۔ رینڈی جورڈن اور تم دونوں ہی عملی طور پر اس ملک میں وہ واحد افراد تھے جن سے وہ واقف تھا۔ رینڈی جورڈن اس سے ان سرخ یاقوتوں کا سودا کر رہا تھا۔ جب وہ چیکوسلاوک باشندہ مردہ پایا گیا تو تم دونوں وہ پہلے افراد تھے پولیس جن کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ پھر تم نے غائب ہونے کا ڈراما رچایا اور پولیس کے لیے ایک مختصر سا کیوٹ پیغام چھوڑ گئیں جس میں لکھا تھا کہ وہ بیش قیمت یاقوت تم اپنے ساتھ لے جا رہی ہو۔ یہ تمام الزام تم نے اپنے ناتواں کاندھوں پر لے لیا تھا۔"

"اور رینڈی جورڈن کو بری الذمہ قرار دے دیا تھا۔" گریشیا نے مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"لیکن بات اس طرح نہیں بنی جس طرح تم چاہ رہی تھیں۔ پولیس ابھی بھی رینڈی پر شبہ کر رہی ہے۔ وہ بدستور اس کی نگرانی کر رہی ہے لیکن جب تک تم دونوں جدا جدا ہو، تم میں سے کوئی بھی ان بیش قیمت پتھروں کے حوالے سے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا جو قدر و قیمت کا حامل ہو۔ رینڈی جورڈن کے بغیر تم ان یاقوتوں کو کہیں ٹھکانے نہیں لگا سکتیں۔ اور رینڈی جورڈن کسی ایسی شے کو فروخت نہیں کر سکتا جو اس کی تحویل میں نہ ہو۔"

یہ سن کر گریشیا کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھر آئی لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں نے یہ بات نوٹ کی کہ اس نے اپنا گلاس دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

"مجھے اس چیکوسلاوک باشندے کے بارے میں مختصراً بتاؤ جسے قتل کیا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تم کیا جاننا چاہتے ہو؟" اس نے آہستگی سے کہا۔

"وہی کچھ جو تم اس کے بارے میں جانتی ہو۔"

"جین بارڈی جوف چیکوسلواکیہ کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ جب کمیونسٹوں نے چیکوسلواکیہ پر قبضہ کیا تو وہ ایک منزل قبل وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے پاس دودھیا قیمتی پتھروں کی ایک تھیلی بھی تھی۔"

"واقعی وہ ایک بڑا اسمگلر تھا۔" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "پھر وہ دودھیا پتھر یاقوتوں میں کس طرح اور کہاں تبدیل ہوئے؟"

"برما میں۔ بارڈی جوف چیکوسلواکیہ سے مشرق کی سمت فرار ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ برما میں یاقوت کے مقابلے میں دودھیا پتھر اوپل نایاب مانا جاتا ہے۔ بارڈی جوف نے کسی نہ کسی طرح ایک حکمران سے ملاقات کر کے اوپلو کے عوض اس سے یاقوتوں کا تبادلہ کر لیا۔ یہ سب اس نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کیا تھا۔ پھر وہ ان یاقوتوں کو اسمگل کر کے امریکا لے آیا جن کی مالیت تیس ملین ڈالرز تھی۔"

"پھر اس نے جورڈن اینڈ کمپنی سے رابطہ کیا۔ اس امید پر کہ وہ ان اسمگل شدہ یاقوتوں کو اس کے ہاتھ فروخت کر دے گا۔" میں نے گریشیا کی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سودے بازی میں اسے اپنی جان کی قیمت بھی ادا کرنی پڑ جائے گی۔"

گریشیا یہ سن کر غصے میں آ گئی۔ "اس نے ایک غیر معمولی قیمت طلب کی تھی اور جیولرز کبھی نقصان کا سودا نہیں کرتے۔"

"سو جورڈن اور تم نے معمول کے مطابق سودا چکا لیا۔ تم نے سو فیصد منافع پر وہ یاقوت حاصل کر لیے۔ لیکن اب قدرے ایک قسم کی رکاوٹ پیش آ رہی ہے۔ لیکن اس معاملے کو سلجھانے کے لیے میں درمیان میں آ گیا ہوں۔ اسے سلجھانے کا آغاز کرنے کے لیے تم وہ یاقوت مجھے دے دو!"

"میں؟" گریشیا کے ہاتھ سے گلاس چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔ "وہ تو میرے پاس نہیں ہیں۔"

اب بھویں اچکانے کی باری میری تھی۔ لیکن میں نے اپنی اس اچانک حیرانی کو چھپانے کی کوشش کی اور طنزیہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ہنی، یہ کوئی راز نہیں ہے۔ جورڈن کا کہنا ہے کہ یاقوت اس کے پاس نہیں ہیں۔ امریکا کی بارہ ریاستیں تمہارے بارے میں جانتی ہیں۔ تو پھر مجھ سے یہ شرماہٹ کیوں ہو رہی ہے؟"

گریشیا نے یہ سن کر ایک جھٹکے سے اپنا گلاس نیچے رکھ دیا۔ "لیکن وہ یاقوت میرے پاس نہیں ہیں۔ میں تو صرف اس لیے فرار ہوئی تھی کہ رینڈی اس الزام سے مبرا ہو جائے۔ یہی سچ ہے، رچرڈ۔ جب پولیس رینڈی کی تلاش ختم کر دے گی تو میں دوبارہ اس سے جا ملوں گی اور ہم دونوں یہ ملک چھوڑ دیں گے۔ یاقوت اسی کے پاس ہیں۔"

"مجھے اس بات کی خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔ "وہ یاقوت جس کسی کے پاس ہیں وہ اس چیکوسلاوک باشندے کا قاتل ہے۔ میں تمہیں اس الزام سے پاک دیکھنا چاہتا ہوں

لیکن مجھ سے بیڈمنٹن کی شٹل کے مانند ہوا میں اچھالنے کا کھیل مت کھیلو گریشیا! تم اس کھیل کھیلنے کی پوزیشن میں قطعی نہیں ہو۔ پولیس کو چل دینے کے مقابلے میں تم اس معاملے میں بری طرح پھنس چکی ہو۔"

یہ سن کر گریشیا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "تم آخر کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"جورڈن تمہیں صرف ایکس کے مانند کراس کرنے کی پلاننگ کررہا ہے۔"

"کیا؟"

"جورڈن یاقوتوں کو ٹھکانے لگانے کے ساتھ ساتھ خود کو ہر الزام سے مبرا بھی ٹھہرانا چاہتا ہے۔ وہ چیکو سلاوک کے قتل کے الزام میں تمہیں پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔"

"وہ ایسا ہرگز نہیں کرسکتا، میں اس سے بات......"

"تم بات کرنے کے قابل ہی کہاں رہو گی...... اس لیے کہ لاش بات نہیں کرسکتی۔"

یہ سن کر وہ اپنے خیالوں میں الجھ گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اچانک مرجھا گئی ہو۔ پھر اس کے چہرے کی رنگت لیموں کے چھلکے کے مانند زرد پڑ گئی۔ اس کے پورے جسم نے جس طرح جھٹکا کھایا اس پر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی کہ میں نے اسے اس طرح صدمہ کیوں پہنچایا۔

اس کے دانت کٹکٹانے لگے۔ "تمہارا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا، رچرڈ۔" میں نے بھانپ لیا کہ اس کی قوتِ مدافعت جواب دینے والی ہے۔ اس کی بے توجہی اور سخت گیری ایک خول تھا جو اس نے اپنے اوپر چڑھایا ہوا تھا۔

"مجھے کہا گیا تھا کہ میں تمہیں آج رات اس ہوٹل میں لے جاؤں اور تمہیں یاقوت حوالے کرنے پر مجبور کردوں۔ ایک بار جب وہ جورڈن کے قبضے میں آجائیں گے تو وہ جانتا ہے کہ وہ کب اور کہاں تمہیں اپنے شکنجے میں جکڑ سکتا ہے۔ پھر تم اپنا کام تمام سمجھو! تم مردہ پائی جاؤ گی جیسے کہ تم نے خود اپنے آپ کو ہلاک کرلیا ہو اور اضافے کے طور پر تمہارے اطراف میں چند ایک یاقوت بھی بکھرے ہوئے پائے جائیں......"

"رچرڈ، میرے ساتھ ایسا کچھ کرنے میں تم اس کی کوئی مدد نہیں کرو گے۔"

"مجھے زبردستی ایسا کرنے پر مجبور کیا جارہا تھا۔ جورڈن نے مجھے تمہارا حلیہ تفصیل سے بتادیا تھا اور ان لوگوں نے تمام پولیس اسٹیشنز کو جو دستی اشتہار بھیجے ہیں اس میں بھی تمہارا تفصیلی حلیہ درج ہے۔ میں نے ذہن نشین کرلیا تھا کہ تم دیکھنے میں کیسی لگتی ہوگی۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی تمہارے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا، گریشیا! جب میں نے تمہیں بس سے اترتے ہوئے دیکھا تو میں نے اسی وقت اپنا ذاتی منصوبہ بنانا شروع کردیا تھا۔"

اس نے مجھے ان نگاہوں سے دیکھا جیسے میرا قد اچانک دگنا ہوگیا ہو۔ "رینڈی کے پاس تمہارے خلاف اتنا کچھ مواد ہوگا جو اس نے تمہیں اس کام کے لیے مجبور کردیا۔ اور تم نے تو اپنے بارے میں ابھی تک کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"ہاں۔" میں نے بددلی سے کہا۔ "میرے بارے میں اس کے پاس مواد ہے۔"

لیکن میں نے یہ بات اپنے آپ تک محدود رکھی تھی۔ میں اسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ جورڈن یہ بات جانتا تھا کہ جیولری کے کاروبار میں میرے اپنے رابطے بھی تھے...... مشکوک اور بدنام لوگوں سے۔ پارک ایونیو کا دولت مند طبقہ کئی بار اپنے چوری شدہ جواہرات کی بازیابی کے لیے میری خدمات حاصل کرچکا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ مجھے قیمتی پتھروں کی پرکھ میں خاصی مہارت حاصل تھی۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ بھی کہ میرے زیرِ زمین مجرموں کی دنیا سے کچھ رابطے بھی تھے اور بیمہ کمپنیوں کے ساتھ بھی!

پھر ایک پرائیویٹ تفتیشی سراغ رساں کے بجائے میں ایک ثالث بن جاتا تھا۔ تمام متعلقہ پارٹیوں سے ملاقات کے بعد میں ایک ایسا سودا طے کرلیتا تھا جس کی رو سے چوری شدہ جواہرات اس کے اصل مالک کو پانچ سے دس لاکھ ڈالرز کے عوض واپس فروخت کردیے جاتے تھے۔ مجھے بھی اس رقم کا ایک معقول حصہ بطور فیس مل جاتا تھا۔ چوری شدہ جواہرات کا اصل مالک چوری کے واقعے کو فراموش کردیتا تھا اور پولیس بھی اس سودے سے لاعلم رہتی تھی۔

یہ تعاون کے بدلے منافع میں حصے داری کا پرانا طریقہ تھا۔

جورڈن نے فون پر مجھ سے کہا تھا۔ "میں ان آدمیوں کو بخوبی جانتا ہوں۔ جنہیں تم نے جواہرات کی چوری کے کیس میں ناجائز طور پر راز میں رہنے دیا تھا، رچرڈ! وہ لوگ اس وقت تمہارے بارے میں کیا سوچیں گے جب ان کے ناموں کی فہرست پولیس کی تحویل میں آجائے گی؟"

"پولیس کو کبھی بھی ان کی بھنک تک نہیں مل سکتی، جورڈن۔" میں نے جواب دیا تھا۔ "زیادہ عرصہ نہیں ہوا، مجھے اپنی زبان بند رکھنے کی وجہ سے چھ ماہ جیل میں گزارنے پڑے تھے۔"

تب جورڈن بولا تھا۔ "تمہیں اس معاملے میں میرے

اور گریشیا والٹ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ ورنہ تمہیں اس سے کہیں زیادہ لمبے عرصے کے لیے اپنی زبان بند رکھنا پڑے گی۔"

سو مجھے گریشیا والٹ سے ملاقات کرنے کی ہامی بھرنا پڑی۔ میرے پاس جورڈن کی خواہش کی تعمیل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

اور اب میں جورڈن کو ڈبل کراس کرنے کا سوچ رہا تھا۔

میرے اس بڑے سے اکلوتے کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گریشیا میرے کچھ کہنے کا انتظار کررہی تھی۔ بند کھڑکی کے شیشوں پر مسلسل بارش گرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہ ایک اچھی رات نہیں کہی جاسکتی تھی۔

بالآخر یہ خاموشی میں نے توڑ دی۔ "یہ پہلوتہی کا کھیل اب ختم کرتے ہیں، ہنی۔" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یاقوت تمہارے پاس ہیں اور چوری کے مال کے خریدار میرے پاس۔ میں ان یاقوتوں کو ٹھکانے لگادوں گا۔ پھر میں اور تم ہوں گے اور بیونس آئرس۔"

اس کے ہونٹ یوں پھڑکنے لگے جیسے وہ مجھ پر ہنسنے کی کوشش کو دبا رہی ہو۔ "کیا تم پاگل ہو؟ کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ایسا کچھ کرکے تم بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاؤ گے؟"

"وہ یاقوت مجھے دے دو، ہنی۔ ضد مت کرو۔ اگر مجھے تمہاری تلاشی لینا پڑی تو مجھے بہت لطف آئے گا لیکن شاید تمہیں لطف نہ آئے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس مرتبہ اس کے ہونٹوں پر کوئی ہنسی نہیں آئی۔ اس کی آنکھوں میں سرد شعلے لپکنے لگے۔ "یاقوت میرے پاس نہیں ہیں۔"

میں نے اس کے پیر کو آرام کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے ایک طرف کردیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں ہمیشہ سے ایک جنٹلمین رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تلاشی کا آغاز تمہارے سامان سے کروں گا۔"

میں اس کے سوٹ کیس پر جھک گیا۔

وہ تلملاتے ہوئے گھوم گئی۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور اس میں سے اعشاریہ تین آٹھ کا ایک آٹومیٹک ریوالور باہر نکال لیا۔ ساتھ ہی اس کی نال کا رخ میری جانب کردیا۔

اب صرف اس کے ٹریگر دبانے کی دیر تھی۔ پھر میری پیشانی پر ایک تیسری آنکھ ابھر آتی۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے جسم کے تمام اعضا پھڑکنا شروع ہوگئے ہوں۔ لیکن میں نے ظاہری طور پر ایسا محسوس نہیں ہونے دیا۔ میں بولا۔ "تم کوئی گولی نہیں چلاؤ گی، ہنی! تم قتل کے الزام میں مطلوب ہو اور تم اپنے ان ننگے پیروں کے ساتھ تمہارے خیال میں کتنی دور تک بھاگ سکو گی؟ یا پھر اپنے پیر ان گیلے جوتوں میں گھسیڑنے کی کوشش کرتی رہنا جب تک پولیس سیڑھیوں سے دندناتی ہوئی یہاں اوپر پہنچ جائے گی۔ اس لیے ریوالور کو نیچے رکھ دو، ہنی!"

اب میں اس کے اتنے نزدیک پہنچ چکا تھا کہ اس کے ہاتھ سے ریوالور لے سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں براہ راست میری آنکھوں پر مرکوز تھیں۔ میں نے اسی عالم میں اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

گریشیا نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور بازو ڈھیلے انداز میں نیچے گرالیا جیسے کہ وہ اپنی ناتوانی پر شرمندہ ہو۔

میں نے ریوالور کا آٹومیٹک سلائڈ ایک جھٹکے سے پیچھے کھسکا دیا۔ تانبے کی رنگت کا ایک چمکدار کارتوس بیرل میں فٹ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سلائڈ کو دوبارہ واپس کھسکا دیا اور آٹومیٹک ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"سامان کی تلاشی۔" میں نے کہا۔ "یہ کام تم خود کروگی یا تم چاہتی ہو کہ میں تلاشی لوں؟"

وہ کرسی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ننگے پیروں آگے بڑھ گئی۔ اس نے اپنا سوٹ کیس کھولا اور اس میں موجود ہر شے باہر نکال دی۔ پھر اس نے اپنا ہینڈ بیگ بھی خالی کردیا۔ لیکن مجھے وہ یاقوت کہیں دکھائی نہیں دیے۔

تب وہ مجھے دکھ بھری نظروں سے دیر تک دیکھتی رہی جیسے اسے سخت صدمہ پہنچا ہو...... پشم تراش بھیڑ کے مانند!

میں نے اپنے چڑچڑے پن کو چھپانے کی کوشش کی جیسے میں کسی الجھن میں تھا۔ "اگر تم نے وہ یاقوت کہیں اور چھپائے ہوئے نہیں ہیں تو پھر یقیناً وہ جورڈن کے پاس ہی ہوں گے۔"

"بس یہ آخری بار تھا۔ اگر عورت کوئی بات کہہ رہی ہو تو اس پر یقین کرلینا چاہیے۔" گریشیا نے تائیدی لہجے میں کہا۔

"آل رائٹ ہنی! میں قائل ہوگیا۔ لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ تمہارا کام ختم ہوگیا۔ ہم اب بھی ارجنٹائن جاسکتے ہیں۔ لیکن پہلے ہمیں جورڈن سے وہ یاقوت حاصل کرنا ضروری ہیں۔"

وہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "تم نے اس کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا ہے اس کے بعد میں اس سے دوبارہ پھر کبھی بھی ملنا نہیں چاہوں گی۔ میں بس یہاں سے بچ نکلنا چاہتی ہوں۔ اب میری یہی خواہش ہے۔"

"میں بھی بچ نکلنا چاہتا ہوں۔" میں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں اتنا ناتجربہ کار بھی نہیں ہوں کہ ان چوری شدہ ہیروں کے بغیر خالی ہاتھ چلا جاؤں۔"

"لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں، رچرڈ؟ وہ ان یاقوتوں کو خود سے کبھی جدا نہیں ہونے دے گا۔" گریشیا نے کہا۔

"کیا کوشش کرنے میں کوئی حرج ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ جورڈن آج رات کہاں ہوگا۔ اگر تم اسے ہوشیار کیے بغیر اچانک وہاں پہنچ جاؤ تو وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کے قابل نہیں ہوگا۔ پولیس اس کے بہت زیادہ قریب ہوگی اور میں بھی تم سے زیادہ پیچھے نہیں ہوں گا۔ ہم دونوں مل کر اس سے یاقوت نکلوانے کی کوشش کریں گے۔"

وہ یہ سن کر جھکتے ہوئے انداز میں دوبارہ دھب سے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور اسے گھورنے لگی۔ مشروب کی برف اب پگھل چکی تھی اور اس کے ہاتھوں کی تپش سے مشروب گرم ہونے لگا تھا۔ پھر اس نے اپنی بلیو گرین آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ "کیا تمہارے خیال سے واقعی ہم یہ کر سکتے ہیں؟"

"یقیناً۔" میں نے جواب دیا۔

☆☆☆

رینی جورڈن فورٹیتھ اسٹریٹ پر واقع ہیرو ٹاور کی اکیسویں منزل پر اپنے دفتر میں موجود تھا۔ اسے رات گئے دیر تک وہاں موجود رہنا تھا کیونکہ وہ میری رپورٹ کا منتظر تھا۔

بارش کا سلسلہ ابھی بھی جاری تھا۔ میں اور گریشیا عمارت کے داخلی حصے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ جورڈن تک پہنچنے کے لیے میں نے کوئی خاص حکمتِ عملی پلان نہیں کی تھی۔ میرا زیادہ تر انحصار اپنی قسمت اور گریشیا کی قدرتی حیلہ سازی پر تھا۔

عمارت کی لابی کے سیاہ ماربل پر میں نے دو آدمیوں کو منڈلاتے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں پولیس کے سراغ رساں تھے جو جورڈن پر نظر رکھے ہوئے تے۔ ہمیں اندر داخل ہونے کے لیے ان کے پاس سے گزرنا پڑتا۔ ہم ان کی نظروں میں آئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

میں نے گریشیا کو اس وقت تک باہر رکنے کو کہا جب تک میں اندر جا کر ان دونوں کی توجہ دوسری جانب مبذول نہ کرالوں۔ تب وہ تیزی سے چوری چھپے لابی سے گزر کر عقبی سروس لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچ جائے۔ اس دوران جتنی جلدی ممکن ہو سکے گا میں بھی اس کے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گا۔

میں نے گریشیا کو باہر بارش میں چھوڑ دیا اور سرسری انداز میں دروازہ کھول کر عمارت میں داخل ہوگیا۔

میرے اندر قدم رکھتے ہی وہ دونوں سراغ رساں فوراً مجھ میں دلچسپی لینے لگے۔ میں نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا جو سنگ مرمر کی دھاری دار دیوار سے کہنی ٹکائے کھڑا ہوا تھا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ نمایاں تھے اور یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں دوسروں کو ایذا پہنچا کر تسکین ہوتی ہے۔

وہ مجھے جانتا تھا۔ مجھے اس کے کردار کے مطابق عمل کرنا تھا۔

"اٹھارویں منزل پر۔" میں نے جواب دیا۔ "رات کا چوکیدار کہاں ہے؟ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا۔"

"وہ نیچے بوائلر روم میں کھانا کھا کر سستا رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے قریب سے غور سے دیکھا۔ "رچرڈ، یہ تم ہو نا؟"

"اور تم کریگ ہو۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں کا لہجہ پرانے شناساؤں کے مانند ہرگز نہیں تھا۔

"تم اوپر کس لیے جانا چاہتے ہو، رچرڈ؟"

"میری ماں وہاں کام کرتی ہے۔"

"کیا کام کرتی ہے؟"

"فرش کو دھوتی اور اس پر پوچا لگاتی ہے۔"

کریگ ترش روئی سے ہنس دیا۔ "جب وہ اپنے پوچے کو نچوڑے گی تو کیا تم اس کے لیے بالٹی تھامنے کے لیے جا رہے ہو؟"

میں ان دونوں سراغ رسانوں کے بالکل نزدیک کھڑا ہوا تھا۔ "میں اس سے کچھ پیسے ادھار لینے کے لیے جا رہا ہوں۔ کیا یہ بات خلافِ قانون ہے، اسکل بسٹر؟"

"تم اس ٹائپ کے لوگوں میں سے ہو جو اپنی ماں کو فرش کی صفائی کرنے اور اس پر پوچا لگانے کے کام پر مجبور کر دیتے ہیں۔" کریگ نے بدمزاجی سے کہا۔

"اور تم اس ٹائپ کے آدمی ہو جس کے چہرے کے نقوش بہتر ہو سکتے ہیں اگر ہونٹ پھولے ہوئے ہوں۔ میں اس ویک اینڈ کو نہیں بھولا ہوں جو ہم نے گزارا تھا، کریگ۔ تم وہ شخص تھے جس کے ہاتھ میں ربر کا پائپ تھا۔ وہ مجھے محسوس تو ہوتا تھا لیکن اس نے میرے جسم پر کسی قسم کا نشان نہیں چھوڑا

تھا۔ تم ہی وہ شخص تھے جس نے یہ تجویز دی تھی کہ مجھے پانی سے محروم رکھا جائے جبکہ برابر کے کمرے میں نلکے سے پانی گرتا رہتا تھا۔ تم ہی وہ شخص تھے جس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر مجھے اڑتالیس گھنٹے تک سونے نہ دیا جائے تو یہ زیادہ لطف کی بات ہوگی۔"

"میں کسی بھی وقت تمہیں لمبی نیند سلا کر اس کی تلافی کر دوں گا، رچرڈ۔" اس نے اپنا منہ بگاڑتے ہوئے کہا تو اس کا چہرہ مزید کرخت ہوگیا۔

اس دوران اس کا ساتھی بالکل چوکنا کھڑا تھا۔

"میں تمہیں اس قابل ہی نہیں سمجھتا بڑ بولے۔" میں نے جان بوجھ کر حقارت سے کہا۔ "نہ ہی تمہارے اس ساتھی کو......"

یہ سن کر اس کا ساتھی تن کر کھڑا ہوگیا۔ "میرا نام اونیل ہے۔" اس نے ڈرانے کے انداز میں کہا۔

تب میں نے ان دونوں کی جانب ان نظروں سے دیکھا جس سے سب کچھ ظاہر ہو رہا تھا ماسوائے ان پر تھوکنے کے۔ "تم دونوں مخبر ٹہلنے کے لیے پارک میں کیوں نہیں چلے جاتے تاکہ گھاس پر پھرنے والی چڑیوں کو بے جا مداخلت پر حراست میں لے سکو؟"

مجھے اپنے چہرے کے سامنے چار گھونسے اٹھتے دکھائی دیے۔ "تمہاری یہ مجال، ناہنجار!" کریگ غرایا۔

"کیا بات ہے، سستی مارے؟" میں نے اسے اشتعال دلاتے ہوئے کہا۔

تب مجھے یوں لگا جیسے میرے جبڑے کو پیانو کے تار سے جکڑ دیا گیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود بھی میں نے جبراً یہ الفاظ ادا کر دیے۔ "مجھ اکیلے کے مقابل تم دو ہو۔ کیا تم دونوں کے لیے یہی کافی نہیں ہے؟ کیا گھر جا کر پٹیوں میں جکڑے رہنا چاہتے ہو؟"

تب کریگ نے مجھے ضرب لگا دی۔ میں نے اس کے پنچ سے بچنے کے لیے جھکائی لی اور پچھلی جانب قلابازی کھاتے ہوئے ایمرجنسی زینے کی طرف چلا گیا۔ پھر لڑھکتے ہوئے زینے کی پہلی سیڑھی کے پاس اندھیرے میں پہنچ گیا۔ وہ دونوں بھی میرے پیچھے لپکے۔

کریگ کے پارٹنر اونیل نے بل ڈاگ شوز پہنے ہوئے تھے جن کے پنجوں پر تانبے کی پتری چڑھی ہوئی تھی۔ اور وہ ٹھوکر مارنے میں طاق تھا۔ ہر مرتبہ جب بھی اس کے جوتے کی دھاتی نوک میرے جسم کے نچلے حصے پر ضرب لگاتی تھی تو مجھے اپنی آنتیں حلق میں آتی محسوس ہوتی تھیں۔

میں ان کے گھمنڈ کو ٹھیس نہ پہنچانے کے لیے ان پر زیادہ طاقت سے جوابی ضرب نہیں لگا رہا تھا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے نیچے ٹینک میں پھینک دیں۔ میں ان کی بچکانہ توانائی کو زائل ہونے دینا چاہ رہا تھا۔

میں بار بار خود سے مسلسل یہی کہہ رہا تھا کہ تیس ملین ڈالر اور گریشیا والٹ کے عوض یہ قیامت کچھ اتنی زیادہ بھاری نہیں ہے۔ یہ خیال میرے درد کی شدت کو کم محسوس کرنے میں مدد دے رہا تھا۔ جب وہ دونوں نڈھال ہوگئے تو انہوں نے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔

"اٹھو!" اونیل نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "سیڑھی کا راستہ ناپو!"

میں وہیں لیٹا رہا۔ "تم رک کیوں گئے؟" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو میری صرف چار پسلیاں فریکچر ہوئی ہیں۔"

کریگ نے ایک جھٹکے سے مجھے اٹھالیا اور گھما کر دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا۔ "اب بھی اپنی بوڑھی ماں سے ملنے کے لیے جانا چاہتے ہو؟" اس نے درشتی سے دانت نکوستے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں اوپر لے جاؤں گا۔"

"پہلے اس کی تلاشی لو۔" اونیل نے کہا۔ "کوئی بھی ہتھیار لے کر اوپر نہیں جاسکتا۔"

کریگ میری جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ پھر ایک جیب میں موجود میرا ریوالور باہر نکال کر اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "اٹالین ہے۔" اس نے ریوالور سگار کاؤنٹر پر اچھال دیا۔ "جب تم واپس نیچے آؤ گے تو اسے لے لینا۔"

میں نے اس خوف سے دیوار کا سہارا نہ چھوڑا کہ کہیں میں نیچے نہ گر جاؤں۔ میں دیوار کے سہارے کھسکتا ہوا پہلی لفٹ کے پاس جا پہنچا۔ میں لفٹ میں داخل ہوا تو کریگ بھی میرے پیچھے اندر آگیا۔

لفٹ اٹھارویں منزل پر پہنچ کر رک گئی۔ میں لڑکھڑاتا ہوا لفٹ سے باہر آگیا۔ "کوئی ناراضگی نہیں!" کریگ نے بدستور دانت نکوستے ہوئے کہا۔

"قطعی نہیں کیونکہ اگلی بار جب ہماری ملاقات ہوگی تو بھی بات کہنے کی باری میری ہوگی۔" میں نے جواب دیا۔

لفٹ کا دروازہ ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بند ہوگیا۔

میں گھسٹتے ہوئے تین زینے عبور کر کے اکیسویں منزل تک جا پہنچا۔

جورڈن کے دفتر کا دروازہ بند تھا لیکن اس میں تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ مجھے دروازے کا تالا کھلا ملنے پر کوئی تشویش نہیں تھی

کیونکہ یہ بات میرے علم میں تھی کہ گریشیا کے پاس نہ صرف اس دفتر کی اپنی چابی موجود تھی بلکہ وہ اس دفتر کے اندرونی سیٹ اپ سے بھی بخوبی واقف تھی۔

میں دبے پاؤں گھسٹتے ہوئے جورڈن کے پرائیویٹ کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ وہ دروازہ بھی بند تھا۔ میں نے اپنے کان دروازے کے پینل سے لگا دیے اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے اندر سے کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دی۔

میرے اندازے کے مطابق اندر سے آوازیں آنی چاہیے تھیں۔ باتوں کی آوازیں، حرکات وسکنات کی آوازیں! مجھے یہاں اوپر آنے میں کتنی دیر لگی ہے؟ ہوسکتا ہے کہ جورڈن نے پہلے ہی گریشیا کو مار دیا ہو؟

میں نے دروازے کی ناب گھمائی۔ آواز بے حد باریک اور مہین تھی۔ پھر میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ پورا کھول دیا۔

گریشیا کھلے ہوئے دیوار گیر سیف کے پاس موجود تھی اور اس میں موجود نقدی کو مٹھیاں بھر بھر کے اپنے ہینڈ بیگ میں ٹھونس رہی تھی۔

میں نے اطراف میں دیکھا۔ آخر یہ جورڈن کہاں چلا گیا؟ دفتر میں کوئی اور بھی موجود نہیں تھا۔

کمرے کی کھڑکی چوپٹ کھلی ہوئی تھی اور اس کا گہرے رنگ کا بھاری پردہ تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اندر کی جانب لہرا رہا تھا۔ پردہ بارش کے پانی سے داغ دار بھی ہو چکا تھا۔

گریشیا دروازہ کھلنے پر میری جانب گھوم چکی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرانے لگی۔ ”کیا انہوں نے تمہیں بہت زیادہ تکلیف پہنچائی ہے، مائی ڈیئر؟“

اس سے پیشتر کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ”ہم اب کس طرح باہر نکلیں گے؟“

”ہمیں باہر نکلنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔“ میں نے بمشکل جواب دیا۔ سانس لیتے ہوئے میرے سینے سے دھونکنی کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں نے اپنی پسلیوں کے فریکچر کے بارے میں جو بات کہی تھی وہ کوئی مذاق نہیں تھا۔

گریشیا استفہامیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔

”جورڈن کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمیں ایک دوسرے سے کچھ زیادہ کہنا سننا نہیں پڑا۔ میں نے اسے اس کی مار سے بے ہوش کر دیا تھا۔“ گریشیا نے میز پر موجود اپنا آٹومیٹک ریوالور اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔ ”وہ اس کھڑکی کے راستے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اس کے پیچھے دو یاقوت بھی اچھال کر ضائع کر دیے تاکہ یوں لگے جیسے اس نے خود ہی کھڑکی سے چھلانگ لگائی ہو۔“ پھر اس کی آنکھیں دہکنے لگیں۔ ”وہ میرے ساتھ بالکل یہی کرنا چاہتا تھا! کیا تم نے کبھی ایسے آدمی کو دیکھا ہے جو بیس منزلوں سے نیچے جا گرا ہو؟“

میں اسے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی پاگل ہو یا پھر ہم دونوں ہی پاگل تھے۔ ”یاقوت تمہارے پاس تھے!“

اس نے رقم سے بھرا ہوا ہینڈ بیگ ایک کھٹکے سے بند کر دیا۔ ”مجھے سیف کے تالے کا کمبی نیشن معلوم تھا۔ میں نے سیف میں موجود تمام نقدی نکال لی ہے اور اسے صاف کر دیا ہے تاکہ جنوبی امریکا پہنچنے کے لیے ہمارے پاس خاصی رقم ہو جائے۔ اس کے بعد تم ان یاقوتوں کو ٹھکانے لگا دینا، ڈارلنگ!“

”ہم کہیں نہیں جائیں گے۔“ میں نے دروازے سے نکلنے کے راستے میں ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ اسے باہر نکلنے کے لیے مجھے راستے سے ہٹا کر جانا ہوگا۔ ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا تھا۔

اس کے آٹومیٹک ریوالور کا رخ جس جانب تھا اس راہ میں کوئی بھی شے بے نشانہ نہیں ہو سکتی تھی۔ ”تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا، رچرڈ۔ یاقوت فروخت کرنے کے لیے مجھے تمہاری ضرورت ہوگی۔ کم آن! وہ لوگ اب تک اس کی لاش دریافت کر چکے ہوں گے۔ وہ اوپر آ رہے ہوں گے۔“ پھر میری حالت کو دیکھتے ہوئے اس کے تاثرات نرم پڑ گئے۔ ”کیا ان آدمیوں میں سے کسی نے تمہاری کھوپڑی پر ٹھوکریں رسید کی ہیں؟“

”میں تمہارے ساتھ جانا چاہتا تھا، گریشیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میرا خیال تھا کہ تم ہر الزام سے پاک صاف ہو۔“ میں نے جواب دیا۔

”رچرڈ، پلیز! ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

”میں قتل کا الزام سر نہیں لے سکتا۔“ میں نے کہا۔

گریشیا کوئی کند ذہن لڑکی نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اب بات بالکل نہیں بنے گی۔

”میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔“ اس نے غصے سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

میں لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی جانب بڑھنے لگا۔

”تم گولی نہیں چلاؤ گی، گریشیا۔ آج ہی کی رات میں ایک بار پہلے بھی یہ ریوالور تمہارے ہاتھوں سے کوئی گولی چلائے بغیر

اپنی تحویل میں لے چکا ہوں۔"

"لیکن اس مرتبہ تم یہ ریوالور میرے ہاتھوں سے نہیں لے سکو گے۔" گریشیا نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

میں نے اس کے ریوالور کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے ٹریگر دبا دیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے داہنے شانے پر کسی نے ایک بڑے بھاری ہتھوڑے سے ضرب لگائی ہو۔ اس امپیکٹ کے نتیجے میں میرا جسم نصف گھوم گیا۔ مجھے زیادہ تکلیف محسوس نہیں ہوئی...... بس گولی کا زور تھا جس نے مجھے گھما دیا تھا۔ وہ یا تو میرے جسم کے کسی اہم عضو کا نشانہ لینا چاہتی تھی اور اتنی زیادہ اشتعال میں آگئی تھی کہ نشانہ چوک گیا یا پھر اسے مجھ سے کسی قسم کا جذباتی لگاؤ تھا اور وہ مجھے زندہ رہنے کا ایک موقع دینا چاہتی تھی۔

میں ایک بار پھر دروازے کی گزرگاہ میں چلا گیا اور اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"تم مزید کوئی فائر نہیں کرو گی۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

پھر میں نے سیدھا اس کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ مجھ سے جس حد تک ممکن ہو سکتا تھا، میں قدم اٹھا رہا تھا۔ جب ہمارے درمیان فاصلہ خاصا کم رہ گیا تو اس نے میرے پیٹ کا نشانہ لیتے ہوئے پاگلوں کے مانند ٹریگر دبانا شروع کر دیا۔ اس کے چہرے پر تشنج کی سی کیفیت تھی اور وہ گھناؤنی لگ رہی تھی۔

لیکن ریوالور میں سے اور کوئی گولی نہیں نکلی!

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے چھیننا چاہا۔ وہ پاگلوں کی سی طاقت کے ساتھ اس ریوالور سے چمٹی رہی اور مجھے پیچھے کی جانب فرش پر دھکیل دیا۔ میں اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا فرش پر گر پڑا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے اور جانوروں کے مانند آپس میں لڑ رہے تھے۔

میں نے تشدد سے پر کئی لڑائیاں دیکھی تھیں۔ مجھے اپاہج بنانے کے لیے وہ مجھ پر ہر قسم کی ایسی گندی ترکیبیں استعمال کر رہی تھی جو میں نے کبھی سنی بھی نہیں تھیں۔ لیکن میں نے اس کے آٹومیٹک ریوالور کو اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیا۔ لیکن اب مجھے اپنے شانے میں گولی کی موجودگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میرے شانے میں یوں جلن ہو رہی تھی جیسے شیطان نے دہکتا ہوا چمٹا میرے شانے میں پیوست کر دیا ہو۔

گریشیا کے تر بتر سنہری بال میرے منہ میں آنے کے ساتھ میری بینائی کو بھی دھندلا رہے تھے۔ پھر اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا سر پیچھے ہٹایا اور کچھ سننے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے بھی وہ آواز سن لی۔

وہ لفٹ کا دروازہ کھلنے کی گڑگڑاہٹ تھی۔

وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنے ہائی ہیل جوتے سے میرے چہرے پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ میں چکرا گیا اور لڑھکتا ہوا میز کے نیچے چلا گیا۔ البتہ میں نے گریشیا کے ریوالور پر اپنی گرفت مضبوطی سے قائم رکھی ہوئی تھی۔ وہ ریوالور اب میری تحویل میں تھا۔

جب میں نے اپنا سر دوبارہ اوپر اٹھایا اور میری آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دھند صاف ہو گئی تو میں نے اپنی نظریں جمانے کی کوشش کی۔ تب مجھے کریگ کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔

"یہاں کیا ہو رہا تھا؟" اس نے غراتے ہوئے پوچھا۔

"وہ سنہری زلفوں والی حسینہ!" میں نے ناتواں لہجے میں کہا۔ "کیا تم اسے مس کر گئے؟ وہ یقیناً زینے کے راستے دوڑتی ہوئی نیچے جا رہی ہو گی...... بیس منزلیں نیچے! وہ گریشیا والٹ ہے!"

"اگر وہ بھاگ رہی ہے تو بچ کر نہیں نکل پائے گی۔ وہ لابی ہی میں دھر لی جائے گی۔ سراغ رساں اونیل دیگر چند سپاہیوں کے ہمراہ وہاں موجود ہے۔" پھر وہ میری حالت کو دیکھتے ہوئے بے حسی سے ہنسنے لگا۔ "تمہیں کیا ہوا ہے؟ تمہاری حالت تو تقریباً ایسی ہی دکھائی دے رہی ہے جیسے اس شخص کی تھی جو ہمیں فٹ پاتھ پر نیچے گرا ہوا ملا ہے۔"

میں ریوالور کو ٹٹولنے لگا۔ "لعنت ہو۔" میں بڑبڑایا۔ "تم گریشیا والٹ کو اور اس چیکوسلاواک اسمگلر کے چوری شدہ یاقوتوں کو اپنی تحویل میں لے سکتے ہو، کریگ!"

اس دوران کریگ اپنا ریوالور بھی نکال چکا تھا۔ اس نے ریوالور میری جانب لہراتے ہوئے کہا۔ "اپنا ریوالور نیچے پھینک دو، ہرچرڈ!" اس کا انداز تحکمانہ تھا۔

میں نے ریوالور نیچے نہیں پھینکا۔ میں نے میگزین کے اسپرنگ کو جھٹکا دیا۔ مجھے اس کا کھٹکا ہٹانے کے لیے اپنی تمام تر رہی سہی طاقت صرف کرنا پڑ گئی۔

پھر میں نے کارتوس کا کلپ باہر کھینچ لیا۔

جب میں نے کلپ کو پلٹا اور اسے قالین پر جھٹکا تو کلپ میں سے جیسے سرخ رنگ کی بارش گرنا شروع ہو گئی...... یہ وہ چوری شدہ یاقوت تھے جو کلپ میں سے اتر رہے تھے۔

انٹرویو

سکندر عظیم

انٹرویو دینا کمال نہیں... انٹرویو لینا بھی ایک فن ہے... وہ دونوں فنکار تھے... اپنی اپنی جگہ کمالات دکھا رہے تھے... میزان کے دونوں پلڑوں کے مانند توازن برقرار رکھے ہوئے تھے... مگر کسی ایک کو تو جھکنا تھا... بالآخر ایک پلڑا متزلزل ہو گیا...

تہذیبی رشتے اور اقتدار سے جڑے ایک مصنف کا آخری یادگار انٹرویو

''تم آخر ہو کون؟ اور میرے گھر میں کیوں موجود ہو؟''

اپنی کوری دھمکی کے باوجود فریڈ بینز رعب دار نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ روب کا کپڑا گھسا ہوا تھا اور رُواں اُڑ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، شیو بڑھا ہوا تھا اور اس نے ہاتھ منہ بھی نہیں دھویا تھا۔

''میرا نام میلینی جونز ہے سر۔ آپ کے گھر میں یوں آدھمکنے پر میں معذرت خواہ ہوں لیکن آپ کے دروازے میں تالا نہیں لگا ہوا تھا۔''

"نہیں، تالا لگا ہوا تھا۔"

"تالے کی چابی صحیح طور پر چھپائی نہیں گئی تھی اس لیے تالے کا لگا ہونا یا نہ لگا ہونا ایک ہی بات تھی۔"

"تم میرے کچن میں میری کرسی پر کیوں بیٹھی ہوئی ہو؟"

"میں آپ کا انٹرویو لینا چاہتی ہوں۔ میں گریجویشن کی طالبہ ہوں۔"

"اوہ لارڈ! گریجویٹ اسکولوں نے شائستگی اور حسنِ اخلاق کے تقاضوں کو کب سے ترک کر دیا ہے؟ اور طالب علموں کو اس بات کی اجازت کب سے دی ہے کہ وہ زندہ رائٹرز کو فوکس کریں؟ تم کسی ایسے رائٹر پر ریسرچ کیوں نہیں کرتیں جو بحفاظت مر چکا ہو؟ جیسے شیکسپیئر؟"

"اس کی زندگی سے اس کے مرنے تک تمام کام مکمل ہو چکا ہے۔"

"ایملی ڈکنسن؟"

"گوشہ نشین۔ اس کی کوئی زندگی نہیں تھی۔"

"او کے۔ لیکن میں ہی کیوں؟"

"آپ شاذ و نادر ہی انٹرویو دیتے ہیں، سر۔ میں اپنی مطبوعات کی اشاعت بڑھانا چاہتی ہوں۔"

"یہ میرے گھر میں زبردستی گھس آنے کا کوئی جواز نہیں۔ تمہارا یہ جرم قابلِ معافی نہیں۔"

"میں نے چابی استعمال کی ہے۔"

"صبح صادق کے وقت۔"

"اس وقت دس بج چکے ہیں۔"

"اور تم مجھے میری صبح کی کافی پینے سے پہلے ہی للکار رہی ہو۔"

"میں آپ کی پسندیدہ کافی لے کر آئی ہوں...... کیرامل کی دو پچکاریں اور سوئے ملک کے ساتھ نصف دودھ ملی کافی۔"

فریڈ بیٹر، میلینی جونز کے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے یہ بات نوٹ کی کہ لڑکی کا لباس کسی لائبریرین کی طرح کا ہے اور اس نے اپنے بالوں میں گرہ لگائی ہوئی تھی۔ اس نے گرہ میں ایک پنسل اڑسی ہوئی تھی۔ لڑکی نے پیپر کپ میں موجود کافی کی جانب اشارہ کیا۔ فریڈ نے کافی کپ اٹھالیا اور آواز کے ساتھ سڑپ سڑپ پینے لگا۔

"تم مجھ سے کس بارے میں انٹرویو لینا چاہتی ہو؟ میری صحافیانہ کام کے متعلق یا دیگر تخلیقات کے بارے میں؟"

"اوہ، آپ کے فکشن کے بارے میں سر۔"

"وہ فکشن جو فکشن کہلاتا ہے یا وہ فکشن جو رپورٹنگ کہلاتا ہے؟" یہ کہہ کر فریڈ بیٹر نے ایک قہقہہ لگایا جیسے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ "تم تو جانتی ہو کہ میرے مرنے کے بیس سال بعد کوئی بھی میری تحریروں کو نہیں پڑھے گا، ہے نا؟ اس وقت رائٹنگ کا ایک سونامی آیا ہوا ہے۔ نثر کا جو حجم ہے اس میں سے حقیقی عمدہ تحریر کو چھانٹی کرنا تقریباً ناممکن ہے۔"

"میں اسی قسم کی باتوں کو اپنے انٹرویو میں شامل کرنا چاہتی ہوں۔" میلینی جونز نے کہا اور اپنے پرس میں سے ایک اسپائرل نوٹ بک نکالنے کے بعد اپنا قلم سنبھال لیا۔

فریڈ بیٹر ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

"آپ کے خیال میں ادبی تحریروں کا کیا مستقبل ہو گا؟" میلینی جونز نے پوچھا۔

"ویسا ہی جیسا کہ اب ہے۔ بیشتر تحریریں گھٹیا تھیں، ہیں اور مستقل ہوتی رہیں گی۔ جو مصنف مستقل مزاجی، توانائی صرف اور صرف محنت اور لگن کے ساتھ اپنی تحریر کو وقت دیں گے تو ان کا چانس بن سکتا ہے لیکن یقینی طور پر نہیں۔ ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایسا ادب تخلیق کر لیں جو کہ قابلِ مطالعہ ہو۔ رائٹرز کو ان کے کام سے شہرت کا عروج اور زوال مل سکتا ہے جنہیں اس بات سے ناکافی واقفیت ہوتی ہے کہ کیا ادب ہے اور کیا ادب نہیں ہے۔ ایک رائٹر کی حیثیت سے آپ کو اپنی تحریروں پر ہونے والے تبصروں کو نظرانداز کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور ان باتوں پر قائم رہنا ہوتا ہے جو بطور ایک آرٹسٹ اور ایک انسان آپ کو تحریک دلاتی اور لکھنے پر اکساتی ہیں۔ آپ کا کام کاغذ پر، الیکٹرانک ٹیبلٹ پر یا کسی اور چیز پر شائع ہوتا ہے، مجھے علم نہیں اور میں پروا بھی نہیں کرتا۔ اگر پبلشر مجھے اس کا معاوضہ دیتا ہے تو تب مجھے پروا ہوتی ہے۔"

"کیا آپ کے خیال میں آپ کو یاد رکھا جائے گا؟" میلینی جونز نے اگلا سوال کیا۔

"کوئی بھی رائٹر اس بات کا بدترین جج ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات میں ایسی کوئی چیز لکھ جاتا ہوں جو قاری کو جکڑ لیتی ہے۔ بعض اوقات میں ایسی کوئی چیز لکھ جاتا ہوں جس کا بنیادی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تحریر کی بے کیفی اور اکتاہٹ کی بنا پر لوگوں کو نیند آجاتی ہے۔ بعض اوقات میں ایک تحریر کا دوسری تحریر سے موازنہ نہیں کر پاتا۔ اگر میں نے معمول سے بہتر نمایاں اچھی خاصی نثر لکھی ہے کہ جس کو اپنی اہمیت کی بنا پر تحریری انگلش کی تاریخ میں زیریں حاشیہ میں جگہ مل سکتی ہے تو اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔" فریڈ بیٹر نے جواب

پے انگ گیسٹ

تاج محمد آنسو کراچی سے آئے تو ناظم آباد میں ایک واقف کار کے ہاں پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے مقیم ہوئے۔ واپسی پر دوستوں نے پوچھا۔

"پے انگ گیسٹ کسے کہتے ہیں؟"

"اس مہمان کو جو میزبان کو کھانے پینے اور قیام کرنے کا کرایہ ادا کرتا ہے۔"

"کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

"بس روزانہ صبح کو تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "چھ بجے صاحب خانہ نماز کے لیے بیدار ہوتا ہے اور وہ تمہیں سوتے سے جگا دیتا ہے۔ ساڑھے چھ بجے صاحب خانہ کی بیوی سو کر اٹھتی ہے اور وہ تمہیں جگا دیتی ہے۔ سات بجے اسکول جانے والے بچے بچیاں اٹھتے ہیں اور ان کی وجہ سے آنکھ کھل جاتی ہے۔ آٹھ بجے کالج جانے والے لڑکے لڑکیاں اٹھ کر جگا دیتے ہیں۔ ساڑھے آٹھ بجے دفتر جانے والا لڑکا اٹھتا ہے اور وہ جگا دیتا ہے۔ اس کے بعد راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے پھر کوئی نہیں اٹھتا؟"

"نہیں میرا مطلب ہے کہ اس کے بعد پورے بستر پر ہمارا قبضہ ہو جاتا ہے۔"

غیبی طاقت

شام کو گھر پہنچا تو نوکر نے بتایا کہ رباب رشیدی آئے تھے اور یہ کہہ کر گئے ہیں کہ کل چھ بجے والی ٹرین سے حضرت استاذ الشعراء رشیدی رامپوری جناب محشر عنایتی رامپور اور ماہرِ غالبیات حضرت عرشی رامپوری تشریف لا رہے ہیں اگر مناسب سمجھو تو ان حضرات کے استقبال کے لیے اسٹیشن پہنچ جاؤ۔ بھلا یہ کب ممکن تھا کہ حضرت استاد رشید رامپوری تشریف لائیں اور میں ان کی قدم بوسی کے لیے نہ پہنچوں۔ اس لیے حضرت استاد نہ صرف میرے استاد ہی تھے بلکہ میں انہیں اپنا دینوی استاد بھی مانتا ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ آج بھی جب کوئی مشکل وقت آن پڑتا ہے تو میں ان کا تصور کرتا ہوں اور وہ دنیائے جاودانی سے میری مشکل کو آسان کرتے ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ نوکر نے مجھے جب بتایا تو کچھ دیر کے لیے میں سوچ میں پڑ گیا کیونکہ اتنی صبح کوئی ٹرین بھی شہباز نگر سے شاہجہاں پور کو نہیں جاتی تھی لیکن حضرت استاد کی عقیدت سے دل بھرپور تھا اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح سویرے ہی پیدل چل کر شاہجہاں پور پہنچوں گا۔

رات کھانا قدرے جلدی کھا کر میں سونے کے لیے لیٹ گیا تاکہ آنکھ ٹھیک وقت پر کھل جائے۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ صبح ہو گئی ہے۔ لہٰذا جلدی سے اٹھا، کپڑے تبدیل کیے اور چل دیا۔ جب میں شہباز نگر کے اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر واقع بڑے تکیے میں پہنچا تو یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی غیبی طاقت مجھے پیچھے کی طرف دھکیل رہی ہے۔ میں نے کوئی دھیان نہیں دیا اور آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا لیکن اسی غیبی طاقت نے مجھے پھر پیچھے کی طرف دھکیلا۔ میں نے پھر آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا تو ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے اس زور سے میرے سینے پر دباؤ دینا شروع کیا کہ میں پیچھے کی طرف ہٹنے لگا۔ کچھ اس بات کے دباؤ اور کچھ دہشت اور خوف کی وجہ سے میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ میں پیچھے ہٹتا ہوا تکیے کی حد سے باہر آ گیا تو شاہجہاں پور کی جیل کے گھنٹے نے بارہ کے طویل گھنٹے بجانا شروع کر دیے۔ ان گھنٹوں کی آواز سن کر میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل رہا تھا اور اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ میں کائنات پر پھیلی ہوئی نکر چاندنی کو صبح سمجھ رہا تھا لہٰذا فوراً واپس گھر لوٹ آیا۔

میں رات کو ہونے والے واقعے سے بہت ہی خوف زدہ ہو گیا تھا لہٰذا حضرت استاد کی قدم بوسی کو نہ جا سکا۔ تقریباً نو بجے صبح معلوم ہوا کہ بڑے تکیے سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ٹھیک اسی وقت کہ جس وقت میں بڑے تکیے سے گزر رہا تھا، ڈاکوؤں نے چار راہ گیروں کو جو شاہجہاں پور سے شہباز نگر آ رہے تھے، جان سے مار ڈالا۔ شام کو میں استاد کی خدمت میں حاضر ہوا تو سارا واقعہ انہیں سنایا، انہوں نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ "رشیدی! باری تعالیٰ کی حمد و ثنا کیا کرو۔"

اس واقعے کو پندرہ سال گزر چکے ہیں لیکن میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں کہ وہ ہاتھ کس کا ہاتھ تھا جس نے مجھے اجل کے عفریت سے بچایا تھا!

کراچی سے دو یا نشم

دیا۔

”بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ کا کام اس لیے متاثر کن ہوتا ہے کہ آپ منشیات کا استعمال اور مے نوشی کرتے ہیں۔“

”اب وہ لوگ یہ بات کہتے ہیں؟ یہ بات تو وہ ہر اس رائٹر کے بارے میں بھی کہتے ہیں جو نشہ آور چیزوں کے استعمال سے پرہیز کرتا ہے۔ کیا یہی بات وہ خاص طور پر... ان تمام رائٹرز کے بارے میں نہیں کہتے جن کا تعلق آئرش ورثے سے ہے؟“

”ایک عرصہ ہو گیا آپ کی کوئی تحریر شائع نہیں ہوئی۔ میں نے پڑھا ہے کہ آپ ڈپریشن میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ بعض لوگ تو یہ تک خیال آرائی کرتے ہیں کہ آپ شاید اپنے آپ کو ہلاک کر لیں گے۔“

”ہیمنگوے یا پلاتھ کے مانند؟ وہ دونوں شدید ترین ڈپریشن کا شکار تھے۔ میں نہیں ہوں۔ بعض رائٹرز اپنی تمام نفس پرستی اور ذاتی شناخت کو بحیثیت رائٹر اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں۔ ایک بار پھر میں یہی کہوں گا کہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ حتیٰ کہ اگر اس سے میری کتابوں کی فروخت کو نقصان پہنچتا ہے تب بھی میرا خود کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ فریڈ بینز نے کہا۔ پھر قدرے چونکتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تمہارے آخری دو سوالوں کا لہجہ قطعی پسند نہیں آیا۔ یہ انٹرویو اب اختتام پذیر ہوا۔“

”ویری ویل۔“ میلینی جونز نے اپنا قلم اور نوٹ بک واپس اپنے پرس میں رکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے حقیقت میں اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ تم میرا انٹرویو کیوں لینا چاہتی تھیں۔ میں نے زیادہ انٹرویو بھی کبھی نہیں دیے کیونکہ کوئی بھی مجھ سے انٹرویو کے لیے نہیں کہتا۔ مجھ میں کسی کو زیادہ دلچسپی بھی نہیں ہے۔ تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ کوئی بھی پبلشر اس انٹرویو میں دلچسپی لے سکتا ہے؟“ فریڈ بینز نے پوچھا۔

”یہ آپ کا آخری انٹرویو ہوگا جو آپ نے اپنی ظاہری خودکشی سے پہلے دیا تھا۔“ میلینی نے کافی کے اس پیپر کپ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جس سے فریڈ بینز نے کافی پی تھی۔ ساتھ ہی وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

فریڈ بینز کی آنکھوں کے سامنے یکایک اندھیرا چھانے لگا اور پھر اس کا سر ڈائننگ ٹیبل پر ڈھلک گیا۔

معصوم لڑکی

سیریناراض

لگن ہو تو صحرا میں بھی پھول کھلائے جا سکتے ہیں... اور جب جان پر بنی ہو تو بڑے سے بڑے پربت کی چوٹی عبور ہو جاتی ہے... اسے بھی زندگی کی مشکلات نے جینا سکھا دیا تھا... مگر سمندر کا ماہر تیراک بننے کے لیے ان تھک جدوجہد درکار ہوتی ہے... حالات و تجربات نے بالآخر اسے مول تول کے گر سکھا ہی دیے... اور اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیا...

مغرب سے موصول شدہ ایک تیز رفتار کہانی کی جرم سازیاں......

کیریبین کی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتی ہوئی جینا ساحل پر کھڑی رالف اور جارج کی جانب متوجہ تھی۔ رالف نے سفید قمیص پہن رکھی تھی اور آنکھوں پر قیمتی دھوپ کا چشمہ تھا جبکہ جارج نے معمولی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں کشتی کے بارے میں راز و نیاز کر رہے تھے اور انہوں نے وقتی طور پر جینا کو مکمل فراموش کر دیا تھا۔ وہ ان باتوں کی عادی تھی۔ ہمیشہ اس کے ساتھ یہی ہوتا تھا۔ صرف جگہ بدل جاتی تھی۔

اس سے پہلے ہوٹل کے کمرے میں بھی اس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ رالف نے اس کا ہاتھ پکڑا اور غیر مہذب طریقے سے اس سے اظہارِ محبت کرنے لگا۔ اس کی آہ و زاری بھی رالف کو جارحیت سے باز نہ رکھ سکی۔ اس نے جینا کو بستر پر دھکیلا اور اپنے حیوانی جذبے کی تسکین کرنے لگا۔ جینا مزاحمت نہ کر سکی کیونکہ وہ پہلے ہی اس کی قیمت وصول کر چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ مطمئن اور پُرسکون نظر آنے لگا۔ جینا بستر کے دوسری طرف لیٹی اس کے سونے کا انتظار کر رہی تھی تاکہ وہ بھی تھوڑی سی نیند لے سکے پھر رالف نے بھونڈے پن سے اسے جگا دیا۔ وہ اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''اپنا سامان باندھ لو، صرف ضروری چیزیں لینا، ہم ابھی یہ جگہ چھوڑ رہے ہیں۔''

''اتنا اچانک......'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''میں نے کہا ہے ابھی۔'' وہ ترش لہجے میں بولا۔ ''اپنا پاسپورٹ لینا مت بھولنا۔ اب چلو۔''

اس طرح وہ اپنے مختصر ساز و سامان کے ساتھ ہوٹل سے روانہ ہو گئے۔ رالف کے پاس ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اور کپڑے رکھنے کے لیے سیاہ چرمی تھیلا تھا جبکہ جینا کے پاس تن کے کپڑوں اور پرس میں رکھی ذاتی اشیا کے سوا کچھ نہ تھا۔ گودی پر ان کی ملاقات جارج سے ہوئی۔ اس کے پاس ایک تیس فٹ لمبی کشتی تھی۔ شام ہو چکی تھی اور افق کے پار سورج نیچے جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا لیکن ان کی باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

بالآخر رالف پلٹا اور اس نے جینا کو ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ اس کے ساتھ کشتی پر چلی گئی۔ جارج نے رالف کی مدد سے کشتی کو سمندر میں اتارا جبکہ وہ ان سے کچھ فاصلے پر حیران و ششدر کھڑی تھی۔ اسے سمندر سے خوف آتا تھا اور وہ سی سک ہونے سے ڈر رہی تھی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی کیونکہ رالف پر اپنی کیفیت ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ شروع میں وہ رالف کی اسی طرح گرویدہ ہو گئی تھی جیسے ماضی میں اپنی زندگی میں آنے والے مردوں سے ہوتی تھی۔ وہ دیکھنے میں برا نہیں لگتا تھا اور نہ ہی اس کے پاس پیسے کی کوئی کمی تھی۔ وہ ان مردوں میں سے تھا جنہیں حکم چلانے اور عورتوں کو زیر کرنے میں خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اسے قابو کرنا بہت مشکل تھا لیکن وہ اب تک جتنے مردوں سے ملی تھی ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ دولت مند اور فیاض تھا۔

اس نے...... منہ دھویا اور اپنی پسندیدہ سی ڈی سننے بیٹھ گئی جس میں اس کی پسندیدہ گلوکارہ ایلا فٹز جیرالڈ کے مختلف گانے موجود تھے۔ وہ کیبن کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تختے پر بیٹھ گئی اور خود بھی گانوں کے بول گنگنانے لگی۔

کچھ دیر بعد اس نے کیبن میں گھٹن محسوس کی تو میوزک بند کر کے گہری سانس لی اور کیبن سے باہر آ گئی۔ رالف نے اس کی غیر حاضری پر کوئی توجہ نہیں دی۔

ایک محفوظ ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے رالف نے اچانک ہی اعلان کر دیا کہ وہ کچھ دیر سونا چاہتا ہے۔ اس نے جینا سے کہا کہ وہ اسٹیئرنگ سنبھال لے۔

''میں......!'' اس نے حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھتے ہوئے کہا جس کے نیلے پانی پر سورج کی شعاعوں کا سنہری عکس پڑ رہا تھا۔ ''کیا مجھے راستے میں آنے والی چٹانوں اور جھاڑیوں کا بھی خیال رکھنا ہو گا؟''

''نہیں، یہ راستہ بالکل صاف ہے بس تم ناک کی سیدھ میں چلتی رہو۔''

یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔ جینا نے کوشش کی کہ وہ اسٹیئرنگ کو زیادہ مضبوطی سے نہ پکڑے۔ کہیں اس کے جوڑ نہ دکھنے لگیں۔ وہ کسی حد تک پُرسکون تھی اور سمندر کی لہروں کے ساتھ چلنے میں اسے مزہ آ رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بحیرۂ روم میں ایک فرانسیسی سرمایہ دار کے بیٹے کے ساتھ سفر کیا تھا جو دوسری بندرگاہ پر ہی ایک نوجوان لڑکی کی خاطر اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یہ بھی غنیمت ہوا کہ اس نے نیو اور لینز کے مشہور گلوکار کی طرح اس کے چہرے پر زخم نہیں لگائے ورنہ اس حالت میں دوسرے شہر تک سفر کرنا مشکل ہو جاتا۔

اس کا اعتماد بحال ہونا شروع ہوا تھا کہ جارج اچانک اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا اور اسٹیئرنگ پکڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

''رالف نے کہا تھا۔'' وہ منمنائی۔

''کیا تم نے کشتی کا ایک طرف جھکاؤ محسوس نہیں کیا۔ اگر ایک منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو یہ کشتی الٹ سکتی تھی۔''

''مجھے افسوس ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہاری معذرت ہی کافی ہے۔''

جینا نے گہری سانس لی اور چہرے پر دلآویز مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی۔ ''مسٹر جارج! مجھ سے غلطی ہوئی۔ کیوں نہ ہم نئے سرے سے آغاز کریں۔ ممکن ہے کہ اس مرتبہ بہتر کوشش کر سکوں۔''

''میں کیوں یہ پریشانی مول لوں؟'' جارج نے بیزاری سے کہا۔

جینا نے زوردار قہقہہ لگایا اور اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے

بولی۔ ”ہم یہاں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔“

جارج کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے ناراضی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے اور رالف کے درمیان ہمیشہ سے ایک مفاہمت رہی ہے۔ میں اس کے لیے کشتی کا بندوبست کرتا ہوں لیکن اس کی داشتاؤں سے دوستانہ روابط قائم کرنا میرے کام کا حصہ نہیں۔ تم تو کسی دوسرے کے بازوؤں کا سہارا لے کر کہیں چلی جاؤ گی لیکن مجھے یہیں رہنا ہے۔“

جینا اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”داشتہ بہت سخت لفظ ہے۔ میں گزراوقات کے لیے اپنا جسم استعمال کرتی ہوں۔“

”تمہارے جیسی لڑکیاں اسی طرح کی باتیں کرتی ہیں۔“

”میں داشتہ نہیں بلکہ مہم جو ہوں۔“

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تم جیسی لڑکی دنیا کو اپنے پیچھے دیکھتی ہے اور رالف بھی یہی سمجھتا ہے کہ تم بہت اسمارٹ ہو۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، میں اسمارٹ ہوں۔ تم نے غور کیا ہوگا کہ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو بے وقوفوں کی طرح جدوجہد کرتی ہیں اور زندہ رہنے کے لیے سخت محنت کرتی ہیں۔“

جارج نتھنے پھلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کسی داشتہ سے اس کی ہستی کا اعتراف نہیں سنا۔ تم بہت ٹھنڈے مزاج کی ہو لیکن تمہارا انجام بھی دوسروں سے مختلف نہیں ہوگا۔ کسی بار میں تنہا بے یارومددگار پڑی ہوگی یا تمہاری لاش کسی گڑھے سے ملے گی۔“

”واہ، کیا خوب صورت تصورات ہیں تمہارے۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

”یا پھر فحش فلموں میں کام کرنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔“

”اوہ، میں شرط لگا سکتی ہوں مسٹر جارج......“

اسی وقت رالف وہاں آ گیا۔ اس نے ہاتھ میں بیئر کی بوتل پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے باری باری جارج اور جینا کو دیکھا اور بولا۔ ”میں کچھ بھول گیا تھا۔“

جینا نے اپنے بالوں کو پیچھے کیا اور رافق کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مسٹر جارج مجھے اپنی ایک کہانی سنا رہے تھے جس میں گڑھے کا ذکر بھی تھا۔“

جارج کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے اپنی توجہ اسٹیئرنگ پر مرکوز کرلی۔ رالف نے جینا کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا قریبی کرسی تک لے گیا۔ اس نے بیئر کی بوتل کھولی اور اس پر جھکتے ہوئے بڑبڑایا۔

”اس سے بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”جانتی ہوں۔ وہ میرے جانے کے بعد بھی یہاں رہ کر اپنی کشتی کو چمکاتا رہے گا۔ میں تو صرف اس سے دوستی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔“

”اگر تم سمجھتی ہو کہ اسے لبھا سکو گی تو تم اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔ اسے صرف کشتیاں اچھی لگتی ہیں اور وہ اس کشتی سے بھی بہت محبت کرتا ہے۔“

جینا نے جارج کی طرف دیکھا جو کسی محبوب کی طرح کشتی کا اسٹیئرنگ پکڑے ہوئے تھا اور اچانک ہی وہ اسے بہت سخت جان لگنے لگا لیکن وہ اس کی پہنچ سے دور نہیں تھا۔ سمندر میں گزارے ہوئے دن اسے بہت جلد بے کیف اور ایک جیسے لگنے لگے گو کہ راتیں بھی ویسی ہی تھیں لیکن رالف کی قربت اسے یکسانیت سے نجات دلا دیتی تھی گو کہ اس کے انداز سے اسے کراہیت محسوس ہوتی تھی لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اس کشتی میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔ جب اس نے رالف سے کہا کہ وہ کسی بندرگاہ پر چلے جہاں سے وہ اپنے لیے چند رسالے اور نیا لباس یا کم از کم نئی بکنی خرید سکے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا اور لہجے میں شدت آ گئی جس سے اس کی ناراضی کا اظہار ہوتا تھا۔

”میں تمہیں پہلے ہی خاموش رہنے کے لیے کہہ چکا ہوں۔“ اس نے ایک اور قیمتی بیئر کی بوتل کھولتے ہوئے کہا۔ ”جب میں کہوں گا تو ہم ساحل پر چلے جائیں گے۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو، مجھے بتا دینا۔ میں لادوں گا۔“

وہ خاموشی سے بیئر پیتا رہا اور جینا نے دوبارہ اپنی آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ چڑھا لیا اور وہ دونوں پوری دوپہر کوئی بات کیے بغیر سمندر کو دیکھتے رہے۔ جارج بالکل الگ تھلگ ہو گیا تھا لیکن اس کشتی پر کوئی پرائیویسی نہیں تھی۔ اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کو زیادہ دیر تک نظر انداز کر سکتے۔ کبھی کبھی جینا کو اس کی نگاہیں اپنے جسم میں پیوست ہوتی محسوس ہوتیں جب وہ عرشے پر چت لیٹی سن باتھ لے رہی ہوتی اور جب وہ اس سے نظریں ملانے کے لیے اپنا سر موڑتی تو وہ جلدی سے دوسری جانب دیکھنے لگتا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی اور رالف کی کیبن میں ہونے والی گفتگو سنتا ہے۔

اس روز وہ بہت حیران ہوئی جب جارج نے اسے تنہا پا کر گیلری میں پکڑ لیا۔ اس نے جینا کی کلائی پر اتنی مضبوط گرفت کی کہ اس کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ وہ درد کی شدت سے کراہتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تکلیف ہو رہی ہے مسٹر جارج۔“

اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کردی اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''سنو لڑکی! گو کہ ان چند ہفتوں میں میری تم سے اتنی زیادہ بے تکلفی نہیں ہوئی لیکن کچھ ایسی باتیں ہیں جو میں تمہاری بھلائی کے لیے بتانا چاہتا ہوں۔''

اس کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔ جینا نے قریب ہو کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اسے وہاں خوف کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''رالف نے کچھ بدمعاشوں سے ایک بڑی رقم لی تھی۔ جس میں سے کچھ اس نے نقدی کی صورت میں اپنے پاس رکھی ہوئی ہے اور اب وہ بھاگتا پھر رہا ہے۔ وہ فلائنگ ڈچ مین بن کر رہ گیا ہے۔ تم جانتی ہو وہ کون تھا۔ ایک جہاز کا کپتان جسے بددعا تھی کہ وہ کبھی خشکی پر قدم نہ رکھ سکے۔ وہ کسی بھوت کی طرح ہمیشہ ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ پر جاتا رہے۔ یہی حال رالف کا ہے۔ وہ ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے کی جانب بھاگ رہا ہے اور صرف ضروری سامان لینے کے لیے تھوڑی دیر رکتا ہے، ہم بھی اس کے ساتھ دوڑ رہے ہیں۔ ہم ان جزیروں کے درمیان سفر کرسکتے ہیں لیکن کسی ایک جگہ زیادہ دیر قیام نہیں کرسکتے کیونکہ وہ بدمعاش رالف کو تلاش کررہے ہیں۔ یقین جانو، وہ بہت ہی خطرناک لوگ ہیں۔ اگر رالف ان کے ہاتھ آگیا تو وہ اس کے ٹکڑے کرکے سمندر میں پھینک دیں گے تاکہ وہ مچھلیوں کی خوراک بن جائے۔ یہی سلوک وہ اس کے ساتھیوں کے ساتھ بھی کریں گے۔''

جینا اپنی کلائی مسلتے ہوئے بولی۔ ''اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میرے پاس کسی کا کوئی پیسا نہیں اور نہ ہی ان بُرے لوگوں کے بارے میں کچھ جانتی ہوں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنے طور پر فرض کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق کارروائی کرتے ہیں۔''

''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' وہ اس کے کندھوں کے عقب میں دیکھتے ہوئے بولی۔ گو کہ وہ جگہ بہت چھوٹی تھی لیکن اگر رالف نیچے آجاتا تو وہ فوراً ہی دیکھ لیے جاتے۔

''ہمارے پاس سامان ختم ہورہا ہے۔ آج رات کسی پورٹ پر لنگرانداز ہونے کا پروگرام ہے۔ کل صبح سورج نکلتے ہی دوبارہ سفر شروع کردیں گے۔ اس وقت تک میں یہاں نہیں ہوں گا۔ اگر تم تھوڑی سی ہوشیاری دکھاؤ تو ساحل پر پہنچ کر کوئی ٹیکسی پکڑ سکتی ہو جو تمہیں جزیرے کے دوسرے سرے پر واقع ہوائی جہازوں کے اڈے تک پہنچا دے گی۔ وہاں سے ہر روز صبح کے وقت اور دوپہر سے پہلے ایک چھوٹا جہاز پرواز کرتا ہے۔ تم پائلٹ کو وہ قیمت دے سکتی ہو جو تم جیسی لڑکی اس جیسے مرد کو دے سکتی ہے اور تم کل اس وقت یہاں سے سیکڑوں میل دور جاسکو گی۔''

''تم مجھے وارننگ کیوں دے رہے ہو، مسٹر جارج؟''

''جیسا کہ تم نے کہا کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اس کے باوجود تم اس سلوک کی مستحق نہیں جو وہ تمہارے ساتھ کریں گے اگر انہوں نے تمہیں رالف کے ساتھ پکڑ لیا۔ اسے تم میرے ضمیر کی آواز کہہ سکتی ہو۔''

میرا خیال ہے کہ تم نے اپنا فرض پورا کردیا مسٹر جارج۔ اس نے کہنا چاہا لیکن وہ پہلے ہی وہاں سے جاچکا تھا۔ وہ بھی اپنے کیبن میں چلی آئی اور تنہائی میں اس نے اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔ اس کی ماں زندہ تھی جسے اس نے کئی برسوں سے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا تھا۔ وہ چودہ سال کی تھی جب اس کا باپ مرگیا۔ اس وقت ان کے پاس بمشکل ایک ہزار ڈالر اور کچھ زیورات تھے۔ اس کی ماں مانگ تانگ کر گزارہ کرنے لگی۔ لیکن زندگی روز بروز مشکل ہوتی جارہی تھی۔ سولہ سال کی عمر میں وہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور اس نے ایک بینڈ کے ساتھ رہنا شروع کردیا۔ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرتے پھر اس کی ملاقات نیو اورلینز کے گلوکار سے ہوئی جو اسے بیماری کا تحفہ دے کر غائب ہوگیا۔ اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ساحلی علاقوں کا رخ کیا اور کاروباری لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے لگی۔

اب وہ یہ زندگی ترک کرنے اور کسی امیر شخص سے شادی کرنے کے لیے تیار تھی تاکہ ایک ہی مرتبہ ساری آسائشیں اس کی دسترس میں آجائیں۔ رالف اسے اس مقصد کے لیے مناسب لگا۔ اس کے پاس بہت پیسا تھا اور وہ اس سے اچھا برتاؤ کرتا تھا۔ وہ اسے اچھی لگتی تھی۔ گھر چھوڑنے کے بعد اس کا جتنے مردوں سے واسطہ پڑا، انہیں جاذب توجہ لڑکی نہیں چاہیے تھی بلکہ ایسی لڑکی کے خواہاں تھے جو اپنی زبان بند رکھے اور جو کہا جائے اس پر عمل کرے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ رالف اور دوسرے مرد اس کے مالک نہیں بلکہ وقتی ساتھی تھے۔

اس نے جانے کا فیصلہ تو کرلیا لیکن اس کے اعصاب پر سراسیمگی طاری تھی جبکہ اسے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنا تھا۔ وہ ساری دوپہر اپنے آپ کو جارج کی نظروں سے دور رکھنے کی کوشش کرتی رہی اور اس نے بیشتر وقت کیبن میں ہی گزارا۔ رات ہوئی تو رالف معمول کے مطابق مے نوشی میں

مشغول ہو گیا۔ جینا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بستر پر لے آئی۔
کچھ دیر بعد ہی رالف گہری نیند سو گیا لیکن وہ جاگتی رہی۔ جارج نے کہا تھا کہ رات میں کسی وقت کشتی مناسب مقام پر لنگر انداز ہو گی۔ وہ اسی وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ جب اسے اندازہ ہو گیا کہ کشتی ایک جگہ رک گئی ہے تو وہ بستر سے اٹھی۔ جلدی جلدی اپنی چیزیں سمیٹیں۔ جس میں اس کے کپڑے، پاسپورٹ اور تقریباً سو ڈالر شامل تھے۔ اس نے ان چیزوں کا بنڈل بنا کر ایک پلاسٹک بیگ میں رکھا۔ اس کے جسم پر صرف تیراکی کا لباس تھا۔ پھر اس کی نظر رالف کے تھیلے پر گئی جس میں سے اکثر وہ اپنے اخراجات کے لیے رقم نکالتا تھا۔ اس نے کھول کر دیکھا۔ وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا اور سب بیس، پچاس اور سو ڈالر کے پیکٹ تھے۔ وہ کچھ ہچکچائی۔ احتیاط پسندی کا تقاضا تھا کہ وہ دل کے کہنے پر عمل نہ کرے۔ اگر اس کی چوری پکڑی گئی تو رالف اسے قتل کر دے گا لیکن اتنے ڈھیر سارے نوٹ دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ ہر مالیت کا ایک ایک بنڈل نکال لے تو رالف کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ اس نے ہمت کر کے تین بنڈل نکالے۔ انہیں پلاسٹک بیگ میں ڈال کر اوپر سے مضبوط گرہ لگائی اور اس بیگ کو رالف کی بیلٹ کی مدد سے اپنی پشت پر باندھ لیا۔

وہ عرشے پر آئی تو جارج اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ پہلے ہی چھوٹی کشتی میں بیٹھ کر نکل گیا تھا۔ اس نے چوتھائی میل کے فاصلے پر ساحل کا معائنہ کیا۔ اسے بندرگاہ پر واقع شہر کی روشنیاں جگمگاتی ہوئی نظر آئیں۔ اس نے ساحل کی سمت ناک کی سیدھ میں تیر کر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جگہ شہر کی حدود سے ایک میل کے فاصلے پر ہو گی اور وہ پیدل چل کر بھی شہر میں داخل ہو سکتی ہے جہاں سے وہ ٹیکسی کے ذریعے جہازوں کے اڈے تک چلی جائے گی۔ اس طرح دوپہر سے پہلے وہ یہ شہر چھوڑ سکتی ہے۔ جب رالف بیدار ہو گا تو اس کا کچھ وقت جارج اور اسے ڈھونڈنے میں لگ جائے گا اور وہ یہی سمجھے گا کہ دونوں اکٹھے فرار ہوئے ہیں پھر وہ یہ سوچنے میں مزید وقت ضائع کرے گا کہ اب کیا کیا جائے اور جب وہ اپنا تھیلا کھول کر دیکھے گا تو پتا چلے گا کہ اس میں سے کچھ رقم غائب ہے لیکن شاید وہ اس معمولی رقم کی خاطر اس کا پیچھا نہ کرے۔ اگر وہ ساری دولت لے جاتی تو اور بات تھی۔ وہ ساحل پر زیادہ دیر رکنے کی ہمت نہیں کر سکتا جہاں ان بدمعاشوں کے ہاتھوں اس کے پکڑے جانے کا زیادہ امکان تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کندھے اچکا کر اس پورے واقعے کو نظرانداز کر دے۔ لنگر اٹھائے اور خود یہ کشتی چلا کر کسی دوسرے جزیرے کی طرف روانہ ہو جائے۔ مستقبل میں وہ ان بدمعاشوں کی پہنچ سے دور ہو سکتا ہے یا پھر وہ اسے تلاش کرنے کے بعد اس کے ٹکڑے کر کے سمندر میں پھینک دیں گے۔ صورت حال جو بھی ہو، رالف صرف اپنے بارے میں سوچے گا۔ جیسے ہی جہاز روانہ ہوا۔ جینا کی ساری پریشانی ختم ہو جائے گی۔ وہ اپنی جان بچا کر چلی آئی تھی اور اسے کچھ منافع بھی ہو گیا تھا۔ اگر وہ رالف کے ساتھ مزید رہتی تو وہ بدمعاش اسے بھی جان سے مار دیتے۔

وہ ایک اچھی تیراک تھی لیکن اس نے کبھی رات کے وقت کھلے سمندر میں اتنا فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ مارو یا مر جاؤ اور سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ وہ آہستہ آہستہ تیر رہی تھی تاکہ اپنی طاقت مجتمع رکھ سکے۔ اس نے کوشش کی کہ رالف کے بارے میں نہ سوچے جو اس وقت کشتی پر پڑا بے سدھ سو رہا ہو گا اور نہ ہی وہ ان سمندری جانوروں کے بارے میں سوچنا چاہ رہی تھی جو اپنے بڑے بڑے دانتوں سمیت کسی بھی وقت اس پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ بالآخر اس کے قدموں نے ریت کو چھو لیا۔ اس نے ایک قریبی چٹان کا سہارا لیا اور اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ جب اس کی سانس بحال ہوئی تو وہ ساحل کی طرف چل پڑی۔ درختوں کے جھنڈ کی آڑ میں اس نے لباس تبدیل کیا اور رالف کی بیلٹ کی مدد سے ریت میں ایک گڑھا کھود کر گیلا تیراکی کا لباس اس میں دبا دیا۔ اور شہر کی طرف جانے والی سڑک پر چل پڑی۔

اس سے غلطی ہوئی تھی اور وہ بندرگاہ سے شہر کے فاصلے کا صحیح تعین نہ کر سکی۔ وہ ایک میل کا فاصلہ طے کر چکی تھی لیکن شہر کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اب ڈھلوان سطح شروع ہو چکی تھی اور اسے قدم اٹھانے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ چوتھا میل شروع ہوا تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ راستے سے بھٹک چکی ہے۔ اس نے جب کشتی چھوڑی تو گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے۔ وہ اندازے سے تیرتی ہوئی ساحل کی طرف آئی لیکن جہاں اس کے قدم زمین کو چھوئے وہ جگہ شہر سے کافی فاصلے پر تھی۔

افق کے اس پار سورج پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اگر بروقت جہازوں کے اڈے پر نہ پہنچی تو جہاز چلا جائے گا۔ اسی اثنا میں ایک سیاہ سیڈان اس کے قریب آ کر رکی اور اس میں بیٹھے

ہوئے بہت ہی ہینڈسم شخص نے اسے لفٹ دینے کی پیشکش کی۔ جینا نے چند لمحے قبل ہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ جس راستے سے آئی ہے، اسی پر واپس چلی جائے۔ وہ ایک درخت کے سائے میں کھڑی ہوئی تھی جس کی شاخوں میں چھوٹے چھوٹے سرخ رنگ کے پھل لٹک رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ یہ پھل کھا سکتی ہے۔ ان کے کھانے سے کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا۔ وہ جس طرز کی زندگی گزار رہی تھی اس میں کافی عرصے سے اس نے اپنے کھانے پینے کے لیے کوئی خریداری نہیں کی تھی۔ اس کا بیشتر وقت بار اور کلب میں گزرتا تھا جہاں کوئی نہ کوئی مہربان اسے کھانے کی دعوت دے دیتا۔

وہ انہی خیالوں میں گم درخت کے نیچے کھڑی ہوئی تھی کہ سیڈان کار کی پچھلی سیٹ کا شیشہ نیچے ہوا۔ اندر بیٹھے ہینڈسم شخص نے دھوپ کے چشمے سے اس کا بغور جائزہ لیا اور بولا۔

”تم راستہ بھول گئی ہو۔“

وہ تھوڑا سا ہچکچائی پھر بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ یہی راستہ شہر کو جاتا ہے۔“

”سڑک تو یہی ہے لیکن تم غلط سمت میں جا رہی ہو۔“ اس شخص نے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے خوشی ہوگی کہ اگر تمہارے کام آسکوں۔“

اس نے جس انداز میں یہ جملہ ادا کیا تھا، اسے سن کر جینا کے بدن میں سنسنی ہونے لگی اور رالف اس کے لیے ماضی کی یاد بن کر رہ گیا۔ وہ چار میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہنچی تھی اور واپس جانے کے تصور سے ہی اس کے گھٹنوں میں درد ہونے لگا اور ویسے بھی اس کے لیے یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ وہ کسی اجنبی شخص کی پیشکش قبول کر رہی تھی۔

”ہاں۔“ اس نے چہرے پر قاتلانہ مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ بیٹھنا پسند کروں گی۔“

اس شخص نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور اگلے دروازے سے ایک مونچھوں والا شخص برآمد ہوا۔ وہ جینا کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر اس کے بیگ کی طرف بڑھا لیکن جینا نے اسے اپنی جانب کر لیا۔ تبھی اس ہینڈسم شخص نے عقبی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”کرسٹوز تمہارا بیگ بحفاظت ڈکی میں رکھ دے گا۔ تم میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔“

جینا نے بحالتِ مجبوری بیگ پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ جس میں اس کا پاسپورٹ، پسندیدہ گانوں کی سی ڈی اور وہ رقم تھی جو رالف اور اس سے پہلے شاید بدمعاشوں کی ملکیت تھی۔ اس کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی جب مونچھوں والا کرسٹوز گاڑی کے عقب میں گیا اور اسے پرس سمیت گاڑی میں دھکیل دیا۔ اندر کافی تنگی تھی۔ جینا نے اپنا ہیٹ اتارا اور نشست پر آرام سے بیٹھ گئی۔ وہ سیاہ شیشوں کے باہر کا منظر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شہر کی حدود شروع ہو چکی تھیں اور سڑک کے دونوں جانب مکانوں اور درختوں کی قطار نظر آرہی تھی۔ اس نے برابر بیٹھے ہوئے شخص سے کہا۔

”مجھے یہیں کہیں اتار دو۔ یہاں سے منزلِ مقصود تک جانے کے لیے ٹیکسی مل جائے گی۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔“

”یہاں سے تمہیں جہازوں کے اڈے تک جانے کے لیے کوئی سواری نہیں ملے گی جینا!“

جینا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یہ اجنبی اس کا نام کیسے جانتا ہے جبکہ اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ اگر تم مجھے یہیں اتار دو۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“

اس شخص نے اسے غور سے دیکھا۔ اچانک ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اب وہ پہلے کی طرح مہربان نظر نہیں آرہا تھا۔

جینا نے آگے بیٹھے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔ ”تمہارا شکریہ کرسٹوز۔ یہیں سڑک کے کنارے گاڑی روک دو۔ اگر تم ڈکی کھول سکو تو میں اپنا بیگ نکال لوں۔“

جیسے ہی گاڑی کی رفتار کم ہوئی، اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور باہر آگئی۔ جلدی میں وہ اپنا ہیٹ لینا بھی بھول گئی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی ڈکی کی طرف بڑھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں گاڑی دوبارہ نہ چل دے اور اسے ڈکی سے اپنی چیزیں نکالنے کی بھی مہلت نہ ملے لیکن اس کا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ کرسٹوز گاڑی سے باہر آیا اور اس کے برابر میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے کی رِنگ میں لگا ہوا ایک بٹن دبایا اور ڈکی کھل گئی۔

اندر جارج رسیوں سے بندھا گٹھڑی بنا ہوا پڑا تھا۔ اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ ڈکی کا دروازہ کھلنے سے سورج کی روشنی اندر داخل ہوئی تو اس کی دائیں آنکھ غیر ارادی طور پر جھپکنے لگی جبکہ بائیں آنکھ سوجن کے سبب بند تھی۔ سر کے بالوں سے لے کر ماتھے تک خون جما ہوا تھا اور برابر میں ہی جینا کا بیگ پڑا ہوا تھا۔

جینا کے لبوں پر ایک چیخ آن کر رک گئی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگیں۔ اس نے گہری سانس لی اور فرار کا راستہ ڈھونڈنے لگی۔ عین اس وقت کرسٹوز نے اسے پوری قوت سے ڈکی میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔ کار کی ڈکی میں آوازوں کا شور اس کی سماعت کو متاثر کر رہا تھا۔

گاڑی کے اندر آرام دہ نشست پر سفر کرتے ہوئے ٹائروں کی چرچراہٹ اور انجن کا شور سنائی نہیں دیتا۔ وہ تنگ جگہ میں جارج کے برابر سکڑ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی مڑی ہوئی ٹانگیں جارج کے پہلو سے ٹکرا رہی تھیں۔

اس نے ہیئر پن کی مدد سے جارج کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا ڈھیلا کیا۔ اس نے ذہن پر زور دے کر سوچا لیکن اس کے پرس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی مدد سے جارج کو رسیوں سے آزاد کرایا جا سکے۔ یہاں تک کہ ناخن ہموار کرنے کی ریتی بھی نہیں۔ اس کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھردرا اور موٹا تھا جسے کھولنے میں جینا کے ناخنوں کے گرد کی کھال پھٹ گئی اور اس کی انگلیوں سے خون رسنے لگا۔ ڈکی کے اندر بالکل تاریکی تھی۔ وہاں روشنی اور ہوا کا گزر نہیں تھا۔ اسے لگا جیسے وہ کسی تابوت میں بند ہے۔ یہ سوچ کر اس کا سر گھومنے لگا اور اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔

اس نے تاریکی سے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اور جان بوجھ کر آہستہ سانس لینے لگی۔ اس نے ریڑھ کی ہڈی سے اٹھنے والے درد کو نظرانداز کر دیا تھا جو اکڑوں بیٹھنے کی وجہ سے ہو رہا تھا پھر اس نے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے سانس لیا۔ گوکہ جارج کے منہ سے کپڑا ہٹ چکا تھا لیکن وہ خاموش رہا۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ جینا اس کی جانب جھکی اور اس کی کلائیوں کے گرد بندھی گرہیں کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔

کچھ دیر چلنے کے بعد کار اچانک ہی ایک جگہ رک گئی۔ جیسے ہی اس کا انجن بند ہوا تو جینا اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گئی۔ اس کی کھوپڑی میں جھنجھناہٹ ہونے لگی اور ہڈیوں میں سنسنی دوڑنے لگی۔ وہ تاریکی میں تیزی سے جارج کی گرہیں کھولنے لگی۔ جیسے ہی ڈکی کا ڈھکنا کھلا سورج کی روشنی اندر آئی اور وہ پلکیں جھپکائے ہوئے سامنے کھڑے ہوئے سیاہ فام کو دیکھنے لگی۔ اس شخص نے جینا کا بازو پکڑ کر اسے ڈکی سے باہر نکالا اور اس کے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے جو اس نے اپنے دفاع کے لیے سوچے تھے لیکن وہ اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ جیسے ہی اس کے قدم زمین سے لگے، اس نے اپنا بازو گھمایا اور سختی سے مٹھی بھینچ کر پوری قوت سے اس کے منہ پر گھونسا دے مارا۔ یوں لگا کہ جیسے وہ کسی چٹان سے ٹکرا گئی ہو۔ اس کے ہاتھ کی ہڈیاں چیخ کر رہ گئیں اور کلائی سے لے کر کندھے تک درد کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ کرسٹوز کا ردعمل متوقع تھا۔ گوکہ اس نے اپنی طرف سے ہلکا ہاتھ رسید کیا تھا لیکن اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا اور یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں کے آگے ستارے جگمگا رہے ہوں۔ وہ لڑکھڑائی اور کرسٹوز کی جانب جھک گئی۔ وہ پیچھے ہٹا تو وہ سڑک پر گر گئی۔ اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی تو کرسٹوز نے اسے ٹھوکر مار کر نیچے گرا دیا اور پاؤں اس کے جسم پر رکھ دیا۔ پھر کرسٹوز نے جارج کو بھی ڈکی سے باہر نکالا۔ جینا نے لیٹے لیٹے آنکھیں گھمائیں اور اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ سڑک کے کنارے دور تک پھیلا ہوا گھاس کا وسیع قطعہ تھا جس پر چھوٹے جہاز کے اترنے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی اور وہیں ایک دو نشستوں والا جہاز بھی کھڑا ہوا تھا۔ پھر اس کی نظر ایک سفید رنگ کے دو منزلہ مکان پر گئی جو کیلے کے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔

جارج بھی جینا کے برابر میں پڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے بھی بُری حالت میں تھا۔ جس جگہ سے جینا نے کپڑا ہٹایا تھا وہاں گہری خراشیں نظر آ رہی تھیں اور اس کی سوجی ہوئی آنکھ کے نیچے گومڑا ابھر آیا تھا جبکہ دانتوں پر بھی سرخ دھبے نظر آ رہے تھے۔ جینا کا پرس بھی اس کے ہاتھ کے پاس ہی آن گرا تھا۔ کرسٹوز نے جارج کے ہاتھ کھولنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اس نے اس کا کالر پکڑا اور اسے گھسیٹ کر چلنے لگا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے جینا کا بازو پکڑا اور انہیں گھر میں لے گیا۔

گھر کے اندرونی حصے میں خوشگوار خنکی چھائی ہوئی تھی۔ کرسٹوز انہیں سیڑھیوں کے ذریعے اوپر لے گیا جہاں ایک جوان عورت نے دروازہ کھولا اور انہیں راستہ دینے کے لیے خود ایک طرف ہو گئی۔ اس پر نظر پڑتے ہی جینا کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کس قماش کی عورت تھی۔ اس کے جسمانی خطوط ساحل پر موجود کسی بھی مرد کو اپنی جانب متوجہ کر سکتے تھے۔ چہرے اور جسم کے مختلف حصوں پر نظر آنے والے نشانات اس کی شب بسری کی داستان بیان کر رہے تھے۔

وہ لڑکی کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی ایک بڑی میز کی جانب گئی جو قدیم دور کی یاد دلا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ میز کے قریب پہنچی؟ وہ ہینڈسم شخص میز کے پیچھے سے برآمد ہوا اور اس نے لڑکی کی کمر..... پر ہاتھ مارا۔ یہ وہی حرکت تھی جو رالف اور دوسرے مرد جینا کے ساتھ کرتے تھے۔ اس شخص نے کرسٹوز کو دیکھا جو جارج کو گھسیٹتا ہوا اس کے پاس لایا تھا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پشت سے بندھے ہوئے تھے اور وہ دونوں مردوں کے مقابلے میں بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔

''رقم کہاں ہے؟'' اس آدمی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس میز پر ہر چیز صاف ستھری اور قرینے سے رکھی ہوئی

تھی۔ جینا نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے مناسب لباس پہننے کے بجائے اپنے جسم کو ایک بڑے کپڑے سے لپیٹ رکھا تھا اور اس کے نیچے بکنی پہن رکھی تھی۔ جینا سمجھ گئی کہ وہ ان کی مستقل ساتھی نہیں ہے بلکہ عارضی طور پر اس کی دل بستگی کا سامان کرنے آئی ہوئی تھی۔

وہ شخص کھڑا ہوگیا۔ اس نے میز پر رکھا ہوا فولڈر کھولا اور اس میں سے کچھ تصویریں نکال کر پھینکتے ہوئے بولا۔

"میں نے پوچھا کہ رقم کہاں ہے؟"

ان میں سے ایک تصویر جینا کے پیروں کے پاس آن گری جو کسی طاقت ور کیمرے کے ذریعے ساحل سے کھینچی گئی تھی اور بڑی واضح تھی۔ اسے اپنے آپ کو پہچاننے میں کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ رالف کی کشتی کے عرشے پر لیٹی سن باتھ لے رہی تھی۔ دوسری تصویر اس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھی جس میں رالف بیئر کا ٹن ہاتھ میں پکڑے جارج سے باتیں کررہا تھا اور تیسری تصویر میں جینا کشتی کا اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے اپنے چہرے پر سے بال ہٹا رہی تھی۔

اس شخص نے ایک جھٹکے سے میز کی دراز کھول کر اس میں سے ایک پستول نکالا اور اتنی زور سے دراز بند کی کہ جینا بھی اپنی جگہ پر اچھل پڑی۔ ایک لمحے کے لیے اسے یوں لگا جیسے پستول کی گولی اس کے سر میں گھس گئی ہے۔ جیسے ہی وہ شخص میز سے باہر آیا، کرسٹوز نے جینا کو اس کی طرف دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑائی اور آدھے راستے میں ہی رک گئی۔ اس کے بازو میں سوئیاں چبھ رہی تھیں جس جگہ سے کرسٹوز نے اسے پکڑا تھا وہاں خون کی گردش رک گئی تھی۔ اس نے بازو کو دو تین جھٹکے دے کر اسے بحال کرنے کی کوشش کی۔

وہ شخص قدم بڑھاتا ہوا جینا کے قریب آگیا۔ اتنا قریب کہ وہ اس کے لباس سے اٹھنے والی مہک بہ آسانی محسوس کرسکتی تھی۔ وہ اب بھی اسے پرکشش لگ رہا تھا لیکن پہلے جیسا نہیں۔ شاید اس لیے کہ اپنی رقم کو پانے کے لیے وہ تشدد پر اتر آیا تھا۔ اس نے جینا پر جھکتے ہوئے نرم آواز میں کہا۔

"میری رقم کہاں ہے۔ اگر پوری نہیں تو اس کا کچھ حصہ۔ جس کے بارے میں تم کچھ جانتی ہو؟"

جینا کہنے والی تھی کہ مجھے تمہاری رقم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں پھر اسے یاد آیا کہ اس کے بیگ کی تہ میں ان نوٹوں کے بنڈل موجود ہیں جو اس نے رالف کی کٹھڑی سے نکالے تھے اور یقیناً اس نے یہ رقم ان بدمعاشوں سے چھپائی ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے بیگ کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنے کولھے کے پیچھے کرلیا۔ عین اس وقت جب تمام نظریں جینا پر مرکوز تھیں، اچانک ہی جارج، کرسٹوز پر جھپٹ پڑا۔ گوکہ اس کے ٹخنے بندھے ہوئے تھے اور وہ لمبی چھلانگ نہیں لگا سکتا تھا لیکن اس کی یہ حرکت کرسٹوز کا توازن بگاڑنے کے لیے کافی تھی۔ وہ ایک گیند کے مانند اس سے جا ٹکرایا جبکہ دونوں کی جسامت میں نمایاں فرق تھا۔ کرسٹوز اور جارج کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر جاگرے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو اس طرح پکڑ رکھا تھا جیسے پرانی فلموں میں ہم رقص ایک دوسرے کو تھامے رہتے ہیں۔ جینا ان کے راستے میں تھی اس لیے اس کے کندھے کو بھی جھٹکا لگا اور وہ ہینڈسم شخص کے بازوؤں میں جاگری۔ اس کے پستول کی نال جینا کے پیٹ سے ٹکرا رہی تھی اور وہ اس کی چبھن محسوس کرسکتی تھی۔ اس نے بے اختیار اسے پکڑ لیا اور ڈگمگاتے ہوئے اس سے دور ہوگئی۔ ہینڈسم آدمی حیران ہوکر اسے دیکھنے لگا پھر اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے لیکن فوراً ہی اس کی جگہ ایک پُرسکون مسکراہٹ نے لے لی۔ جینا نے پستول دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کی نال کا رخ اس آدمی کی جانب کیا۔ اس کے زخمی جوڑ بری طرح دکھ رہے تھے اور جب اس نے مضبوطی سے پستول کا دستہ پکڑا تو اس کی انگلیاں کانپنے لگیں۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے پستول صحیح پکڑا ہوا ہے۔ بے شک وہ ٹیکساس میں پلی بڑھی تھی جو جرائم پیشہ لوگوں کی آماجگاہ ہے لیکن ساتھ ہی وہ ایک شہری لڑکی بھی تھی اور اس نے صرف فلموں میں ہی ہتھیاروں کا استعمال دیکھا تھا۔

جیسے ہی جینا نے پستول اوپر اٹھایا تو کاؤچ پر بیٹھی ہوئی لڑکی بھی اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور ان میں خوف اتر آیا۔ ہینڈسم شخص نے اپنے خالی ہاتھ پھیلا دیے اور گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

"دیکھو، پیسوں کی فکر کرو۔ میں سمجھ گیا۔ تم اس رقم کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ کوئی بات نہیں ہم اپنا کام جاری رکھیں گے۔ تم اس شخص کو تلاش کرنے میں میری مدد کروگی جو میرے پیسے لے کر بھاگ گیا ہے۔ ممکن ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ اچھا کرسکوں۔ ایک عمدہ اپارٹمنٹ، قیمتی ملبوسات اور بہت سی اچھی چیزیں وغیرہ وغیرہ......"

وہ دبک کر چلتا ہوا جینا کے قریب آیا اور آگے بڑھ کر پستول جھپٹنے کی کوشش کی، جینا گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ اس کا ارادہ

ٹریگر دبانے کا نہیں تھا بلکہ اسے تو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ اس کی انگلیاں صحیح جگہ پر ہیں لیکن اچانک ہی گولی چل گئی اور اس کے زخمی بازو میں درد کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے کان بجنے لگے اور اس کے منہ کا ذائقہ بدمزہ ہو گیا جیسے اس نے اپنے منہ میں قلعی اترا ہوا پرانا چمچہ رکھ لیا ہو۔

وہ ایک بار پیچھے کی طرف ہٹی اور دیوار سے ٹیک لگا کر پستول کو سیدھا کر کے اس کی نال کا رخ جھکے ہوئے ہینڈسم شخص کی جانب کر دیا۔ جس کی ران پر گھٹنے اور کولھے کے درمیان سرخ رنگ کا دھبا نمودار ہو گیا تھا۔ جینا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ خون اس کی چلائی ہوئی گولی سے ہوا ہے اور اس نے ایک شخص کو زخمی کر دیا ہے۔ جیسے ہی وہ سیدھا ہوا۔ کاؤچ پر بیٹھی ہوئی لڑکی تیزی سے اس کے پاس پہنچی اور اس نے اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر اسے سہارا دینا چاہا لیکن وہ غرایا اور مکا لہراتے ہوئے اسے میز کی طرف دھکیل دیا۔ لڑکی کا سر میز سے ٹکرایا اور ایسی آواز پیدا ہوئی کہ جینا کو لگا جیسے گولی دوبارہ چل گئی ہو۔

زخمی شخص دونوں بازو پھیلائے جینا کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے ہاتھ حرکت میں آئے اور آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ جان بوجھ کر دوبارہ ٹریگر دبا سکے گی اور یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس بار گولی پہلے کے مقابلے میں اوپر کی جانب اس آدمی کے سینے یا چہرے کے درمیان پیوست ہو جائے گی۔ بعد میں ساری زندگی وہ یہ بھی نہ جان پائے گی کہ اس نے ٹریگر دبایا تھا یا نہیں لیکن آخری لمحہ آنے سے پہلے وہ شخص اپنی جگہ رک گیا۔ جیسے جم کر رہ گیا ہو پھر وہ آہستہ سے لہرایا اور فرش پر گر پڑا۔

پستول ہاتھ میں پکڑے جینا لاش کے پاس سے گزرتی ہوئی کھڑکی تک آئی اور باہر جھانک کر دیکھا۔ پہلے اس کی نظر کرسٹوز پر گئی۔ وہ لوہے کے بنے ہوئے بہت بڑے خشک مصالحوں کے ریک پر جا کر گرا تھا جس کی وجہ سے زمین پر چاروں طرف دار چینی، جائفل اور جاوتری کے ٹکڑے بکھر گئے تھے۔ اس کی کمر لوہے کے فریم میں پھنس گئی تھی اور وہ آدھا مڑ گیا تھا جیسے کسی نے اس کا سوٹ خشک ہونے کے لیے لٹکایا ہو۔ اس کے مقابلے میں جارج زیادہ خوش قسمت رہا۔ وہ قریب ہی گھاس پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے پیروں کے نزدیک ہی ایک مرغی ٹہل رہی تھی۔ اس نے جینا کو دیکھا جس نے ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا۔ پہلے وہ تھوڑا ہچکچایا پھر اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس نے بھی جواب میں اشارہ کیا تو جارج نے اپنا سر ہلا دیا اور قہقہے لگانے لگا۔ جینا نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ لڑکی مرے ہوئے آدمی کی جیبوں سے نقدی نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس رہی تھی۔ اس نے جینا سے کہا۔ ”بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اس کے آدمی یہاں پہنچنے والے ہوں گے۔“

جینا نے تائید میں سر ہلایا۔ جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو پھر اس نے اپنا پرس اٹھایا اور ہچکچاتے ہوئے پستول اس میں رکھ لیا۔ جارج برآمدے کے آخری سرے پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کا حال دریافت کیے بغیر وسیع لان عبور کیا۔ جارج کے چلنے کی رفتار سست تھی۔ شاید نیچے گرنے سے اسے چوٹ آئی تھی۔ اس نے ایک آنکھ چندھی کر کے ایئر فیلڈ کی طرف دیکھا جہاں آخری کنارے پر ایک جہاز کھڑا ہوا تھا۔

”اس طرح کے جہازوں کو اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ جارج نے کہا۔ ”یا پھر چابی جہاز کے اندر ہی موجود ہو گی۔ یہ چھوٹا سا جہاز بہت عمدہ ہے اور اسے اڑانا بھی آسان ہے۔ اس میں غالباً اتنا فیول تو ہو گا جو ہمیں دوسرے جزیرے تک لے جائے۔ وہاں کے اڈے پر میرا ایک دوست ہے جو ہمیں کسی مشکل کے بغیر اترنے کی اجازت دے دے گا۔“

جینا نے اپنے زخمی بازو پر انگلی رکھی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا ہی کرے گا مسٹر جارج۔“ پھر اپنی پسندیدہ گلوکارہ کے گانے کے بول گنگنانے لگی۔ ”میں دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچاتی ہوں۔“

جارج نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم میری سوچ سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہو معصوم لڑکی۔ اس سے بھی کچھ زیادہ جتنا میں نے تم پر اعتبار کیا تھا۔“

جینا کو اپنے کولھے پر پستول کا وزن محسوس ہونے لگا۔ بیگ میں رکھے سامان کے ساتھ یہ ایک نامانوس شے تھی۔ اس نے پستول نکالتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا اندازہ درست ہے مسٹر جارج۔ اب میں کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ اس راز کو یہیں دفن ہو جانا چاہیے۔“

یہ کہہ کر اس نے پستول کی نال سیدھی کی۔ اس بار نشانہ لینے میں اس سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ جارج کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ جینا نے پستول کے دستے پر سے انگلیوں کے نشان صاف کیے اور اسے دوبارہ پرس میں رکھ لیا۔ وہ دوسرے جزیرے پر جا کر بھی اس سے جان چھڑا سکتی تھی۔ پھر وہ خراماں خراماں جہاز کی طرف چل دی۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

تیرھویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا۔ گروہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سنسنی خیز لمحات سے لبریز، لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی، ایک سحر انگیز اور دل گداز داستان...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سر راہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرغنہ تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچازاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انسپکٹر قیصر شدید زخمی ہو کر اسپتال کیش ہوا۔ شکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی "غلطی" کی تھی۔ میں نے شکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ میں یہاں بیزار ہو چکا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آ جائے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راستے گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبردارنی کو کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کو دیا جا رہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آ گئی۔ مولوی فدا ایک خداترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر ہلّا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ٹی بی کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا، لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے ہڈیوں کے ڈھانچے وکرم کو کندھے پر لادا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نمبردارنی کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ یہ کام مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس "بلیک میلنگ" سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاول کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چھپ کر ان کی تصاویر کھینچ لیں۔ پھر میں اقبال کا تعاقب کرتا ہوا یا سر تک جا پہنچا اور چھپ کر ان کی باتیں سنیں۔ وہ بے بس و مظلوم شخص تھا اور چھپ کر ایک قبرستان میں اپنے دن گزار رہا تھا۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر ساتا جی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کا کھوج لگانے کا بیڑا اٹھا بیٹھا اور ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کے باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ درگاہ پر ہم سب قید تھے لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور حالات نے اس تیزی سے کروٹ لی کہ درگاہ کا سب نظام درہم برہم ہو گیا۔ میرے ہاتھوں پردے والی سرکار کا خون ہو گیا۔ آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم بالآخر پہاڑوں کے درمیان تک جا پہنچے۔ یہاں بھی ملنگی محافظوں سے ہمارا مقابلہ ہوا۔ اس دوران انیق وغیرہ ہم سے بچھڑ گئے۔ میں اور تاجور بھاگتے ہوئے ایک جنگل میں پہنچے۔ لیکن ہماری جان ابھی چھوٹی نہیں تھی۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق ہم سیالکوٹی سجاول ڈکیت کے ڈیرے پر جا پہنچے تھے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤ جی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ آ گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا

ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انھوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی ہی غائب ہوگئی۔ اس واقعہ کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان ککس مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف سکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر میں نے ہار مان لی لیکن سجاول کا دل جیت لیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وفعتاً میرے فون کی بیل ہوئی۔ میں نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف سے بولنے والے کا انتظار کیا۔ ''ہیلو۔'' انیق کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

میرے سینے میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ''ہیلو انیق! کہاں ہو تم......؟''

''جی شاہ زیب بھائی! کیسے ہیں آپ؟ جناب کی آواز سننے کو ترس گیا تھا آپ کا خادم۔''

سگنل واضح نہیں آرہے تھے۔ میں سیل فون کے ساتھ باہر احاطے میں آگیا اور ایک چٹان کے نزدیک کھڑا ہوکر دھیمے لہجے میں انیق سے بات کرنے لگا۔ انیق کو پہلوان کے ذریعے میرا پیغام مل گیا تھا۔ وہ میری خیر خیریت کی طرف سے بے حد فکرمند تھا اور جلد از جلد میرے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ابھی دس پندرہ منٹ بعد اسے دوبارہ کال کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ اسے کیسے اور کس طرح یہاں پہنچنا ہے۔

میں اندر پہنچا۔ ساتھ والے کمرے میں لڑکی کو مسلسل بنایا سنوارا جارہا تھا۔ سارے کمرے میں شیمپو اور صابن وغیرہ کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ سجاول کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے اس کو بتایا کہ انیق کا فون آگیا ہے اور وہ یہاں آنے کے لیے تیار ہے۔

سجاول نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ اسے کوٹلی کا ایڈریس بتا دو۔ وہاں سے میرا کوئی بندہ اسے لے لے گا۔''

سجاول نے مجھے ایڈریس لکھوایا اور ایک فون نمبر بھی دیا۔ میں نے باہر جاکر دوبارہ انیق کو فون کیا اور اسے یہ دونوں چیزیں لکھوا دیں۔ وہ اس قدر بے تاب تھا کہ فوراً چاند گڑھی سے روانہ ہونا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ کل آرام سے تیار ہوکر نکلو، لیکن جب بھی نکلو پوری احتیاط کرنا۔ ہوسکتا ہے، عالمگیر کے بندے تم پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔''

وہ بولا۔ ''احتیاط تو پوری کروں گا جی لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں خاموشی سے نکل آؤں تو پھر...... تو ابھی نکل آنا چاہیے۔ رات کا وقت ہے سارا گاؤں سویا پڑا ہے۔''

بات تو اس کی ٹھیک تھی۔ میں نے کہا۔ ''جیسا مناسب سمجھو کرو، اور میری ''کِٹ'' ساتھ لیتے آنا۔''

''کِٹ'' سے میری مراد وہ جدید الیکٹرانکس اشیا تھیں جو میں چاند گڑھی روانہ ہوتے وقت لاہور سے ساتھ لے کر چلا تھا۔ ننھا سا پن ہول کیمرا، ڈکٹا فون، بے ہوشی کا اسپرے اور اس قسم کی دیگر اشیا۔

انیق نے پُرجوش انداز میں ''یس سر'' کہا۔ میں نے اسے کچھ ضروری ہدایات دیں اور سلسلہ منقطع کردیا۔

انیق قریباً 24 گھنٹے بعد میرے پاس سجاول کے خفیہ ڈیرے پر پہنچ گیا۔ اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا تھا۔ فخرو کے علاوہ ایک اور مونچھیل بندہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ انیق نے پتلون قمیص پر موٹی جرسی پہن رکھی تھی۔ ہاتھوں پر دستانے تھے اور سر پر گرم ٹوپی۔ اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی۔ اس نے غور سے اردگرد دیکھا پھر مجھے پہچان کر میری طرف آیا اور لپٹ گیا۔ کتنی ہی دیر تک ہم نے ایک دوسرے کو گلے لگائے رکھا۔ وہ منظر نگاہوں کے سامنے آگیا جب ہم جدا ہوئے تھے۔ تاجور تیز رفتار گاڑی میں سے اچھل کر ڈھلوان پر گرگئی تھی اور میں نے اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی تھی۔ چھلانگ لگانے سے شاید دو تین منٹ پہلے میں نے انیق کی آخری جھلک دیکھی تھی۔ اور اب ان گنت دنوں بعد وہ مجھے آج دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے سجاول سے اس کا تعارف کرایا پھر فیض محمد اور باقر وغیرہ سے ملایا۔ سجاول پرکھنے والی نظروں سے انیق کو دیکھ رہا تھا۔ شاید انیق کے قد کاٹھ نے اسے مایوس کیا تھا لیکن سجاول کو معلوم نہیں تھا کہ عام قد کاٹھ کے اس دبلے پتلے لڑکے میں کتنی توانائی اور جرأت ہے۔ اس کے علاوہ اس کی وہ خداداد صلاحیت جس کے بل بوتے پر وہ دیواروں میں در بنالیتا تھا اور مشکل ترین لوگوں میں بھی گھل مل جاتا تھا۔

سجاول نے ہمیں چائے پلائی پھر ہم اپنے کمرے کی

طرف چل پڑے۔ احاطے کے اطراف میں انیق نے درختوں کی بلندی پر جگنو سے چمکتے دیکھے تو حیران ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ مچانیں ہیں جن پر مسلح گارڈز بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ روشنیاں ان کی ٹارچوں وغیرہ کی ہیں۔ ہم کمرے میں پہنچے۔ ہمارے پاس کرنے کے لیے ڈھیروں باتیں تھیں اور سردیوں کی طویل رات تھی۔

انیق نے سب سے پہلے تاجور کے بارے میں پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ وہ خیریت سے ہے اور ایک محفوظ جگہ پر پہنچ گئی ہے۔

"کس نے پہنچایا ہے؟"

"سمجھو میں نے ہی پہنچایا ہے۔ اس کی طرف سے مجھے پورا اطمینان ہے۔"

"تاجور کے گھر والے تو جا چکے ہیں چاند گڑھی سے۔"

"ہاں، مجھے پتا ہے۔ سمجھو کہ وہ بھی ان کے پاس ہی پہنچی ہے۔"

"یہ تو بڑی زبردست بات ہے۔" انیق کے سینے سے جیسے اطمینان کی طویل سانس خارج ہوئی۔

میں نے اس سے گاؤں کے حالات پوچھے۔ انیق نے بتایا کہ گاؤں کے لوگ کافی حد تک پیر ولایت سے متنفر ہو گئے ہیں مگر پھر بھی ایک دھڑا ایسا ہے جو سب کچھ جاننے کے باوجود ان فراڈیوں کی حمایت کر رہا ہے۔ یہی لوگ تھے جو پیر ساتا کو مسجد کے پہلو میں دفنانا چاہتے تھے مگر بعد میں لوگوں کے احتجاج پر اسے عام قبرستان میں سپردِ خاک کرنا پڑا۔

میں نے کہا۔ "یار، یہ اندھی عقیدت بھی کیسی ہوتی ہے لوگ اپنی آنکھوں سے اپنے جھوٹے مرشدوں اور مخدوموں کے گندے کرتوت دیکھتے ہیں پھر بھی ان کا نام جپنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔"

"مگر ایک بات ہے جناب! پیر ولایت کا یہ پاکھنڈ اب زیادہ دیر چلنے والا نہیں۔ وہ گرتی دیوار کی طرح ہے۔ ایک زوردار دھکا اور لگا تو ڈھے جائے گا۔"

"ملنگوں کا کیا حال ہے؟"

"ان کے بارے میں تو یہی پتا چل رہا ہے کہ بہت سوں کو پولیس نے دھر لیا ہے، باقی تتر بتر ہو گئے ہیں۔ تتر بتر ہونے والوں میں "پردے والی سرکار" کا نمبر دو یعنی ملنگ کرنالی بھی ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کرنالی کا خفیہ طور پر پیر ولایت سے رابطہ بھی ہے۔ باقی اللہ جانے۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "ہاں، یاد آیا وہ ملنگنی ضرور پہنچ گئی تھی چاند گڑھی تک۔"

"کون ملنگنی؟"

"وہی ڈاکٹر فرح۔ وہ شیطان کی چرخی، رضوان ٹی کے پیچھے گاؤں آئی تھی۔ اس کے سر پر کافی سارے ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ لیکن وہ بھی ہوشیار نکلا۔ اس کے آنے سے دو تین دن پہلے ہی گاؤں سے کھسک گیا۔ مجھ سے بھی ملی تھی۔ اس کے لیے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے ہیروئن نہ ملنے سے کسی کا نشہ ٹوٹا ہوا ہو۔ میری منتیں کر رہی تھی کہ میں اس کا پتا بتا دوں۔ پھر دھمکیوں پر اتر آئی۔ میں نے کہا، یہ مت بھولو کہ کئی دوسرے ملنگوں کی طرح اس وقت تم بھی پولیس کو مطلوب ہو۔ پتا نہیں کتنے ناجائز "ابارشن" کیے ہوئے ہیں تم نے۔ یہاں سے نکل ہی جاؤ تو اچھا ہے تمہارے لیے۔"

"کہاں گئی پھر؟"

"اسے شک تھا کہ رضوان لاہور کی طرف گیا ہے۔ اُدھر ہی نکل گئی ہو گی۔ دل کے سہارے کے لیے اس کی تصویر پرس میں رکھی ہوئی تھی اور بار بار پرس کھول کر تسلی کرتی تھی کہ تصویر موجود ہے......"

میں نے انیق سے لاہور کا احوال پوچھا اور داؤد بھاؤ کی خیر خیریت دریافت کی۔ انیق ایک چکر لاہور کا بھی لگا آیا تھا اور چاند گڑھی صرف اس لیے واپس آیا تھا کہ میرے اور تاجور کے بارے میں ٹوہ لے سکے اور اگر کوئی سراغ ملے تو ہمیں تلاش کر سکے۔ اس نے بتایا کہ داؤد بھاؤ خیریت سے ہے لیکن آج کل انڈر گراؤنڈ ہے۔ امید ہے کہ پاکستان میں ہی ہے اور دو چار ہفتوں تک پھر نمودار ہو جائے گا۔

رات کا پہلا حصہ میں نے اور انیق نے باتیں کرتے گزارا۔ انیق مجھ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ واقعی میں نے تاجور سے نکاح کر لیا تھا۔ اگر نہیں کیا تھا تو پھر ہماری محبت کہاں تک پہنچ پائی ہے؟

میں نے کہا۔ "انیق! جو کچھ تم سننا چاہ رہے ہو، وہ میرے پاس سنانے کے لیے نہیں ہے۔ اگر تم ضرور سننا چاہو گے تو پھر تمہارا دل برا ہو گا۔ اس لیے ابھی اس موضوع کو یہیں رہنے دو۔ ہم اس معاملے پر بات کرتے ہیں جس پر بات کرنا اس وقت بہت ضروری ہے۔ ہمیں آج رات ہی کسی وقت یہاں سے روانہ ہونا ہے۔"

"کہاں؟" انیق نے تعجب سے پوچھا۔

"وہاں...... جہاں کا پتا ابھی ٹھیک سے مجھے بھی

نہیں معلوم۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یعنی ہم سجاول کے ساتھ کہیں جا رہے ہیں؟" انیق نے معاملہ فہمی کا ثبوت دیا۔

"ٹھیک جواب تک پہنچے ہو...... مجھے ایک بات بتاؤ۔ تم کافی زبانیں جانتے ہو۔ ملائی زبان کے بارے میں بھی کچھ پتا ہے؟"

"ہائیں...... یہ ملائی کا ذکر کہاں سے آ گیا بیچ میں؟"

"یہ ذکر بیچ میں ہے نا۔ تم بتاؤ کچھ شدبد ہے اس بولی کی؟"

وہ کسی دانشور کی طرح بولا۔ "ملائی کی بھی دو تین قسمیں ہیں لیکن جو ملائیشیا وغیرہ میں بولی جاتی ہے، میں اچھی طرح بول اور سمجھ لیتا ہوں۔ ویسے اس زبان کو مالے کہتے ہیں۔"

"برونائی میں بھی یہی بولی جاتی ہے؟"

"ہاں جی...... زیادہ تر۔" اس نے کہا۔ پھر ذرا ٹھٹکتے ہوئے انداز میں بولا۔ "یہ سجاول کہاں پھنسا رہا ہے آپ کو۔ مجھے تو یہ اچھا بندہ نہیں لگا۔"

"بڑی پھوکٹ بات کی ہے تم نے۔ ڈاکو، اچھا بندہ کیسے لگے گا لیکن برے سے برے بندے میں بھی کوشش کر کے اپنے مطلب کے لیے کوئی اچھائی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ اب تم داؤد بھاؤ کو ہی دیکھ لو۔ اس میں بھی دو چار اچھائیاں ڈھونڈی ہی ہوں گی تم نے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس بندے کی آنکھوں میں مجھے بے انتہا لالچ نظر آیا ہے۔ ایسا بندہ کسی بھی وقت دھوکا دے سکتا ہے۔"

"یہ دنیا تو ہے ہی دھوکے کا گھر۔ اب دیکھو ملنگی ڈیرے پر کیسے کیسے دھوکے ملاحظہ کیے ہم نے۔ اگر سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی یقین نہ آتا۔"

اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ آج پھر جاناں ہی نہ آ دھمکی ہو، لیکن یہ فیض محمد تھا۔ اس نے کہا۔ "سردار نے کہا ہے کہ صبح چار بجے یہاں سے نکل جائیں گے۔ تم نے تھوڑا بہت آرام کرنا ہو تو کر لو اور میڈم کو بھی تیار رہنے کا کہہ دو۔"

"میڈم۔" اس نے ذرا طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ میڈم سے اس کی مراد "جاناں" ہی تھی۔

"ہاں، شام کو ہی کہہ دیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ وہ واپس چلا گیا۔

جاناں کے بارے میں سردار سجاول سے کل ہی بات ہوئی تھی۔ سردار نے بتایا تھا کہ یہ لڑکی چونکہ پڑھی لکھی ہے، اس سے ایک کام لیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اس کو ساتھ رکھنا ہے۔ مجھے یہ تجویز پسند تو نہیں آئی تھی لیکن مجبوراً ہاں کرنا پڑی تھی۔

ڈھائی بجے کے لگ بھگ ہم اپنے کمروں سے نکلے اور احاطے میں آ گئے۔ گرم چادر میں لپٹی ہوئی جاناں اور انیق میرے ساتھ تھے۔ احاطے میں چار پانچ گھوڑے بالکل تیار حالت میں موجود تھے۔ ایک پالکی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ سردار سجاول ذرا بدلے ہوئے حلیے میں نظر آیا۔ سیاہ شلوار قمیص کے بجائے، وہ بڑے سائز کی سفید گھیر دار شلوار اور خاکی کرتے میں دکھائی دیتا تھا۔ سر پر اس نے "بس ڈرائیوروں" کی طرح ڈبی دار مفلر باندھ رکھا تھا۔ کندھوں پر گرم چادر تھی۔ وہ فیض محمد کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ سجاول کی غیر موجودگی میں فیض محمد ہی یہاں کے حالات کی نگرانی کرتا تھا۔ وڈا سردار اعظم تو کسی مرض کی دوا ہی نہیں تھا...... بلکہ وہ خود مرض تھا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ سجاول اپنے نائب فیض محمد کو جو ہدایات دے رہا ہے، ان میں سے زیادہ تر شرابی سردار اعظم کے لیے ہی ہوں گی۔

اتنے میں دو لڑکیاں ایک تیسری لڑکی کو بازوؤں سے پکڑے آہستہ آہستہ چلاتی پالکی کی طرف لائیں۔ لڑکی سرتاپا ایک سرخ چادر میں چھپی ہوئی تھی، جیسے نو بیاہتا دلہن ہو۔ اسے بڑی احتیاط سے پالکی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ وہی حسین دوشیزہ تھی جسے میں نے کل تیار ہوتے دیکھا تھا۔

سجاول کے اشارے پر جاناں بھی پالکی میں سوار ہو گئی۔ میں، انیق اور سردار سجاول گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ سردار سب سے آگے تھا۔ حسب معمول ہماری آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ اونچے نیچے دشوار راستے پر سفر کرتے تینوں گھوڑوں نے قریباً پانچ کلومیٹر فاصلہ طے کیا اور اس پختہ سڑک پر آ گئے جو شمال میں گھنے جنگلوں کے اندر کہیں غائب ہو جاتی تھی اور جنوب میں، کوٹلی وغیرہ کی سمت جاتی تھی۔

میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹائی گئی تو سامنے ہی ایک مزدا لوڈر کھڑا نظر آیا۔ اس پر لکڑی کے سلیپر لدے ہوئے تھے۔ آزاد کشمیر کے علاقوں سے لکڑی عموماً میدانی علاقوں کی طرف روانہ کی جاتی ہے، یہ بھی کوئی ایسا ہی مال بردار ٹرک تھا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب پتا چلا کہ [illegible] نما ٹرک پر لدے ہوئے سلیپروں کے اندر ایک [illegible]

موجود ہے۔ لوڈر کا ڈرائیور ہمارے ساتھ لوڈر پر چڑھ گیا۔ چند سلیپروں کو ان کی جگہ سے ہٹایا گیا تو ٹارچ کی روشنی میں قریباً پانچ فٹ ضرب چھ فٹ کا ایک چوکور خلا نظر آیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے سجاول کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"لیہ تک کے لیے تمہارے سفر کا انتظام۔ مزے سے بیٹھو اور کھاؤ پیو۔"

میں نے دیکھا کہ اس خلا کے اندر پھل فروٹ کے علاوہ دو بڑے ٹفن باکس بھی رکھے تھے، یقیناً ان میں کھانا تھا۔

پالکی میں سے پہلے جاناں اور پھر وہی دلہن کی طرح سجی ہوئی لڑکی برآمد ہوئی۔ دونوں کو سجاول اور میں نے سہارا دے کر لوڈر پر چڑھایا اور خلا میں اتارا۔ لڑکی واقعی کسی نوخیز پھول کی طرح تھی۔ سبک بدن اور نرم و نازک، جاناں خوش شکل تو تھی لیکن اس کا جسم ذرا لمبوترا اور چھریرا تھا۔ پالکی میں سے کچھ اور بھی نکالا گیا، یہ وہی مشینی پھول تھا جس کی سرخ پتیاں میکنزم کے تحت کھلتی اور بند ہوتی تھیں۔ اب یہ فولڈنگ پھول بند تھا۔ یہ آسانی لکڑی میں موجود خلا کے اندر آ گیا۔ سجاول نے مجھے بھی خلا میں اترنے کی ہدایت کی۔ ٹارچ کی روشنی میں، میں نیچے اتر گیا۔ کلاشنکوف میرے کندھے پر تھی۔ پروگرام کے مطابق اس نامی گرامی ڈاکو سجاول سیالکوٹی کو ڈرائیور کے روپ میں یہ لوڈر ڈرائیو کرنا تھا اور اسحٰق کو اس کے کنڈیکٹر یا ہیلپر کا کردار ادا کرنا تھا۔

ہم بیٹھ گئے تو خلا کو پھر لکڑی کے شہتیروں یا سلیپروں سے ڈھک دیا گیا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" لڑکی منمنائی۔

میں نے ٹارچ روشن کر دی۔ اس نے سرخ شال کا گھونگھٹ سرکا دیا تھا۔ وہ واقعی ایک خوش رنگ دلہن لگ رہی تھی۔ پوری طرح سجی ہوئی اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی۔ لوڈر ایک دھچکے کے ساتھ اپنے اجنبی سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ میں نے لڑکی سے اس کا نام پوچھا۔

"سنبل۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"پانسہرہ سائڈ کی۔"

"تمہیں پتا ہے، ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہاں جی پتا ہے، لیکن...... سردار جی نے کہا تھا کہ...... زیادہ باتیں نہیں کرنی ہیں۔" وہ قدرے معصومیت سے بولی۔

جاناں مجھے تیکھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید سمجھ رہی تھی کہ میں اس سنبل نامی دیہاتی لڑکی میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ وہ کیا سمجھ رہی ہے یا سوچ رہی ہے بلکہ مجھے ایک طرح سے پریشانی بھی تھی کہ وہ دُم چھلا بن کر میرے ساتھ چل پڑی ہے۔ اس پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسے بھوت جتنی جلدی چڑھتے ہیں اتنی جلدی اتر بھی جایا کرتے ہیں۔ لیکن فی الحال تو یہ بھوت بڑے کروفر سے اپنی جگہ براجمان تھا۔

ہمارا سفر اگلے تقریباً چھ گھنٹے تک بغیر رکے جاری رہا۔ شروع کے دو گھنٹوں میں یہ سفر زیادہ مشکل اور ہچکولے دار تھا مگر پھر قدرے ہموار ہو گیا۔ ہمارے چاروں طرف وزنی لکڑی کی چرچراہٹ اور بو تھی۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا لیکن اندازہ سا تھا کہ یہ دیار کی لکڑی ہے۔ ساگوان کے بعد غالباً اسی لکڑی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کی اپنی ایک مہک ہوتی ہے، چکھنے میں اس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے۔ سجاول نے وقتِ رخصت مجھ پر انکشاف کیا تھا کہ ہم یہ لکڑی اسی وڈے صاحب کی عالیشان کوٹھی کے لیے لے جا رہے ہیں۔ یہ کوٹھی کسی مضافاتی علاقے میں کافی بڑے رقبے پر تعمیر ہو رہی تھی۔ سوال یہ تھا کہ سجاول کو کیسے پتا چلا کہ وڈے صاحب تک پہنچنے کے لیے لکڑی سے بھرے ہوئے لوڈر کو ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ اور یہ کیسے پتا چلا کہ یہ لکڑی کہاں سے کون سپلائی کر رہا ہے۔ یقیناً یہ ساری معلومات سجاول کو منشی افضل سے ہی حاصل ہوئی تھیں اور لڈو پیڑے والے کمرے سے ہی حاصل ہوئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں سجاول کی سفاکی دیکھ کر کبھی کبھی مجھے جان ڈیرک اور اس کا ٹیکساری گینگ یاد آ جاتا تھا۔ وہ لوگ بھی سفاکی کے چیمپئن تھے اور میرے ازلی دشمنوں میں سے۔ مجھے پتا تھا جلد یا بدیر میرا اُن سے پھر سامنا ہونا ہے۔

قریباً چھ گھنٹے کے بعد لوڈر ایک جگہ رکا۔ یقیناً اب دن کافی چڑھ آیا تھا۔ سنبل کی کلائی پر ہفت رنگ چوڑیوں کے ساتھ ساتھ ایک خوب صورت گھڑی بھی موجود تھی۔ میں نے وقت دیکھا۔ نو بجنے والے تھے۔ "کیا محل آ گیا؟" سنبل نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ محل کے لفظ پر میں اور جاناں دونوں ہی چونکے تھے۔

پتا نہیں کہ سجاول نے اس لڑکی کو کیا بتا رکھا تھا اور کس طرح مطمئن کر رکھا تھا کہ وہ خوشی خوشی کسی عشرت کدے کی طرف جا رہی تھی۔ اسے تحفے کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا اور

دیکھا جاتا تو وہ واقعی لاکھوں میں ایک تھی، کم از کم شکل و صورت کے لحاظ سے تو تھی۔

اسی دوران میں میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف سجاول تھا۔ وہ لوڈر کے کیبن سے بول رہا تھا۔ اب وہ مجھے کافی بے تکلفی سے مخاطب کر لیتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''کیا حال ہے جگر! ناشتا واشتا کر لیا؟''

میں نے کہا۔ ''تم کہیں ٹکنے دیتے تو ناشتا کرتے۔ اب کہاں ہیں ہم؟''

''میانوالی اور بھکر کے درمیان ہیں۔ آگے پانچ چھ گھنٹے کا سفر باقی ہے۔'' پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''چھوری کیسی ہے؟'' چھوری سے مراد سنبل ہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ابھی پوچھ رہی تھی کہ محل کتنی دور ہے؟''

سجاول نے ذرا آواز دبا کر کہا۔ ''اس سے زیادہ باتیں نہ کر۔ اویں الجھ جائے گی۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ وڈا صاحب محل میں رہتا ہے۔''

......سجاول نے لڑکی سنبل سے ایسے ہی کہہ دیا تھا کہ وڈا صاحب محل میں رہتا ہے لیکن جب کوئی سات آٹھ گھنٹے بعد ہم لکڑی کے ان شہتیروں کے نیچے سے نکلے اور اردگرد دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ ہم ایک سنسان جگہ پر تھے جو کسی حد تک سرسبز بھی تھی۔ ہمارا لوڈر ایک پختہ سڑک پر درختوں کے نیچے کھڑا تھا۔ قریباً دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر ہمیں واقعی ایک خوب صورت محل نما وسیع عمارت نظر آرہی تھی۔ اس کی بلند دیواریں اور سفید برجیاں دور ہی سے چمکتی دکھائی دیتی تھیں، کافی فاصلے سے بھی مجھے رکھوالی کے کتوں کا مدھم شور سنائی دیا۔ ہم ابھی تک لوڈر کے اوپر ہی کھڑے تھے۔ جاناں نے دور دور تک ان ویران نشیب و فراز پر نگاہ دوڑائی اور بولی۔ ''ہم کہاں ہیں شاہ زیب؟''

''ابھی تو لوڈر پر ہیں۔ نیچے اترو گی تو پتا چلے گا۔'' میں نے کہا۔

ہمارے ساتھ ہی انیق اور سجاول بھی لوڈر کے اگلے حصے سے نکل آئے تھے۔ سجاول مہندی لگے بالوں والے ایک تنومند شخص سے باتیں کرنے لگا۔ انیق نے میرے ساتھ مل کر دونوں لڑکیوں کو سہارا دیا اور لوڈر سے نیچے اتارا۔ ایک ہی جگہ سمٹ کر بیٹھے رہنے سے سنبل کی ٹانگیں اکڑ گئی تھیں اور وہ ہائے ہائے کر رہی تھی۔ محل نما عمارت تو خاصے فاصلے پر تھی، ہمیں چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر ایک اور شاندار بنگلا نظر آرہا تھا۔ یہ ڈیڑھ دو کنال کے رقبے پر ہوگا۔ باقی اوپن ایریا تھا۔ دروازے پر پنجابی شکل و صورت اور حلیے والا ایک دراز قد شخص پہرا دے رہا تھا۔ اس کے کندھے سے سیون ایم ایم رائفل جھول رہی تھی۔

مہندی لگے بالوں والے شخص نے مجھے اور دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیا اور اس بنگلا نما عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ ہمارے عقب سے سجاول نے ہانک لگائی۔ ''شاہی، میں بھی تھوڑی دیر میں آرہا ہوں، یہ مال اتار کر۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

محل نما وسیع و عریض بلڈنگ کے عقب میں کچھ تعمیر کیا جارہا تھا۔ دور ہی سے حرکت کرتے مزدوروں کے ہیولے دکھائی دیتے تھے۔ سیمنٹ اور بجری وغیرہ مکس کرنے والی کسی ہیوی مشین کا شور بھی سنائی دیتا تھا۔ یقیناً یہ لکڑی جو ہم لے کر یہاں پہنچے تھے، اسی نئی تعمیر میں استعمال ہونا تھی۔ ہم مہندی لگے بالوں والے شخص کے عقب میں چلتے بنگلے کے دروازے پر پہنچے۔ پہرے دار نے دلچسپی اور شرارتی نظروں سے دونوں لڑکیوں کو دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ اس نے میرے کندھے سے جھولتی ہوئی کلاشنکوف پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم اندر آگئے۔ (تاہم اگلے دن یہ رائفل مجھ سے لے لی گئی)

یہ بنگلا اندر سے زیادہ سجا ہوا تھا۔ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ باہر سے یہ عمارت ایک ویرانے میں کھڑی ہے۔ ماربل کے فرش، آرائشی چھتیں، قدرتی گیس اور بجلی کا انتظام۔ صاف ستھری راہداریاں، نوکر چاکر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مہندی لگے بالوں والے شخص نے اپنا نام سراج بتایا اور ہمیں ایک کشادہ کمرے میں پہنچا دیا۔ جہاں قیمتی صوفے اور آرام دہ کرسیاں رکھی تھیں۔ دیوار گیر شیشے کی دوسری جانب پھلواری تھی اور اس کے درمیان فوارے کا پانی اچھل رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک ملازمہ ہمارے لیے چائے اور دیگر لوازمات لے کر آگئی۔ وقت تو یہ کھانے کا تھا، بہرحال چائے اور لوازمات بھی غنیمت تھے۔ ابھی ہمیں بیٹھے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ کسی پاس والے کمرے سے کسی شخص کے گرجنے برسنے کی آواز آئی۔ شاید کسی ملازم کو زبردست ڈانٹ پلائی جارہی تھی۔ کبھی کبھی ملازم کی لرزتی کانپتی باریک سی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ گفتگو سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ گرجنے برسنے والا شخص وہ ہے جسے سجاول نے وڈے صاحب کا منیجر بتایا تھا۔ ڈانٹ ڈپٹ کے آخر میں اس نے ملازم کو تھپڑ جڑ دیا اور گالیاں دیں۔ گالیوں کی غلاظت

ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ سنبل اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی اور جاناں بھی ڈری ڈری نظر آئی۔

پانچ دس منٹ مزید گزرے تھے کہ مجھے کہیں پاس سے ہی سجاول کی بھاری بھرکم آواز بھی سنائی دے گئی۔ لکڑی اتنی جلدی تو "اَن لوڈ" نہیں کی جا سکتی تھی۔ یقیناً سجاول یہ کام مزدوروں کے سپرد کر کے واپس یہاں بنگلے میں آگیا تھا۔

قدموں کی تیز آواز آئی اور پھر رنگے بالوں والا سراج لمبے ڈگ بھرتا اندر آگیا۔ ملازمہ بھی ساتھ تھی۔ ملازمہ نے جلدی جلدی چائے کے برتن اٹھائے۔ سراج نے تنقیدی نظروں سے ہمارا جائزہ لیا اور اطلاع دینے والے انداز میں بولا۔ "آقا جان آرہے ہیں۔ تم لوگوں سے بات کریں گے۔" پھر اس کی نظر میری کلاشنکوف پر پڑی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ میں نے کلاشنکوف کندھے سے اتار کر ایک طرف صوفے کی آڑ میں رکھ دی۔

دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ بھاری قدموں کی آوازیں آئیں۔ سنبل نے ڈری ڈری نظروں سے میری اور جاناں کی طرف دیکھا۔ وہ ایک اَن پڑھ دیہاتی لڑکی تھی۔ اس کا کل سرمایہ اس کی خوب صورتی اور جسمانی موزونیت ہی تھی۔ دروازہ کھلا اور تین افراد اندر آگئے۔ ان میں ایک تو سجاول تھا جو ڈرائیور کے روپ میں بالکل ٹھیک لگ رہا تھا، دوسرا سراج تھا جو اب بڑے مؤدب انداز میں ناف پر ہاتھ باندھے ہوئے تھا اور تیسرا وہی "آقا جان" تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب ہوگی۔ آدھا سر گنجا تھا۔ جسم چھریرا اور چہرے پر سختی نے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ اس کی ناک کے اوپر ماتھے کے قریب ایک موٹا بل تھا جو اس کی تند مزاجی کی واضح دلیل تھا۔ اس نے پینٹ قمیص کے ساتھ سیاہ واسکٹ پہن رکھی تھی، آستینیں اڑسی ہوئی تھیں۔ اس نے تیز نظروں سے ہم تینوں کا جائزہ لیا۔ ہم کھڑے ہو چکے تھے۔ چند سیکنڈ بعد وہ سجاول سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ہاں بھئی، کیا چاہتے ہو تم؟"

سجاول نے "عاجزی" سے کہا۔ "اس لال چادر والی کو دیکھ لیں جی۔"

"کچھ دکھائے گی تو دیکھوں گا نا۔" آقا جان نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ اس کی ناک کا بل کچھ اور موٹا ہوگیا۔

سجاول نے جاناں کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے سنبل کے سر سے چادر اتار کر ایک طرف صوفے پر رکھ دی۔ سنبل اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ آقا جان نے اسے سرتاپا گھورا۔ اس کی آنکھوں میں چند لمحے کے لیے مجھے دلچسپی کے آثار نظر آئے لیکن پھر اوجھل ہوگئے۔ "ذرا گھماؤ اس کو۔" آقا جان نے جاناں سے مخاطب ہو کر کہا۔ جیسے سنبل کوئی جیتی جاگتی لڑکی نہ ہو۔ لکڑی کی شہتیری ہو یا کوئی ڈیکوریشن پیس۔ جاناں نے چند سیکنڈ جھجکنے کے بعد سنبل کو آہستہ سے گھمایا اور پھر آقا جان کے رخ پر کھڑا کر دیا۔ آقا جان بیزاری سے بولا۔ "کیا کرنا ہے اس کا؟ مجھے تو کچھ خاص نظر نہیں آرہا۔ پڑھی لکھی بھی نہیں ہے شاید۔"

سنبل جیسے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ سجاول نے فرمائشی انداز میں کہا۔ "نین نقش کی اچھی ہے جناب...... اور تابع دار بھی ہے۔"

"نین نقش کی کیا اچھی ہے۔ رنگ ذرا دبا ہے۔ ایسی تو اب بھی دو تین یہاں وہاں پھر رہی ہوں گی۔" آقا جان کی ناک کی سلوٹ مزید نمایاں ہوگئی۔ وہ خاصا غصیلا اور بددماغ لگتا تھا۔

سجاول نے کہا۔ "ذرا علیحدہ ہو کر میری بات سنیں جی۔"

وہ بیزار انداز میں سجاول کے ساتھ باہر چلا گیا۔ ہم اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے پھر بیٹھ گئے۔ سنبل خود کو خاصی خجل محسوس کر رہی تھی۔ وہ خوب صورت تھی اور اس کی خوب صورتی واقعی متاثر کرنے والی تھی...... اور مجھے یقین تھا کہ وہ سڑیل آقا جان بھی اس سے متاثر ہوا ہے۔ لیکن اس نے ظاہر یہی کیا تھا، جیسے سجاول جس لڑکی کو نادر تحفہ سمجھ کر لایا ہے، وہ عام سی لڑکی ہے۔

سجاول تو آقا جان کے ساتھ چلا گیا۔ ہم وہیں پر رہے اور اردگرد کا جائزہ لیتے رہے۔ ایک کھڑکی میں دیوار گیر شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس شیشے میں سے بھی دور فاصلے پر وہ محل نما عمارت نظر آتی تھی جس کا نظارہ ہم نے لوڈر سے اترتے وقت کیا تھا۔ عمارت کی بیرونی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ انہیں شاید حال ہی میں مزید اونچا کیا گیا تھا۔ اوپر خاردار تاروں کے بڑے بڑے چھلّے تھے۔ کئی جگہ چھوٹی چھوٹی برجیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ یقیناً یہ چیک پوسٹ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سورج کی روشنی میں سرچ لائٹس کے شیشے بھی چمک رہے تھے۔

جاناں نے کہا۔ "لگتا ہے کہ یہاں رہنے والوں کو سیکیورٹی کا بہت زیادہ مسئلہ ہے۔"

"ہاں لگ تو یہی رہا ہے۔"

''کن لوگوں سے خطرہ ہو سکتا ہے؟'' جاناں نے پوچھا۔

''بڑے لوگوں کے لیے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی یہ مضافاتی علاقہ ہے۔ یہاں زمیندار لوگ رہتے ہیں، ممکن ہے کہ یہ کوئی مقامی خطرہ ہی ہو۔''

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ سجاول واپس آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ خاصا تپا ہوا ہے۔ وہ اور میں کشادہ کمرے کے ایک گوشے میں کارنر صوفے پر جا بیٹھے۔ وہ بولا۔ ''بہت بھیڑی شے ہے یہ آقا جان۔ ایک نمبر کا دغاباز اور لالچی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کڑی میں نقص کیوں نکال رہا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہے اس کو۔ لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ہے۔ پہاڑی لوگ تھے، ٹھیک ٹھاک پیسے دے کر لایا ہوں اسے۔ اور یہ خانہ خراب آقا جان کہہ رہا ہے کہ مال نرم ہے۔''

''کوئی چکر ہو گا اس کے پیچھے یا پھر تم سے کچھ رقم اینٹھنا چاہتا ہو گا۔''

''میں نے اشاروں کنائیوں میں کہا ہے کہ اگر کچھ مال پانی کا مسئلہ ہے تو وہ بھی حل ہو سکتا ہے۔ مگر ایک بار اس کڑی پر وڈے صاحب کی نظر ضرور پڑنی چاہیے۔''

''کیا کہتا ہے؟''

''یہی کہ لڑکی ابھی کچی لگتی ہے۔ اٹھنے بیٹھنے کی تمیز نہیں ہے۔ بات چیت اور لباس کا رنگ ڈھنگ بھی ایسا ہے کہ وڈے صاحب کو پسند نہیں آئے گا۔ کہہ رہا ہے کہ یا تو اسے واپس لے جاؤ یا چند دن یہاں بنگلے میں رہنے دو تاکہ اس پر تھوڑی محنت کر کے اسے وڈے صاحب کے قابل بنایا جا سکے؟''

''اور محنت کرے گا کون؟''

''کہتا ہے کہ یہاں دو تین عورتیں ایسی ہیں جو وڈے صاحب کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔''

''اور ہم واپس چلے جائیں گے؟''

''نہیں۔ تم اور جاناں تو شاید نہیں جاؤ گے۔ میں اور انیق لکڑی کا دوسرا پھیرا لے کر دو چار دن میں پھر آ جائیں گے۔''

''میں اور جاناں کس طرح یہاں رہیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ یہ لنڈھینگ (جاناں) یہاں کسی کام آسکتی ہے۔ یہ آقا جان کی بیوی کو گھٹنے نپنے کے کام آئے گی۔''

''آقا جان کی بیوی؟''

''ہاں کسی انگریز سے بیاہ کیا ہوا ہے اس نے۔ اس عورت کے بس دو ہی شوق ہیں۔ انگریزی کے ناول پڑھنا اور اپنی ٹانگیں دبوانا۔ لیکن پڑھ وہ خود نہیں سکتی۔ اس کی آنکھوں اور سر میں سخت درد ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے کسی ایسی کڑی کی ضرورت ہے جو اسے کتاب پڑھ کر سناتی رہے، اور ساتھ ساتھ ہر گھنٹے بعد پانچ دس منٹ کے لیے اس کا جسم بھی دباتی رہے۔''

ہمیں جہاں رکھا گیا تھا، یہ دراصل اس بنگلے کی انیکسی تھی۔ رات کو ہمارے لیے ساتھ والا کمرا بھی کھول دیا گیا۔ میں سجاول اور انیق اس کمرے میں چلے گئے۔ جاناں اور سنبل دوسرے کمرے میں رہیں۔ شام کے بعد ہمیں آقا جان کی بیوی کی بس ایک چھوٹی سی جھلک نظر آئی۔ وہ ٹیرس میں کھڑی کسی کو آواز دے رہی تھی۔ خوب صورت تو تھی لیکن موٹی ہو چکی تھی۔ عمر پینتیس چالیس ہو گی۔ گال سیبوں کی طرح دہک رہے تھے۔

انیق رات کا کھانا کھانے کے بعد برآمدے میں ٹہلنے چلا گیا۔ میں اور سجاول اپنے اپنے بستر پر بیٹھے صورتِ حال پر غور کرتے رہے۔ باتیں کرنے سے پہلے میں نے اچھی طرح کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ یہاں آڈیو وڈیو ریکارڈنگ کا کوئی خفیہ انتظام نہ ہو۔ لیکن یہ اندیشہ غلط نکلا۔ بہرحال ہم نے گفتگو میں بالکل دھیما لہجہ ہی اختیار کیا۔ میں نے سجاول سے کہا۔ ''میں جانتا ہوں، تم نے کچھ باتیں مجھے بتائی ہیں اور کچھ چھپائی بھی ہیں اور جو چھپائی ہیں شاید وہ زیادہ اہم ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''اگر ہمیں ایک ساتھ چلنا ہے اور اس وڈے صاحب کا کچا چھٹا جاننا ہے تو پھر ایک دوسرے سے آدھا نہیں پورا سچ بولنا ہو گا۔ اسی صورت میں کامیابی مل سکتی ہے۔''

''میں نے تم سے کیا چھپایا ہے؟'' وہ اپنی بھاری پاٹ دار آواز میں بولا۔

''پہلی بات تو یہ چھپائی ہے کہ منشی افضل بھاگنے کی کوشش میں مارا گیا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے کارندوں نے اسے ''لڈو پیڑے'' والے کمرے سے خود نکالا اور قتل کیا۔''

سجاول کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا۔ اسی طرح پہلو کے بل لیٹا رہا۔ سر کو اونچا رکھنے کے لیے اس نے

کہنی کو تکیے پر ٹکایا ہوا تھا۔ اس کے چوڑے چکلے جسم نے جیسے پورے بیڈ کو گھیرا ہوا تھا۔ ''اب دوسری بات بھی بتا دو۔'' وہ بولا۔

''دوسری بات یہ کہ تم نے منشی افضل سے بہت کچھ اگلوایا۔ اسی کی دی ہوئی معلومات کے مطابق تم نے وڈے صاحب تک پہنچنے کے لیے لوڈر ڈرائیور کا روپ دھارا۔ منشی افضل کو پوری طرح نچوڑنے کے بعد تم نے اسے شوٹ کروا دیا۔''

سجاول نے وہسکی کے دو گلاس بھر لیے تھے۔ اس نے ایک میری طرف بڑھایا اور دوسرے سے گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ اس کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے دھیمے لہجے میں بولنا شروع کیا۔

''یہ وڈا صاحب جو کوئی بھی ہے بیرونائی سے آیا ہے۔ بے تحاشا پیسے کا مالک ہے۔ لیکن ہے چِٹا ان پڑھ۔ کہتے ہیں کہ زندگی میں اس نے جس مٹی میں بھی ہاتھ ڈالا ہے اسے سونا بنایا ہے۔ کافی شوقین مزاج بھی ہے۔ پھولوں اور خوشبوؤں سے بہت زیادہ پیار کرتا ہے۔ سیکڑوں طرح کے تو گلاب ہی ہیں جو اس نے اپنے محل میں لگا رکھے ہیں۔''

میں نے دیوار گیر کھڑکی سے باہر دیکھا درمیانی راتوں کا گول چاند محل نما عمارت کی بلند برجیوں کے اوپر دمک رہا تھا۔ قریباً سترہ اٹھارہ فٹ اونچی چار دیواری پر سرچ لائٹس حرکت کر رہی تھیں۔

سجاول نے کہا۔ ''شاید اس چاند کو دیکھ رہے ہو تم۔ اس چاند کا بھی یہاں ہونے والے پروگرام سے گہرا ناتا ہے۔''

''چاند کا...... گہرا ناتا؟''

''ہاں...... ہر تیسرے چاند پر یہ وڈا صاحب اپنے لیے کچھ تفریح وغیرہ کا انتظام کرتا ہے۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو یہاں اس مہمان خانے میں ہم اکیلے ہی نہیں ٹھہرے ہوئے...... پانچ چھ اور مہمان بھی ہیں۔ سمجھو کہ پانچ چھ لڑکیاں اور ان کو یہاں لانے والے...... کل چودھویں کی رات ہے اور سب کو کل ہی کا انتظار ہے۔''

''تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی سجاول۔ کسی ترتیب سے بتاؤ تو شاید پتا چل جائے۔'' میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔

اس نے حسبِ عادت اپنی تیکھی مونچھوں کو شہادت کی انگلی سے سہلایا اور بولا۔ ''یہاں پانچ چھ کڑیاں اور بھی ہیں۔ کل وہ سب وڈے صاحب کے سامنے لائی جائیں گی۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے پاس رکھے گا۔ اس کو یہ لوگ ''ملازم رکھنا'' کہتے ہیں۔ باقی لڑکیوں اور ان کے وارثوں کو انعام اکرام دے کر رخصت کر دیا جائے گا۔ ملازم ہونے والی کڑی دو تین مہینے یہاں وڈے صاحب کے پاس رہے گی اور پھر کافی ساری رقم اور تحفے تحائف لے کر چلی جائے گی۔ لیکن ایسی ملازماؤں میں سے کوئی ایک آدھ ایسی خوش قسمت بھی ہوتی ہے جو خواص بن جاتی ہے۔''

''خواص کا کیا مطلب؟''

''مطلب تو ٹھیک سے مجھے بھی پتا نہیں۔ بس یہ سمجھو کہ وڈا صاحب اسے رخصت نہیں کرتا بلکہ پکی ملازمت دے دیتا ہے۔ ایسی سات آٹھ زنانیاں اور بھی یہاں موجود ہیں۔ ان کو خواص کہا جاتا ہے۔ وہ اس محل جیسی بلڈنگ کے علیحدہ علیحدہ حصوں میں بڑے ٹھاٹ سے رہتی ہیں۔''

''علاقے کے لوگ پوچھ تاچھ نہیں کرتے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''پوچھ تاچھ کرنے والے کون لوگ ہوتے ہیں؟ یہی علاقے کے ایم پی اے، ایم این اے اور دوسرے آگو زمیندار وغیرہ۔ یہ سب لوگ تو خود ایسے حماموں میں ننگے نہا رہے ہیں۔ ویسے بھی یہ سارا کام بڑے طور طریقے سے کیا جاتا ہے۔ اخبار میں باقاعدہ اشتہار دیا جاتا ہے کہ پڑھی لکھی خوش اخلاق ملازمہ کی لوڑ ہے وغیرہ وغیرہ۔ پر جاننے والے جانتے ہیں کہ وڈے صاحب کے محل میں کس طرح کی ملازمہ چاہیے اور کیوں چاہیے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ملازمہ اور ملازمت کے لفظ یہاں کس مطلب میں بولے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ آجاتے ہیں۔ اب بھی آئے ہوئے ہیں۔''

''کون لوگ ہیں یہ؟'' میں نے پوچھا۔

''یار، وہی شہدے جو اس طرح کے کام کرتے ہیں۔ ان میں سے دو تو لاہور کے شاہی محلے سے یہاں پہنچے ہیں۔ ایک خیر سے میرے سیالکوٹ کا ہی ہے...... لاہور سے ہی فلموں کا ایک ایکسٹرا سپلائر بھی ایک سپلائی (یعنی ایک لڑکی) لے کر آیا ہوا ہے۔ ایک بظاہر شریف زنانی ہے، بیوٹی پارلر والی...... وہ اپنی سگی بھتیجی کو لے کر یہاں پہنچی ہوئی ہے۔ یہ سب وہ کڑیاں ہیں جن کو اس حرامی آقا جان نے چن رکھا ہے۔ لیکن مجھے ایک سمجھ نہیں آرہی۔'' سجاول الجھے ہوئے سے انداز میں بولا۔

''وہ کیا؟''

''میں نے دوپہر کو ان میں سے تین چار کڑیوں کو

دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک بھی اس سنبل کے پائے کی نہیں ہے۔ پائے کی کیا اس کے گوڈوں تک بھی نہیں آتی۔ پر یہ بہن خور آقا جان سنبل میں کیڑے نکال رہا ہے۔''

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ آقا جان اور یہ وڈا صاحب نازل کہاں سے ہوئے ہیں پاکستان میں؟''

جواب میں سجاول نے اپنی محدود معلومات کے مطابق جو کچھ بتایا، اس کا لب لباب یہ تھا۔ ''وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ساتھ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی کسی کے ساتھ سخت دشمنی چل رہی تھی۔ اس دشمنی سے خود کو اور بیٹوں کو بچانے کے لیے وہ یہاں آ گیا تھا۔ وڈے صاحب کے اصل نام کا تو سجاول کو پتا نہیں تھا، ہاں یہ معلوم تھا کہ اس کا باپ مسلمان اور ماں کوئی کرسچن خانہ بدوش تھی۔ وڈا صاحب صرف آٹھ سال کا تھا کہ اس کی ماں فوت ہو گئی۔ باپ بھی زیادہ توجہ نہ دے سکا اور وڈا صاحب آوارہ ہو گیا۔ وہ ان پڑھ تھا لیکن زبردست مقدر لے کر پیدا ہوا تھا۔ جوان ہو کر اس نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا، اس کو سونے کی کان بنا دیا۔ برونائی میں تیل کی ایک بڑی کمپنی اس کی ملکیت تھی۔ اس کے علاوہ کئی فیکٹریاں، فرمیں اور فارم ہاؤسز بھی اس کی پراپرٹی میں شامل تھے۔ جہاں دولت زیادہ ہوتی ہے وہاں حاسد بھی ہوتے ہیں۔ اپنے خاندان میں ہی کسی حاسد سے وڈے صاحب کی دشمنی چل نکلی۔ مگر یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اس دشمنی کی جڑیں ماضی میں کافی دور تک موجود تھیں۔ وڈا صاحب جب چالیس پینتالیس کا تھا اس کو ایک خطرناک بیماری نے آلیا۔ اس کی جان تو بچ گئی مگر اس کی قوتِ سماعت بہت کمزور ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس کی جلد پر داغ سے نمودار ہو گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس بیماری کے پیچھے بھی ''دشمنی'' ہی تھی۔''

سجاول نے مزید جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یوں تھا۔ مجموعی طور پر وڈا صاحب بہت نفیس سمجھا جاتا تھا۔ اچھے لباس، اچھی خوشبوئیں اور بہترین گاڑیاں اس کا شوق تھا۔ اب اس کی عمر پچپن سال سے اوپر تھی مگر جسمانی طور پر صحت مند تھا۔ دیگر مشاغل کے علاوہ خواتین کے ساتھ وقت گزارنا بھی اسے پسند تھا۔ اس کے لیے وہ بڑے کھلے دل سے روپیا بھی خرچ کرتا تھا۔ اس کے مذہب کے بارے میں بات واضح نہیں تھی۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ مسلمان ہے، کچھ کا خیال تھا کہ اس نے اپنی ماں کا مذہب اپنایا ہوا ہے۔

سجاول کی ساری بات سننے کے بعد میں نے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں جو بہت ہائی سیکیورٹی نظر آ رہی ہے، اس کی وجہ وڈے صاحب کی وہ برونائی والی دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔''

''شاید ایسا ہی ہے۔'' سجاول بولا۔

''لیکن وہ دوسرا معما کیا ہے؟''

''کون سا؟''

''ان لڑکیوں والا جن کو زہر دے کر کسی کام کے لیے تیار کیا جا رہا ہے؟''

''تمہارا دماغ کیا کہتا ہے؟'' سجاول نے کہا۔

''ابھی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ لیکن لگتا ہے کہ یہ معاملہ عیاشی والا نہیں ہے۔ وہ لڑکیاں کوئی بہت زیادہ خوب صورت بھی نہیں۔ پھر ان کا تعلق ایسے گھرانوں سے ہے جو مذہبی ہیں۔ ان لڑکیوں سے شاید کوئی اور طرح کا کام لیا جانا ہے۔''

اچانک ساتھ والے کمرے میں آہٹ ہوئی اور پھر کسی عورت کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ اس ساتھ والے کمرے میں جاناں اور سنبل ٹھہری ہوئی تھیں۔ میں دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ ایک عورت ولایتی لہجے میں اردو بول رہی تھی اور جاناں سے باتیں کر رہی تھی۔ ''ہام کو بہت خوشی ہوا کہ تم، ہام کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ ہام کو تم جیسا گرل کا بہت ضرورت تھا۔''

''مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہو گی۔'' جاناں نے کہا۔

''کیا تم ابھی ہام کے ساتھ چلنا پسند کریں گا۔ ہام کا دل کتاب سننے کو چاہتا ہے۔''

میں نے کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ یہ وہی، آقا جان کی فربہ اندام انگلش بیوی تھی جس کی جھلک بالکونی میں نظر آئی تھی۔ وہ بڑے دھڑلے سے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے جاناں سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کا لہجہ ضرور نرم تھا مگر چہرے پر اپنے خاوند کی طرح ہی کرختگی تھی۔ اس بارے میں میرے اور سجاول کے درمیان پہلے ہی مشورہ ہو چکا تھا۔ اس مشورے کے مطابق جاناں اس انگریز عورت کے ساتھ چلی گئی۔ کمرے میں اب سنبل اکیلی تھی۔ سجاول نے اس کے پاس جا کر اسے تسلی تشفی دی اور کہا کہ وہ آرام سے لحاف اوڑھ کر اور دروازہ بند کر کے سو جائے۔ جاناں کے پاس کمرے کی چابی ہے۔ جب اس کو آنا ہو گا، خود ہی آ جائے گی۔

میں اور سجاول اپنے کمرے میں ایک بار پھر باتوں

میں مصروف ہو گئے۔ اس مرتبہ گفتگو پھر منشی افضل کی موت سے شروع ہوئی۔ سجاول نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اقرار کرلیا کہ اسے منشی کو قتل کرنا پڑا ہے...... ابھی ہمیں گفتگو کرتے ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ باہر سے ایک بار پھر آقا جان کی کڑک دار آواز آنا شروع ہو گئی۔ وہ کسی اور ملازم کو ڈانٹنے پھٹکارنے میں مصروف تھا۔ سجاول نے کہا۔ ''اوے شاہی، تیرا وہ نکو شہزادہ ابھی تک نہیں آیا۔ کسی نے اغوا ہی نہ کرلیا ہو۔'' انیق کو وہ نکو شہزادہ کہہ کر بلانے لگا تھا۔

میں نے کہا۔ ''گھبراؤ نہ۔ وہ اتنا نکو بھی نہیں۔ عام کیٹیگری کے دو تین بندوں کو تو وہ خود اغوا کر سکتا ہے۔''

''بھئی، بڑی لمبی عمر ہے اس کی۔ وہ دیکھو آرہا ہے۔'' سجاول نے چھوٹی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

باہر ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی میں انیق لمبے ڈگ بھرتا ہوا آرہا تھا۔ دو منٹ بعد وہ کمرے میں تھا۔ میں اب اس کے تاثرات کو کافی حد تک پہچاننے لگا تھا۔ اس کی چپ بتا رہی تھی کہ وہ کوئی خبر لے کر آیا ہے۔

دروازہ بند کر کے اس نے احتیاط سے اردگرد کا جائزہ لیا اور دھیمی آواز میں کہا۔ ''مجھے ساتھ لا کر آپ لوگوں نے اچھا کیا ہے۔ میں نے آتے ساتھ ہی آپ حضرات کے لیے ایک آسانی پیدا کردی ہے۔''

''کیسی آسانی؟''

''میں نے ابھی آقا جان کو فون پر کسی سے باتیں کرتے سنا ہے۔ وہ لان میں ٹہل رہا تھا اور بڑی بے پروائی سے کسی سوہل نامی بندے سے گفتگو کررہا تھا۔ کافی خفیہ قسم کی گفتگو۔''

''خفیہ گفتگو اور سرعام؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں یہ مالے زبان میں تھی۔'' انیق ... معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''پتا چل گیا ہے جی کہ یہ آقا جان، سنٹل میں کیڑے کیوں نکال رہا ہے۔ دراصل وہ اپنا ایک الو سیدھا کرنا چاہ رہا ہے۔ کل جو پانچ چھ لڑکیاں وڈے صاحب کے سامنے جائیں گی ان میں سے ایک ایسی ہے جو آقا جان کے کسی جاننے والے کی سفارش سے آئی ہے۔ اگر وہ لڑکی وڈے صاحب کو پسند آجاتی ہے اور ''ملازمت'' کے لیے سلیکٹ ہو جاتی ہے تو آقا جان بڑے فائدے میں رہے گا۔ شاید روحی نام ہے اس لڑکی کا۔''

سجاول نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''وہی نسواری آنکھوں والی جو چست پتلون میں پنسل جیسی ٹانگیں لیے پھر رہی تھی......؟''

''میں نے اس کو دیکھا تو نہیں جی۔ بس نام سنا ہے۔'' انیق نے کہا۔

سجاول نے اس لڑکی کو اور آقا جان کو ایک غائبانہ گالی دی اور وہسکی کے کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اتنے غصے میں کیوں ہے۔ سفید پتلون اور سرخ جرسی والی لڑکی پر میری نظر بھی پڑی تھی۔ وہ واقعی اس لڑکی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی جو سجاول یہاں ''چارے'' کے طور پر وڈے صاحب کے لیے لے کر آیا تھا۔ اگر یہ ''چارا'' شکار تک پہنچ جاتا تو کسی بڑی کامیابی کی امید کی جاسکتی تھی۔ مگر راستے میں یہ آقا جان آگیا تھا۔

سجاول نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی طرح ہم براہ راست وڈے صاحب سے رابطہ کر سکیں۔ میرا مطلب ہے تمہارے اس نکو شہزادے کا فائدہ اٹھایا جائے۔ تمہارا یہ شہزادہ ان لوگوں کی بولی جانتا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بہت بڑی بات تو ہے لیکن اگر ہم جلد بازی کریں گے تو کام خراب بھی ہو سکتا ہے۔ لگتا ہے کہ اس خانہ خراب آقا جان نے وڈے صاحب کو پوری طرح اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے۔ ہمیں پہلے یہاں کی اونچ نیچ دیکھنا پڑے گی۔''

''مطلب یہ ہوا کہ اس بار تو ہم اس وڈے صاحب کے پاس بھی نہیں پھٹک سکیں گے۔ ہمیں اگلے تین مہینے تک انتظار کرنا پڑے گا۔'' سجاول نے کہا۔

''لگتا تو یہی ہے۔ پر ہو سکتا ہے کوئی راستہ نکل آئے۔'' میں نے کہا۔ ''آقا جان کی باتوں سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ ابھی ہمیں یہاں رکھنا چاہتا ہے۔''

''اس میں بھی بدبخت کی کوئی چال ہی ہوگی۔'' سجاول پُرسوچ لہجے میں بولا۔

رات خیریت سے گزری۔ اگلے روز پُرتکلف ناشتا دیا گیا۔ جاناں رات کو آقا جان کی بیوی میڈم لورین کو سلانے کے بعد بارہ بجے کے لگ بھگ واپس آئی تھی۔ وہ گاہے بگاہے اپنے لمبے پتلے بازو خود ہی دبانے لگتی تھی۔ اس نے بتایا کہ میڈم لورین کی خمیرے آٹے جیسی ٹانگیں دبا دبا کر اس کا برا حال ہوا ہے۔

شام کو وہ کارروائی شروع ہوگئی جس کے لیے مختلف مہمان پچھلے تقریباً اڑتالیس گھنٹے سے اس بنگلے کی اینکسی میں

ٹھہرے ہوئے تھے۔ چھ عدد لڑکیاں جو آقا جان نے منتخب کر رکھی تھیں اپنے وارثوں کے ساتھ شاندار لینڈ کروزر گاڑیوں میں آ بیٹھیں۔ ان سب نے عجیب سوانگ بھر رکھے تھے۔ ایک نے بالکل ملائیشیائی طرز کا لباس پہن رکھا تھا اور اسی انداز سے بالوں کے جوڑے میں پھول سجا رکھے تھے۔ ایک ہندوستانی دلہن کے روپ میں تھی۔ اس نے بنارسی ساڑی باندھ کر زیورات پہن رکھے تھے اور ماتھے پر باقاعدہ ٹیکا لگا رکھا تھا۔ شاید کسی انڈین فلمی اداکارہ کا روپ پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک شہد رنگ بالوں والی لڑکی ایسے لباس میں تھی جو ایک چست لبادے کی صورت اس کے کندھوں سے لے کر اس کے ٹخنوں تک چلا گیا تھا۔ اس لبادے نے لڑکی کے جسم کو ایک بوتل جیسی شکل دے دی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اس کا چہرہ بوتل کا ڈھکن ہے۔ ایک امیدوار ایسی تھی جس کا لباس موتیے کی سیکڑوں لڑیوں کے ذریعے مکمل کیا گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ یہ لڑکیاں کسی خاص فینسی ڈریس شو میں حصہ لینے کے لیے جارہی ہیں۔

کچھ دیر بعد چمکتی دمکتی لینڈ کروزر گاڑیاں محل نما عمارت کی طرف روانہ ہو گئیں۔ روانہ ہونے والی ان لڑکیوں میں سفید پتلون اور سرخ جرسی والی روحی بھی تھی۔ ہر لڑکی کے ساتھ ایک یا دو افراد موجود تھے۔ یہ کل تین گاڑیاں تھیں۔ ہر گاڑی میں دو تین مسلح وباوردی محافظ بھی موجود تھے۔

یقیناً ان لوگوں کو سیکیورٹی کے کئی مراحل سے گزرنے کے بعد ہی محل نما عمارت میں جانے کا موقع ملا ہوگا۔ اب ہماری معلومات میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ اس محل نما عمارت کو یہاں پارا ہاؤس یا پارا کوٹھی کہا جاتا تھا۔ یہ نام ''پارا'' کیوں پڑا؟ اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ پارا ہاؤس قریباً پندرہ ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں تالاب، گولف کلب، وسیع پھلواریاں اور ہیلی کاپٹر وغیرہ موجود تھے۔ رہائشی عمارت دو منزلہ تھی۔ اور یہاں ساٹھ سے زائد کمرے تھے لیکن یہ ساٹھ ستر کمروں والی لق ودق عمارت بھی شاید وڈے صاحب کے لیے ناکافی تھی اور اب پارا ہاؤس کے عقب میں بالکل جدید طرز کی ایک اور عالی شان عمارت تعمیر کی جارہی تھی۔ بتایا جاتا تھا کہ یہ جدید عمارت دو پورشن کی صورت میں تعمیر ہو رہی ہے۔ یہ جگہ لیہ سے کافی فاصلے پر تھی...... جیسے ٹیلوں کے درمیان ایک نخلستان سا ہوتا ہے۔ اسے مقامی طور پر ورول کہا جاتا تھا۔ منشی افضل کے الٹے خط میں بھی اسے ورول ہی لکھا گیا تھا۔ باقی سارا خط چونکہ الٹے حرفوں میں تھا اس لیے ہم ورول کو بھی لورو پڑھتے رہے تھے۔

چودھویں کا چاند پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا اور پارا ہاؤس میں کوئی ایسی محفل برپا تھی جس سے ہمیں دور کر دیا گیا تھا۔ ہم صرف تصور ہی کر سکتے تھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہوگا۔ اگر گہرائی سے دیکھا جاتا تو یہ جسموں کی خرید وفروخت ہی تو تھی جسے ایک نئی اور مہذب شکل دینے کی کوشش کی جارہی تھی۔

مہمانوں کی واپسی رات بارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہی اطلاع ملی جس کی ہم توقع کر رہے تھے۔ انیق نے جو کچھ بتایا وہ بالکل درست تھا۔ وہی سفید پتلون اور سرخ گلابی جرسی والی چنچل لڑکی روحی ''ملازمت'' کے لیے منتخب ہو گئی تھی۔ اب اسے اگلے تین ماہ کے لیے پارا ہاؤس کی زمینی جنت میں رہنا تھا۔ اور اگر اس کی قسمت زور مارتی تو ہو سکتا تھا کہ وہ خواص بن کر خواص پورے کی زینت بن جاتی۔

سجاول بہت تپا ہوا تھا۔ اس کے طیش میں ایک اطلاع نے مزید اضافہ کر دیا تھا اور وہ اطلاع یہ تھی کہ منتخب ہونے والی لڑکی کو اسی کھلنے اور بند ہونے والے پھول میں بٹھا کر وڈے صاحب کی نظر سے گزارا گیا تھا جو سجاول خود بنوا کر یہاں لایا تھا۔ وہ اس خوب صورت مشینی پھول میں سنبل کو بٹھانا چاہتا تھا۔

کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ سجاول ٹرک ڈرائیور کا بہروپ چھوڑ کر سیدھا سیدھا ڈکیتی قاتل بن جائے گا اور جا کر آقا جان کی انتڑیوں میں اپنا ایک فٹ لمبا چھرا گھونپ دے گا مگر بندہ عقل مند تھا۔ جانتا تھا کہ کوئی بہت...... بہت بڑا فائدہ اس کا منتظر ہے اور اس فائدے کے لیے اسے کچھ صبر سے کام لینا پڑے گا۔ یہ بات تو اب ہماری سمجھ میں بھی اچھی طرح آرہی تھی کہ آقا جان نے اپنی من پسند لڑکی کو ملازمہ رکھوانے کے لیے اس گروپ کی دیگر لڑکیوں کی سلیکشن اپنے حساب سے کی تھی۔

جو لوگ پارا ہاؤس سے نامراد ہو کر واپس آئے تھے وہ بھی مکمل نامراد نہیں رہے تھے۔ ان سب کو قیمتی تحائف ملے تھے۔ ان میں زیورات، بیش قیمت پارچہ جات اور نقدی وغیرہ شامل تھی۔

اگلے دن یہ سب ''مہمان'' واپس روانہ ہو گئے۔ سجاول اور انیق بھی ڈرائیور اور کنڈیکٹر کے روپ میں لوڈر لے کر آزاد کشمیر کی طرف نکل گئے۔ انہیں لکڑی کا اگلا پھیرا

لے کر چار دن بعد واپس آنا تھا۔ اب میں اور جاناں ہی بنگلے میں تھے۔ میرے بارے میں سجاول نے آقا جان کو بتایا تھا کہ میں ایک گن مین ہوں لیکن کوئی نوکری مجھے راس نہیں آتی اور کسی کو میں راس نہیں آتا۔ میں نے جاناں سے کورٹ میرج کی ہوئی ہے۔ آج کل جاناں مختلف کام کر کے کما رہی ہے اور میں آرام کر رہا ہوں لیکن بندہ میں کام کا ہوں اور اعتبار والا بھی۔ سنبل کو مزید تربیت دینے اور سنوارنے، نکھارنے کے لیے آقا جان نے ان عورتوں کے سپرد کر دیا تھا جن کا ذکر اس نے تین چار دن پہلے کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ عورتیں عام لڑکی کو خوب صورت...... خوب صورت کو حسین اور حسین کو حور پری بنا دیتی ہیں۔

میں جانتا تھا کہ یہاں سنبل کو کسی بھی طرح کی زبردستی کا سامنا نہیں ہوگا۔ سب سے اہم وجہ تو یہ تھی کہ وہ وڈے صاحب کے لیے بطور تحفہ یہاں آئی تھی۔ اس پر میلی نظر ڈالنا یقیناً بہت بڑا خطرہ مول لینا تھا۔ دوسرے میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ آقا جان کو عورت سے کوئی ایسی خاص دلچسپی نہیں۔ یا ممکن تھا کہ تھوڑی بہت ہو لیکن اپنی دبنگ بیوی کی وجہ سے وہ اس باب کو بند رکھتا ہو۔

☆☆☆

رات سرد اور خاموش تھی۔ میں بنگلے کے آرام دہ کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ ٹی وی آن تھا مگر آواز بہت دھیمی تھی۔ کھڑکی میں سے دور قریباً ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر پارا ہاؤس کی برقی روشنیاں نظر آرہی تھیں اور سرچ لائٹس کے دائرے گھومتے دکھائی دیتے تھے۔ پتا چلا تھا کہ پارا ہاؤس کے لیے بجلی کی ہیوی لائن قریباً چار کلومیٹر دور سے لائی گئی تھی۔ اسی طرح پارا ہاؤس والوں نے ذاتی خرچ پر قریباً چودہ کلومیٹر سڑک کو از سر نو تعمیر کروایا تھا۔

کمرے میں الیکٹرک ہیٹر، فریج، ٹی وی، انٹرکام غرض ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ وال کلاک رات کے گیارہ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر پاکستان کا معروف لوک گلوکار شوکت علی نغمہ سرا تھا...... بہار آئی تو صحرا کی طرف چل نکلا......

میری آنکھوں کے سامنے تاجور کی من موہنی صورت آگئی۔ اس کا سادہ معصوم حسن اپنی بے پناہ کشش کے ساتھ میرے خیالات پر حملہ آور ہوا۔ وہ کیا تھی؟ کہاں سے میری زندگی میں آئی تھی اور کہاں چلی گئی تھی؟

دل درد سے بھر گیا۔ اسے خود سے جدا کرنا میرے لیے آسان نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے لگاؤ رکھتی ہے لیکن ذہنی طور پر مجھ سے بہت دور ہے۔ میں اس کی محبت میں سر تا پا ڈوبا ہوا تھا مگر اس کے جذبے میں شاید وہ طاقت نہیں تھی جو مجھے میرے ماضی اور حال سمیت قبول کر سکتی۔ مجھ سے سوال کیا جا سکتا تھا کہ میں نے خود کو بدلنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ اس کا جواب بڑا مشکل تھا۔ میں حالات کے جس بندی خانے میں بند تھا۔ اس میں سے صرف ایک ہی راستہ نکلتا تھا اور وہ قبرستان میں لے جاتا تھا۔

میں نے سائیڈ ٹیبل سے بوتل اٹھائی اور اپنے لیے جام بنانا شروع کیا۔ پتا نہیں کیوں، میں اب جس وقت بھی ساغر و مینا کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا، ایک چہرہ میرے سامنے آجاتا تھا۔ اس چہرے پر بالوں کی دو ریشمی لٹیں جھولتی تھیں اور آنکھوں میں دل چیر دینے والا دکھ ہوتا تھا۔

اسی اثنا میں دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے جاناں کھڑی تھی۔ ''السلام علیکم'' اس نے بڑی ادا سے کہا اور اندر آگئی۔

''تمہاری ڈیوٹی تو میڈم لورین کے ساتھ تھی۔''

''ڈیوٹی کسی وقت ختم بھی تو ہو سکتی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''کیا مطلب؟''

''میڈم بڑی سمجھ دار عورت ہے۔ اسے پتا ہے کہ عورت روٹی اور پانی کے بغیر تو زندگی گزار سکتی ہے لیکن محبت اور توجہ کے بغیر نہیں۔ اور خاص طور سے اپنے شوہر کی محبت اور توجہ کے بغیر۔ اس لیے اس نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا ہے۔ ان کی نظروں میں تو ہم میاں بیوی ہی ہیں۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بڑی قیامت نظر آرہی تھی۔ لانبا لیکن نازک اور گداز بدن۔ کمر تک جاتے ہوئے گھنے بال اور خوب صورت آنکھوں میں محبت اور لگن کی جوت۔ وہ جیسے ان لمحوں کی قید میں تھی جب وہ ایک کھوہ میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی تھی اور کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے موت کے جبڑوں سے نکالا تھا۔

''جاناں! تم دوسرے کمرے میں سو رہو تو بہتر ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں ایک کونے میں پڑا رہنے دیں گے تو بہت نوازش ہوگی۔'' وہ اپنی دودھیا کلائی میں کنگن کو گھماتے ہوئے بولی۔

میں نے کمرے کو چاروں طرف دیکھا۔ ''کس کونے

میں پڑے رہنا پسند فرماؤ گی؟"
"میں کمرے کے کونے کی نہیں، بستر کے کونے کی بات کر رہی ہوں۔" وہ شوخی سے بولی۔
میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے جام میرے ہاتھ میں تھما دیا۔
وہ رات ہم نے ساتھ گزاری۔ الکحل اور جاناں کی قربت میں، میں اپنے اندر کے بے پناہ دکھ کو کچھ دیر کے لیے بھول گیا۔ وہ چہرہ عارضی طور پر میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گیا جس پر دو لٹیں جھولتی تھیں اور دو دو کبے خنجروں کی طرح میرے دل کو درمیان سے چیر ڈالتی تھیں۔ مگر پھر بھی صبح دم اٹھا تو سینے پر جیسے ایک بہت بھاری بوجھ رکھا تھا۔ ایسا بوجھ جس سے مجھے کراہت محسوس ہوتی تھی اور جو میری پسلیوں کو توڑے ڈالتا تھا۔
رات بھر کے خمار کی وجہ سے سر میں درد تھا۔ جاناں کو وہیں سوتا چھوڑ کر میں باہر نکل آیا۔ سرد ہوا لگی تو طبیعت کچھ بحال ہونے لگی۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہلکی سی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ موسم اب بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ یخ بستہ ٹھنڈ والی کیفیت ختم ہو رہی تھی۔ لیکن جب ہوا چلتی تھی تو بہت سرد ہوتی تھی۔
اس وسیع بنگلے میں سامنے اور پیچھے دونوں طرف قریباً ایک ایک کینال کا گراسی لان تھا۔ سامنے والے لان کے درمیان مین گیٹ تھا، جہاں ایک یا دو باوردی گارڈز موجود رہتے تھے۔ میں سامنے والے لان کے بجائے پچھلے لان میں ٹہلنے لگا۔ دراصل میرے اور سجاول میں یہی مشورہ ہوا تھا کہ ہم بنگلے میں زیادہ وقت کمروں کے اندر ہی گزاریں۔ اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ عالمگیر وغیرہ میں سے کوئی یہاں آجاتا...... اور ہمیں دیکھ لیتا۔ یہ صورتِ حال سجاول اور عالمگیر کی "دوستی" کے لیے زہرِ قاتل ثابت ہوتی۔
ابھی مجھے ٹہلتے ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک کمرے میں سے سنبل چہکتی ہوئی نکلی۔ اس کی گود میں سفید رنگ کا چھوٹا سا میمنا تھا۔ وہ اس سے لاڈ کر رہی تھی اور چوم رہی تھی۔ ایک اور لڑکی بھی اس کے ساتھ تھی۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا اور اپنے حال میں مگن رہیں۔ یہ سنبل واقعی ہوش رُبا خوب صورتی کی مالک تھی۔ پھر عمر بھی چھوٹی تھی، جو اسے دیکھتا تھا، دیکھتا رہ جاتا تھا لیکن میں اسے صرف ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تاجور کی سادہ خوب صورتی کو دیکھنے کے بعد کسی اور کو دیکھنے یا سراہنے کی حس ہی جیسے ختم ہو گئی تھی۔

دونوں لڑکیاں ہنستی کھیلتی اندر چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے ہیوی موٹر سائیکلوں کے ہوٹرز کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً گردن اونچی کر کے بنگلے کی چار دیواری سے باہر جھانکا۔ گاڑیوں کا ایک قافلہ پارا ہاؤس کی طرف سے برآمد ہوا تھا اور اب برق رفتاری سے جنوب کی طرف جا رہا تھا۔ یہ کم و بیش بیس گاڑیاں ہوں گی اور ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی۔ موٹر سائیکلز کے عقب میں مسلح گارڈز کے دو اوپن ویگو تھے۔ اس کے پیچھے ایک لینڈ کروزر جیپ تھی۔ اس کے پیچھے دو کھلی جیپیں تھیں پھر ایک شاندار پورشے گاڑی تھی۔ اس کے شیشے تاریک تھے۔ عقب میں پھر مسلح گارڈز کا جتھا تھا۔ پچھلے حصے میں کچھ کاریں تھیں اور آخر میں دو بڑے لوڈر تھے۔ یہ پُرشکوہ قافلہ برق رفتاری سے بنگلے کے قریب سے گزرا اور چند سیکنڈ بعد درختوں میں اوجھل ہو گیا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وڈا صاحب عام طور پر کالے شیشوں والی سفید پورشے...... میں سفر کرتا ہے۔ یقیناً یہ وہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ لوگ تلور وغیرہ کے شکار پر نکلے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق یہ شکار سدھائے ہوئے عقابوں سے کیا جاتا تھا۔
میں وہیں سرسبز لان میں کھڑا سوچتا رہا۔ یہ عالی مرتبت وڈا صاحب کون ہے؟ یہ یہاں کیوں موجود ہے؟ اور اس کے حوالے سے یہاں سے سیکڑوں میل دور چاند گڑھی کی بھولی بھالی زینب پر جو ظلم ہو رہا ہے، اس کا مقصد کیا ہے؟
جاناں یہاں پہنچنے کے بعد ایک فعال روپ میں نظر آنے لگی تھی۔ اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر گلابی چمک نظر آتی تھی اور چال ڈھال میں تیزی آ گئی تھی۔ وڈے سردار اعظم نے اس کے ماتھے پر جو زخم لگایا تھا وہ مندمل ہو چکا تھا بس معمولی نشان رہ گیا تھا۔ وہ بھی لمبے بالوں کے آگے کو جھکے ہوئے اسٹائل میں چھپ جاتا تھا۔ جاناں رات گئے تک میڈم لورین کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے دو ہی کام تھے۔ میڈم کو انگلش ناول سنانا یا اس کی مٹھی چاپی کرنا۔ اپنی اس ذمے داری کے دوران میں اس نے کچھ اہم معلومات بھی حاصل کر لی تھیں۔
سجاول اور انیق کو آزاد کشمیر سے لکڑی کا اگلا پھیرا لانے میں پانچ دن لگ گئے۔ وہ لوگ چھٹے روز دوپہر کے وقت یہاں پہنچے۔ ان کے آنے کی خبر مجھے آقا جان سے ہی ملی۔ آقا جان سے دن میں کم از کم ایک بار ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔ وہ سخت سڑیل اور غصیلا تھا مگر اب مجھے اس کا

مزاج سمجھ میں آ گیا تھا۔ لہٰذا میں اسے کامیابی سے ہینڈل کر رہا تھا۔ وہ مجھے جاناں کے نکھٹو شوہر کی حیثیت سے برداشت کر رہا تھا اور میں اسے وڈے صاحب کے منہ چڑھے خرانٹ ملازم کی حیثیت سے جھیل رہا تھا۔

لوڈر سے مال اتروانے کے بعد سجاول سہ پہر کو ہی بنگلے میں واپس آ گیا تھا لیکن اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ انیق نے بتایا کہ اسے آقا جان نے اپنے پاس روک لیا ہے، شاید کوئی خاص بات کرنی ہے۔

انیق نے سفر کی صورتِ حال بتائی اور میرا حال احوال پوچھا۔ سجاول کے بارے میں انیق کی رائے بالکل تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اس کے مطابق وہ ایک بے حد سفاک اور عیار شخص تھا...... اور اپنے مطلب کی خاطر کسی بھی بندے کو چیونٹی کی طرح مسل سکتا تھا۔ اس نے بتایا کہ راستے میں کس طرح اس نے معمولی جھگڑے پر ایک ٹریفک کانسٹیبل کو شوٹ کر دیا ہے۔

اسی دوران میں سجاول بھی آ دھمکا۔ مجھ سے گلے ملا اور گرم جوشی کا اظہار کیا۔ تاہم میں اس کی آنکھوں میں غصے کی لالی بھی صاف دیکھ رہا تھا۔ یہ غصہ آقا جان کے لیے تھا اور اس کی تصدیق بھی جلد ہی ہو گئی۔ میں اور سجاول کمرے میں پہنچے۔ تنہائی ملتے ہی سجاول پھٹ پڑا۔ اس نے آقا جان کو زبردست صلواتیں سنائیں اور اس کی ماں بہن سے انواع و اقسام کے رشتے جوڑے۔ "یہ خبیث ہمارے اور وڈے صاحب کے درمیان دیوار بنا ہوا ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس دیوار کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں، پتا نہیں کیسے برداشت کر رہا ہوں۔"

میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔ "یہ چاہتا ہے کہ سنبل کو ہم سے خرید لے...... اور بعد میں اپنے طور پر اور اپنے حساب سے وڈے صاحب کو پیش کرے۔"

"اس سے ایسی ہی امید تھی۔" میں نے کہا۔

"اپنی طرف سے بڑا ہوشیار لومڑ بنتا ہے، کہہ رہا ہے کہ اب تو ہمیں سنبل سے کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے تین مہینے انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس سے پہلے وڈا صاحب کوئی نئی ملازمہ نہیں رکھے گا۔"

"سنبل کے لیے کیا آفر کر رہا ہے تمہیں؟"

"تین لاکھ روپیا، اور وہ بھی نقد نہیں۔ تین لاکھ کے زیور دے رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی اس نے ان لوگوں سے اینٹھے ہوں گے جو وڈے صاحب سے بخششیں وغیرہ لے کر آتے ہیں۔ اس کو پتا نہیں کہ 50 لاکھ کے زیور بھی ہوں گے تو میں اس کے منہ پر پھینک دوں گا۔ مجھے یہ کوئی بڑا چکر نظر آ رہا ہے شاہی! ہمیں اس کی تہ تک پہنچنا ہوگا۔"

سجاول کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے وہ منظر یاد آ گیا جب میرے ساتھ دوبدو مقابلے میں اس کی وحشت عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ تب وہ ایک اور ہی مخلوق نظر آتا تھا لیکن اس نارمل حالت میں بھی وہ کچھ کم خوفناک نہیں تھا۔ غصے میں اس کا مارا ہوا ایک مُکا کسی کو بھی عدم آباد کی سیر کرا سکتا تھا۔ کچھ جدا سی بات تھی اس کے اس دائیں ہاتھ میں اور بازو میں۔ میں نے ہتھ جوڑی میں اس کا مُکا کندھے پر سہا تھا اور اس واقعے کو دو ہفتے گزر چکے تھے مگر اثرات ابھی باقی تھے۔

کسی وقت سجاول کی آنکھوں میں جھانک کر مجھے موذن عبدالرحیم کی موت بھی یاد آ جاتی تھی اور دل درد سے بھر جاتا تھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟" سجاول نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے بھی ترکی بہ ترکی پوچھا۔

"یہی کہ تم وہ بات کب مانو گے جو باقر نے بتائی تھی۔ تم بہت بڑے یورپی پھڈے باز ہو۔"

"یہ پھڈے باز کا لفظ تو تم بالکل غلط استعمال کر رہے ہو، مارشل آرٹ کا کھلاڑی کہو تو پھر بھی بات ہے۔"

"چلو پھڈے باز کھلاڑی کہہ لیتے ہیں۔" وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔

"اور اس پھڈے باز کھلاڑی کو تمہاری والدہ محترمہ جوائی بنانے پر تلی ہوئی ہیں۔" میں بات کو ہلکے پھلکے انداز میں لے گیا۔

اس نے گہری سانس لی اور مسکرانے لگا۔ "ہاں، ماں وہاں بہت یاد کر رہی ہیں تم کو۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا ہے کہ تم ضروری کام سے نکلے ہو، چند دن میں آ جاؤ گے۔ انہوں نے تمہارے لیے دیسی گھی اور مربہ وغیرہ بھی بھیجا ہے۔ ساتھ ہی الٹی میٹم دیا ہے کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ دو ہفتے کے اندر واپس آنا چاہیے۔"

ایک بار پھر کسی کمرے سے آقا جان کی چنگھاڑیں سنائی دیں۔ اس بار ساتھ ہی اس کی بیوی بھی بول رہی تھی۔ دونوں کسی ملازمہ کی ایسی تیسی کر رہے تھے۔ آقا جان کی آواز سنتے ہی سجاول کا موڈ بگڑ جاتا تھا۔ اس نے منہ ہی منہ میں کوئی گالی بکی اور بولا۔ "پتا نہیں کس افلاطون نے اس خبیث کی ماں کو امید سے کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ ''جہاں تک مجھے پتا چلا ہے یہ پاکستان سے برونائی گیا تھا۔ اور وہاں دس بارہ سال وڈے صاحب کی کسی فرم کا منیجر رہا ہے۔ کافی منہ چڑھا ہے۔ اب وڈے صاحب کو یہاں پاکستان آنا پڑا ہے تو یہ بھی ساتھ آیا ہے۔ یہاں آکر اس کا اثر رسوخ بڑھ گیا ہے کیونکہ یہ دونوں زبانیں جانتا ہے۔''

''کرلیں گے اس کی پھرتیوں کا بھی علاج۔'' سجاول نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''اب کیا ارادے ہیں؟'' میں نے گیس ہیٹر آن کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے پچھلے چھ سات دنوں میں کیا ٹوہ لگائی ہے؟'' سجاول نے الٹا سوال کیا۔

''ٹوہ یہی ہے کہ وڈے صاحب کا اصل نام ریان فردوس ہے۔ لیکن اسے وڈے صاحب...... بڑے صاحب یا پھر عزت مآب کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ اس نے پچھلے قریباً تین سال سے یہاں ڈیرا جما رکھا ہے۔ یہ جو پارا ہاؤس ہے، یہ ریان فردوس نے ایک بڑے مقامی زمیندار چودھری شہاب الدین سے خریدا تھا۔ اب اپنے دو بیٹوں کے لیے علیحدہ پورشن بنوا رہا ہے۔ یہ عمارت دو حصوں میں بٹے گی۔ جاناں نے ان میں سے ایک بیٹے کا نام ابراہیم معلوم کیا ہے۔ دوسرے کا پتا نہیں۔''

''نام سے کیا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وڈا صاحب مسلمان ہے یا کچھ اور؟''

''نام سے تو بات واضح نہیں ہوتی ہے۔ فردوس تو شاید مسلم نام ہی ہوگا، مگر ریان کرسچن بھی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح بیٹے کا نام بھی ہے۔ ابراہیم یا ابراہم عیسائی بھی رکھتے ہیں......''

''اس کے علاوہ کیا پتا چلا؟'' سجاول نے پُرسوچ لہجے میں پوچھا۔

''جاناں کے مطابق یہاں صرف ایک اور بندہ ایسا ہے جو آقا جان کی طرح وڈے صاحب کے لیے بے حد بھروسے کا ہے۔ وہ برونائی کا ہی باشندہ ہے۔ اس کا نام حلمی ہے۔ آقا جان کی طرح وہ بھی تھوڑی بہت اردو بول لیتا ہے۔ جاناں کا خیال ہے کہ آقا جان اور حلمی آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں بندے وڈے صاحب کے لیے مترجم کی ذمے داریاں بھی نبھاتے ہیں اور جس طرح نبھاتے ہوں گے، تم خود ہی اندازہ لگا سکتے ہو۔''

ہم رات گئے تک مشورہ کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے لیے انیق بھی اس مشورے میں شریک ہوا۔ انیق عام طور پر ہلکے پھلکے انداز میں مزاحیہ گفتگو کرتا تھا اور ساتھ ساتھ فلموں کے حوالے بھی دیتا جاتا تھا مگر سجاول کے سامنے وہ محتاط ہی رہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سجاول میں انڈین اداکار امریش پوری کی روح گھسی ہوئی ہے اور وہ کسی بھی وقت کسی کی زندگی سے کھیل سکتا ہے۔ طویل بات چیت کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ فی الحال اس آقا جان سے بنا کر ہی رکھنا پڑے گی۔ اگر جلد بازی میں اس سے ٹکر لیں گے تو نقصان ہوسکتا ہے۔ انیق کا خیال تھا کہ یہ آقا جان بہت سے مالی گھپلے بھی کر رہا ہے۔ کیونکہ اس نے لکڑی کی جو ''پے منٹ'' کی تھی، اس کا کوئی ریکارڈ وغیرہ نہیں رکھا تھا۔

سنبل کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ اگر آقا جان بہت اصرار کرے تو پھر چار پانچ لاکھ کے عوض سجاول اس کی بات مان لے۔ (سنبل کو سجاول نے اپنی ایک واقف کار نائیکا سے خریدا تھا۔ وہ طوائف زادی تو نہیں تھی لیکن ان لڑکیوں میں سے تھی جن کو بکنے میں کوئی خاص تامل نہیں ہوتا)

اگلے روز ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں سویرے جلدی جاگ گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کا مزہ لینے کے لیے میں بنگلے کے لان میں آ گیا۔ مین گیٹ کے ساتھ چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے ایک چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ سنبل مین گیٹ سے باہر تھی۔ وہ اس سفید مینے کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی جو آج کل اس کی گود میں نظر آتا تھا۔ وہ چھلانگیں لگاتا ہوا ادھر سے اُدھر پھدک رہا تھا۔ ''گیٹ کیپر گارڈ'' بھی مینے کو پکڑنے میں سنبل کی مدد کر رہا تھا۔ غالباً یہ مینا سنبل کو چکما دے کر باہر نکل گیا تھا اور اب وہ اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ پھر گیٹ کیپر نے مینے کو دبوچ لیا اور اسے لے کر سنبل کی طرف آیا۔ وہ خوشی سے گلنار نظر آنے لگی۔ یہی وقت تھا جب مجھے موٹر سائیکلوں کے ہوٹرز سنائی دیے۔ ایک بار پھر وہی منظر نظر آیا جو میں نے چند دن پہلے دیکھا تھا۔ شاندار گاڑیوں کا تیز رفتار جلوس بڑے کروفر سے سڑک پر رواں نظر آیا۔ مسلح گارڈز، قیمتی جیپیں، موٹر سائیکلز اور وہ شاندار سفید پورشے کار جس کی قیمت میرے اندازے کے مطابق 5 لاکھ پونڈ سے کم نہیں تھی۔ سنبل ٹھٹک کر رک گئی اور اس جلوس کو دیکھنے لگی۔ مسلح گیٹ کیپر بھی اٹینشن کھڑا ہو گیا۔ گاڑیاں یکے بعد دیگرے بنگلے کے سامنے سے گزرتی رہیں...... پھر ایک غیر متوقع واقعہ ہوا...... گاڑیوں کے اس قافلے کی رفتار سست ہو گئی۔ میں نے دیکھا۔ سفید پورشے کے پیچھے والی گاڑیاں رک رہی ہیں۔ سفید پورشے سے آگے

والی گاڑیاں اپنی رفتار سے کچھ آگے نکل گئیں مگر پھر وہ بھی آہستہ ہو گئیں۔

سفید پورشے رک گئی۔ دو تین مسلح گارڈز گاڑی کی عقبی کھڑکی کے قریب جھک گئے پھر دو مزید افراد اپنی شاندار کاروں میں سے اترے اور بڑے مؤدب انداز میں سفید گاڑی کی کھڑکی کے پاس چلے گئے۔ وہ مڑ مڑ کر سنبل اور گیٹ کیپر کی طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ قافلے کے رکنے کی وجہ سنبل ہی ہے۔ سنبل میمنے کو سینے سے لگائے گیٹ کیپر کے پاس ساکت کھڑی تھی۔ بڑا افسانوی سا ماحول نظر آ رہا تھا۔ اسی دوران میں مجھے اپنے عقب میں آقا جان کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کیا ہوا ہے؟ یہ گاڑیاں کیوں رک گئیں؟''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ نیم گنجا آقا جان سلیپنگ سوٹ میں نظر آ رہا تھا۔ تب اس کی نگاہ چار دیواری سے باہر سنبل پر پڑی اور میں نے اس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھا۔ ''یہ...... یہ کیسے باہر چلی گئی۔'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔

''مجھے تو پتا نہیں جی، میں ابھی آیا ہوں۔''

آقا جان حواس باختہ انداز میں باہر کی طرف لپکا۔ چھوٹا گیٹ کھلا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے باہر آ گیا۔ باہر اب باقاعدہ تماشا لگ گیا تھا۔ بہت سے لوگ گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔ لیکن وہ سب دور دور کھڑے تھے۔ سنبل کو سفید گاڑی کے قریب لے جایا گیا تھا۔ وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔ آقا جان کو دیکھ کر اسے کچھ حوصلہ ہوا۔

میں بھی قریب چلا گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو انیق بھی آ گیا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم نے دیکھا سفید پورشے گاڑی کی پچھلی کھڑکی کا شیشہ نیچے اترا ہوا ہے۔ کھڑکی میں ایک ایسا شخص بیٹھا تھا جس نے ملائیشین طرز کا نہایت قیمتی لبادہ پہن رکھا تھا۔ اس کی گندمی جلد پر ہلکے سرخ داغ سے تھے۔ گلے میں قیمتی موتی، مالا کی شکل میں جھول رہے تھے۔ ہاتھوں میں زبردست جڑاؤ انگوٹھیاں تھیں اور کھلی آستین والی کلائی پر کوئی نہایت مہنگی گھڑی لشکارے مار رہی تھی۔ اس شخص کے گرد جیسے شہرت و دولت اور شان و شوکت نے ایک غیر مرئی ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ یقیناً یہی تھا برونائی کا ارب پتی ریان فردوس، جسے وڈا صاحب کہا جاتا تھا۔ عزت مآب کہا جاتا تھا اور پتا نہیں کیا کچھ کہا جاتا تھا۔

پچھلی نشست پر ایک اور بارعب شخص بھی موجود تھا۔ اس کی توند جیسے اس کے گھٹنوں پر رکھی تھی۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ رنگ قندھاری انار سا تھا۔ یہ ادھیڑ عمر شخص کوئی مقامی صنعت کار لگتا تھا اور یقیناً وڈے صاحب کا دوست تھا۔ وہ بھی دلچسپ نظروں سے سنبل کو دیکھ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اسی تھری پیس سوٹ والے نے سنبل کو پہلے دیکھا تھا اور وڈے صاحب کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی تھی۔

سنبل جیسے ایک تماشا بن چکی تھی۔ وڈے صاحب نے نامعلوم زبان میں آقا جان سے کچھ پوچھا۔ آقا جان نے ادب سے جھک کر اس کا جواب دیا۔ وڈے صاحب نے کچھ اور پوچھا۔ اس کا جواب بھی آقا جان نے دیا۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ دو تین منٹ جاری رہا۔ اس دوران میں سنبل کبھی وڈے صاحب اور کبھی آقا جان کا منہ تکتی رہی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آقا جان نے کسی نہ کسی طرح وڈے صاحب کو سنبل کے حوالے سے مطمئن کر دیا ہے۔

وڈا صاحب جو کچھ بولا تھا، اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن اس کے طور اطوار سے پتا چلتا تھا کہ بے شک دولت کی شکل میں بے پناہ طاقت اس کے پاس ہے لیکن وہ دھیمے مزاج کا مالک ہے۔

چند سیکنڈ بعد وڈے صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ گاڑیوں کا قافلہ پھر حرکت میں آ گیا۔ جب تک گاڑیاں دور نہیں چلی گئیں، آقا جان اور بنگلے کے ملازمین ساکت اور مؤدب کھڑے رہے۔

تب آقا جان مڑا۔ اس نے کھا جانے والی شعلہ بار نظروں سے گیٹ کیپر کو گھورا۔ ''یہ باہر کیسے نکلی؟'' اس نے دانت پیس کر پوچھا۔

''جی، مجھے بالکل پتا نہیں چلا۔ دراصل یہ میمنا......''

ایک زناٹے کا تھپڑ گیٹ کیپر کے گال پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے چلا گیا۔ پھر وہ بے چارگی سے دائیں بائیں جھانکنے لگا جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ کس کس نے اسے تھپڑ کھاتے دیکھا ہے۔ آقا جان سنبل کو ساتھ لیتا ہوا اور پاؤں پٹختا ہوا اندر چلا گیا۔

کمرے میں جا کر میں نے انیق سے پوچھا۔ ''تمہاری سمجھ میں کچھ آیا؟ آقا جان اور وڈے صاحب میں کیا بات ہوئی؟''

''بس جی ویسی ہی بات ہوئی جیسی فلم قربانی کے گانے میں ہے...... ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے...... مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں

بولا۔ پھر ذرا توقف کرکے ٹھہرے لہجے میں گویا ہوا۔ ''کل سنبل پارا ہاؤس میں جارہی ہے جی۔''

''زبردست، یہ کس طرح ہوا؟''

''جس طرح ہونا چاہیے تھا جناب! یہ لڑکی سنبل واقعی کسی بھی بندے کی مت مار سکتی ہے۔ وڈے صاحب کے ساتھ جو موٹا سا بندہ بیٹھا تھا، اس نے سنبل کو میمنے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے دیکھا اور وڈے صاحب کو بھی متوجہ کیا۔ وڈے صاحب نے بھی اسے پسند کیا۔ اب وڈا صاحب آقا جان سے پوچھ رہا تھا کہ یہ لڑکی کون ہے اور اس کی نظر سے اوجھل کیوں رہی؟ آقا جان نے بہانہ بنایا کہ جب دوسری لڑکیاں وڈے صاحب کے سامنے سے گزاری گئیں تو تب یہ لڑکی یہاں نہیں پہنچی تھی۔''

''وڈے صاحب نے یقین کرلیا؟''

''ہاں جی لگتا ہے کہ وہ اس مکار پر آنکھیں بند کرکے بھروسا کرتا ہے۔ اسی گانے والا حساب ہے، جو تم کو ہو پسند وہی بات کہیں گے...... تم دن کو اگر رات کہو، رات کہیں گے۔''

''یار، ہر جگہ شاعری نہ گھسیڑا کرو۔ اور کیا بات ہوئی؟''

''آقا جان نے کہا...... عزت مآب لڑکی بہت اچھی ہے، لیکن ''ملازمت'' سے پہلے اسے اٹھنے بیٹھنے کی تھوڑی سی ٹریننگ دینا ہوگی۔ وڈے صاحب نے کہا، کوئی بات نہیں۔ اسے پارا ہاؤس میں پہنچاؤ۔ ہمیں یہ ٹھیک لگ رہی ہے۔ اس بات پر آقا جان خاموش ہوگیا۔''

''مزید کچھ کہا گیا؟''

''شاہ زیب بھائی، وڈا صاحب جیسا بھی ہے لیکن مہمان نواز اور رکھ رکھاؤ والا لگتا ہے۔ آقا جان سے کہہ رہا تھا کہ جو اسے لے کر آیا ہے، اسے بھی ساتھ بھیجو۔ ہم اس سے ملنا چاہیں گے......''

''مطلب یہ کہ سجاول بھی اس کے ساتھ پارا ہاؤس جائے گا۔''

''ایسا ہی لگ رہا ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن اگر کسی طرح تم بھی ساتھ جاسکو تو اور اچھی بات ہے۔ اندر کی کہانی کا کچھ پتا چلے۔''

''پتا نہیں کہ آقا جان مانے گا یا نہیں۔ ابھی تو وہ اسی پر پیچ وتاب کھا رہا ہوگا کہ سنبل بنگلے سے باہر کیوں نکل گئی تھی۔''

اسی دوران میں سجاول بھی جاگ گیا۔ ہم نے اسے ساری صورت حال بتائی۔ اس کا چہرہ دمکنے لگا۔ ہمیں آگے بڑھنے کا راستہ مل رہا تھا۔ سنبل کا اتفاقاً بنگلے سے باہر نکل جانا بڑا نیک شگون ثابت ہوا تھا۔ اس واقعے سے سنبل کے شعلہ صفت حسن کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ اس کی خوب صورتی کسی کی عقل کو بھی خاکستر کرسکتی تھی۔ وڈے صاحب کے حوالے سے دیکھا جاتا تو ہمیں یہی پتا چلا تھا کہ وہ ملازمہ منتخب کرنے کے بعد تین ماہ تک چپ سادھ لیتا تھا اور تیسرے چاند کی چودھویں شب کو پھر لڑکی کا انتخاب کرتا تھا مگر سنبل کو دیکھنے کے بعد شاید اس نے اپنے اس چاند ماری والے اصول میں کچھ تبدیلی کرلی تھی۔

انیق نے جس طرح ہمارے لیے ایک ناقابلِ فہم زبان کا ترجمہ کیا تھا، وہ معمولی بات نہیں تھی۔ سجاول اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میرا بھی خیال تھا کہ بہت ہوا تو انیق انگریزی کے علاوہ فرانسیسی یا عربی وغیرہ جانتا ہوگا مگر اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تو اس حوالے سے جینئس سے کم نہیں، وہ بہت سی زبانوں کی شدبد رکھتا تھا اور کسی بھی زبان کو چند دن کی کوشش سے سمجھنا شروع کردیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس سے میڈم نور جہاں کے گانوں کے ترجمے کرائے جائیں تو دور دراز افریقی ملکوں صومالیہ اور ایتھوپیا وغیرہ میں بھی لوگ گاتے پھریں گے۔ یہ گھر میرا گلشن ہے۔ گلشن کا خدا حافظ......

ہم ناشتا وغیرہ کرکے فارغ ہوئے ہی تھے کہ آقا جان وہاں آدھمکا۔ اس کی ناک کا بل بہت موٹا نظر آرہا تھا اور چہرے سے جھنجلاہٹ ٹپکی پڑ رہی تھی۔ اس نے سجاول کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''یہ اس لڑکی کے لیے اچھا نہیں ہوا۔ اگر اس خبیث کو اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے کی تھوڑی سی تمیز آجاتی تو پارا ہاؤس میں اس کی جگہ بن سکتی تھی۔ اب بس جائے گی اور چند دن بعد آجائے گی۔''

سجاول بولا۔ ''پتا نہیں یہ سب کیسے ہوگیا۔ یہ آپ کے پاس ہی تھی۔ میں نے تو کئی دن سے اسے دیکھا بھی نہیں تھا اور کچھ نہیں تو گیٹ کیپر کو ہی چاہیے تھا کہ اسے باہر نہ نکلنے دیتا۔''

''اچھا...... اب جو ہونا تھا، ہوگیا۔'' آقا جان نے سخت بیزاری سے کہا۔ ''اب بڑے صاحب نے کہا ہے کہ اسے پارا ہاؤس پہنچاؤ۔ ساتھ میں تم کو بھی بلایا ہے۔ کوئی ڈھنگ کے کپڑے ہیں تو پہن لینا۔ اگر نہیں تو بتاؤ۔ میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔''

''ہاں جی، کپڑے تو ہیں۔ بس استری وغیرہ کرنے

والے ہیں۔'' سجاول نے کہا۔

آقا جان کے کہنے پر اس نے اپنے بیگ میں سے گرم شلوار قمیص نکال کر دکھائی۔ آقا جان بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ لیکن یہ گرم چادر وغیرہ وہاں نہیں چلے گی۔ میں تمہیں کسی کا سویٹر وغیرہ لے دیتا ہوں۔ اور ایک بات اچھی طرح سن لو۔ وہاں زیادہ بات شات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بڑے صاحب جو پوچھیں بس اس کا جواب دینا ہے اور مختصر دینا ہے۔ اگر وہ یہاں آنے کی تاریخ کا پوچھیں تو 26 بتانی ہے۔ یہ بات ذہن میں بٹھالو۔''

''پر اُن سے بات چیت کس بولی میں کی جائے گی؟'' سجاول نے پوچھا۔

''وہ اپنی ہی بولی میں بولیں گے۔ لیکن وہاں ایک دو ترجمہ کرنے والے بھی ہیں۔''

پارا ہاؤس جانے کے حوالے سے آقا جان نے سردار سجاول کو جلدی جلدی کچھ ضروری ہدایات دیں اور جھنجلایا ہوا سا واپس چلا گیا۔

صورتِ حال میں یہ ایک اچھی تبدیلی آئی تھی۔ سجاول ایک جہاندیدہ اور زیرک شخص تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پارا ہاؤس میں داخل ہوگا تو ضرور کوئی کام دکھائے گا۔ وہ ایک ٹرک ڈرائیور کے روپ میں تھا۔ اس نے اپنی چال ڈھال اور بول چال کو اسی کے مطابق بنا رکھا تھا مگر اصل میں وہ کیا تھا...... وہ ہم جانتے تھے۔

شام کے فوراً بعد ہی سجاول اور سنبل پارا ہاؤس جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ وہاں سے ان کے لیے گاڑی آنا تھی۔ سنبل کو پوری طرح تیار کیا گیا تھا۔ اس نے بہترین لباس پہن رکھا تھا اور خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ بالوں میں پھول سجائے گئے تھے اور کلائیوں میں بھی پھولوں کے گجرے تھے۔ اس نے جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ برونائی کے رواج کے مطابق تھے۔ ایک لمبا کڑھائی دار چغا تھا جس میں سینے اور بازوؤں پر خوب صورت دھاریاں تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ اس لباس کو ''باجو کرنگ'' کہا جاتا تھا۔ سنبل میک اپ کے بغیر بھی حسین تھی مگر میک اپ سے اسے مزید نکھارنے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔ سنبل کو یقیناً انہی عورتوں نے تیار کیا تھا جو یہاں بنگلے میں اس کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔

شام آٹھ بجے کا وقت تھا جب چمک دار لیموزین سجاول اور سنبل کو لے کر پارا ہاؤس کی طرف روانہ ہوگئی۔ میں اور انیق کمرے میں آ کر ٹی وی دیکھنے لگے۔

ہماری نگاہیں اسکرین پر تھیں مگر دماغ پارا ہاؤس میں الجھا ہوا تھا۔ تصور میں سجاول اور سنبل کے حالات تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ وہاں کیا صورتِ حال پیش آئی ہے۔ لگتا تو یہی تھا کہ سجاول وہاں سے اکیلا واپس آئے گا اور سنبل کو پارا ہاؤس میں رہنے کی ''عزت'' بخش دی جائے گی۔ عین ممکن تھا کہ سجاول کافی انعام و اکرام لے کر لوٹتا...... مگر وہ انعام و اکرام کے لیے تو یہاں نہیں آیا تھا۔ اس کی ''حرص'' بہت بڑی تھی۔ وہ بہت آگے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وڈے صاحب کی صورت میں ایک بہت بڑی آسامی اس کے ہاتھ آنے والی ہے۔

ٹی وی پر ایک نیوز دیکھ کر انیق چونکا۔ نیوز یوں تھی کہ ''بدھ کے روز سیالکوٹ روڈ پر کسی نامعلوم شخص کی فائرنگ سے شدید زخمی ہونے والا ٹریفک کانسٹیبل اسپتال میں دم توڑ گیا۔''

انیق نے کہا۔ ''لو جی ایک اور قتل سجاول سیالکوٹی کے کھاتے میں چلا گیا۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح کے کاموں سے تو اس کا کھاتا بھرا ہے۔ شاید اب اس کھاتے میں اتنی جگہ ہی نہیں ہے کہ یہ چھوٹے موٹے قتل اس میں درج کیے جائیں۔''

اچانک مین گیٹ کی طرف گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ یہ وہی لیموزین تھی جو تھوڑی دیر پہلے سجاول اور سنبل کو یہاں سے لے کر گئی تھی۔ لیموزین اتنی جلدی واپس آئے گی اس کی توقع نہیں تھی۔ انیق باہر گیا اور تصدیق کر کے آیا کہ یہ وہی لیموزین ہے۔ تھوڑی دیر بعد آقا جان بھنایا ہوا سا ہمارے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی تیوری تو ہر وقت چڑھی رہتی تھی، اب کچھ زیادہ ہی چڑھی ہوئی تھی۔

''اٹھو بھائی! بلاوا آیا ہے تمہارا۔'' اس نے کہا۔

''کہاں سے جی؟'' میں نے پوچھا۔

''پارا ہاؤس سے۔ بڑے صاحب نے تم دونوں کو بھی بلایا ہے۔ تم دونوں بھی تو اس لڑکی کو لانے والوں میں شامل ہو۔'' لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ یقیناً سجاول اور سنبل کے وہاں جانے کے بعد یہ بات کھلی تھی کہ ہم دونوں بھی ان مہمانوں میں شامل ہیں جو سنبل جیسا ''نادر تحفہ'' لے کر یہاں آئے ہیں (حالانکہ حقیقت میں یہ ساری کارروائی سجاول ہی کی تھی) اب وڈے صاحب نے ہمیں بھی شرفِ میزبانی بخش دیا تھا۔

آقا جان نے کہا۔ ”تمہارے پاس بیس منٹ ہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو، باہر گاڑی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

یہ بڑی غیر متوقع اور خوشگوار صورتِ حال تھی۔ ہم نے آقا جان کی ہدایت کے مطابق جلدی جلدی کپڑے بدلے اور باہر نکل آئے۔

قریباً دس منٹ بعد ہم لیموزین پر سوار پارا ہاؤس کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ مسلح گارڈز نے بڑی شائستگی کے ساتھ ہمیں گاڑی سے باہر نکلنے کے لیے کہا اور ہمارے لباس کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ لیموزین حالانکہ تھوڑی دیر پہلے ہی پارا ہاؤس سے گئی تھی پھر بھی اس کو چیک کیا گیا۔ پارا ہاؤس کے مین گیٹ پر ایک بار پھر گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشے اتارے گئے اور عقابی آنکھوں والے سیکیورٹی ایجنٹس نے ہمارا جائزہ لیا۔

ہم پارا ہاؤس کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ یہاں ہمیں سیکیورٹی کا دوسرا دائرہ نظر آیا۔ باہر کی بلند چار دیواری کے اندر ایک چھوٹی لیکن مضبوط چار دیواری اور نظر آ رہی تھی۔ یہ دراصل چھوٹے چھوٹے مضبوط پلر تھے، جنہوں نے پارا ہاؤس کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا...... وہاں دور تک خوب صورت گراسی لان اور پھلواریاں نظر آ رہی تھیں۔ رنگ برنگ پھولوں اور پھولوں سے بنی ہوئی اشکال کو نمایاں کرنے کے لیے ان پر اس طرح سے روشنی ڈالی گئی تھی کہ ایک ایک پتی اجاگر ہو گئی تھی۔ ان پھلواریوں میں رنگین پانی کے فوارے تھے اور کہیں کہیں مصنوعی آبشاریں تھیں جو حوضوں میں گرتی تھیں۔ ہر چیز رات کے وقت بھی روشن دکھائی دیتی تھی، مگر یہ روشنی ایسی تھی جو آنکھوں کو چبھتی نہیں تھی۔ جگہ جگہ باوردی گارڈز پتھر کے مجسموں کی طرح ساکت کھڑے تھے، ایک جگہ کبوتروں کے بڑے بڑے کابک نظر آئے اور وسیع پنجروں میں خوش الحان پرندوں کے جھرمٹ دکھائی دیے۔ کسی گوشے سے کسی شکاری عقاب کی تیز طویل آواز کانوں میں گونجی اور ہوا کی لہروں پر سرسراتی چلی گئی۔

اندرونی عمارت باہر سے بھی زیادہ پُرشکوہ تھی۔ بلند چھتیں، بلند و بالا محرابی دروازے، مرمریں فرش، فانوس، قالین، آبنوسی اور ساگوانی فرنیچر۔ ہر شے سے بے پناہ امارت ٹپکتی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں سی سی ٹی وی کیمروں کا نظام بھی موجود ہے اور ہماری ہر ہر حرکت دیکھی جا رہی ہے۔ ہم ایک نہایت کشادہ اور سجی سجائی نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ یہاں سجاول پہلے سے موجود تھا۔ ہم بھی اس کے پاس آرام دہ صوفے پر جا بیٹھے۔ سجاول کے سامنے میز پر چائے کی خالی پیالی اور دیگر لوازمات رکھے تھے۔

نشست گاہ کی ایک دیوار پر بڑی ایل سی ڈی اسکرین نظر آئی اور کنٹرول پینل بھی دکھائی دیا۔ چند سیکنڈ بعد ایک دراز قد شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے نفیس پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہی وہ حلمی نامی شخص ہے جو آقا جان کی طرح وڈے صاحب کے لیے ترجمان کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ہم نے کھڑے ہو کر اس سے مصافحہ کیا۔ اس نے خوش آمدید کہنے کے لیے رسمی کلمات ادا کیے۔ اس کی اردو اچھی تھی مگر لہجے میں غیر ملکی جھلک واضح نظر آتی تھی۔ اسی دوران میں سامنے لگی ہوئی جہازی سائز کی ایل سی ڈی روشن ہو گئی۔ اسکرین پر بڑے صاحب ریان فردوس کی شکل نظر آئی۔ جلد پر سرخ دھبے نمایاں تھے۔ جس طرح ہم اسے دیکھ رہے تھے یقیناً وہ بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہمیں مالے زبان میں خوش آمدید کہا۔ حلمی نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”عزت مآب تمہیں ویلکم کہہ رہے ہیں اور تمہارے نام پوچھ رہے ہیں۔“

ہم نے اپنے اصل نام بتائے۔ اس کے بعد وڈے صاحب نے کچھ مزید کہا۔ حلمی نے ترجمہ کر کے بتایا۔ ”عزت مآب کا کہنا ہے کہ وہ تم سے مل کر خوش ہوئے ہیں۔ تم لوگ بھی سجاول کی طرح یہاں مہمان ہو اور رات کا کھانا یہیں کھا کر جاؤ گے۔“

ہم نے شکریہ ادا کیا۔ کچھ دیر بعد اسکرین تاریک ہو گئی۔ ایک سیکریٹری ٹائپ اسمارٹ لڑکی اندر داخل ہوئی۔ حلمی نے سجاول سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مسٹر سجاول، تمہیں ایک دو کاغذات پر دستخط کرنے ہیں، تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔“

سجاول نے اثبات میں سر ہلایا اور چست اسکرٹ والی لڑکی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ سجاول کے جانے کے بعد حلمی نے مجھ سے پوچھا۔ ”یہ لڑکی سنبل، جو مسٹر سجاول لے کر آئے ہیں، کہاں سے آئی ہے اور کیا وہ اپنی خوشی سے یہ ”ملازمت“ کرنا چاہ رہی ہے؟“

میں سمجھ گیا کہ سجاول کو اسی لیے باہر بھیجا گیا ہے تاکہ ہم سے اس کے بیانات کی تصدیق ہو سکے۔ بہتر یہی تھا کہ سب کچھ سچ سچ بتایا جاتا۔ میں نے کہا۔ ”جناب! یہ طوائف زادی تو نہیں ہے لیکن ایک نائیکہ کے پاس رقص وغیرہ سیکھ رہی تھی۔ ایک ماموں کے سوا اس کا اور کوئی نہیں ہے۔ اسے

پتا تھا کہ ماموں بدقماش ہے اور اسے کہیں نہ کہیں اونے پونے بیچ ڈالے گا۔ اب یہ لڑکی اس بات پر بہت خوش ہے کہ یہ سجاول کے پاس آگئی ہے اور سجاول کے ذریعے ایک امیر گھر میں جارہی ہے اگر یہ یہاں مستقل طور پر نہ بھی رہ سکی تو عزت مآب کی غریب نوازی سے اتنا کچھ تو ضرور حاصل کر لے گی کہ آئندہ اسے ہر طرح کا آرام آسائش مل جائے گا۔''

''اس کے ماموں سے سجاول نے اسے کیسے حاصل کیا؟'' حلمی نے ملائیشین لہجے کی اردو میں پوچھا۔

''سجاول نے اسے باقاعدہ معاوضہ دیا ہے...... اور کوئی اسٹامپ پیپر بھی لکھوا رکھا ہے۔ اس کے ماموں کی طرف سے اب کسی طرح کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

کئی واقعات بالکل غیر متوقع ہوتے ہیں۔ ہم اس وقت پارا ہاؤس کی زبردست سیکیورٹی کے حصار میں تھے۔ یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ لہٰذا جب اوپر تلے دو فائر ہوئے تو ہم بری طرح چونک گئے۔ چھوٹی آنکھوں اور چوڑی پیشانی والا حلمی بھی ہماری ہی طرح چونکا۔ اس نے جلدی سے انٹرکام اٹھایا اور کسی سے پوچھا۔ ''یہ فائر کیسے تھے؟''

دوسری طرف سے کسی مقامی گارڈ نے کہا۔ ''شاید کسی کا ٹریگر غلطی سے دب گیا ہے جناب۔''

''جلدی پتا کرو۔ کون تھا یہ؟'' حلمی دہاڑ کر بولا۔

''او کے سر۔'' اسپیکر سے مؤدب آواز ابھری۔

حلمی نے اپنی ٹائی درست کی اور اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ملانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کا چہرہ اندرونی اضطراب کا عکاس تھا۔ گارڈ نے کہا تھا کہ شاید غلطی سے کسی کا ٹریگر دب گیا ہے لیکن ٹریگر غلطی سے نہیں دبا تھا اور اس کا ثبوت چند سیکنڈ بعد مل گیا۔ نشست گاہ سے باہر بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں پھر ایک زبردست دھماکے سے دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ ہم نے قریباً چار افراد دیکھے۔ ان کے جسموں پر پارا ہاؤس کے گارڈز کی ہی وردیاں تھیں لیکن چہرے اسکائی ماسک میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ اندر گھستے ہی انہوں نے بے دریغ حلمی کو نشانہ بنایا۔ وہ اسے شاید مارنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ زخمی کر کے یرغمال بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ گولی حلمی کے کندھے میں لگی۔ وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ میں نے اور انیق نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں ہم نے فیصلہ کرلیا۔ ہم ایک ساتھ نقاب پوشوں پر ٹوٹ پڑے۔

جو نقاب پوش میری طرف اپنی سیون ایم ایم رائفل سیدھی کررہا تھا، اس کے پیٹ میں میری زوردار ٹھوکر لگی۔ وہ دہرا ہوا تو اس کی رائفل میری پہنچ میں آگئی۔ میں نے بیرل کا رخ چھت کی طرف موڑ دیا۔ ایک برسٹ چلا اور بھاری بھرکم فانوس چکنا چور ہوگیا۔ میں نے نقاب پوش کو دھکیلا وہ اپنے ساتھی پر گرا اور اس کی فائرنگ سے شدید زخمی ہو گیا۔ میں نے رائفل اس سے چھین لی۔ دوسری طرف انیق بھی ایک گرانڈیل نقاب پوش سے لپٹ گیا تھا، دونوں میں زبردست کشمکش جاری تھی۔ ملنگی ڈیرے سے فرار کے وقت میں نے انیق کی زبردست فائٹنگ اسپرٹ دیکھی تھی، میں جانتا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے نمٹ لے گا۔ اسی دوران میں زخمی حلمی نے ایک بڑے صوفے کی اوٹ لے کر اپنے کوٹ کے اندر سے بریٹا پسٹل نکال لیا۔ اس نے انیق سے لپٹے ہوئے نقاب پوش کو نشانہ بنایا۔ صورتِ حال بدلتے دیکھ کر چوتھا نقاب پوش باہر کی طرف پسپا ہوا۔ اب پورے پارا ہاؤس میں خطرے کے الارم بجنے لگے تھے۔

جس شخص کی فائرنگ سے اس کا اپنا ہی ساتھی زخمی ہوا تھا، وہ اب اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی رائفل خالی ہو چکی تھی۔ اس نے رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے میرے سر کو نشانہ بنانا چاہا۔ میں نے اطمینان سے جھک کر یہ وار خالی دیا۔ دوسرا وار بھی میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں نے ٹانگ مار کر اسے دور ہٹا دیا اور ساتھ ہی اس کے ساتھی سے چھینی ہوئی رائفل بھی سیدھی کرلی۔

''ہینڈز اپ۔'' میں گرجا۔

اس نے خود کو بے بس دیکھ کر ہاتھ کھڑے کر دیے۔

اسی دوران میں انیق نے عقب سے اس کے سر پر پیتل کے ایک وزنی گلدان کا تباہ کن وار کیا۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا۔ گلدان کی دوسری ضرب نے اسے انٹا غفیل کردیا۔ میں نے اس کے چہرے سے اسکائی ماسک یعنی نقاب نوچا...... وہ مقامی شخص ہی تھا۔ اس کی فائرنگ سے زخمی ہونے والے کی پشت پر کم از کم چھ سوراخ تھے۔ اس کا جسم ساکت ہو چکا تھا۔ تیسرے شخص کے سینے میں حلمی کی چلائی ہوئی گولی لگی تھی اور وہ بھی گرا پڑا تھا۔

مگر یہ معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ پارا ہاؤس کے کسی اور حصے سے زبردست فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں؟'' حلمی انٹرکام پر

چلا دیا۔

پھر اس نے اپنے زخمی کندھے کو دبائے دبائے کنٹرول پینل کی طرف چھلانگ لگائی۔ اس نے مانیٹرز آن کیے۔ دس بارہ اسکرینز پر پارا ہاؤس کے مختلف حصے دکھائی دینے لگے۔ ایک حصے میں زبردست ہلچل نظر آرہی تھی۔ حلمی نے بٹن دبا کر اس سین کو پوری اسکرین پر پھیلا دیا۔ یہ کسی اندرونی کمرے کا منظر تھا۔ شاہانہ فرنیچر، فانوسوں اور غالیچوں سے سجا ہوا یہ کمرا میدانِ جنگ کا منظر پیش کررہا تھا۔ ہم نے ایک عورت کو دیکھا جو پچاس کے پیٹے میں نظر آتی تھی۔ اس نے برونائی طرز کا اسلامی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر اسکارف تھا۔ تین نقاب پوش اس سے لپٹے ہوئے تھے۔ ایک نے اپنا پسٹل اس کی کنپٹی پر رکھا ہوا تھا اور دو اسے گھسیٹ کر باہر لے جانے کی کوشش کررہے تھے۔

تب ایک اور منظر نے ہمیں ہلا دیا۔ ہم نے سردار سجاول کو دیکھا۔ وہ کسی بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ اس نے آتے ساتھ ہی پستول بردار کو نشانہ بنایا۔ اس کے سر کی طوفانی ضرب چہرے پر کھا کر پستول بردار دور جا گرا۔ اس کا پسٹل ہاتھ سے چھوٹ کر اور کھڑکی کا شیشہ توڑ کر نجانے کہاں گیا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا شخص سجاول پر فائر کرتا، سجاول کا وہی مشہور و معروف مکا دیکھنے میں آیا جس کی کہانیاں مشہور تھیں...... اور جس کی ایک ضرب میں خود بھی دوبدو مقابلے میں جھیل چکا تھا۔ اس بھیانک مکے نے یقیناً رائفل بردار کا جبڑا چکنا چور کرڈالا تھا۔ وہ کٹے شہتیر کی طرح منہ کے بل زمین پر گرا۔ تیسرا شخص فائر کرنے میں کامیاب رہا۔ گولی سجاول کو مس کرتی ہوئی اس کے اپنے ہی ساتھی کو کہیں لگی اور وہ جو پہلے ہی نیم جان تھا بالکل ساکت ہوگیا۔ سجاول نے جھپٹ کر تیسرے بندے کو چھاپ لیا۔ وہ اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کررہا تھا۔ عورت بے حد دہشت زدہ حالت میں ایک کونے میں سمٹی ہوئی تھی اور مسلسل چلا رہی تھی۔ سجاول کے مدِمقابل نے بلند آواز میں اپنے ساتھیوں کو پکارنا شروع کیا۔ ابھی اس نے بمشکل ایک دو آوازیں ہی نکالی تھیں کہ سجاول نے اسے گھما کر دیوار سے دے مارا اور وہ نڈھال ہوکر فرش پر لڑھک گیا۔ اس کی رائفل اب سجاول کے ہاتھ میں تھی۔ سجاول کے تاثرات سے صاف پتا چلا کہ راہداری میں سے بھاگتے قدموں کی آوازیں قریب آرہی ہیں۔ یہ یقیناً وہی حملہ آور تھے جنہیں ان کے ساتھی نے مدد کے لیے پکارا تھا۔

سجاول نے دہشت زدہ عورت کو کمرے کے واش روم میں گھسا کر دروازے کو باہر سے بولٹ کردیا اور قریب پہنچتے ہوئے حملہ آوروں کے سامنے دیوار بن گیا۔ اس نے ایک گوشے میں پوزیشن لے لی اور کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے گن باہر نکال کر حملہ آوروں پر جوابی فائر کرنے لگا۔

حلمی نے افراتفری کے عالم میں ایک اور مانیٹر کے منظر کو ''انلارج'' کیا۔ یہ اس راہداری کا منظر تھا جہاں سے کچھ لوگ سجاول پر حملہ آور ہوئے تھے۔ یہ کم وبیش آٹھ افراد تھے اور سب کے سب نقاب پوش۔ انہوں نے پوزیشنز لے رکھی تھیں اور سجاول کو ڈھیر کرنے کے لیے اندھا دھند فائرنگ کررہے تھے۔ جسے وہ ڈھیر کرنا چاہتے تھے وہ کوئی عام شخص نہیں تھا۔ ایک خونی گروہ کا خونخوار سردار تھا۔ وہ ایسے نجانے کتنے سنگین مرحلوں سے گزرا ہوا تھا۔

یہی وقت تھا جب اس نشست گاہ کے بالکل سامنے ہماری دائیں طرف بھی اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ ایتق بڑبڑایا۔ ''لگتا ہے، یہ لمبا ہی کھڑاگ ہوا ہے۔''

''جوابی فائرنگ بھی ہورہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، یہ ہمارے ہی لوگ ہیں۔'' حلمی نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

ایک گولی شیشہ توڑتی ہوئی آئی اور حلمی بال بال بچا۔ اس نے ایک کھڑکی کے ساتھ پوزیشن لے لی۔ ہم بھی جھک کر اوٹ میں ہوگئے۔ ہم دونوں کے پاس بھی اب رائفلیں موجود تھیں مگر ہم اس وقت تک فائر نہیں کرسکتے تھے جب تک کوئی ہم پر گولی نہ چلاتا۔ ہمیں پتا ہی نہیں تھا کہ یہاں اپنا کون اور پرایا کون؟

حلمی نے اپنا زخمی کندھا دوسرے ہاتھ سے دبایا ہوا تھا۔ خون اس کے پورے بازو کو بھگو رہا تھا۔ وہ ملائیشین لہجے کی اردو میں بولا۔ ''ہم فائر نہیں کریں گے۔ ہماری گولی اپنے ہی گارڈز کو لگ سکتی ہے۔''

حلمی کی بات سے اس امر کی تصدیق ہوئی کہ پارا ہاؤس کے گارڈز نشست گاہ کے سامنے مورچا بند ہوگئے ہیں اور حملہ آوروں کو نشست گاہ کی طرف آنے سے روک رہے ہیں۔ الارم مسلسل شور مچا رہے تھے۔ بالائی منزل سے بھی بھاگ دوڑ کی آوازیں آرہی تھیں، تاہم وہاں فائرنگ کے آثار نہیں تھے۔

حلمی رکوع کی حالت میں جھک کر چلتا ہوا دوبارہ مانیٹرز کے پاس پہنچا۔ اس نے ایک بٹن پش کیا۔ سجاول نے آہنی دیوار کی طرح حملہ آوروں کو روکا ہوا تھا۔ کمرے کے

سارے شیشے، فانوس اور آرائشی برتن چکنا چور ہو چکے تھے۔ دیواروں پر گولیوں کے ان گنت نشان تھے۔ فرش پر پڑے باقی دونوں افراد اپنے ہی ساتھیوں کی اندھا دھند فائرنگ سے ہلاک ہو چکے تھے۔ دوسرا کیمرا حملہ آوروں کو دکھا رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا آگے تو ضرور آئے تھے مگر اب بھی خاتون کے اس بیڈروم سے بیس تیس قدم کی دوری پر تھے۔

حلمی نے کنٹرول پینل پر مختلف بٹن دبائے۔ پھر مائیکروفون پر چلانے لگا۔ ”انچارج قادر! کہاں ہو تم؟“

جواب میں پھولی ہوئی سانسوں میں کہا گیا۔ ”میں یہاں ہوں سر! مین سیڑھیوں کے پاس۔“

”احمق...... گدھے...... تمہیں اندر سے فائرنگ سنائی نہیں دے رہی۔ اندر جاؤ، بڑی بیگم کے بیڈروم کی طرف۔ وہاں وہ لوگ بیگم کو گھیر رہے ہیں۔ جلدی کرو۔ جتنے بندے ہیں ساتھ لے لو۔ سیدھی گولی چلاؤ۔“

”یس سر۔“ انچارج گارڈ نے ہانپی آواز میں کہا۔

ہماری نگاہیں ایک بار پھر اس اسکرین پر مرکوز ہو گئیں جہاں سجاول تن تنہا بڑی بیگم کی حفاظت کر رہا تھا۔ وہ واقعی کسی قدیم جنگجو قبیلے کا فرد نظر آتا تھا۔ مرنا اور مارنا جس کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔

تیس چالیس سیکنڈ بعد ہمیں ایک دم اندازہ ہوا کہ سجاول پر دباؤ کم ہو گیا ہے...... لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ حلمی کے آرڈر پر پارا ہاؤس کے گارڈ وہاں پہنچ گئے تھے۔ اس کی وجہ ایل ایم جی سے فائر ہونے والے وہ دو تین طویل برسٹ تھے جن کی آواز بالائی منزل سے آئی تھی۔ اس خوفناک ”تڑتڑاہٹ“ کے فوراً بعد ہی حملہ آوروں نے اپنی پوزیشنز چھوڑ دی تھیں اور اندرونی سیڑھیوں کی طرف لپکے تھے۔ ایک کیمرے نے سیڑھیوں کے قریب ان کی جھلک دکھائی۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی اطلاع پر بالائی منزل کی طرف بھاگے ہیں۔ شاید واکی ٹاکی پر رابطہ کر کے انہیں اوپر بلایا گیا تھا۔

”او مائی گاڈ...... او مائی گاڈ۔“ حلمی اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کراہ اٹھا۔

پھر اس نے لرزاں ہاتھوں سے کنٹرول پینل پر ایک بٹن دبایا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ اسکرین پر ہمیں اکیس بائیس سال کا ایک دبلا پتلا لڑکا نظر آیا۔ وہ ایک لمبے قیمتی لبادے میں تھا۔ اس کے سر پر وہی کیپ تھی جو برونائی کے باشندے پہنتے ہیں۔ اس نے چھوٹی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ دو نقاب پوشوں نے اسے دیوار سے لگا کر اس پر

پریت کی ریت

”ٹھہریئے! آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”پیار۔“

”کس کا پیار؟“

”عورت کا۔“

”عورت کے تو بہت سے روپ ہیں۔ عورت ماں ہے، بہن ہے، بیوی ہے۔ چلو فرض کرو...... اگر آپ کو ماں کا پیار مل جاتا ہے تو؟“

”تو دنیا و آخرت میرے لیے جنت ہے۔“

”اگر بہن کا پیار مل جاتا ہے۔ تب؟“

”تو میری پگ محفوظ رہے گی۔“

”لیکن اگر بیوی کا پیار مل جائے تو؟“

”تو باقی سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ آخر کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی تو پڑتا ہے۔“

جہانگیر حسین قیصر، ہیڈ مرالہ ڈھلے والی سے

رائفلیں تان رکھی تھیں۔ فرش پر دو گارڈز کی خونچکاں لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انہیں یقیناً چند سیکنڈ پہلے ہی گولیاں لگی تھیں۔ لہو چکنے فرش پر حرکت کر رہا تھا اور ارد گرد گولیوں کے خول بکھرے تھے۔

بمشکل دس پندرہ سیکنڈ ہی مزید گزرے ہوں گے کہ وہ پانچ چھ گارڈز بھی اس بڑے کمرے میں پہنچ گئے جہاں لڑکے کو یرغمال بنایا گیا تھا۔ یہ سب کے سب بے حد جوش میں دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے تین افراد نے اپنے چہروں پر سے اسکائی نقاب نوچ کر اتار دیے۔ یہ تینوں اپنی صورتوں سے ملائیشیا یا برونائی کے لگتے تھے۔ ذرا چھوٹی آنکھیں، بھاری پپوٹے اور پست ناک۔ ان میں سے ایک لحیم شحیم شخص نے کیمرے کی طرف چہرہ کیا اور گرج دار لہجے میں چند فقرے بولے۔

میں نے انیق کی طرف دیکھا۔ وہ میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ”ان لوگوں نے بڑے صاحب کے چھوٹے بیٹے ابراہیم کو یرغمال بنا لیا ہے۔ اب یہ بڑے صاحب کو وارننگ دے رہے ہیں کہ انہیں اپنی جان کی پروا نہیں۔ اگر لڑکے کو چھڑانے کی کوشش کی گئی تو وہ اسے اور خود کو دھماکے سے اڑا لیں گے۔“

حلمی ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر ایک بغلی

دروازے سے کسی طرف نکل گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بڑے صاحب کی معاونت کے لیے گیا ہے مگر یہ اندازہ غلط نکلا۔ ایک منٹ بعد حلمی ہمیں اسی کیمرے میں نظر آیا جو سجاول اور بڑی بیگم والے مناظر کو ''کور'' کر رہا تھا۔ آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ لیکن ویڈیو میں دکھائی دیا کہ وہ سجاول کی پیٹھ تھپک رہا ہے۔ پھر اس نے بڑی بیگم کو باہر نکالنے کے لیے واش روم کا دروازہ کھولا۔ بڑی بیگم باہر نکل آئیں۔ کمرے کا خونچکاں منظر دیکھ کر بیگم کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ چلا رہی تھیں۔ حلمی انہیں سہارا دیتا ہوا دروازے کی طرف لے گیا۔ اب پارا ہاؤس کے قریباً نصف درجن گارڈز بھی یہاں آگئے تھے۔ انہوں نے حلمی اور بڑی بیگم کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے شاہ زیب بھائی؟ یہ تو سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی بات ہے۔'' انیق نے کہا۔

''ابھی اور بھی اولے پڑنے ہیں۔ لگتا ہے کہ لڑکے کے پکڑے جانے سے معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔'' نشست گاہ کے عین سامنے ہونے والی تابڑ توڑ فائرنگ اب مدھم پڑ گئی تھی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ پارا ہاؤس کے گارڈز نے حملہ آوروں کو پیچھے ہٹا دیا ہے یا پھر وہ مارے گئے ہیں۔ اسی دوران میں اسپیکر پر اعلان ہونے لگا۔ ''میں انچارج قادر بول رہا ہوں۔ پارا ہاؤس کے گیٹ بند کر دیے گئے ہیں۔ کوئی شخص یہاں سے باہر نہیں جائے گا، نہ ہی کسی کو باہر سے اندر آنے دیا جائے گا۔ پارا ہاؤس میں کوئی شخص اپنا فون استعمال نہیں کرے گا۔ میں پھر دہراتا ہوں، کوئی شخص فون استعمال نہیں کرے گا۔''

انچارج قادر کی آواز سارے پارا ہاؤس میں گونج رہی تھی۔

اگلے دو تین منٹ میں صورتِ حال کچھ واضح ہو گئی۔ پارا ہاؤس کے گراؤنڈ فلور پر اب کوئی حملہ آور موجود نہیں تھا۔ اب وہ اوپر والی منزل پر تھے۔ جہاں انہوں نے عزت مآب بڑے صاحب کے چھوٹے بیٹے ابراہیم کو یرغمال بنا لیا تھا...... اور خود کو دو تین کمروں کے اندر محصور کر کے بیٹھ گئے تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہاں موجود حملہ آوروں کی تعداد آٹھ کے لگ بھگ ہے، جن میں سے کچھ برونائی کے باشندے ہیں۔

پارا ہاؤس کے تین گارڈز دندناتے ہوئے نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک گیم شحیم شخص آگے بڑھا اور بھاری آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بہت شکریہ مسٹرز، آپ نے بہت ہمت دکھائی ہے، اور مدد کی ہے۔''

میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس شخص کے چہرے کی غیر معمولی چیز اس کے بھاری چوڑے جبڑے تھے۔ اس کی آواز سے میں نے اسے پہچان لیا کہ یہ وہی انچارج گارڈ قادر ہے جو تھوڑی دیر پہلے پارا ہاؤس کے آڈیو سسٹم پر اناؤنسمنٹ کر رہا تھا۔

وہ دوبارہ بولا۔ ''اب یہاں نیچے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ یہ رائفلیں ہمیں دے دیں۔''

میں نے نقاب پوش سے چھینی ہوئی سیون ایم ایم رائفل انچارج کے حوالے کر دی۔ انیق نے بھی اپنی والی رائفل انچارج کو دے دی۔ نشست گاہ کے فرش پر اس وقت ایک لاش اور دو بے ہوش حملہ آور موجود تھے۔ گلدان کی چوٹ سے بے ہوش ہونے والے کے چہرے پر ابھی تک اسکائی ماسک موجود تھا۔ انچارج نے یہ ماسک ہٹا کر دیکھا۔ یہ بھی دوسروں کی طرح مقامی ہی تھا۔ گارڈز دونوں بے ہوش افراد کو گھسیٹ کر باہر لے گئے۔

انچارج نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آپ دونوں میرے ساتھ آئیں اور اس ساتھ والے کمرے میں بیٹھیں۔ حالات ذرا کنٹرول میں ہوتے ہیں تو حلمی صاحب آپ کو سچویشن بتانے کے لیے خود آتے ہیں۔''

انچارج قادر نے ہمیں ایک قریبی کمرے میں پہنچا دیا۔ یہ عام سائز کا آراستہ کمرا تھا۔ صوفے اور کرسیاں وغیرہ موجود تھیں۔ ریفریجریٹر میں پینے پلانے کے لوازمات بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ٹی وی آن تھا اور ایک بیکار سے ٹاک شو میں تین چار بے تکے سیاست دان منہ سے جھاگ اُڑا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ چینل کے اسٹوڈیو میں زلزلہ آیا ہوا ہے۔ ایسا ہی زلزلہ فی الوقت پارا ہاؤس کے طول و عرض میں بھی آیا ہوا تھا۔ فائرنگ تو تھم گئی تھی مگر آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ ہر طرف بھاگ دوڑ مچی ہوئی ہے۔ ایمبولینس گاڑیوں کے سائرن بھی سنائی دیے۔

ہمیں وہاں بیٹھے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ سردار سجاول بھی وہاں پہنچ گیا۔ ایک زبردست معرکے کے باوجود وہ محفوظ رہا تھا۔ صرف ایک بازو کو گولی چھوتی ہوئی گزری تھی یہاں تازہ بینڈیج دکھائی دے رہی تھی۔

''کچھ پتا چلا ہے تم کو؟'' سجاول نے اپنی تیکھی مونچھوں کو سہلا کر پوچھا۔

''ہاں پتا چلا ہے اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے تھوڑی دیر پہلے جو پانی

پٹ کی جنگ لڑی ہے، وہ سی سی ٹی وی پر ہم نے لائیو دیکھی ہے، ویل ڈن! زبردست۔''

سردار سجاول نے کہا۔ ''اور تمہارے ساتھ کیا بیتی؟''

میں نے مختصر الفاظ میں اسے وہ سب کچھ بتایا جو تھوڑی دیر پہلے نشست گاہ میں پیش آیا تھا اور جس کے نتیجے میں ایک شخص ہلاک اور دو شدید زخمی ہوئے تھے۔

سجاول نے کہا۔ ''اوپر، بڑی بیگم کا برا حال ہے۔ اسے ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ اس کا پتر مسلح بندوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ وہ رو رہی ہے اور اپنے سر پر دو ہتڑ مار رہی ہے۔''

''یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟'' انیق نے پوچھا۔

''شاید یہ وہی بروناٹی والی دشمنی ہے جس کے بارے میں تھوڑی سی ٹوہ جاناں نے لگائی تھی۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

ہمیں اندیشہ تھا کہ اس کمرے میں بھی ریکارڈنگ کا نظام موجود ہو لہٰذا ہم بہت دھیمے انداز میں بات کر رہے تھے۔

سجاول نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''پتا چل رہا ہے کہ پارا ہاؤس کے اندر کے کچھ گارڈز بھی ان لوگوں سے ملے ہوئے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے، ورنہ جتنی سخت سیکیورٹی ہے، یہ سب کچھ بھی نہ ہوتا۔''

میں نے کہا۔ ''بڑی بیگم کی جان تو تمہاری وجہ سے بچ گئی، مگر اب انہوں نے بیٹے کو دھر لیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، یہ بچے کھچے بندے بڑے صاحب کے بچے کو چھوڑ دیں گے؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ انہوں نے لڑکے کی ٹانگ کے ساتھ کوئی بم وغیرہ باندھ دیا ہے اور سب کچھ اُڑانے کی دھمکی دے رہے ہیں۔''

''ہاں، یہ دھمکی تو ہم نے بھی فوٹیج میں دیکھی اور سنی ہے۔ لیکن تب تک بم وغیرہ نہیں باندھا گیا تھا۔''

سجاول بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کا ایک ہی مطالبہ ہوگا۔ وہ لڑکے سمیت یہاں سے نکلنا چاہیں گے۔''

''ان کی ٹھیک تعداد کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سات، آٹھ ہیں۔ ان میں سے تین باہر کے ہیں۔''

......پارا ہاؤس میں عجیب سی سنسنی اور دہشت پائی جا رہی تھی۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ باہر نکل کر صورتِ حال کا جائزہ لیں مگر حلمی نے ہمیں سختی کے ساتھ باہر نکلنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کمرے میں صرف ایک ہی کھڑکی تھی اور وہ ایک چھوٹے سے لان میں کھلتی تھی جہاں ہلکی روشنی میں پھولوں کے رنگ برنگ تختے تھے۔

یہ ساری جگہ ہی سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھی۔ ہمیں سردی کا احساس بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نشست گاہ کی طرف سے بات چیت کی آوازیں آنے لگیں۔ غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ یہ بڑے صاحب کا دستِ راست حلمی ہی ہے جو کسی سے بڑے تیز لہجے میں باتیں کر رہا ہے۔ مگر الفاظ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ انیق نے کی ہول سے جھانک کر دیکھا لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

میں نے ایک بار پھر بڑے محتاط انداز میں اس کمرے کے کونے کھدروں کا جائزہ لیا۔ یہاں مجھے کوئی کیمرا یا ڈکٹا فون وغیرہ نظر نہیں آیا۔ ہم سرگوشیوں کے بجائے قدرے نارمل انداز میں باتیں کرنے لگے۔ سجاول نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ پولیس کو بلائیں گے؟''

''ابھی جو اعلان ہو رہا تھا، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس معاملے سے خود ہی نمٹنا چاہتے ہیں۔ اعلان یہی تھا کہ کوئی اندر سے باہر نہیں جا سکتا اور باہر سے اندر نہیں آ سکتا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے پاس اتنی نفری ہے کہ یہ اپنے طور پر کارروائی کر سکتے ہیں۔''

''ہاں، یہ تو ہم نے یہاں آتے ہوئے بھی دیکھا تھا، عمارت کے چپے چپے پر گارڈ موجود تھے اور یہ کوئی عام، خانہ پُری والے گارڈز نہیں ہیں۔ کوئی ہائی فائی سیکیورٹی ایجنسی ہے۔''

''پھر بھی سوچنے والی بات ہے کہ یہاں کئی لوگوں کی جانیں چلی گئی ہیں۔ پولیس کو اطلاع دیے بغیر تو گزارا نہیں ہوگا۔'' سجاول نے نکتہ اٹھایا۔

''ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی وجہ ہو۔ یہ لوگ فی الحال پولیس کو بلانا نہ چاہتے ہوں۔''

مختلف آہٹوں، آوازوں اور بھاگ دوڑ سے پتا چلتا تھا کہ سیکیورٹی گارڈز اور شوٹرز نے پورے پارا ہاؤس کو حصار میں لے لیا ہے۔ پارا ہاؤس کے عقبی حصے کی ساری لائٹس روشن کر دی گئی تھیں اور سرچ لائٹس کے دائرے بھی مسلسل حرکت کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد نشست گاہ کی طرف سے پھر آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ اس دفعہ یہ آوازیں نسبتاً نزدیک سے آ رہی تھیں۔ میں نے کی ہول

سے آنکھ لگا کر دیکھا...... اور اس مرتبہ مجھے ''سرویلینس اسکرین'' کا ایک حصہ نظر آیا۔ کنٹرول پینل کے سامنے حلمی بیٹھا تھا۔ ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ مجھے بس اس کا وہ کندھا دکھائی دے رہا تھا جس پر تازہ تازہ بینڈ یج کی گئی تھی۔ وہ شاید حملہ آوروں کے سرغنہ سے بات کر رہا تھا۔

میں نے انیق کو اشارہ کیا۔ اس نے پہلے کی ہول سے آنکھ لگا کر نشست گاہ کا منظر دیکھنے کی کوشش کی پھر کی ہول سے کان لگا دیا۔ مالے زبان میں بات ہو رہی تھی اور آواز بہت مدھم تھی۔ وہ بڑے دھیان سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔

''کچھ پتا چلا؟'' میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آنکھیں میچ کر ساکت بیٹھا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر دلچسپی کے آثار ہیں۔

تین چار منٹ بعد اس نے دوبارہ کی ہول سے آنکھ لگائی اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''یہ معاملہ کچھ زیادہ ہی گڑبڑ لگ رہا ہے جی۔'' وہ بولا۔

''وہ کس طرح کی گڑبڑ؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں بڑے صاحب کے بیٹے ابراہیم کے علاوہ کوئی اور اہم بندہ بھی ''ہوسٹیج'' بن گیا ہے۔ وہ یہاں پارا ہاؤس میں وی وی آئی پی مہمان کے طور پر موجود تھا۔ ابھی تک نام کا پتا نہیں چل سکا۔ پر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی حکومتی یا سیاسی شخصیت ہے۔''

سنسنی خیز اطلاع تھی۔ میں اور سجاول ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

سجاول نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس خاص بندے کے یہاں ہونے کو چھپایا جا رہا ہے اور اسی لیے پولیس کو اس پھڈے سے دور رکھا جا رہا ہے۔''

''بالکل یہی بات ہے۔'' انیق نے تائید کی۔ ''حلمی نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بنگلے میں آقا جان سے بھی بات کی ہے۔ اس سے کہا ہے کہ وہ پورا دھیان رکھے۔ کسی بھی مقامی اخبار نویس یا میڈیا والے کو پارا ہاؤس کے قریب بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔ اگر کوئی فائرنگ وغیرہ کے بارے میں پوچھے تو ہوائی فائرنگ کا یا اس طرح کا کوئی اور بہانہ بنا دیا جائے۔''

''یہ مہمان کون ہوسکتا ہے؟'' سجاول نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

انیق بولا۔ ''ایسے لگتا ہے کہ سیر اور شکار کے لیے کوئی یہاں پارا ہاؤس میں موجود ہے۔ آج کل تلور کا شکار بھی ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ پارا ہاؤس والوں نے اس شغل کے لیے کسی کو دعوت دے رکھی ہو۔ اب وہ بندہ بھی اس لپیٹے میں آ گیا ہو۔''

مجھے گاڑیوں کا وہ پُرشکوہ قافلہ یاد آیا جو کل بھی فراٹے بھرتا پارا ہاؤس سے نکل کر ٹیلوں کی طرف گیا تھا۔ یہ لوگ زبردست موج میلے میں مصروف تھے اور کبھی کبھی زبردست موج میلے سنگین ترین حادثات پر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔

یہاں آتے وقت سجاول کے ارادے تو کچھ اور تھے مگر میں اور انیق اس نیت سے لیے پہنچے تھے کہ ہمیں زینب کے معمے والا حل ملے۔ زینب کو اور دیگر دو لڑکیوں کو کس مقصد کے لیے تیار کر کے یہاں بھیجا جا رہا تھا مگر یہاں آ کر یہ دوسرا چکر چل گیا تھا۔ بڑے صاحب کی پرانی دشمنی نے اپنا جلوہ دکھایا تھا۔ غالباً یہ وہی دشمنی تھی جس سے بچنے کے لیے بڑے صاحب نے برونائی سے اپنا بستر بوریا سمیٹا تھا اور جنوبی پنجاب کے اس دور افتادہ علاقے میں چلا آیا تھا۔

بالائی منزل سے کسی جوان شخص کے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ بھی یرغمالیوں میں شامل ہو۔ اس نے شاید بھاگنے کی کوشش کی تھی اور اسے دوبارہ پکڑ لیا گیا تھا۔ اب اس سے مار پیٹ کی جا رہی تھی۔

سنگین ترین حالات کے باوجود انیق اب اپنے موڈ میں آ چکا تھا۔ وہ داؤد بھاؤ کا سدھایا ہوا تھا۔ ایسے حالات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے، بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! ہم نے تو ہر فلم ڈرامے میں یہی دیکھا ہے کہ اولاد آوارہ گرد ہوتی ہے اور والدین نیکوکار۔ مگر یہاں لگتا ہے کہ الٹا حساب ہے۔ قبلہ والد صاحب رنگین مزاج ہیں لیکن بیٹے کو دیکھ کے لگتا ہے کہ شریف پرہیزگار ہے۔''

''اس کی والدہ کو بھی تو دیکھا ہے تم نے۔ اسلامی لباس میں تھی اور اسکارف باندھا ہوا تھا۔ اولاد پر اکثر ماں کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ بڑے صاحب کی ماں لوز کریکٹر تھی؟''

''لوز کریکٹر کا تو پتا نہیں، لیکن وہ ایک کرسچن خانہ بدوش تھی، ہم نے تو یہی سنا ہے۔''

''ویسے ماں کے اثر والی بات آپ نے ٹھیک کہی ہے جی۔'' انیق نے چور نظروں سے سردار سجاول کی طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے بات بدل کر بولا۔ ''ایسا سین تو فلم عادل میں بھی ہے۔ محمد علی بچپن میں ماں کی تربیت کا بہت اثر

لیتا ہے اور گانا گاتا ہے پیاری ماں، دعا کرو میں جلد بڑا ہو جاؤں......''

سجاول سخت خشک لہجے میں بولا۔ ''یہ مسخری کا موقع نہیں ہے۔ کھوپڑے کو استعمال کرو اور سوچو کہ اب کیا کرنا ہے۔''

انیق نے سہمنے کی اداکاری کی اور مغموم صورت بنا کر بیٹھ گیا۔

اسی دوران میں نشست گاہ کی طرف سے ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دینے لگی۔ یہ پارا ہاؤس کے سب سے بااختیار شخص بڑے صاحب ریان فردوس کی آواز تھی۔ بڑا صاحب اپنے دستِ راست حلمی سے بات کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک ملازم نے آ کر کہا کہ ہمیں بلایا گیا ہے۔

ہم تینوں نشست گاہ میں پہنچے۔ بڑا صاحب سخت پریشانی کے عالم میں ایک بیش قیمت صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ برونائی کے چولا نما روایتی لباس میں تھا۔ دو مسلح گارڈز عقب میں چوکس کھڑے تھے۔ حلمی بھی سامنے ایک صوفے پر موجود تھا اور بہت مؤدب نظر آ رہا تھا۔

ہم بڑے صاحب کے رُوبرو کھڑے ہو گئے۔ بڑے صاحب نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے ہمیں اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے۔ بڑے صاحب نے تعریفی نظروں سے سجاول کو دیکھا اور اس کے لیے ستائش کے کلمات کہے، جن کا مطلب حلمی نے ہمیں بتایا۔ بڑے صاحب نے دوبارہ کچھ کہا۔

حلمی نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ ''عزت مآب تم تینوں سے خوش ہیں۔ تم نے جواں مردی کا ثبوت دیا بلکہ پارا ہاؤس کے گارڈز سے بھی بڑھ کر جرأت دکھائی۔ بہرحال ابھی یہ بلا ٹلی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے پارا ہاؤس کے ایک اہم شخص کے علاوہ ایک معزز مہمان کو بھی یرغمال بنا رکھا ہے۔ ہمیں ان کی رہائی کے بارے میں کچھ سوچنا ہے۔''

سجاول نے کہا۔ ''عزت مآب کے لیے جان بھی حاضر ہے۔ ہم کسی لائق تو نہیں ہیں لیکن عزت مآب ہمیں جو بھی حکم دیں گے ہم بجا لائیں گے۔''

حلمی نے سجاول کی بات بڑے صاحب تک پہنچائی۔

جواب میں بڑے صاحب نے کہا۔ ''نہیں، ہم خود اس معاملے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ جلد ہو جائے گا۔ اگر کسی طرح کی ہیلپ کی ضرورت ہوگی تو تم لوگوں کو ضرور بتایا جائے گا۔''

مختصر گفتگو کے بعد مجھے اور انیق کو تو واپس بھیج دیا گیا مگر سجاول کو وہیں روکا گیا۔ میں اور انیق نشست گاہ کے ساتھ والے کمرے میں واپس آ گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ سجاول کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے اور یہ درست بھی تھا۔ اس نے پارا ہاؤس کی بڑی بیگم کو یرغمال بننے سے بچا کر ایک زبردست کام کیا تھا۔

سجاول کی واپسی قریباً ایک گھنٹا بعد ہوئی۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی اہم خبر تھی۔ رازداری کے لہجے میں بولا۔ ''اس مہمان کا پتا چل گیا ہے جو بڑے صاحب کے بیٹے کے ساتھ یرغمال بنا ہے۔ بڑا اونچا بندہ ہے۔''

''کون ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''تم ڈنمارک سے نازل ہوئے ہو۔ یہاں کے حالات اور یہاں کے سیاسی لوگوں کا تمہیں کچھ زیادہ پتا نہیں ہوگا۔ داراب فیملی کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟ یہاں کی ایک مشہور سیاسی فیملی ہے۔''

میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا مگر اپنے تاثرات میں نے ظاہر نہیں ہونے دیے۔ ''نام کچھ سنا سنا لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''داراب فیملی کا ایک نوجوان سپوت ہے۔ سپوت بھی کیا شہزادہ ہے۔ شکیل نام ہے اس کا۔ بڑے اُونچے درجے کی شے ہے۔ وہ اس رگڑے میں آ گیا ہے...... اور بڑے صاحب کے پتر کے ساتھ ہی پکڑا گیا ہے۔''

میرے سینے میں دھڑکن کے گولے سے پھٹ رہے تھے۔ شکیل داراب کو میں کیسے بھول سکتا تھا۔ یہی تو وہ سیاست زادہ تھا جس سے طاقت کا نشہ سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا اور وہ اپنی من مانیوں کی کوئی حد مقرر نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ لوگ فی الوقت براہِ راست تو حکومت میں نہیں تھے لیکن اصل میں حاکموں کے حاکم تھے۔

شکیل داراب نے جس طرح اپنی ایک ٹیچر کو اپنے نام نہاد عشق کا نشانہ بنایا تھا اور جس طرح اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی، وہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ سیالکوٹ شہر کا وہ گھر جس میں ٹیچر ناہید رہتی تھی اور جس کی ایک دیوار میں ایک ایسا راستہ تھا جو ساتھ والی محل نما عمارت میں کھلتا تھا۔ یہ اسی شکیل داراب کا راستہ تھا جہاں سے یہ سیاست زادہ اپنی منکوحہ ناہید سے ملنے پہنچتا تھا...... مگر اب اس کا دل اس سے بھر چکا تھا اور اس کا ثبوت یہی تھا کہ اس نے عاشرہ نامی لڑکی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

عاشرہ کو اس سے بچانے کے لیے میں نے شکیل داراب سے ایک بڑی دھانسو قسم کی ملاقات کی تھی۔ یہ ملاقات ایک اسٹیشن ویگن کے اندر ہوئی تھی اور ہم میں کچھ باتیں طے ہوگئی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ شکیل کو وہ ملاقات بھولی نہیں ہوگی۔

آج کئی ماہ بعد میں پھر شکیل داراب کا نام سن رہا تھا۔

سجاول کی آواز نے مجھے میرے تیز رفتار خیالوں سے چونکایا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہ شکیل داراب آج سہ پہر یہاں تشریف لایا تھا۔ وہی، تگور کے شکار کی تیاریاں تھیں۔ سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی شکار کرنے والا بھی شکار ہوجاتا ہے۔''

''یہ بھی ابراہیم کے ساتھ ہی تھا۔'' انیق نے پوچھا۔

''نہیں، یہ بالکل ساتھ والے پورشن کے بیڈ روم میں سویا ہوا تھا۔ اسے تب پتا چلا جب ایک رائفل اس کے سر سے آن لگی۔ یہ ایک بڑی خبر ہے۔ اب اس کو چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میڈیا کو بھنک پڑگئی تو یہاں کیمروں کی قطاریں لگ جائیں گی۔''

''اب یہ لوگ کیا کررہے ہیں؟''

''ابھی تو گل بات سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ یعنی کچھ لو اور کچھ دو۔ مگر بات بنتی نظر نہیں آتی۔ ان لوگوں کی زبان سمجھ میں نہیں آتی مگر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک کو گالیاں دے رہے ہیں اور خطرناک دھمکیاں بھی۔ ان کے لیڈر کا نام شاید ثاقب ہے...... وہ مرنے مارنے پر تلا ہوا ہے۔ دو بندوں نے مسلسل بڑے صاحب کے پتر پر رائفلیں تان رکھی ہیں۔ دو بندوں نے ہی شکیل داراب کی کنپٹی پر بھی اسلحہ رکھا ہوا ہے۔ وہ بالکل چوکس ہیں۔''

''اور وہ بم والی بات؟''

''وہ تو ابھی تک ثابت نہیں ہوئی۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے پاس کوئی بم ہو لیکن ابھی کیمروں میں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔''

''کیمرے کام کررہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے تو کررہے تھے لیکن اب انہوں نے توڑ دیے ہیں۔ صرف ایک کیمرا چل رہا ہے اور اس کا رخ انہوں نے اپنی مرضی سے رکھا ہوا ہے۔''

''وہ جو تم دوسرا نام لے رہے ہو شکیل داراب کا...... وہ بھی اب ابراہیم والے کمرے میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں دونوں کو اکٹھے بٹھایا ہوا ہے ساتھ ساتھ...... دونوں کے ہاتھ بھی پیچھے بندھے ہیں۔ سب کچھ نظر آرہا ہے اسکرین پر۔''

اچانک میں چونک گیا۔ کھڑکی سے باہر احاطے میں ایک منظر دکھائی دیا۔ دو تین افراد نے قالین کا ایک بڑا ٹکڑا فرش پر بچھایا۔ پھر دو افراد ایک خون چکاں لاش اٹھا کر لائے اور قالین پر رکھ دی...... اور یہ کوئی ایک لاش نہیں تھی...... یکے بعد دیگرے قریباً آٹھ لاشیں لاکر قالین پر رکھی گئیں۔ یہ سب کے سب نیلی وردیوں والے گارڈز ہی تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو کچھ دیر پہلے ہونے والے خونی ہنگامے میں ہلاک ہوئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ابھی کچھ اور لاشیں بھی ہوں جو کہیں اور رکھی گئی ہوں۔ یہ آٹھ لاشیں بظاہر تو یارا ہاؤس کے محافظوں کی تھیں مگر یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی ہوسکتے تھے جنہوں نے محافظوں کے بجائے حملہ آوروں کا کردار ادا کیا تھا۔ پھر ہم نے حلمی اور چند دیگر افراد کو دیکھا۔ وہ لاشوں کا معائنہ کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان میں چالیس پینتالیس سال کا ایک چاق و چوبند شخص بھی تھا۔ اس عمر میں بھی اس کا جسم کسرتی اور چال ڈھال میں زبردست قسم کا طمطراق تھا۔ اس نے پینٹ اور جرسی پہن رکھی تھی۔ وہ بڑے ماہرانہ انداز میں لاشوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

سجاول سرگوشی میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے، یہی وہ کمانڈو خالد شاہ ہے۔''

''خالد شاہ؟''

''ہاں، ابھی حلمی اس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ یہ کوئی ریٹائرڈ پولیس افسر ہے۔ اسپیشل برانچ میں تھا۔ اس طرح کے کاموں میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔''

''یہ کیا کرے گا؟''

''میرا خیال ہے کہ اسے یہ لوگ کسی بھیس میں اوپر بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں...... پر ابھی ٹھیک سے پتا نہیں۔''

اگلا قریباً ایک گھنٹا بھی سخت تناؤ میں گزرا۔ نشست گاہ میں اب خاموشی تھی۔ بس کبھی کبھی تیز قدموں کی آواز آتی تھی، دروازے کھلتے یا بند ہوتے تھے۔ بیرونی چار دیواری کی طرف رکھوالی کے کتوں کا شور تھا اور سرچ لائٹس حرکت کررہی تھیں۔

ایکا ایکی نشست گاہ دوبارہ آباد ہوگئی۔ مختلف آوازیں سنائی دینے لگیں جن میں ریان فردوس یعنی بڑے صاحب کی آواز بھی شامل تھی۔ میں نے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ اسکرین پھر روشن دکھائی دے رہی تھی۔ ساری اسکرین تو کی ہول سے نظر نہیں آتی تھی مگر جتنی بھی آتی تھی وہ بھی صورت

حال کو سمجھنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے اسکرین پر پہلی بار شکیل داراب کو دیکھا۔ (اور اسے اس حال میں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی) وہ سلیپنگ سوٹ میں تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ گورے چٹے چمک دار چہرے پر دو نیلگوں گومڑ نظر آ رہے تھے۔ ایک نقاب پوش نے رائفل باقاعدہ اس کی کنپٹی سے لگا رکھی تھی اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ شکیل خوف زدہ تو تھا مگر اس خوف میں شدید غصہ بھی شامل تھا۔ اس کے پہلو میں وہی دبلا پتلا لڑکا بیٹھا تھا جس کا نام ہمیں ابراہیم معلوم ہوا تھا۔ اس کی ایک آستین خون آلود تھی۔ اس زخم پر پہلے ہماری نگاہ نہیں پڑی تھی۔ اس کے سر سے دو رائفلیں لگی ہوئی تھیں۔

یہ عزت مآب ریان فردوس کا لختِ جگر تھا اور اس کی کنپٹی پر بندوق رکھ کر ان نقاب پوشوں نے اس پورے پارا ہاؤس کو مفلوج کر ڈالا تھا۔

اسکرین پر ابھرنے والا ایک منظر دیکھ کر میں چونکا۔ وہی ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا جسے ہم نے تھوڑی دیر قبل چھوٹے احاطے میں لاشوں کے پاس دیکھا تھا۔ سجاول کے بقول یہ کوئی سابق پولیس کمانڈو تھا اور اسپیشل برانچ سے تعلق رکھتا تھا مگر اس وقت وہ مجھے ایک ڈاکٹر کے روپ میں نظر آیا۔ اس نے باقاعدہ سفید کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے سے اسٹیتھ اسکوپ لٹکایا ہوا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں میڈیکل باکس صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' سجاول نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''کمانڈو موقع پر پہنچ گیا ہے۔ ڈاکٹر کے روپ میں آیا ہے۔ شاید ابراہیم کی مرہم پٹی کے لیے۔''

''زبردست...... مجھے بھی دیکھنے دو۔''

میں پیچھے ہٹ گیا۔ سجاول نے اپنی آنکھ کی ہول سے چپکا دی۔

یہ بڑے سنسنی خیز لمحے تھے۔ ظاہر تھا کہ اگر یہ کمانڈو موقع پر پہنچا ہے تو صرف مشاہدہ مطالعہ کرنے نہیں گیا۔ وہ موقع کی تاک میں گیا ہے اور چانس ملنے پر کوئی کارروائی ضرور کرے گا۔ عین ممکن ہے کہ اس کے میڈیکل باکس میں کوئی ہتھیار بھی موجود ہو۔

کچھ دیر بعد سجاول پیچھے ہٹا تو انیق نے کی ہول کے ذریعے نشست گاہ کا منظر دیکھا...... تب پھر میری باری آ گئی۔

جب میں نے دیکھا تو کمانڈو خالد شاہ نے مضروب لڑکے ابراہیم کے لبادے کی آستین چاک کر دی تھی اور اس کے بازو کے زخم کو دیکھ رہا تھا۔ زخم اسکرین پر نظر نہیں آ رہا تھا تاہم صورتِ حال سے پتا چلتا تھا کہ خون کا مسلسل اخراج ہو رہا ہے اور زخم کو ٹانکوں کی ضرورت ہے۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے خالد شاہ نے زخم کی اسٹیچنگ شروع کر دی۔ ابراہیم کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ سرغنہ ثاقب نے مسلسل ہائی الرٹ کی پوزیشن اختیار کر رکھی تھی۔ اس کی ''اے کے 47'' رائفل ابراہیم کی عین کنپٹی پر تھی۔ باقی رائفل بردار بھی چوکس تھے۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' سجاول نے سوال کیا۔

''ٹانکے لگ رہے ہیں۔''

''کسی ہلچل کا چانس بھی ہے کہ نہیں؟''

''ابھی تک تو نہیں۔ اگر زبردستی چانس پیدا کیا گیا تو نقصان ہو سکتا ہے۔''

کمانڈو خالد شاہ اب اپنے میڈیکل باکس میں سے شاید قینچی ڈھونڈ رہا تھا لیکن اس نے جو شے نکالی، وہ قینچی نہیں تھی میڈیکل باکس کے کسی خفیہ خانے سے اس نے پستول برآمد کیا تھا۔ بالکل جیسے بجلی سی چمک گئی۔ خالد شاہ کا نشانہ شاندار تھا۔ اس نے سرغنہ کی کلائی کو بڑی صفائی سے نشانہ بنایا۔ میں نے دیکھا ''اے کے 47'' رائفل ایک جھٹکا کھا کر سرغنہ کے ہاتھ سے نکل گئی۔

اس کے ساتھ ہی اسکرین تاریک ہو گئی۔ باہر سے کمرے کی لائٹ آف کر دی گئی تھی، یقیناً ایسا پروگرام کے تحت ہی کیا گیا تھا۔ بالائی منزل پر کئی فائر ہوئے اور زبردست ہلچل نظر آئی۔ صرف آٹھ دس سیکنڈ بعد اسکرین دوبارہ روشن ہو گئی۔ (کیمرا تو چل ہی رہا تھا صرف اندھیرا ہونے کی وجہ سے اسکرین تاریک ہوئی تھی) جو نیا منظر اسکرین پر نظر آیا۔ وہ بالکل غیر متوقع تھا۔

کمرے میں ایک شلوار قمیص والے نوجوان کی لاش پڑی تھی۔ یقیناً اس نے کمانڈو خالد شاہ کی مدد کے لیے کمرے میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔ کمانڈو خالد شاہ کی دونوں ٹانگوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ شاید یہاں گولیاں لگی تھیں۔ سرغنہ ثاقب نے خالد شاہ کو دیوار سے لگایا ہوا تھا اور اے کے 47 کی نال اس کی گردن میں گھسیڑی ہوئی تھی۔ وہ غیر ملکی زبان میں پتا نہیں کیا کیا بک رہا تھا۔ ابراہیم اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ شکیل داراب بھی اوندھا گرا ہوا تھا۔ وہ دونوں رائفلوں کی زد میں تھے۔

سجاول نے مجھے دھکیل کر پیچھے ہٹایا اور کی ہول سے آنکھ لگادی۔

''کیا ہوا شاہ زیب بھائی؟'' انیق نے پوچھا۔

''وہی جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ان لوگوں نے حملہ ناکام کردیا۔ خالد شاہ زخمی ہوگیا ہے۔''

انیق نے بھی کان دروازے سے لگادیا اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔ سرغنہ ناقب کے دہاڑنے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔

''کیا کہہ رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''لگتا ہے کہ خالد شاہ کو جان سے مارنے کی دھمکی دے رہا ہے......''

ابھی انیق کا فقرہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ''اے کے 47'' کا گونج دار فائر سنائی دیا۔ اس کے دو سیکنڈ بعد کہیں پاس ہی کوئی وزنی شے پختہ فرش پر گری۔ ایک دم بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں۔

سجاول نے اپنی آنکھ کی ہول سے ہٹائی اور آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ماتھے پر بندوق رکھ کر گولی ماردی پھر لاش اوپر سے نیچے پھینک دی۔'' سجاول نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''کس کو ماری؟ خالد شاہ کو؟'' میں نے پوچھا۔

سجاول نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

جدھر سے وزنی شے فرش پر گرنے کی آواز آئی تھی، اس طرف ہمارے واش روم کی کھڑکی تھی۔ میں نے واش روم میں جاکر کھڑکی سے جھانکا۔ ماربل کے فرش پر خالد شاہ کا بے جان جسم پڑا تھا۔ گولی اس کی فراخ پیشانی توڑ کر سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر بھی زخم تھے۔

اس چاق وچوبند شخص کو ہم نے صرف ایک گھنٹا پہلے چھوٹے احاطے میں دیکھا تھا۔ چوڑا سینہ، آنکھوں میں دلیری کی چمک، چہرے پر تجربے کی روشنی۔ اسے اگر پارا ہاؤس والوں نے یہاں بلایا تھا تو یقیناً اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کے سبب ہی بلایا تھا اور وہ بڑے اعتماد سے چلا آیا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ آج وہی دن ہے جو ہر جانباز کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ایک دن اس کے ہاتھ میں موت کا سندیسا تھما دیتا ہے۔ ہمارے لیے خالد شاہ کا کردار کتنا مختصر ثابت ہوا تھا، اس کے لیے کہا جاسکتا تھا۔ وہ آیا...... وہ جھپٹا......اور وہ مرگیا۔

بڑے صاحب، حلمی اور انچارج قادر سمیت کئی افراد اس کی لاش کے گرد جمع تھے۔ ہم بھی کمرے سے باہر آگئے اور سوگوار انداز میں اس کی لاش کے پاس کھڑے ہوگئے۔ اسے بالائی منزل کی کھڑکی سے نیچے پھینکا گیا تھا اور لاش پھینک کر کھڑکی پھر بند کردی گئی تھی۔

اب بالائی منزل پر ایک بار پھر وہی پُراندیش خاموشی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بڑے صاحب کے چہرے پر رنگ آجارہے تھے۔ انہوں نے حلمی کو ساتھ لیا اور تیز قدموں سے واپس نشست گاہ کی طرف چلے گئے۔ ہم بھی اپنے کمرے میں واپس آگئے۔ سنبل کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور موجودہ صورتِ حال میں کیا محسوس کررہی ہے۔ بے شک وہ جادوئی حسن کی مالک تھی لیکن سمجھ بوجھ بہت زیادہ نہیں تھی۔ یہ افراتفری کے حالات اسے خوف زدہ کرسکتے تھے۔

ہمیں کمرے میں پہنچے ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ حلمی وہاں پہنچ گیا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ آقا جان بھی تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی سجاول کو تھپکی دی اور ہم دونوں کو بھی شاباشی کی نظروں سے دیکھا۔ حلمی نے کہا۔

''حالات کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ ابھی تم تینوں نے بھی وہ لاش دیکھی ہوگی جو اوپر سے پھینکی گئی ہے۔''

سجاول نے اثبات میں جواب دیا اور انجان بنتے ہوئے کہا۔ ''بہت زیادہ افسوس ہوا ہے جی۔ خالد شاہ صاحب سے تو بڑی امید تھی۔ یہ سب کیسے ہوگیا؟''

حلمی نے مختصر الفاظ میں بتایا کہ کس طرح خالد شاہ اور اس کے ساتھی نے حملہ آوروں کو زیر کرنے کی کوشش کی اور کس طرح یہ کارروائی ناکام ہوئی۔

ہم یہ سب کچھ مانیٹرنگ اسکرین پر دیکھ چکے تھے۔

حلمی کے ہاتھ میں کینوس کا ایک بیگ نظر آرہا تھا۔ اس نے بیگ فرش پر رکھ دیا اور بولا۔ ''اس میں دو رائفلیں اور ایک پستل ہے۔ کافی فالتو راؤنڈ بھی ہیں۔ یہ ہتھیار تم تینوں کے لیے ہیں۔ تم نے تھوڑی دیر پہلے جس جی داری کا مظاہرہ کیا ہے اس کی فوٹیج بڑے صاحب نے بھی دیکھی ہے۔ وہ تم سے متاثر ہوئے ہیں اور خاص طور سے مسٹر سجاول سے۔''

سجاول نے اسلحہ نکال کر دیکھا اور حلمی کا شکریہ ادا کیا۔

حلمی نے کہا۔ ''موجودہ حالات میں تم تینوں کا مسلح ہونا ہمارے لیے توانائی کا سبب ہوگا۔ اللہ کرے پارا ہاؤس کے گارڈز خود ہی حالات کنٹرول کرلیں لیکن پھر بھی تم لوگوں

کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار ہونا چاہیے۔"
حلمی کا لہجہ دوستانہ تھا۔ میں نے آقا جان کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ اسے یہ پچویشن کچھ زیادہ پسند نہیں آرہی۔ وہ تو ہمارے یہاں آنے کے حق میں ہی نہیں تھا۔ ہم نہ صرف آئے تھے بلکہ اب بڑے صاحب کی نظروں میں بھی آگئے تھے۔
"اب صورتِ حال کیا ہے جی؟" میں نے حلمی سے پوچھا۔
"وہی جو خالد شاہ کے جانے سے پہلے تھی بلکہ اب تو ان خبیثوں نے وہ آخری کیمرا بھی توڑ ڈالا ہے۔ وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں لیکن ہم انہیں نہیں دیکھ پا رہے۔ ان سے ہمارا صرف آڈیو رابطہ ہے۔"
"میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے جی۔" میں نے کہا۔
"کہو کہو۔"
"ایسا نہ ہو کہ پارا ہاؤس کے گارڈز میں ابھی کوئی ایک آدھ اور "کالی بھیڑ" بھی موجود ہو...... اور وہ کوئی نقصان پہنچا جائے۔"
حلمی نے ملائیشین لہجے کی اردو میں کہا۔ "یہ اندیشہ ہمارے ذہن میں بھی پیدا ہو رہا ہے۔ ہم نے دس پندرہ ایسے لوگوں سے ہتھیار رکھوا لیے ہیں، جن پر کسی طرح کا شک کیا جا سکتا تھا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ کچھ مزید لوگوں کو بھی چیک کرنا چاہیے۔ مناسب نفری تو موجود ہے لیکن کالی بھیڑ والی بات خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"
"حملہ آوروں میں سے کوئی زندہ بھی پکڑا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"صرف ایک۔ اور وہ بھی زخمی ہے۔ بیسمنٹ میں بے ہوش پڑا ہے۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ شاید وہ کچھ بتا سکے۔"
اسی دوران میں حلمی کے سیل فون کا میوزک بجنے لگا۔ وہ کال ریسیو کرتا ہوا تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ آقا جان بھی اس کے ساتھ ہی گیا تھا۔ وہ یہاں ہماری پذیرائی پر کافی حیران ہوا تھا۔ اس کے نزدیک تو سجاول فقط ایک ٹرک ڈرائیور اور انیق ہیلپر تھا۔ میری حیثیت اس کے لیے ایک ست الوجود گارڈ کی تھی۔ لیکن یہاں ہماری کارکردگی کا سن کر وہ متعجب ہو رہا تھا۔
اگلا ایک گھنٹا بے حد تناؤ بھرا تھا۔ ہم کمرے میں تھے اور کوئی اہم اطلاع ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ لگتا ہے

لگا ہے بالائی منزل سے دہاڑنے چنگھاڑنے کی آوازیں آتی تھیں۔ یہ آوازیں یقیناً سرغنہ اور اس کے غیر ملکی ساتھیوں کی ہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ آڈیو سسٹم کے ذریعے "ہائی جیکروں" سے مذاکرات ہو رہے ہیں۔ غالباً کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔
اب رات کے ایک بجے کا عمل تھا، یہ نہایت سنگین ہنگامہ شروع ہوئے اب چار گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ ڈاکٹر کے روپ میں کمانڈو خالد شاہ کی انٹری نے حملہ آوروں کو بے حد مشتعل کر رکھا تھا اور دہاڑ چنگھاڑ کی آوازیں بھی اسی حوالے سے تھیں۔ ہمیں یہاں کھانے کے لیے بلایا گیا تھا لیکن اس عزت افزائی سے پہلے ہی یہاں آگ برسنا شروع ہو گئی تھی اور جہاں گولیاں کھلائی اور کھائی جا رہی ہوں وہاں کھانے کا ہوش کس کو رہتا ہے۔ اوپر سے جو آوازیں نیچے پہنچ رہی تھیں، ان میں گاہے بگاہے کسی عورت کی آہ و بکا بھی شامل ہو جاتی تھی۔ یقیناً یہ اسی پریشان حال ماں کی آواز تھی جس کا لختِ جگر قاتلوں کے قبضے میں تھا، اگر یہ صرف روپے پیسے کا معاملہ ہوتا تو شاید اب تک حل بھی ہو گیا ہوتا۔ کیونکہ مال و زر کی اس پارا ہاؤس میں کوئی کمی نہیں تھی۔ یہاں مطالبہ کچھ اور طرح کا تھا جس کی وجہ سے مذاکرات طول پکڑتے جا رہے تھے۔
رات قریباً دو بجے کا عمل ہوگا جب حلمی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ آقا جان بھی اس کے ساتھ تھا۔ حلمی نے کہا۔ "معاملات طے ہو رہے ہیں۔ ان لوگوں کا ایک ہی مطالبہ ہے۔ وہ چھوٹے صاحب ابراہیم کے ساتھ یہاں سے نکلنے کا راستہ مانگ رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ وی آئی پی مہمان کو چھوڑ دیں گے۔"
"یہ مطالبہ مان لیا گیا ہے؟" سجاول نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔
"بظاہر تو مان لیا گیا ہے۔" حلمی نے رازداری کے لہجے میں کہا۔ "لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔"
سجاول سوالیہ نظروں سے حلمی کو دیکھنے لگا۔ حلمی نے سجاول کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ...... بلکہ تم دونوں بھی آجاؤ۔" اس نے میری طرف بھی اشارہ کیا۔
ہم حلمی کے ساتھ کمرے سے نکل آئے اور نشست گاہ میں سے گزر کر ایک کوریڈور میں آگئے۔ یہ کوریڈور بغل کے داخلی دروازے تک جاتا تھا۔ کوریڈور میں سرخ قالین بچھا

ہوا تھا اور یہ نہایت بیش قیمت تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر حلمی رک گیا۔ یہاں قالین کا ایک حصہ ختم ہوتا تھا اور دوسرا شروع ہوتا تھا۔ حلمی نے اس جگہ کو اپنے پاؤں سے ٹھوکا۔ نیچے کھوکھلا پن کا احساس ہوا۔

حلمی نے ایک گارڈ کو اشارہ کیا، اس نے قالین کو کنارے سے پکڑ کر ہٹایا۔ نیچے ماربل کے فرش کے بجائے مضبوط لکڑی کے تختے تھے۔ اس کے کہنے پر گارڈ نے کوریڈور کے سرے پر جا کر ایک پوشیدہ کھٹکا دبایا۔ یکا یک تختے اپنی جگہ سے ہٹ کر نیچے لٹک گئے اور ایک خلا نظر آیا۔ اس کی چوڑائی کوریڈور کی چوڑائی کے برابر تھی۔ یعنی مشکل سے چار فٹ۔ لمبائی چھ فٹ کے لگ بھگ ہوگی۔

میں اور سردار سجاول حیرت سے حلمی کی طرف دیکھنے لگے، وہ بولا۔ ”یہ ہم نے نہیں بنایا۔ بہت پہلے کا بنا ہوا ہے۔ پہلے مالک نے بنایا ہوگا۔ اس طرح کا ایک اور ”ٹریپ“ مہمان خانے کی طرف بھی موجود ہے۔“

حلمی کی بات سمجھ میں آرہی تھی اور یہ بڑی سنسنی خیز بات تھی...... حملہ آوروں کو یہاں سے نکلنے کا جو راستہ دیا جانے والا تھا، وہ اس کوریڈور کی طرف سے تھا۔ اور یہاں ان کے لیے ایک بنا بنایا ٹریپ موجود تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا یہ ٹریپ کام کر جائے گا؟

حلمی ہمیں لے کر ایک تنگ زینے سے اترا اور تہ خانے میں پہنچ گیا۔ یہاں فوم کے دس بارہ گدے اوپر تلے پھیلا کر رکھ دیے گئے تھے۔ تاکہ گرنے والوں کو زیادہ چوٹ نہ آئے۔ حلمی نے سجاول کو مختصر الفاظ میں جلدی جلدی پلاننگ سے آگاہ کیا۔ اس پلاننگ کا اہم مفروضہ یہی تھا کہ حملہ آور اس کوریڈور سے گزرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ دونوں یرغمالی یعنی ابراہیم فردوس اور شکیل داراب کو آگے رکھا جاتا تھا۔ دو یا تین افراد نے انہیں براہِ راست گن پوائنٹ پر رکھنا تھا، باقی چھ سات افراد کو اس کے عقب میں ہونا تھا۔ جیسے ہی شکیل داراب اور ابراہیم فردوس تختوں پر پہنچتے تختوں کو ہٹا دیا جاتا۔ وہ دونوں نیچے گرتے، ان کے ساتھ دو یا تین حملہ آور بھی گرتے۔ یہاں تہ خانے میں کم از کم پانچ چھ افراد کو موجود ہونا تھا۔ وہ نیچے گرنے والوں کو چھاپ لیتے یا فوراً شوٹ کر دیتے۔ اوپر والوں کو تختے کھلنے کے فوراً بعد ہی شوٹ کر دیا جاتا۔ انہیں شوٹ کرنے کے لیے رائفل بردار ابھی سے کوریڈور میں موجود کھڑکیوں کے پیچھے چھپا دیے گئے تھے۔

حلمی نے سجاول کو آفر کی کہ اگر وہ چاہے تو ان پانچ افراد میں شامل ہو سکتا ہے جن کو تہ خانے میں موجود رہنا تھا۔

سجاول نے اپنے چوڑے، صندوق جیسے سینے پر ہاتھ رکھا اور اس پیشکش کو قبول کرنے میں ایک لمحے کی دیر... نہیں لگائی۔

انچارج قادر بھی ان پانچ افراد میں شامل تھا جنہوں نے حملہ آوروں کے نیچے گرتے ہی انہیں چھاپ لینا تھا۔ باقی تین افراد بھی گارڈز کی نفری میں سے چنے ہوئے لوگ تھے۔ وہ اپنے مالک اور اس کے لختِ جگر کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے کے لیے بالکل تیار نظر آتے تھے۔ ان کے لیے سب سے ضروری ہدایت یہی تھی کہ ابراہیم اور وی آئی پی مہمان کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

حلمی اور آقا جان نے سجاول کو جلدی جلدی کچھ ضروری ہدایات دیں اور پھر ہم تہ خانے سے نکل کر اوپر آگئے۔ اب آقا جان کا رویہ بھی ہم سے کچھ بہتر نظر آنے لگا تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ فی الحال ہماری قسمت چھکارے مار رہی ہے اور اس کا کڑھنا بیکار ہے۔ حلمی نے مجھے اور انیق کو فی الحال کمرے میں رہنے کی ہدایت کی اور کہا کہ ہم تیار رہیں۔ ہماری ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔

میں نے حلمی سے کہا۔ ”جناب ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔ ابھی آپ نے کہا تھا کہ یہ لوگ یہاں سے نکلتے ہی وی آئی پی مہمان کو رہا کر دیں گے۔ مگر اب آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ لوگ چھوٹے صاحب ابراہیم کے علاوہ معزز مہمان کو بھی لے کر نکلیں گے؟“

”تمہارا سوال درست ہے۔“ حلمی نے کہا۔ ”ان لوگوں نے مہمان کو چھوڑنے والا مطالبہ مانا تو ہے مگر وہ مہمان کو تب چھوڑیں گے جب پورچ میں پہنچ کر گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔“

میرے سوال کا جواب دینے کے بعد حلمی بڑی سرعت سے باہر نکل گیا۔ آقا جان وغیرہ بھی اس کے ساتھ تھے۔ جاتے جاتے وہ سجاول کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

☆☆☆

قریباً پندرہ منٹ بعد وہ خطرناک مرحلہ شروع ہو گیا جس کا یہاں شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ میں اور انیق کمرے میں موجود تھے اور ادھ کھلے دروازے سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ پارا ہاؤس کے گارڈز ہر جگہ موجود تھے اور ہائی الرٹ تھے۔ کوریڈور میں موجود کھڑکیوں کے پیچھے ماہر شوٹرز پوزیشن لے چکے تھے۔ سجاول دیگر چار افراد کے ساتھ نیچے تہ خانے میں پہنچ چکا تھا جس بندے نے کھٹکا دبا کر

کوریڈور کے تختے کو نیچے گرانا تھا، وہ بھی اپنی جگہ پر پہنچ چکا تھا اور یہ خود حلمی تھا۔ دوسرے لفظوں میں اسٹیج پوری طرح تیار تھا۔ سب کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔

آخر وہ لمحے آن پہنچے۔ سیڑھیوں کی طرف سے قدموں کی چاپیں ابھریں۔ چند سیکنڈ بعد ہی ہمیں دونوں یرغمالی اور مسلح افراد نظر آئے۔ سرغنہ نے بڑی بے رحمی سے ابراہیم کے بال مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ اس بے چارے کی دبلی گردن ایک طرف کو مڑ کر رہ گئی تھی۔ رائفل کی نال اس کے سر سے لگی تھی۔ وہ نیک صورت نظر آتا تھا۔ دہشت کے علاوہ زخم کی بے پناہ تکلیف بھی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

شکیل داراب کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے تھے اور ایک رائفل اس کی پشت سے لگی ہوئی تھی۔ رائفل بردار کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ اس حال میں بھی شکیل کے خوبرو چہرے پر رعونت اور غصیلا پن دکھائی دیتا تھا۔

انیق نے سرگوشی کی۔ ''سچ کہتے ہیں کہ رسی جل گئی مگر بل نہ گیا۔''

شکیل اور ابراہیم کے عقب میں کم وبیش آٹھ مسلح افراد تھے۔ سب کے سب مسلح اور انتہائی چوکس۔ وہ چاروں طرف عقابی نظروں سے دیکھتے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے آرہے تھے۔ حلمی کوریڈور کے سرے پر موجود تھا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اس ''قافلے'' کو کوریڈور کی طرف موڑنا چاہا۔

یہاں تھوڑا سا مکالمہ ہوا۔ غالباً سرغنہ ناقب، حلمی سے دریافت کررہا تھا کہ وہ سامنے والے دروازے کی طرف سے کیوں نہیں نکل سکتے۔ جواب میں حلمی نے وضاحت کی۔ یہ گفتگو مالے میں تھی۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ؟'' میں نے انیق سے پوچھا۔

''کہہ رہا ہے کہ گاڑیاں اس طرف کھڑی ہیں۔ اُدھر سے گے تو چکر پڑے گا۔''

چند سیکنڈ تذبذب میں گزرے۔ شاید سرغنہ کی چھٹی حس اسے کسی خطرے سے خبردار کررہی تھی مگر پھر وہ کوریڈور کی طرف مڑنے پر راضی ہوگیا لیکن یہاں جو تبدیلی آئی، وہ ہرگز ہرگز بڑے صاحب اور حلمی وغیرہ کے حق میں نہیں تھی۔

سرغنہ یرغمالی ابراہیم کے ساتھ سب سے آگے چل پڑا۔ اس کے عقب میں چار پانچ مسلح افراد تھے۔ اس کے بعد دوسرے یرغمالی شکیل کو رکھا گیا۔ اس کے عقب میں بھی دو مسلح افراد تھے۔ بالفاظ دیگر اب ابراہیم اور شکیل میں کم و بیش دس بارہ فٹ کا فاصلہ تھا۔

''بیڑا غرق۔'' انیق کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہاں یہ تو گڑبڑ ہوگئی۔'' میں نے کہا۔

ہم سب کچھ براہ راست دیکھ رہے تھے اور جو ہونے والا تھا، وہ بھی سمجھ میں آگیا تھا۔ اگر تختے گرا کر ابراہیم کو نیچے گرایا جاتا تو شکیل داراب باہر رہ جاتا اور اسے حملہ آور بھون ڈالتے۔ ساری پلاننگ کا ستیاناس ہورہا تھا۔ میں نے حلمی کے چہرے پر انتہا درجے کی پریشانی دیکھی۔

سرغنہ اور ابراہیم مقررہ مقام تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے قالین پر اس جگہ پاؤں رکھے جہاں نیچے خطرناک تختے موجود تھے۔ پھر وہ صحیح سالم گزر کر آگے بڑھ گئے۔ تین چار سیکنڈ بعد شکیل داراب کے قدم بھی تختوں والی جگہ پر پڑے اور وہ بھی باعافیت وہاں سے گزر گیا۔

''اب کیا ہوگا؟ یہ لوگ نکل جائیں گے؟''

انیق نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

ابھی اس کا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ ہم نے کوریڈور کے اگلے دروازے کو بند ہوتے دیکھا۔ یہ اسٹیل کا بنا ہوا سلائڈنگ دروازہ تھا۔ اور آٹومیٹک طریقے سے حرکت میں آیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اسے حلمی نے ہی حرکت دی تھی۔

اپنے سامنے بند دروازہ دیکھ کر حملہ آور بری طرح ٹھٹکے۔ سرغنہ کی چنگھاڑ ابھری۔ یقیناً وہ حلمی سے پوچھ رہا تھا کہ ان کا راستہ کیوں مسدود کیا گیا ہے۔

حلمی نے بلند آواز میں کچھ کہا۔ انیق نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''حلمی کہہ رہا ہے میکانکی خرابی سے بند ہوا ہے......''

اگلے پانچ چھ سیکنڈ کے اندر ٹینشن عروج پر پہنچ گئی۔ اے کے 47 رائفل کی خوفناک آواز سے درودیوار دہل گئے۔ سرغنہ ناقب نے یہ ہوائی فائرنگ کی تھی۔ راہداری کی چھت سے پلاسٹر کے پرخچے اڑ کر ہر طرف بکھر گئے۔

''دروازہ توڑو۔'' حملہ آوروں میں سے کسی مقامی شخص نے چلا کر کہا۔

اسٹیل کے دروازے پر دو برسٹ چلائے گئے۔ ہر طرف چنگاریاں بکھر گئیں اور دھماکوں نے یاراہاؤس کو لرزا دیا، بالائی منزل سے خواتین کے چلانے کی دہشت زدہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسٹیل کے مضبوط دروازے کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔

سرغنہ ناقب سمجھ گیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی چال چلی

گئی ہے۔ پا جلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ دہاڑ رہا تھا اور خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس نے حلمی پر بھی دو فائر کیے لیکن خوش قسمتی سے گولی حلمی کو لگی نہیں۔ اسی دوران میں ثاقب کے ایک ساتھی نے ایک قریبی کمرے کا دروازہ توڑ دیا۔ اور اس کے ساتھی، دونوں یرغمالیوں کو کھینچتے ہوئے اندر لے گئے۔ ان لوگوں نے ایک بار پھر خود کو کمرے میں محصور کرلیا تھا۔

یہ خطرناک صورت حال تھی۔ پارا ہاؤس والوں نے ایک چال چلی تھی اور یہ ناکام ہوئی بلکہ یہ دوسری چال تھی جس کا نتیجہ مثبت نہیں نکل سکا تھا۔ اب حملہ آوروں کا غیظ و غضب کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ جن لوگوں کو تہ خانے میں بھیجا گیا تھا، وہ بھی اب اوپر آگئے تھے۔ ان میں سجاول بھی شامل تھا۔ وہ ہمارے پاس چلا آیا اور سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے اسے بتایا۔ ”پلاننگ فیل ہوگئی ہے۔ وہ لوگ ہوشیار نکلے ہیں۔ دو حصوں میں کوریڈور میں گئے تھے۔ ابراہیم اور شکیل کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ حلمی وغیرہ کچھ نہیں کرسکے۔“

اب نشست گاہ کی جانب سے حلمی اور انچارج گارڈ قادر خان کے جھگڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے پر ناکامی کا الزام لگا رہے تھے۔ حلمی کڑک کر بولا۔ ”اب دفع ہو جاؤ باہر...... جب ضرورت پڑے گی تمہیں بلا لوں گا۔“ قادر خان بیزار لہجے میں بولا۔ ”آپ کہتے ہیں تو میں ویسے ہی دفع ہو جاتا ہوں۔ سب کچھ میری ہی وجہ سے ہو رہا ہے نا۔“

”تو ہو جاؤ دفع۔ دور کرو اپنی شکل۔ تم ذمے دار ہو اس ساری مصیبت کے۔“ حلمی گرجا۔

آقا جان نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی اور قادر خان کو سمجھا بجھا کر باہر لے گیا۔ کوریڈور کے اندر سے کسی لڑکی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں بلکہ یہ ایک سے زیادہ لڑکیاں یا عورتیں تھیں، حملہ آور جس کمرے کا دروازہ توڑ کر اندر گھسے تھے یقیناً یہ خواتین وہیں پر موجود تھیں اور حملہ آوروں کے ہتھے چڑھ گئی تھیں۔

”کہیں سنبل وغیرہ کی شامت تو نہیں آگئی؟“ انیق نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”نہیں وہ اس حصے میں نہیں ہے۔“ سجاول نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”یہ یہاں کی ملازمائیں ہو سکتی ہیں۔“

حلمی اپنے زخمی کندھے کو دبائے لپکتا ہوا بڑی اسکرین کے پاس آیا اور ایک کیمرے کا منظر ابھارا۔ کیمرے کا یہ وہی کمرا تھا جہاں حملہ آور بھرا مار کر گھسے تھے۔ سجاول کا اندازہ درست تھا۔ یہ ملازمہ لڑکیوں کا ہی کمرا تھا جو اسکرین پر نظر آرہی تھیں۔ وہ چار لڑکیاں تھیں۔ یہ سب ملازماؤں والی یونیفارم میں تھیں...... اور قبول صورت تھیں۔ لیکن اس وقت بری حالت میں تھیں۔ ان میں سے دو نے شاید بھاگنے کی کوشش کی تھی یا حملہ آوروں سے مزاحمت کی تھی۔ انہوں نے ان دونوں کے کپڑے پھاڑ کر انہیں نیم عریاں کر ڈالا تھا۔ ان کے گال طمانچوں سے سرخ نظر آرہے تھے۔ باقی دو لڑکیاں بھی سہم کر فرش پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سر پر رائفل بردار کھڑے تھے۔ ابراہیم اور شکیل بدستور گن پوائنٹ پر تھے۔

سرغنہ ثاقب نے ایک نیم برہنہ لڑکی کے بال بیدردی سے مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے اور اپنی ”اے کے 47“ اس کی گردن میں گھسیڑ رکھی تھی۔ اس نے کیمرے کی طرف رخ کر کے اور دہاڑ دہاڑ کر کچھ کہا۔ جواب میں حلمی نے بھی مائیک آن کیا اور سرغنہ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ سنگین گفتگو مالے میں ہو رہی تھی۔

انیق نے بتایا۔ ”یہ لوگ بہت بھڑک گئے ہیں۔ ثاقب نے صرف پندرہ منٹ کا الٹی میٹم دیا ہے۔ حلمی سے کہہ رہا ہے کہ اگر انہیں باہر نکلنے کا راستہ نہ دیا گیا تو وہ پندرہ منٹ بعد اس لڑکی کو گولی مار دے گا۔“

”حلمی کیا کہہ رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دروازے کی خرابی کا بہانہ کر رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ میں گاڑیاں دوسری طرف سے منگواتا ہوں۔ لیکن یہ صرف کہنے کی بات ہے۔ اس نے ایسا کرنا ہرگز نہیں۔“

سجاول بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ اگر ایک بار ابراہیم پارا ہاؤس سے نکل گیا تو پھر سب کچھ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

گڑبڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ پورے پارا ہاؤس میں ایک سراسیمگی کی کیفیت تھی۔

یکایک بالائی منزل سے رونے چلانے کی بلند آوازیں ابھریں۔ ایسا لگا کہ تہلکہ سا مچ گیا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کے چہرے دیکھنے شروع کردیے۔ جلد ہی پتا چلا کہ پارا ہاؤس کے مالکان میں سے کسی معزز خاتون کو غشی کا دورہ پڑا ہے۔ تھوڑی دیر بعد تصدیق ہوگئی کہ وہ ابراہیم کی والدہ بڑی بیگم ہی ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ پارا ہاؤس

کے اندر بھی جدید طبی سہولتیں موجود ہیں۔ تاہم یہ سہولتیں صرف خاص لوگوں کے لیے تھیں۔ بڑی بیگم سے بڑھ کر خاص اور کون ہو سکتا تھا۔ یہ اطلاع ملی کہ انہیں پاراہاؤس کے نجی اسپتال میں پہنچایا گیا ہے۔ چند لمحے کے لیے ہمیں ایک اسکرین پر "بڑے صاحب عزت مآب ریان فردوس" کی صورت بھی نظر آئی۔ وہ دو ڈاکٹروں کو ڈانٹ پلا رہا تھا اور انہیں ضروری ہدایات بھی دے رہا تھا۔ بڑے صاحب کے بال منتشر تھے اور انگلیوں میں سگار لرز رہا تھا۔

آج کی رات اگر نارمل رہتی تو ممکن تھا کہ بڑے صاحب کے لیے بڑی نشاط انگیز ثابت ہوتی۔ اس نے نوخیز سنبل کو پسند کیا تھا اور اپنے پاس بلایا تھا۔ کیا پتا کہ وہ آج کی رات اس کے ساتھ گزارنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اگر ایسا ارادہ نہ بھی ہوتا تو بھی وہ اس کے ساتھ دل لگی کی باتیں کر سکتا تھا اور اپنی اس زمینی جنت میں اس کے ساتھ کچھ اچھا وقت گزار سکتا تھا۔ لیکن یہاں سب کچھ الٹ ہوا تھا۔ بڑے صاحب کو ایک بدترین مصیبت نے آن گھیرا تھا۔ پچھلے چند گھنٹوں کے اندر پاراہاؤس میں کم و بیش پندرہ افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، جن میں ایک سابق پولیس آفیسر بھی تھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اب ناقب کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے میں فقط پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ حلمی، ناقب کو قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ کسی کی جان لینے میں جلد بازی نہ کرے۔ اس نے ناقب سے کہا۔ "بڑی بیگم کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ ان کی جان خطرے میں ہے۔ بڑے صاحب ان کے ساتھ نجی اسپتال میں ہیں۔ میں جب تک ان سے مشورہ نہ کرلوں، کچھ نہیں کر سکتا۔"

جواب میں ناقب گرجا۔ "میری طرف سے تمہاری بڑی بیگم مرتی ہے تو مر جائے...... اس کا پورا خاندان مر جائے۔ لیکن میں نے اب جو کہہ دیا ہے، وہی ہوگا۔ میں اس لڑکی کو اڑا ڈالوں گا۔ صرف تین منٹ باقی ہیں۔"

حلمی بولا۔ "تم صرف پندرہ منٹ اور دو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ......"

"پندرہ سیکنڈ بھی نہیں۔" ناقب دہاڑا۔ اور اس نے لڑکی کے بالوں کو اپنے ہاتھ کے گرد بل دے کر اس طرح مروڑا کہ اس کی گردن ٹوٹنے والی ہوگئی، وہ اپنی نیم برہنگی فراموش کر چکی تھی اور صرف جان بچانے کے لیے دُہائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ دہشت کی تصویر تھی۔

پندرہ منٹ پورے ہوتے ہی ناقب نے بے گناہ لڑکی کے عین ماتھے پر فائر مارا اور اس کی کمر پر لات رسید کر کے اسے کمرے سے باہر پھینک دیا۔ یہ ایک دلدوز منظر تھا۔ میں نے دیکھا حلمی بڑی اسکرین کے سامنے سر پکڑ کر بیٹھا ہوا ہے۔

میں نے کہا۔ "سجاول! پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ میں ان حرام زادوں کا غرور توڑ سکتا ہوں۔"

"کس طرح؟" سجاول نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"وہ غدار گارڈ کہاں ہے جو زندہ پکڑا گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نیچے پاراہاؤس کے اسپتال میں۔"

"ابھی ہوش میں آیا ہے یا نہیں؟"

"ٹھیک سے پتا نہیں۔"

"تم ایسا کرو سجاول، حلمی سے کہو کہ تم اس زخمی گارڈ کو دیکھنا چاہتے ہو۔"

"لیکن کیوں؟"

"جیسا کہہ رہا ہوں، ویسا کرو نا۔"

"لیکن یہ بات تم خود بھی تو حلمی سے کہہ سکتے ہو۔"

"یار! یہاں تمہارا ڈنکا بج رہا ہے۔ تم جو کچھ کہو گے، اس کا اثر ہوگا۔"

سجاول نے باہر جا کر حلمی سے بات کی۔ حلمی نے دو گارڈز کو سجاول کے ساتھ کیا اور اسپتال کی طرف روانہ کیا۔ سجاول نے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ نشست گاہ کے ساتھ والے کمرے میں جدید لفٹ موجود تھی۔ ہم اس کے ذریعے چند سیکنڈ کے اندر پاراہاؤس کے اس پورشن میں پہنچ گئے جسے ایک چھوٹے سے جدید اسپتال کی شکل دی گئی تھی۔ اس وقت بڑی بیگم بھی اسی کلینک نما اسپتال کے کسی اندرونی حصے میں طبی امداد کے لیے موجود تھیں۔

میں اور سجاول اس کمرے میں پہنچے جہاں زندہ پکڑے جانے والے حملہ آور گارڈ کو رکھا گیا تھا۔ ہمیں یہاں بھی کچھ اضافی سراسیمگی نظر آئی۔ دروازے کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ کرچیاں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر خون کے تازہ چھینٹے بھی دکھائی دیے۔ دو نرسیں اور ایک ڈاکٹر پریشان حال کھڑے تھے۔ بیڈ خالی تھا۔ "مریض کہاں گیا؟" ہمارے ساتھ آنے والے ایک گارڈ نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"وہ اب نہیں رہا۔" ڈاکٹر نے بے دلی سے جواب دیا۔

"کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ ایم ایس سے بات کریں۔" ڈاکٹر نے

خشک لہجے میں کہا اور اندر چلا گیا۔

ہم ایم ایس کے پاس پہنچے۔ یہاں ایک بغلی کمرے میں کسی مشتعل شخص کو بند کیا گیا تھا۔ وہ دروازے پر دوہتڑ چلا رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا۔ مار دو...... مجھے بھی مار دو۔ ختم کر دو مجھے بھی۔“

”یہ کون ہے؟“ سجاول نے ایم ایس سے پوچھا۔

چند گھنٹوں میں ہی سجاول یہاں کی جانی پہچانی شخصیت بن گیا تھا اور کیوں نہ بنتا اس نے تن تنہا بڑی بیگم کو یرغمال بننے سے بچایا تھا۔ ایم ایس نے ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا اور بولا۔ ”اس بندے نے زخمی گارڈ پر حملہ کیا ہے، جس کی وجہ سے اس کی جان چلی گئی ہے۔ اس کی حالت پہلے ہی اچھی نہیں تھی۔ سینے میں چاقو لگنے سے وہ فوراً ختم ہو گیا۔“

یہ سب حیران کن تھا۔

ایم ایس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بندہ جو اندر بند ہے اس کا نام صغیر ہے۔ یہ یہاں لیموزین ڈرائیو کرتا ہے۔ اس کا بھائی بھی بطور ڈرائیور یہاں بھرتی ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے جب یہاں حملہ ہوا تو جن تین چار لوگوں کو سب سے پہلے گولی لگی ان میں صغیر کا بھائی صادق بھی شامل تھا۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ صغیر اس کے غم میں دیوانہ ہو گیا ہے۔ پہلے اس نے احاطے میں رکھی ہوئی حملہ آوروں کی لاشوں کو آگ لگانے کی کوشش کی پھر پتا نہیں کس طرح اس طرف نکل آیا۔ آتے ہی زخمی گارڈ آصف پر پل پڑا۔ بہت مشکلوں سے پکڑا گیا ہے۔ ایک نرس کو بھی زخمی کیا ہے اس نے۔“

اسی دوران میں مشتعل صغیر نے کمرے کی کھڑکی کا ایک شیشہ توڑ دیا اور ٹوٹے شیشے میں سے منہ نکال کر چلانے لگا۔ ”یہ غدار ہیں۔ ان سب کی لاشوں کو آگ لگا دو۔ ان کی وجہ سے میرا بھائی مرا۔ ان کی وجہ سے وڈے صاحب پر مصیبت آئی۔ ان کو چن چن کر مار دینا چاہیے۔“

وہ پوری آواز سے بول رہا تھا اور اس کا چہرہ دہک رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ بہت سے قاتلوں کے بہت سے جنونیوں کے چہرے دیکھے تھے میں نے۔ مجھے اب کسی حد تک ایسے چہروں کو پڑھنا آ گیا تھا۔ ایک دم میرے دل نے گواہی دی کہ اس شخص کا واویلا حقیقی نہیں ہے، اور جو جنونی جذبات وہ شو کر رہا ہے، وہ بھی بڑی حد تک بناوٹی ہیں۔ یکایک مجھے لگا کہ اس شخص نے زخمی آصف کو مقصد کے تحت مارا ہے۔ شاید اس لیے کہ حملہ آوروں کے خلاف یہ اکلوتی شہادت ناپید ہو جائے۔ کوئی اس سے سوال جواب کر کے معلوم ہی نہ کر سکے کہ حملہ آور کس طرح پارا

ہاؤس کی زبردست سکیورٹی کو ناکام بنانے میں کامیاب ہوئے اور اس خطرناک سازش میں کون کون شریک تھا۔

میں سجاول کو ایک طرف لے گیا۔ میں نے کہا۔ ''سجاول! ایک کام کرو اور تم کر سکتے ہو۔ مجھے یہ بندہ چاہیے۔''

''اس کمرے والے کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں...... تم اپنی طرف سے یہ بات کرو۔ حلمی سے کہو یا وڈے صاحب سے یا جس سے بھی۔''

''وہ...... کیسے مانیں گے؟''

''سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ لوگ تم کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں...... تم ان کو گارنٹی دو کہ تم ان کو کوئی بریک تھرو دو گے...... کوئی کھوج لگا کر دو گے۔''

جیسا کہ میں نے بتایا ہے سجاول زبردست مردم شناس اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے دھیان سے میرے تاثرات دیکھے، پھر بولا۔ ''اگر کوئی رزلٹ نہ نکل سکا تو پھر...... خواہ مخواہ کی نکاتی ہوگی۔''

''نہیں ہوگی نکاتی...... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ تم بس بات کرو حلمی سے میرا ذکر بے شک نہ کرو۔ اپنی طرف سے بات کرو۔''

سردار سجاول مجھے وہیں چھوڑ کر لفٹ کی طرف گیا اور حلمی کے پاس پہنچ گیا۔

...... قریباً دس منٹ بعد میں اور سجاول اس بپھرے ہوئے سانڈ صغیر کے ساتھ ایک بند کمرے میں موجود تھے۔ خوش قسمتی سے یہ کمرا ساؤنڈ پروف بھی تھا۔

وہ اب بھی منہ سے جھاگ اڑا رہا تھا۔ وہ سجاول کو سر کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا۔ ''آپ نے دیکھ لیا ناں، ان نمک حراموں نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ برباد کر دیا ہمیں۔ میرا باپ جیسا بھائی مر گیا۔ ہمارے چھوٹے صاحب کو جان کے لالے پڑ گئے۔ ایک بہادر پولیس افسر کی جان گئی...... اور...... ابھی پتا نہیں کیا کچھ ہونا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے صغیر صاحب کہ کیا ہونا ہے۔ ابھی آپ کے گال شریف پر ایک زناٹے کا تھپڑ پڑنا ہے اور آپ کے چودہ طبق روشن ہو جانے ہیں۔''

وہ بے حد حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا اور پھر واقعی وہی ہوا جو میں نے کہا تھا۔ میرے تھپڑ نے اس کا گال اندر سے پھاڑ کر رکھ دیا اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔ ایک لمحہ سکتہ زدہ رہنے کے بعد اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہوا اور وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔ اس نے میری گردن پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ ایسا کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ میں تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس کے پہلو میں لات رسید کی۔ وہ فٹ بال کی طرح دیوار سے ٹکرایا اور اوندھے منہ فرش پر گرا۔ میں نے اسے وہیں دبوچ لیا۔

وہ غلیظ گالیاں بکنے لگا۔ میں نے اس کا بازو مروڑا اور کہنی پر سے توڑ ڈالا۔ بازو توڑنے کی وجہ اس کی ''گالیاں'' نہیں تھیں، دراصل مجھے پتا تھا کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر میں روایتی طریقوں سے اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرتا تو شاید گھنٹے لگ جاتے۔

وہ ایسے بھیانک انداز میں چلایا کہ محسوس ہوا اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دے گا۔ اس کا پورا جسم پھڑک رہا تھا۔ یقیناً اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ ایکا ایکی اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو خود کو نیم دیوانہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کا بھائی مر گیا تھا اور یہاں اس سے بڑھ کر دیوانے اسے ٹکر گئے تھے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے بازو کی ہڈی گوشت چیر کر اپنی جھلک دکھانے لگی تھی۔

میں نے کہا۔ صغیر صاحب! سب کچھ سچ سچ بتا دو گے تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہاں پر جدید علاج موجود ہے۔ ابھی دو گھنٹے میں تمہاری بہترین سرجری ہو جائے گی۔ پلیٹیں وغیرہ لگ جائیں گی۔ دو ماہ بعد تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ کبھی تمہارا بازو گڑ بڑ ہوا تھا لیکن اگر تم نے یہ ڈرامے بازی جاری رکھی تو میں ابھی دو چار منٹ کے اندر تمہارا دوسرا بازو توڑوں گا اور اس کے بعد تمہارے دوسرے ''حصوں'' کی باری آئے گی۔''

صغیر کے سر پر جیسے قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ میرے نیچے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ''کون ہو تم؟ میرا بھائی مر گیا ہے...... مجھے بھی مار ڈالو، مجھے بھی مار ڈالو۔'' وہ پھر جنونی انداز میں چلایا۔

''بالکل ایسا ہی کریں گے۔ ممکن ہے تم دونوں برادران کی نماز جنازہ ایک ساتھ ادا ہو۔'' میں نے کہا اور اس کے دوسرے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

وہ دہائی دینے لگا اور نفی میں سر ہلانے لگا۔

''آصف تمہارا ساتھی تھا نا...... ابھی اس کو چاقو کیوں مارے تم نے؟''

اس کے ساتھ ہی میں نے اس کا بازو مروڑا۔ تکلیف کی شدت سے اس نے قے کر دی۔ اس کی مزاحمت دم توڑ رہی تھی۔

...... ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ہم صغیر کو جیپ پر لے کر

برق رفتاری سے ایک قریبی دیہہ کی طرف جارہے تھے۔
صغیر کا بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ طاقتور پین کلر انجکشن نے اسے قدرے سہارا دے رکھا تھا۔ پھر بھی جیپ پر لگنے والے ہچکولوں سے وہ کراہ اٹھتا تھا۔ میرے اور سجاول کے علاوہ انچارج قادر خان اور اس کے دو ماتحت بھی جیپ پر سوار تھے۔ یہ صورتِ حال اتنی اہم تھی کہ حلمی خود ہمارے ساتھ آنا چاہتا تھا مگر پارا ہاؤس کے نہایت سنگین حالات کے سبب اسے وہاں رکنا پڑا تھا۔ اس نے قادر خان کو ہمارے ساتھ روانہ کیا تھا۔

اب رات کے تین بج چکے تھے۔ اس دوران میں پارا ہاؤس کے اندر بپھرے ہوئے ناقب نے ایک اور خادمہ لڑکی کو بے دردی سے گولی مار کر باہر پھینک دیا تھا۔ وہ ابھی زندہ تھی مگر حالت شدید خطرے میں تھی۔ اچانک صغیر کے سیل فون کا میوزک بجنے لگا۔ اس کا ایک بازو تو میں نے توڑ ڈالا تھا مگر دوسرے کو بھی ایسا شدید مروڑ دیا تھا کہ چھوٹا موٹا فریکچر ہو چکا تھا۔ اس کے لیے کہنی کو حرکت دینا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی مدد کرتے ہوئے اس کی جیب میں سے اس کا فون نکالا اور اسپیکر آن کر کے اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ساری بات میں نے اس کو پہلے ہی سمجھا دی تھی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”ہیلو صغیر بھائی، کہاں ہو تم؟“ (یہ صغیر کے غدار ساتھیوں میں سے کوئی تھا)

”میں بس پہنچ گیا ہوں۔ تم لوگ کب تک آ رہے ہو؟“

”لگتا ہے ابھی تو تھوڑا ٹائم لگے گا۔ وڈا صاحب بڑا ڈھیٹ بنا ہوا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لاڈلے پتر کا معاملہ ہے۔ کنجر کو پتا ہے کہ ایک بار ہم لوگ اسے پارا ہاؤس سے لے کر نکل گئے تو پھر اس کے ہاتھ میں چھنکنا بھی نہیں آئے گا۔“

پس منظر میں لڑکیوں کے رونے چلّانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اور گاہے بگاہے سرغنہ ناقب کی کڑک دار آواز بھی گونجتی تھی۔ صغیر کو یہ فون پارا ہاؤس سے ہی آیا تھا۔ اس کے کسی ساتھی بشیرے نے کیا تھا۔ یہ بشیرا ان لوگوں میں شامل تھا جنھوں نے ناقب وغیرہ کے ساتھ مل کر ابراہیم اور شکیل داراب کو یرغمال بنایا ہوا تھا۔

آخر میں بشیر عرف بشیرا بولا۔ ”بس تم تیار رہو صغیر بھائی، ہم جب یہاں سے نکلنے لگیں گے میں تمہیں فون کروں گا۔“

”ٹھیک ہے، میرا فون آن ہے۔“

بشیرے نے ذرا ٹھٹک کر کہا۔ ”کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو، کوئی چوٹ شوٹ لگی ہے تمہیں؟“

”نن...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ذرا طبیعت بوجھل ہے۔ کچھ بھی ہے آخر تھا تو بھائی......“

صغیر اپنے مرنے والے بھائی کا ذکر کر کے اپنی چوٹوں کی ”ہائے ہائے“ چھپا رہا تھا۔

فون پر بات ختم ہوئی تو صغیر شدت سے کراہنے لگا۔

جیپ اب پکی سڑک سے اتر کر اینٹوں کے سولنگ والی سڑک پر آگئی تھی۔ تارکول کی سڑک اور اینٹوں والے راستے میں بہت فرق ہوتا ہے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اب ساڑھے تین بج چکے تھے۔ رات سرد تھی۔ راستے کی دونوں جانب کیکر اور ٹاہلی کے درخت تھے۔ کھیتوں میں کہیں کہیں کوئی روشنی کا جگنو چمک رہا تھا۔ زیادہ تر ریتیلے ٹیلے تھے اور خودرو جھاڑیاں تھیں۔ صغیر کا سارا کچا چٹھا اب کھل چکا تھا۔ اسی خبیث نے پارا ہاؤس کے پندرہ بیس گارڈز کو اس خطرناک نمک حرامی پر تیار کیا تھا۔ یہ سب کے سب اس کے گاؤں برادری کے لوگ ہی تھے۔ ان سب کو بھاری رقمیں ایڈوانس میں دی گئی تھیں اور ”کام“ ہو جانے کے بعد بیش بہا انعامات کا وعدہ کیا گیا تھا۔ صغیر کا مرحوم بھائی جو خود بھی پارا ہاؤس کا ڈرائیور تھا اس سازش میں شریک نہیں تھا۔ وہ اس حملے کے شروع میں ہی سینے پر دو گولیاں لگنے سے جاں بحق ہو چکا تھا۔

پوچھ گچھ کے دوران میں صغیر قبول کر چکا تھا کہ اس نے پارا ہاؤس میں کارروائی کے لیے ناقب صاحب اور اس کے ساتھیوں کو ہر طرح کی سہولت فراہم کی ہے۔ پچھلے چھ دن سے ناقب اور اس کے ساتھی صغیر کے گھر میں ہی موجود تھے اور وہیں پر اس کارروائی کی ساری پلاننگ ہوتی رہی تھی۔ وہیں پر برادری کے گارڈز کو صغیر نے اپنے ساتھ ملایا تھا، وہیں پر ناقب اور اس کے دو ساتھیوں کے لیے سیکیورٹی ایجنسی کی وردیوں کا انتظام ہوا اور دیگر تیاری ہوئی تھی۔ پارا ہاؤس کے اس ساؤنڈ پروف کمرے میں بیٹھے کتے صغیر نے میرے اور سجاول کے سامنے ایک ایک بات اگل دی تھی۔ اس میں یہ اعتراف بھی شامل تھا کہ اس کی بیوی بھی اس سازش میں شریک تھی اور یہ سب کچھ اس کے لالچ کی وجہ سے ہوا ہے۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہم اس روجھا نامی دیہہ کے قریب پہنچ گئے...... صغیر کا گھر دیہہ سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس کی تھوڑی سی زمین بھی تھی اور وہیں پر اس نے گھر بنایا ہوا تھا۔ اس کے مرحوم ہو جانے والے بھائی کا گھر بھی یہیں پر تھا۔ ہم نے جیپ کی لائٹس بجھا دیں اور اسے کچھ فاصلے پر ہی روک دیا۔ پہلے میں خود جا کر ماحول کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میں نے حلمی کی دی ہوئی رائفل اپنی گرم چادر میں چھپالی اور احتیاط

سے آگے بڑھا۔ گو صغیر صرف ایک ڈرائیور تھا لیکن اس نے اچھا خاصا گھر بنا رکھا تھا۔ اس کے مقابلے میں مرحوم بھائی کا گھر چھوٹا اور خستہ حال تھا۔ دونوں گھروں کو دیکھ کر ہی دونوں بھائیوں کے کردار اور مزاج پر روشنی پڑ جاتی تھی۔

چند قدم آگے جا کر مجھے رکنا پڑا۔ یہاں رکھوالی کے لیے ایک کتا موجود تھا جو شور مچانے لگا تھا۔ یہ صورتِ حال پریشانی پیدا کر سکتی تھی۔ میں واپس جیپ میں آیا اور صغیر کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ اس نے گرم چادر کی بُکل مار لی تھی۔ یوں اس کا زخمی بازو بھی چھپ گیا۔ اس مرتبہ ہم بہ آسانی گھر کے دروازے تک پہنچ گئے۔ مجھے حیرانی ہوئی رات کے اس پہر بھی اندر سے میوزک کی آواز ابھر رہی تھی۔ کیسٹ پلیئر آن تھا...... عیسیٰ خیلوی نغمہ سرا تھا۔ دل لگایا تھا دل لگی کے لیے۔ صغیر کی طرف سے میں نے دروازے پر مدھم دستک دی۔ میوزک تھم گیا۔ پھر کسی نے دروازے پر آ کر سریلی آواز میں پوچھا۔ ''کون؟''

''میں ہوں۔'' صغیر مری مری آواز میں بولا۔

مجھے لگا کہ دروازہ کھولنے سے پہلے گھر والی نے کسی درز وغیرہ سے ہم دونوں کو دیکھا ہے۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ سامنے ایک جواں سال عورت کھڑی تھی۔ اس نے سر پر اوڑھنی لے رکھی تھی اور اوڑھنی کو مضبوطی سے ٹھوڑی کے نیچے تھاما ہوا تھا۔ یہ چادر نما اوڑھنی اس کے ٹخنوں تک پہنچ رہی تھی۔ عورت کی عمر تیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ رنگ گورا چٹا اور آنکھوں میں چالاکی تھی۔ یہی صغیر کی بیوی تھی۔

''خیر تو ہے صغیرے؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''ہاں ہاں...... خیر ہے۔'' صغیر نے میرے ساتھ اندر کی طرف قدم بڑھائے۔

عورت ہمارے پیچھے پیچھے آئی۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ صغیر نے کہا۔ ''یہ...... اپنا دوست ہے۔ پارا ہاؤس سے آیا ہے۔''

''وہاں سب ٹھیک ہے نا؟'' عورت نے آنکھیں پٹ پٹا کر پوچھا۔

صغیر نے اثبات میں جواب دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ یہاں پر سرغنہ ثاقب کا کم از کم ایک ساتھی موجود تھا۔ وہ اس گھر کے عقبی پورشن میں تھا۔ اس سے فوری ملاقات ضروری تھی۔ لیکن اس سے پہلے اس عورت کا بندوبست ضروری تھا۔ میں نے صغیر کو اشارہ کیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور ایک کونے میں جا کر عورت کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگا۔ اس نے وہ سب کچھ بتایا جو پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اس کے ساتھ پیش آ چکا تھا...... اور وہ سب کچھ بھی جو ''نافرمانی'' کی صورت میں آئندہ پیش آ سکتا تھا۔ عورت کا رنگ بالکل ہلدی ہو گیا۔ وہ دہشت زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی شال نما اوڑھنی کھینچی اور میرا یہ اندازہ درست نکلا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ایک نہایت ہی مختصر چولی والی سرخ ساڑی میں تھی۔ اس نے بہت سا طلائی زیور پہن رکھا تھا جس میں جھمکے، جڑاؤ ہار، گلوبند، ملائیشین طرز کے کنگن، انگوٹھیاں اور مزید بہت کچھ تھا۔

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ یہ ساری حلال کی کمائی تمہارے خاوند کو پچھلے چار پانچ دن میں ہی نصیب ہوئی ہے؟''

''جی...... وہ...... میں تو......''

''ہاں تم تو بس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ذرا دل کو خوش کر رہی تھیں۔ پھر یہ ساری چیزیں تم نے اتار کر کسی گندے نالے میں پھینک دینی تھیں۔ ایسا زیور تو اگلے جہان میں آگ میں تپا کر عورت کی چمڑی پر لگایا جائے گا نا......''

''ہاں جی...... نہیں جی......'' وہ اپنے خشک گلابی ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

اس کا رنگ برنگا سیل فون سامنے بستر پر پڑا تھا۔ وہ میں نے اپنے قبضے میں لے لیا اور اسے اس کے لمبے بالوں سے پکڑ کر کمرے کے اسٹور روم میں بند کر دیا۔ وہ اتنا ڈر گئی تھی کہ گم صم ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے زخمی صغیر کو گردن سے دبوچتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بھئی، کہاں ہے تمہارا وہ مہمان؟'' میں نے یہ جملہ سرگوشی کے لہجے میں بولا تھا۔

صغیر نے مکان کے پچھلے صحن کی طرف نشاندہی کی۔ میں نے چادر کے نیچے ہی نیچے رائفل کا رخ صغیر کی طرف کر لیا اور اس سے کہا کہ وہ آگے آگے چلے۔

یکا یک مجھے محسوس ہوا کہ ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم جس کی طرف جا رہے تھے، وہ شاید ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود تھا اور ہمیں دیکھ رہا تھا۔ یہ بڑا پُرخطر احساس تھا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

چال پہ چال

عکسِ فاطمہ

چوری اور سینہ زوری کا محاورہ کتنا ہی پرانا ہو جائے مگر ہر دفعہ اپنی افادیت کو ثابت کر دیتا ہے... چوری کی واردات اور سینہ زوری کی قرارداد پر پوری اترتی ایک پُرمزاح کہانی... اپنے معمولاتِ زندگی نبھاتے ہوئے اس نے محفوظ طریقوں پر غور کرنا شروع کر دیا تھا... اپنی سرگرمیوں مین کامیاب ہو جانے والے شخص کادلچسپ قصہ...

ٹوٹی کہاں کمند دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا..... تبسم ریز کہانی کے پیچ و خم
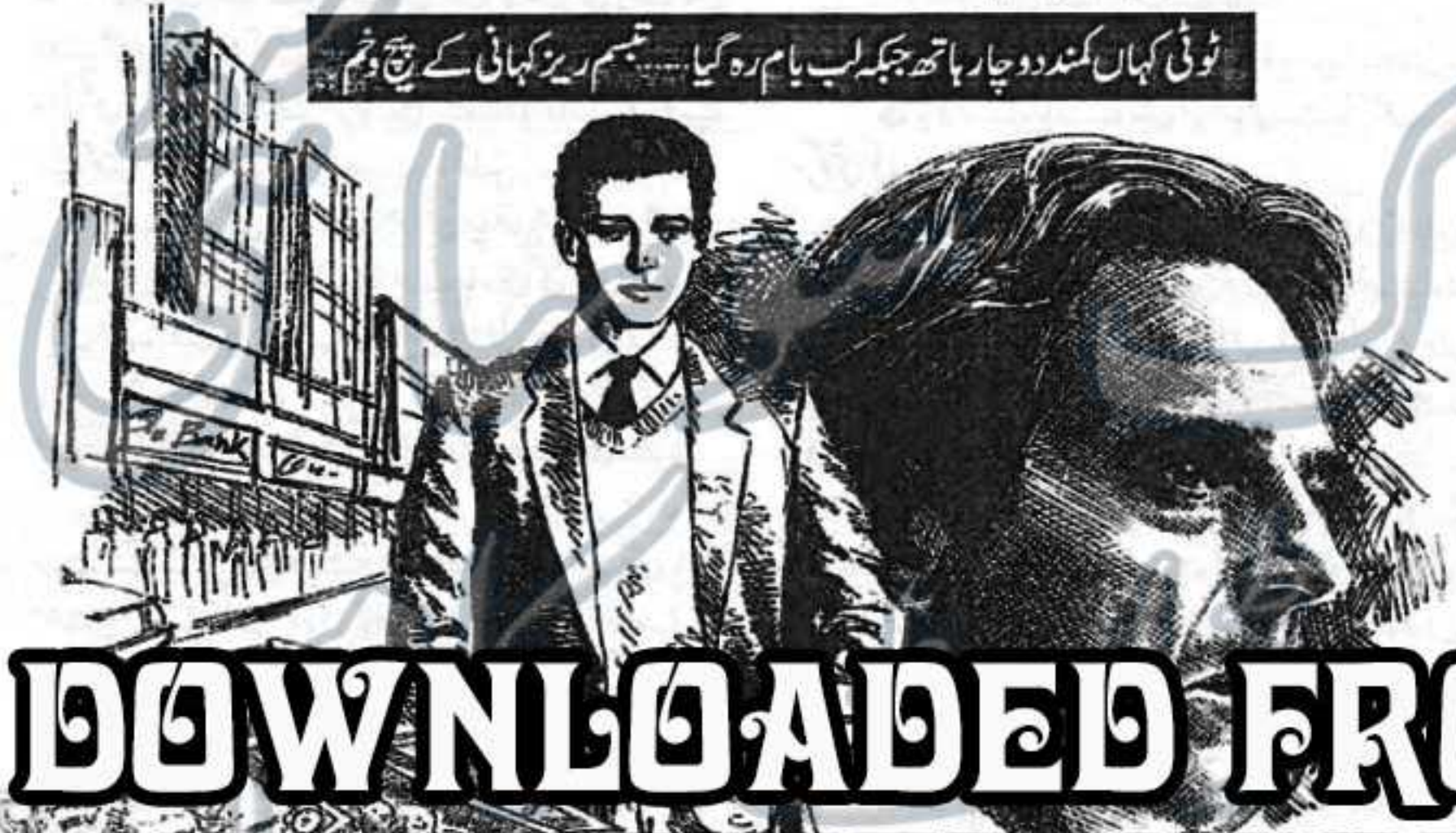
پوری رات ادھیڑبن میں گزری۔ دیر تک جاگنے کے باعث صبح سات بجے اٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ نہ جاتا تو کوئی پہاڑ نہیں ٹوٹ پڑتا لیکن دو وجوہات کی بنا پر جانا ضروری تھا۔ ایک تو میرے کنٹریکٹ کے مطابق چھٹی کی اجازت نہیں تھی۔ دوسرا یہ کہ مجھے مس کٹی سے ذرا الفت بھری باتیں کر کے اس کا حوصلہ بڑھانا تھا۔ رات بھر اپنے منصوبے پر غور کرتا رہا تھا۔ مس کٹی میرے منصوبے کا ایک ضروری حصہ تھی۔ یوں سمجھو کہ وقت پڑنے پر گدھی کو پری

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

چہرہ مجبوبہ مان لینے والی بات تھی۔

اگر کل رات میں ریستوران نہ جاتا تو شاید مس کٹی کے بارے میں سوچتا بھی نہیں لیکن قدرت کے اتفاقات ہماری عقل سے ماورا ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا اتفاق ایسی کہانی بُنتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

مسٹر جارج اگر ڈنر کے لیے میرے پسندیدہ ریستوران نہ آتے یا میں ڈنر کے لیے کسی اور جگہ چلا جاتا یا پھر یہ کہ میں وہاں گھنٹا بھر دیر سے پہنچتا یا پھر مسٹر جارج گھنٹا بھر بعد آتے تو شاید کل رات میں دیر سے نہ سوتا، نہ ہی مس کٹی کا خیال دل میں لیے کچی نیند سے زبردستی بیدار ہوتا۔

خیر جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ مسٹر جارج مجھ سے کچھ پہلے ہی ریستوران پہنچ گئے تھے اور اتفاق کہیں کہ میں بھی لیٹ نہیں ہوا۔ شاید یہ ایسا اتفاق تھا جس پر مس کٹی بہت خوش ہونے والی تھی۔ یہ اور بات کہ مسٹر جارج سے ٹکراؤ کو اب میں اپنے لیے خوش نصیب اتفاق قرار دے رہا تھا۔

جب سے میں نے بینک جوائن کیا تھا، تب سے ہی ہیڈ کیشیر مس کٹی مجھ پر ڈورے ڈالے جا رہی تھی لیکن میں نے کسی ایک موقع پر بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی مگر وہ بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اب میرے التفات کو وہ اپنی جہد مسلسل کا صلہ سمجھنے والی ہے۔

میں بینک میں داخل ہوا تو آٹھ بج کر پچیس منٹ ہو رہے تھے۔ دفتری اوقات شروع ہونے میں اب بھی پانچ منٹ باقی تھے لیکن ہماری چھوٹی سی برانچ کا مختصر عملہ اپنی اپنی جگہوں پر تھا۔ میں لابی سے نکل کر چھوٹے سے کوریڈور میں داخل ہوا تو سامنے سے مس کٹی کافی کا مگ تھامے چلی آ رہی تھی۔ چھوٹا قد، فربہی بدن، گول بھاری چہرے پر پھولے گالوں کے اندر دبے ہونٹ، اوپر سے بٹن نما آنکھیں...... اس سے پہلے کہ وہ حسب عادت کچھ کہتی میں نے یہ موقع چھین لیا۔

”گڈ مارننگ۔“ اس نے پہلوانوں کے ناپ کی گلابی پھول دار شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اس میں پھنسی پھنسی لگ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی بڑے لحاف پر تنگ غلاف چڑھانے کی بھونڈی کوشش کی گئی ہو۔ ”خوبصورت لباس......“ میں نے مسکرا کر بڑی کامیابی سے صاف جھوٹ بولا۔

لمحے بھر کو وہ جہاں تھی، وہیں ٹھہر گئی۔ ”گڈ مارننگ......“ کچھ توقف کے بعد اس نے کپکپاتے لبوں سے کہا۔ ”تم ٹھیک ہو۔“ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ صبح ہی صبح حیرت کے سرد سمندر میں غوطے کھا رہی ہے۔

میں بدستور اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ میرا مزاج بالکل رومانوی نہیں لیکن پوری کوشش کر رہا تھا کہ رومینٹک ہونے کی سو فیصد درست اداکاری کر سکوں۔ ”اوہ کافی......“ میں نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پیو گے؟“ اس کے لہجے میں جیسے سارے جہاں کا پیار امنڈ آیا ہو۔

”کیوں نہیں، بڑی طلب ہو رہی ہے لیکن تمہارے ہاتھ کی بنی ہو تو لطف آ جائے گا۔“

”یہ لو......“ اس کا چہرہ خوشی کے مارے دمک رہا تھا۔

”نہیں نہیں...... یہ تو تم نے اپنے لیے بنائی ہے۔“

”ارے نہیں، لو......“ اس نے زبردستی مگ مجھے تھما دیا۔

”سنو......“ میں نے آہستہ سے کہا۔

اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

”لنچ یا ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ میں نے سرگوشی کی۔

اس کے چہرے پر حیرت کا ایک رنگ آ اور دوسرا جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس سے یہ غیر متوقع خوشی سنبھالے نہ سنبھل رہی ہو۔ ”کیا کہا تم نے......“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ایسا لگا کہ اسے یقین نہ آ رہا ہو۔ وہ شاید سوچ رہی تھی کہ جو سنا، وہ کیا واقعی سچ ہے۔

”لنچ یا ڈنر......“ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے رازداری سے دہرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتی، میں نے فوراً پینترا بدل لیا۔ ”اچھا ٹھیک ہے، میں کچھ دیر میں تمہاری طرف چکر لگاتا ہوں۔ تب تک سوچ لو۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ باچھیں کھول کر مسکرائی تو سرخ مسوڑھوں میں دھنسے چھوٹے چھوٹے زردی مائل دانت دیکھ کر مجھے اُبکائی آنے لگی۔

”میں اپنے کیبن میں جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر دو قدم آگے بڑھا اور پھر رک کر اس کی طرف پلٹا۔ ایک گھونٹ بھرا۔ ”کافی کے لیے شکریہ۔“ مجھے یقین تھا کہ اپنا کام نکالنے کے لیے اتنا ہی کافی رہے گا۔

کیبن میں پہنچتے ہی میں نے مگ کی ساری کافی گملے میں اُنڈیلی۔ ایک گھونٹ نے ہی منہ کا سارا ذائقہ خراب کر ڈالا تھا۔ اتنی بدذائقہ کافی پینے کا حوصلہ وہی کر سکتا ہے جسے پینے کا تو شوق ہو لیکن کبھی چکھی تک نہ ہو۔

میں بہت خوش تھا۔ مجھے لگا کہ منصوبے کا ایک حصہ تو کامیابی سے مکمل ہو چکا۔ ایک دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں مسٹر جارج والے واقعے کی اطلاع باس کو نہ ہو جائے۔ میرے

منصوبے کی کامیابی کا دارومدار اب صرف اسی اطلاع پر تھا۔ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ کچھ ایسا ہو کہ باس اُسی میں اُلجھ کر رہ جائے۔ پوری کوشش تھی کہ منصوبہ کسی طرح آج ہی مکمل ہو ورنہ کل تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے امید نہ تھی کہ باس کو یہ اطلاع مل سکتی ہے۔ ویسے بھی اسے اخبار پڑھنے یا ٹی وی دیکھنے کی عادت نہ تھی۔ اس لیے تسلی تھی کہ فی الحال تو وہ لاعلم ہے۔ دعا تھی کہ کم از کم آج تو وہ اس واقعے سے بالکل لاعلم ہی رہے۔ کل کی مجھے کوئی پروانہ تھی۔

ساڑھے دس بجے تک میں تین بار کیش کاؤنٹر کے چکر لگا چکا تھا۔ اسسٹنٹ کیشیئر چھٹی پر تھی۔ مس کٹی تنہا ہی کیش کاؤنٹر سنبھال رہی تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ کئی بار میری بلائیں لے چکی تھی۔ میں نے بھی ہر بار اس کی نگاہِ الفت کو بظاہر بہ دل سے خوش آمدید کہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا کام بس کسی بھی وقت ہونے والا ہے۔

منصوبے کے مطابق میں دو بار باس کے کمرے کے چکر لگا کر اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے، یہ بھانپ چکا تھا کہ اسے مسٹر جارج کے حوالے سے کوئی خبر نہ تھی۔ بس اب مجھے موقع کی تلاش تھی۔ اسی چکر میں کوریڈور سے نکل کر لابی کی طرف جا رہا تھا کہ اُسے اندر آتے دیکھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اُس روز جب لارنس لیڈنر پہلی بار ہمارے بینک میں داخل ہوا تو وہ ایک صارف سے زیادہ بینکر دکھائی دے رہا تھا۔ نہایت عمدہ سوٹ، سِلک کی ٹائی، سیاہ جوتے، جو لابی کی تیز روشنی میں ایسے چمک رہے تھے کہ اُن میں آئینے کی طرح چہرہ دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کی اطمینان بھری چال میں وقار اور مستی دونوں نمایاں تھے۔ اسے دیکھ کر تو میں لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک کر، جہاں تھا وہیں پہ کھڑا رہ گیا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ شخص میرے منصوبے کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے غیب سے مدد کے طور پر آیا ہے۔

میرا مطلبی اور چاپلوس باس ڈیلٹن روفس اپنے کیبن میں بیٹھا شیشے کے پار سے اسے اندر داخل ہوتے دیکھ چکا تھا۔ آنے والے کا حلیہ ہی ایسا تھا کہ ڈیلٹن سامنے آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ہر ممکنہ کامیابی کو اپنا نام دینے کی جستجو میں رہتا تھا۔ اس نے لمحہ بھر میں ہی طے کر لیا کہ اب کیا کرنا ہوگا۔ ”میں یہاں کا برانچ منیجر ہوں۔“ وہ تیزی سے باہر آیا اور لارنس کے قریب پہنچ کر عاجزانہ مسکراہٹ لبوں پہ سجا کر بولا۔ تب تک لارنس میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ ”اور یہ ہے میرا اسسٹنٹ جیمز فرالے۔“ وہ سمجھ چکا تھا کہ میرا تعارف کرائے بنا شاید گاڑی آگے نہ بڑھے۔

اُس نے جو میرا عہدہ بتایا، وہ درست نہ تھا۔ دراصل میرا تو کوئی عہدہ ہی نہ تھا۔ میں بینک کا صرف یک زیرِ تربیت ملازم تھا اور کچھ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنی ملازمت زیادہ پسند نہ تھی۔ اگرچہ میرے پاس بینکنگ اور فنانس میں گریجویشن کی ڈگری تھی اور میں نے فوج میں بھی کچھ عرصہ خدمات سرانجام دی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ میرے سر میں آزادی اور خودسری کا جنون تھوڑا زیادہ ہو گیا تھا۔ فوج کی کٹھن زندگی دیکھنے کے بعد اب آرام کا طلب گار تھا۔ میں پیسے کمانا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے جان مار محنت کا تصور ہی میرے لیے سوہانِ روح تھا۔ اگر اس وقت کوئی مجھ سے پوچھتا کہ تم اپنے مستقبل کو کیسا دیکھنا چاہتے ہو تو میرا جواب ہوتا بالکل لارنس لیڈنر کے جیسا، ایک دم شاہانہ طرزِ زندگی، فکر سے آزاد، زندگی کے جھمیلوں سے ہزاروں میل دور......

موجودہ ملازمت کو دل سے ناپسند کرنے کے باوجود یہ فوجی زندگی کا ڈسپلن ہی تھا کہ میں اپنا کام پوری توجہ سے سرانجام دے رہا تھا۔ جسے میں ڈسپلن سمجھتا تھا، میرے چاپلوس باس کے نزدیک وہ تابعداری تھی۔ اسی لیے وہ مجھے پسند کرتا تھا۔ یس سر کہنا تو جیسے میری گھٹی میں پڑا ہو۔ یہی وجہ ہوگی کہ ڈیلٹن نے اس میٹنگ میں مجھے بھی شریک کر لیا تھا۔ ویسے کوئی تابعدار ماتحت قریب نہ ہو تو دوسرے کو خود کے باس ہونے کا یقین دلانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔

جب مجھے باس نے میٹنگ میں شامل ہونے کو کہا تو دل ہی دل میں اس پر میں نے سخت لعن طعن کی۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف اپنا منصوبہ اور اس پر کامیابی سے عمل کرنا تھا۔ مجھے وہ میٹنگ اپنے زاویے سے وقت کا زیاں لگی تھی۔ دل تو چاہتا تھا کہ ٹکا سا جواب دے کر اپنی راہ لوں لیکن ایک بے وقعت ملازم کے لیے باس کے حکم پر عمل کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہوتا۔

مسٹر لارنس نے میٹنگ کے دوران بتایا کہ وہ اپنے سرمائے کو محفوظ بنانے اور مزید دولت حاصل کرنے کے لیے بینک کی منافع بخش اسکیموں میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ڈیلٹن کو بینک کے لیے بڑا ڈپازٹ حاصل کرنے کا سنہری موقع ہاتھ لگا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ بینک کی منافع اسکیموں کے بارے میں اتنی زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا کہ فرفر سنا کر ممکنہ کلائنٹ کو ڈپازٹ دینے پر آمادہ کر سکے۔ ویسے بھی باس کو فنانس سے زیادہ مینجمنٹ میں دلچسپی تھی۔

مجھے تو جیسے یہ سب اسکیمیں ازبر تھیں۔ میں رٹو توتے کی

طرح انہیں سنا کر دوسرے کی دلچسپی ان اسکیموں میں پیدا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ میں دوبار ان صلاحیتوں کو پہلے بھی کامیابی سے استعمال کر چکا تھا، جس کے باعث باس مجھ سے کافی مرعوب تھا لیکن اس بات کا پتا نہیں چلنے دیتا تھا۔ خود مجھے بھی بینک کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد ہی اپنی اس صلاحیت کا پتا چلا تھا۔

میٹنگ روم میں صرف تین افراد تھے۔ باس، میں اور لارنس۔ چاپلوس ڈیلٹن نے کلائنٹ کو مرعوب کرنے اور اس کی عزت افزائی کے اظہار کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے کریم کافی بنائی تھی۔

''سب سے پہلے تو میں آپ کو عمدہ کافی کے ساتھ لانگ برانچ میں خوش آمدید کہنا چاہوں گا۔'' ڈیلٹن نے جھک کر اس کے سامنے کافی رکھتے ہوئے خالص پیشہ ورانہ گفتگو کا آغاز کیا۔

''عمدہ کافی......'' لارنس نے مگ کی طرف دیکھا اور ذو معنی لہجے میں کہا۔

''جی بالکل......'' ڈیلٹن کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ ''ہم بینک کے خاص کلائنٹس کو اسی طرح خوش آمدید کہتے ہیں۔''

مجھے لگا کہ شاید لارنس نے طنزیہ انداز میں وہ جملہ کہا تھا مگر باس سوچتا کم تھا۔ اس نے اُسے بھی تعریف سمجھا۔ ویسے بھی میں اچھی طرح جانتا تھا کہ لارنس کی شخصیت سے مرعوب ڈیلٹن اس وقت صرف ڈپازٹ حاصل کرنے کا ہی سوچ رہا تھا۔ اگر اس کی خاطر اسے اپنے قیمتی کوٹ کی اوپری جیب میں اُڑسے ہلکے رومال سے کلائنٹ کے جوتے بھی صاف کرنے پڑ جاتے تو وہ اس میں بھی کوئی قباحت محسوس نہ کرتا۔

لارنس نے بڑے وقار سے مگ اٹھا کر کافی کا گھونٹ بھرا۔ چند لمحے تک اِدھر اُدھر بے پروائی سے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر کی بے مصرف نظر بازی کے بعد اس نے ڈیلٹن کے چہرے پر نگاہیں جمائیں۔ ''کافی اچھی ہے۔'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا، مگر......'' مزید کچھ کہنے کے بجائے وہ بات ادھوری چھوڑ کر مگ کو دیکھنے لگا۔

''کیا سر! میں کچھ سمجھا نہیں۔'' ڈیلٹن نے چونک کر پوچھا۔

لارنس نے فوری طور پر کچھ کہنے کے بجائے سکون سے گھونٹ بھرا اور مگ میز پر رکھ کر، جیب سے رومال نکالا اور شائستگی سے ہونٹ صاف کیے۔ ''مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ ہیڈ آفس نے اس کا نام لانگ برانچ کیوں رکھا ہے۔'' یہ کہہ کر ہونٹ سکیڑے۔ ''معاف کیجیے گا بڑا عجیب سا نام ہے لانگ برانچ......'' یہ کہتے ہوئے اس کی بھویں اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔

ڈیلٹن نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا اور میز پر دونوں کہنیاں ٹکاتے ہوئے گردن آگے کی طرف جھکائی۔ وہ کلائنٹ کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دینے پر یقین رکھتا تھا اور یہاں صورت یہ تھی کہ کلائنٹ ڈپازٹ پر بات شروع کرنے سے پہلے برانچ کے نام پر ہی سوال اٹھا رہا تھا۔

''ایک بات تو ہے مسٹر لارنس......'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ''ہماری برانچ کا نام ہے بہت منفرد۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ خود آپ اسے نوٹس کر چکے ہیں۔'' اس نے بات بنانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔

لارنس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر گڑائیں۔ ''تو یہ نام انفرادیت کے لیے رکھا گیا ہے؟'' لہجہ سوالیہ تھا۔

''ارے نہیں سر، ایسا ہرگز نہیں۔'' ڈیلٹن نے کسمساتے ہوئے پھر پہلو بدلا۔ ''ہیڈ آفس نے برسوں پہلے کھلنے والی اس برانچ کا نام تو شاید کچھ اور رکھا ہوگا لیکن بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے بینک کی یہ برانچ لانگ اسٹریٹ پر واقع ہے۔ اسی وجہ سے لوگوں نے لانگ برانچ پکارنا شروع کیا اور پھر ہم نے بھی لوگوں کا یہ لقب قبول کرلیا۔ اب برانچ کا دفتری نام بھی یہی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ستائش طلب نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''کسی سیلون، ریستوران یا کافی شاپ کی طرح۔'' لارنس منہ ہی میں بڑبڑایا۔ ''کیا عجیب بات ہے، کیسا نام پڑا ہے۔''

ڈیلٹن اُس کا زیرِ لب تبصرہ سُن چکا تھا۔ اپنی بھرپور وضاحت کے جواب میں کلائنٹ کا یہ تبصرہ اسے بدتہذیبی لگا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اسے مزید ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا لیکن اس وقت بات کچھ اور تھی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور معصومانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔ ''معاف کیجیے گا سر، کیا آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے؟''

''میرا مطلب ہے بڑا عجیب سا نام پڑا ہے برانچ کا، بالکل ویسے ہی جیسے گن اسموک......'' اس کا لہجہ مفاہمانہ تھا۔ شاید وہ ڈیلٹن کے جذبات کا اندازہ لگا چکا تھا۔

''سر! اب ایسا بھی عجیب نام نہیں ہے یہ۔'' میں نے مداخلت کی تو اس نے چہرہ میری طرف موڑا۔ نفیس کمانیوں والے چشمے کے شفاف شیشوں سے اس کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

اس کے یوں گھورنے سے مجھے لگا کہ اس بے مقصد

موضوع کو کسی دلچسپ موڑ پر لے جا کر ختم کرنا ہوگا تاکہ کام کی بات شروع ہو سکے۔ مجھے ڈیلٹن کی نہیں، اپنی فکر تھی۔ لگ رہا تھا کہ جیسے یہاں وقت ضائع ہو رہا ہو۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ میں مسکرایا اور پھر ہلکے سے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''اب یہی دیکھ لیں سر، ہماری برانچ کی ہیڈ کیشیئر کا نام مس کنٹی ہے مگر وہ گلک میں پیسے جمع کرنے کے بجائے دن بھر کھاتے داروں کے چیک کیش کر کے نوٹ تھماتی رہتی ہیں۔'' یہ کہہ کر میں پھر مسکرایا۔ ''یہ ضروری تو نہیں کہ کام اور نام، دونوں میں مماثلت بھی ہو۔''

توقع تھی کہ میرے اس نکتے پر میٹنگ روم میں لارنس کا قہقہہ گونجے گا مگر اس کے بعد بھی چند لمحوں تک سناٹا طاری رہا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی یہی سوچ رہا ہوگا کہ ہمیں جانا کہاں تھا لیکن نکلے کہاں ہیں۔

''مسٹر لارنس......'' آخر ڈیلٹن نے کھنکھارتے ہوئے کمرے میں چھائی خاموشی توڑی۔ ''کیا آپ اس علاقے میں نئے شفٹ ہوئے ہیں؟''

''نہیں نہیں، اب ایسا بھی نہیں ہے۔'' لارنس نے فوراً لب کشائی کی۔ ''دراصل میرے پاس کافی دولت ہے لیکن وہ صرف بینک کھاتوں میں ہے۔ سال چھ مہینوں میں منافع ملتا ہے تو دولت کا قد تھوڑا سا بڑا ہو جاتا ہے ورنہ تو......''

ڈیلٹن نے اس کی بات بیچ سے ہی اُچک لی۔ ''اوہ...... اسی لیے آپ بینکنگ سیکٹر میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں۔'' اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔ کام کی بات شروع ہو چکی تھی۔

لارنس مسکرایا۔ ''ہوشیار بینکر ہو۔''

''شکریہ......'' اپنی تعریف سن کر اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ ''میں ساری دولت کی تو نہیں البتہ کچھ رقم کی سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہوں۔''

''اندازاً کتنی رقم......'' ڈیلٹن نے بے تابی سے پوچھا۔

''یہی کوئی پچاس ساٹھ ملین ڈالر......'' لارنس نے بھویں اچکاتے ہوئے ایسے کہا کہ جیسے یہ کوئی رقم ہی نہ ہو۔

ڈیلٹن پر ایک لمحے کے لیے سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کی پوری زندگی میں بھی کسی کلائنٹ نے اتنی بڑی رقم ڈپازٹ نہیں کی تھی۔ اسے لگا کہ اب تو اس کی ترقی پکی ہونے والی ہے۔

''پچاس ساٹھ ملین ڈالر......'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اگر سامنے کلائنٹ نہ ہوتا تو شاید وہ خوشی کے مارے ناچنا شروع کر دیتا لیکن فی الوقت اسے سنجیدگی دکھانی تھی۔

''کیا یہ رقم کم ہے؟'' باس کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر لارنس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''ایسی بات نہیں۔'' ڈیلٹن مسکرایا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ آپ کے لیے کون سی اسکیم سب سے بہتر رہے گی۔''

لارنس نے سنجیدگی سے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔ ''مجھے سرمایہ کاری کے منصوبوں کا بہت زیادہ علم نہیں۔ میں تو شاید اسٹاک مارکیٹ چلا جاتا لیکن میرے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ اپنی رقم اس بینک میں لگانی چاہیے۔'' یہ کہہ کر لارنس نے لحہ بھر توقف کیا اور ڈیلٹن کی طرف دیکھا۔ ''مورگن براگ میرا پرانا دوست ہے، آپ جانتے ہیں اسے۔ وہ سرمایہ کاری کے شعبے کا ایک معتبر مشیر ہے۔''

یہ سن کر ڈیلٹن نے کچھ سوچا اور پھر دونوں بھویں اچکائیں۔ ''یاد نہیں پڑتا کہ کب ان سے ملا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ جانتا ضرور ہوں گا۔'' صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بات بنا رہا ہے ورنہ اس وقت تو اسے صرف ایک ہی بات یاد تھی......ڈپازٹ۔

لارنس کی بات سن کر مجھے یاد آ گیا کہ مورگن براگ ایسٹ کوسٹ کے ایک بڑے بینک سے وابستہ تھا۔ اس کے بعد اس نے کارپوریٹ سیکٹر جوائن کیا اور اب اس کی ماتحتی میں کئی بڑے بینکوں کا ایک کنسورشیم کام کر رہا تھا۔ مجھے یقین نہ تھا کہ لارنس اسی مورگن براگ کے بارے میں کہہ رہا ہے یا وہ مورگن کوئی اور ہے۔ میں بینکاری کے شعبے میں مورگن کی شہرت اور اس کی چھاپا مار کارروائیوں کے بارے میں تھوڑا بہت سن اور پڑھ چکا تھا۔ وہ اچانک اپنے ماتحت بینک کی کسی برانچ کا دورہ کرتا اور ناقص سیکیورٹی انتظامات، کھاتے داروں کو سہولتوں کی فراہمی میں کمی اور اس طرح کے دیگر چھوٹے موٹے انتظامات مکمل نہ کرنے پر ملازمین کو ملازمت سے دودھ سے مکھی کی طرح نکال باہر کر دیتا تھا۔

گزشتہ تین ماہ کے دوران وہ لیونا ہنزلے سمیت کئی لوگوں کو فارغ کر چکا تھا۔ لیونا ہنزلے ایک بڑے بینک کا اسسٹنٹ وائس پریزیڈنٹ تھا۔ میں نے اس کے بارے میں واشنگٹن پوسٹ کے مالیاتی صفحات پر ایک تفصیلی رپورٹ پڑھی تھی۔ کچھ دنوں پہلے اڑتی اڑتی یہ افواہ میرے کانوں تک بھی پہنچی تھی کہ وہ کسی وقت ہماری برانچ پر بھی دھاوا بول سکتا ہے۔ اگرچہ ہماری برانچ نیویارک کے مضافاتی علاقے میں تھی تاہم اس افواہ میں ایک صداقت یہ تھی کہ مورگن کا

ہیڈ آفس نیویارک میں ہی تھا اور وہ بہ آسانی ہماری برانچ پر بھی چھاپا مار سکتا تھا۔ ویسے بھی ہمارا بینک اس کے ماتحت بینکوں میں سے ایک تھا۔ کم از کم میں تو ایسے کسی بھی وقت کے لیے خود کو بالکل تیار کر چکا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اگر ایسا ہوا تو میں اسے پہچانوں گا کیسے۔ وہ ہر جگہ ایک مختلف روپ میں پہنچتا تھا۔ لمحہ بھر کو خیال آیا کہ کہیں یہ مورگن تو نہیں۔ میں نے غور سے اسے دیکھا اور سکھ کا سانس لیا۔ مورگن کے بارے میں اخباری اطلاعات تھیں کہ اس کا قد خاصا لمبا ہے لیکن لارنس کا قد ایسا نہیں تھا کہ اسے لمبا کہا جا سکے۔

''یہ اچھا ہوا کہ ہم اپنے موضوع پر واپس آ چکے ہیں۔'' ڈیلٹن نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں جیمز تم مسٹر لارنس کو ہمارے بینک کی سرمایہ کاری کی تازہ ترین پُرکشش پیشکشوں کے بارے میں تفصیلی طور پر بتاؤ۔ تاکہ انہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو سکے۔''

''بالکل ٹھیک......'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور تیزی کے ساتھ زبان چلانی شروع کر دی۔ اگرچہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ لارنس میری باتوں پر پوری طرح دھیان نہیں دے رہا لیکن میں اپنا فرض پورا کرتا رہا۔ چند منٹ میں ہی سرمایہ کاری پر بینک کی تمام تر پیشکشیں اس کے گوش گزار کر دیں۔

میری بات ختم ہونے پر لارنس نے بے نیازی سے گردن موڑی اور میٹنگ روم کے شیشے والی دیوار کے پار دیکھنے لگا۔ اس وقت لابی میں صرف تین چار لوگ ہی موجود تھے۔ بلیک اوورکوٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ادھیڑ عمر کا ایک طویل القامت مرد، کندھے پر بڑا سا بیگ لٹکائے خوش شکل نوجوان لڑکی، بینک کے واحد کیش کاؤنٹر پر چیک کیش کی منتظر ایک بوڑھی عورت اور ہیڈ کیشیئر مس کٹی۔ سب اپنی باری کے انتظار میں تھے۔ بینک کی اسسٹنٹ کیشیئر ڈیزی کینسن آج اتفاقیہ چھٹی پر تھی۔ اسی لیے یہ لائن لگی تھی ورنہ ہماری برانچ میں اتنی تیز رفتاری سے کام ہوتا تھا کہ کھاتے دار کو انتظار کی بالکل بھی زحمت نہیں ہوتی تھی۔

میں نے گردن موڑ کر سامنے کی طرف دیکھا۔ شیشے کے پار باہر سڑک پر موسمِ بہار کی گہما گہمی تھی۔ کاریں زناٹے سے آ جا رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر لوگوں کی چہل پہل تھی مگر برانچ کے اندر نہایت سکون اور خاموشی کا عالم تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور لارنس کی طرف دیکھا۔ وہ لابی کی طرف ہی دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے ڈیلٹن پر نظر ڈالی، وہ بھی خاموش تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ لارنس شاید ہماری پیشکشوں پر غور کر رہا ہے۔ اسی لیے خاموشی سے اس کی لب کشائی کا منتظر رہا۔

چند لمحے اسی طرح گزر گئے۔ لارنس کی نگاہیں کبھی ہم پر پڑتیں اور کبھی لابی کا طواف کرتی رہتیں۔ اسی دوران اس نے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈالا۔ میں سمجھا کہ شاید وہ چیک بک نکالنے جا رہا ہے۔ میں نے ایک نظر فرش پر ڈالی اور ایک قدم آگے بڑھانے کی کوشش کرنی چاہی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ چیک لکھ لے تو اس سے وصول کر کے نہایت تابعداری کے انداز میں ڈیلٹن کو پیش کروں۔

اس سے پہلے کہ میرے پاؤں فرش سے اٹھتے، برابر کی کرسی پر بیٹھے ڈیلٹن نے میرا کوٹ پکڑ کر روکنے کی کوشش کی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''اس کے پاس پستول ہے۔'' اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ اب پوری بات سمجھ آ چکی تھی۔

''کیا......'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ میں نے سامنے نظر ڈالی۔ لارنس کے ہاتھ میں پستول تھا اور ہونٹوں پر خباثت بھری مسکراہٹ۔

اس کی توقع تو مجھے کیا میرے باس کو بھی نہ تھی۔ کہاں لینے کی باتیں تھیں اور اب دینے کا معاملہ گلے پڑ گیا تھا۔ لمحے بھر کو تو میں بھنا کر رہ گیا۔ دل میں سوچا کہ یہ تو میرے رنگ میں بھنگ ڈالنے جا رہا ہے۔ دل میں خیال آیا کہ اس پر ایک چھلانگ لگا کر قابو کر لوں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا وہ تیزی سے اٹھا۔ پستول کا رخ ہم دونوں کی جانب تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے بجائے ذومعنی نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا اور ہلکے سے مسکرایا۔ صورتِ حال پوری طرح صاف ہو چکی تھی۔

''گڈ...... ویری گڈ۔ بس اسی طرح بیٹھے تماشا دیکھتے رہو ورنہ......'' اس نے پستول والا ہاتھ آگے بڑھایا۔

باس پہلے ہی کرسی پر ڈھے چکا تھا۔ یہ حکم سن کر تو جیسے کرسی پر ہی نیم دراز ہو گیا۔

لارنس مسکراتا ہوا اس طرح آگے بڑھا کہ ہم دونوں بدستور اس کے نشانے پر رہے۔ وہ آہستہ سے میٹنگ روم سے نکلا اور دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر لگتا تھا جیسے پاؤں زمین میں دھنس چکے ہوں۔ ڈیلٹن بے جان بنا کرسی میں دھنسا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی اور منہ حیرت نہیں خوف سے کھلا ہوا تھا۔ میں نے سامنے کی طرف نظر ڈالی۔ لارنس کیش کاؤنٹر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول کو لابی میں موجود تمام لوگ دیکھ چکے تھے۔ جو جہاں تھا، وہیں جم گیا۔

مس کٹی کے دونوں ہاتھ منہ پر تھے، جیسے زبردستی خود کو چلانے سے روک رہی ہو۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ کاؤنٹر پر کھڑی عورت تیزی سے پلٹی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ڈپازٹ سلپ تھی۔ اس نے جو دیکھا، اس کے فوری بعد اس کا دوسرا ہاتھ دل پر تھا۔ وہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ قطار میں کھڑی دوسری عورت کی بھی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ کیش کاؤنٹر کی مختصر قطار کے درمیان میں کھڑے شخص نے بھی خاموشی میں بہتری سمجھی۔ اس نے اوورکوٹ کی جیب میں موجود ہاتھوں کی مٹھیاں شاید اور سختی سے بھینچ لی تھیں۔ لگتا تھا جیسے اس کی سب سے قیمتی چیز جیب میں رکھی ہو۔

بینک لٹنے جا رہا تھا۔ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ لارنس جیسے خوش پوش ڈاکو کو بینک لوٹتا دیکھنا ان سب کی زندگیوں کا پہلا اور منفرد تجربہ تھا۔ خود میرے لیے بھی لارنس جیسی شخصیت کا یہ روپ نہایت حیرت انگیز تھا۔ کچھ دیر پہلے تک اس کا شاہانہ انداز میرے لیے آئیڈیل تھا مگر اب میری سوچ بدل رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ لارنس اس کا اصل نام نہیں ہوگا۔ کون ڈاکو اپنا اصل نام بتا کر بینک لوٹتا ہے۔ ویسے اس پر شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔ بینک لٹتا تو میرے خواب لٹ جاتے۔ رات بھر کا جاگنا اکارت جاتا، اوپر سے میں آج صبح مس کٹی سے جو ڈراما کر چکا تھا، باقی کے دنوں میں اس کا خراج بھرنا پڑ سکتا تھا۔ میرے ساتھ تو وہی بن کھائے پیے گلاس توڑنے جیسا معاملہ ہونے جا رہا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

لارنس، کم از کم اب تک میرے لیے اس کا نام یہی تھا، سب کو پستول کی زد پر لیے آگے بڑھا اور اوورکوٹ والے آدمی کے پیچھے جا کر ایک ہاتھ اس کی گردن میں ڈال کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ شخص دُہرا ہو چکا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے لارنس نے اس کا بازو مروڑ کر پیچھے کیا۔ اب وہ شخص گھٹنوں کے بل فرش سے بس کچھ ہی اونچا زمین پر تھا۔

''آگے بڑھو۔'' لارنس نے قطار میں کھڑی خوش شکل نوجوان عورت کو گھورتے ہوئے حکم دیا۔

''کیا......'' اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''اس کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالو......'' لارنس نے اوورکوٹ والے مرد کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا...... سمجھی نہیں۔'' خوف سے عورت کی آواز لرز رہی تھی۔ اس کا جسم بھی کپکپا رہا تھا۔

''جیب میں ہاتھ ڈالو اور پستول نکال کر مجھے دو۔'' لارنس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

عورت نے لرزتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھایا اور گھٹنوں کے بل نیم زمین بوس شخص کے اوورکوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اگلے لمحے اس کا ہاتھ باہر نکلا تو اس میں سیاہ چمکدار پستول دبا ہوا تھا۔

''اسے نال کی طرف سے پکڑو۔'' اس سے پہلے کہ عورت سیدھی کھڑی ہوتی، وہ رعب دار آواز میں بولا۔

وہ کانپتے ہوئے سیدھی کھڑی ہوئی تو لارنس نے آنکھوں سے اشارہ کر کے قریب بلایا۔ عورت کا پستول والا ہاتھ تیزی سے کانپ رہا تھا۔ پستول بھی اس نے نال کی طرف سے ایسے پکڑ رکھا تھا، جیسے کسی موذی سانپ کو سر کی طرف سے پکڑ رکھا ہو۔

پستول کے دستے کو اس آدمی کی کھوپڑی پر ہتھوڑے کی طرح مارو۔'' عورت نے پستول لارنس کو دینے کی کوشش کی مگر اس نے لینے کے بجائے اسے نیا حکم دے دیا۔

اس کی بات سن کر تو جیسے عورت کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔

''سنا نہیں تم نے......'' لارنس نے دانت کچکچا کر کہا۔ ''پوری قوت سے دستہ مارو اس کے سر پر۔''

''کیا......'' وہ منمنائی۔

لارنس نے پستول کی نال اس کی طرف کر کے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ عورت کے پاس حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور ایک قدم آگے ہو کر نال سے پکڑے پستول کو اوپر اٹھایا اور اگلے ہی لمحے دستہ پوری قوت سے اس کے سر کے پچھلے حصے کی طرف مار دیا۔

چوٹ پڑتے ہی وہ کٹے پیڑ کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اب اس کے ہاتھ اوورکوٹ کی جیب سے باہر تھے۔ ایک مٹھی میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ اس کے گرتے ہی گرفت ڈھیلی پڑی۔ وہ کاغذ کا ٹکڑا غیر محسوس طور پر کیش کاؤنٹر کے قریب فرش پہ جا پڑا تھا۔

لارنس نے گہری سانس لی اور آگے بڑھ کر عورت کے ہاتھ سے پستول اُچک لیا۔ ''دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو۔'' اس کے بعد وہ ادھیڑ عمر عورت کی طرف مڑا۔ ''کیا نام ہے تمہارا۔''

''کیتھی...... کیتھی بیرنس۔'' وہ بھی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔

''لاؤ، یہ مجھے دے دو۔'' لارنس نے پستول سے اشارہ کیا۔

کیتھی نے ہاتھ میں ایک باکس تھام رکھا تھا۔ یہ سنتے ہی

اس کی گرفت سخت ہوگئی۔

لارنس نے پستول کی نال اس کے سر کی طرف کی۔ عورت نے خاموشی سے جھک کر باکس اس کے قدموں تلے رکھ دیا۔

''بیگ بھی......'' لارنس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ عورت کے کندھے سے لٹکتا بیگ اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے زپ کھولی اور ہاتھ اندر ڈالا۔ ہاتھ باہر نکلا تو اس میں ایک رسی موجود تھی۔ لارنس نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا۔

''چلو اب ایک دوسرے کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھو۔'' چند منٹوں میں ہی لابی میں موجود تمام لوگ ایک دوسرے کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ چکے تھے۔ فرش پر پڑے شخص کے ہاتھ لارنس نے خود باندھے تھے۔ تمام لوگ اب اس کے رحم و کرم پر تھے۔

''اب سب آگے چلو۔'' اس نے مس کٹی کی طرف پستول کیا۔ ''اور تم اسٹرانگ روم کی چابیاں نکالو۔''

اگلے ہی لمحے وہ انہیں لے کر کوریڈور میں بڑھ گیا۔ میرے جسم کا تناؤ بڑھ گیا تھا۔ میں سب کچھ اتنی آسانی سے نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ بینک لٹتا تو میرے خواب...... یہ خیال آتے ہی میرا فشارِ خون تیز ہوگیا۔ کنپٹیوں پر دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ یہی وہ فیصلہ کن لمحہ تھا جب میں نے سوچا کہ ایک زوردار لات مار کر میٹنگ روم کا دروازہ توڑ کر باہر نکلوں اور اسے سبق سکھاؤں۔ میرے بازو کی مچھلیاں تن رہی تھیں۔ میں سیکیورٹی گارڈ نہ تھا کہ خود فیصلہ کرتا، مڑ کر برابر میں دیکھا۔ میں اپنے باس سے ہدایت لینا چاہتا تھا لیکن وہ فرش پہ پڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں سیدھی اور بازو پھیلے ہوئے تھے۔ میں جھکا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن اس کی سانسیں معمول کے مطابق چل رہی تھیں۔ وہ صرف خوف زدہ تھا۔

''لابی سے دھواں آرہا ہے۔'' ڈیلٹن نے میرا ہاتھ اپنے سینے پر محسوس کیا تو جھٹ سے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی گہری سانس لی۔ دھواں پھیلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''لگتا ہے اسموک بٹن آن ہوگیا ہے۔'' میں نے کہا۔

اسموک بٹن حفاظت کے لیے تھا۔ اس سے دھواں پھیلتا ہے، جس سے ایک طرف تو ڈاکوؤں کو نظر نہیں آتا تو دوسری جانب بینک کے باہر لوگ یہ سوچ کر کہ اندر آگ لگ گئی ہے، پولیس یا فائر بریگیڈ کو اطلاع کر سکتے تھے۔ دھوئیں سے یرغمال بنائے گئے کسٹمر کی جان کو لاحق خطرات بھی کم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ دھواں ابھی پھیلنا شروع ہی ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مس کٹی نے اسٹرانگ روم کھولتے ہوئے اسموک بٹن آن کر دیا ہوگا۔

میں نے ایک نظر لابی پہ رکھی ہوئی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ اِردگرد نظر ڈالی تاکہ کوئی ایسی چیز مل سکے، جس سے دروازہ کھول کر باہر نکل سکوں مگر میٹنگ روم میں ایسا کچھ نہ تھا۔

میں نیچے جھکا۔ ''کچھ ہے ایسا، جس سے دروازے کا لاک کھولا جاسکے۔''

ڈیلٹن نے انکار میں سر ہلا دیا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں سیدھا کھڑا ہوا۔

''تم کیا کرنے جارہے ہو؟'' ڈیلٹن چلایا۔

''جھک مارنے جارہا ہوں۔'' میں نے پرس سے اے ٹی ایم کارڈ نکالتے ہوئے بھنا کر جواب دیا۔

''بھاڑ میں جاؤ۔''

سنی ان سنی کر کے دروازے کی چوکھٹ سے لاک کے قریب، جھری سے کارڈ ڈال کر لاک کھولنے کی کوشش کی۔ چار پانچ منٹ بعد ایک ہلکی سی کلک سنائی دی۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ میں تیزی سے باہر نکلا۔ لابی خالی تھی۔ کیش کاؤنٹر سے آگے بڑھا تو دھواں اٹھتا محسوس ہوا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ اسٹرانگ روم اور لاکرز دونوں ہی ایک ہال نما کمرے میں تھے۔ دھواں وہیں سے آرہا تھا۔ اسٹرانگ روم کوریڈور کے اختتام پر تہ خانے میں تھا، جس کے لیے چند سیڑھیاں نیچے اترنا پڑتا تھا۔

میں بنا آہٹ کیے اندر داخل ہوا تو مس کٹی، مسز کیتھی اور نوجوان عورت، تینوں دیوار کی طرف منہ کیے کھڑی تھیں۔ لارنس کئی لاکرز کھول چکا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو دھواں بڑھتا جارہا تھا۔ اگرچہ دھواں بڑھتا جارہا تھا لیکن جب تک میں اندر داخل ہوا تب تک یہ اتنا نہ تھا کہ کچھ دیکھنا ممکن نہ ہوتا۔

فرش پہ ایک تھیلا پڑا تھا۔ کئی لاکرز کھلے ہوئے تھے۔ میرے پہنچنے پر وہ لاکرز نمبر سترہ کھول رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، میں نے اس کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ پلٹا اور گھوم کر کک مارنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران میں اسے پیچھے کی طرف سے دبوچ چکا تھا۔ وہ خود کو چھڑانے اور مجھ پر قابو پانے کے لیے سخت مزاحمت کر رہا تھا۔

''تم لوگ لابی میں بھاگو۔'' مزاحمت کے دوران میں

چلایا۔

وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ بازی پلٹ چکی ہے۔ اس کی مزاحمت میں بھی تیزی آ چکی تھی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ دبلے پتلے نظر آنے والے لارنس میں اتنی جان ہو سکتی ہے کہ وہ میرے قابو میں نہ آ سکے، وہ لیکن بلا کا پھرتیلا تھا۔ پوری طرح جان لڑانے کے باوجود میں نے اسے پیچھے سے دبوچ رکھا تھا۔ اسے فرش پہ پٹخنا چاہتا تھا لیکن وہ اتنی تیزی سے مچل رہا تھا کہ مجھے اپنا توازن سنبھالنا مشکل تھا۔ اسی دوران اس نے پوری شدت کے ساتھ میری کلائی پہ کاٹ لیا۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ میری گرفت کچھ کمزور پڑ چکی تھی لیکن س کے باوجود وہ بدستور گرفت میں تھا۔ اچانک وہ کچھ اس طرح اچھلا کہ میری تھوڑی سے اس کا سر ٹکرایا۔ میرے دانت تک ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ ایک لمحے کو لگا جیسے پورا جبڑا اپنی جگہ سے ہل گیا ہو۔ اسی دوران میری گرفت کچھ اور کمزور پڑی۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے خود کو مجھ سے تڑپ کر آزاد کرایا اور فرش پر رکھے تھیلے کو اٹھانے کی کوشش کی۔ تب تک میں خود کو کسی حد تک سنبھال چکا تھا۔ میں نے پلٹ کر اسے زوردار کِک مارنے کی کوشش کی لیکن بڑھتے دھوئیں میں میرا نشانہ غلط پڑا۔ اسے کیا کِک لگتی، میں اپنے ہی جھول میں منہ کے بل فرش پر گر پڑا۔

لارنس تھیلا اٹھانے ہی والا تھا کہ میں نے دوبارہ کوشش کی۔ اس بار نشانہ درست تھا۔ کِک اس کی ٹانگ پر پڑی۔ وہ ڈگمگایا۔ اس دوران میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے کھڑا ہوتا دیکھ کر اس نے تھیلا چھوڑا اور باہر کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے بھاگنے کے بجائے تیزی سے پلٹا۔ یہ حالات میرے منصوبے کا حصہ نہ تھے لیکن اب اس پر سوچنے کا وقت نہ تھا۔ لاکر نمبر سترہ کھلا پڑا تھا۔ چابیوں کا گچھا بھی لٹک رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اندر ہاتھ ڈالا۔ وہاں مخمل کی ایک تھیلی اور نوٹوں کی چند موٹی موٹی گڈیاں اور ایک لفافہ رکھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی مخمل کی تھیلی اور نوٹ اپنی جیبوں میں بھرے۔ شرٹ کے بٹن کھول کر لفافہ بنیان کے اندر ڈالا اور لاکر کا دروازہ بند کر کے چابیوں کا گچھا فرش پر پھینک دیا۔

کمرے میں دھواں کافی بھر چکا تھا۔ میں جبڑا پکڑ کر کراہتے ہوئے باہر نکلا۔ ڈیلٹن عورتوں کے ہاتھ کھول چکا تھا۔

''لابی میں بھی دھواں تھا۔'' جلدی سے اسموک بٹن آف کرو۔'' میں نے کھڑکیاں کھولتے ہوئے مس کٹی سے

سب تصویریں میری ہی ہیں!

کہا۔

مسز کیتھی اپنے موبائل سے ایمرجنسی کو فون ملا رہی تھی۔ ''پلیز فوراً پولیس بھیجو۔ اٹھائیس لانگ اسٹریٹ، بینک ڈکیتی۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی اور سامنے دیکھا۔ ''ایک ایمبولینس بھی بھیجو۔ یہاں پر ایک زخمی ہے۔'' وہ سخت بدحواس نظر آ رہی تھی۔

لارنس کہاں ہے۔'' میں نے چلا کر پوچھا۔

''بھاگ گیا۔'' مس کٹی نے جلدی سے کہا اور میرے قریب آئی۔ ''مجھے تم پر فخر ہے۔ میں نے سب کچھ دیکھا کہ......''

''باتیں بعد میں، پہلے اسموک بٹن آف کرو۔''

''اوہ......'' موٹی مس کٹی ڈولتے ہوئے کوریڈور کی طرف جا رہی تھی۔

اسموک بٹن آف ہونے کے بعد دھواں بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میں نے سامنے دیکھا۔ اوور کوٹ والا شخص کرسی پر بیٹھا سر سہلا رہا تھا۔

''تم اس پر قابو نہیں پا سکے۔'' ڈیلٹن میرے قریب آکر چلایا۔

''میں خود زخمی ہو چکا ہوں۔'' لارنس کے ساتھ دھینگا مشتی کے دوران میرا نچلا ہونٹ پھٹ چکا تھا۔ وہاں سے خون رس رہا تھا۔

''اوہ......'' ڈیلٹن نے میرے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں نے بڑی کوشش کی لیکن وہ بہت پھرتیلا تھا۔''

''خیر...... اس کے پاس پستول تھا۔ اگر اسے استعمال کرنے کا موقع مل جاتا تو......'' ڈیلٹن نے مجھ سے ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا۔

''اسے پستول چلانے کا موقع کیسے ملتا۔ میں نے تو اسے لوٹ کا مال بھی اٹھانے نہیں دیا۔''

''کیا......'' ڈیلٹن چلایا۔ ''بینک لٹنے سے بچ گیا۔'' اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ''تم نے تو کمال کر دیا۔''

''جی سر......'' مس کٹی نے قریب آکر ڈیلٹن سے کہا۔ ''میں نے خود دیکھا ہے، وہ خالی ہاتھ بھاگا ہے یہاں سے۔ اور یہ سب کچھ ان کی وجہ سے ہوا۔'' اس نے میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے شرما کر کہا۔

''ویل ڈن......'' ڈیلٹن چلایا۔ ''تم نے تو آج سیکیورٹی گارڈ کی کمی بھی پوری کر دی۔'' وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ وہ مس کٹی کی طرف مڑا۔ ''تم فوراً اسٹرانگ روم کی طرف جاؤ اور دروازہ لاک کر دو۔''

''او کے......'' مس کٹی دوبارہ اسٹرانگ روم کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اسی دوران سر پر پستول کا دستہ کھانے والا بینک کسٹمر اپنی جگہ سے اٹھا۔ ''بڑی قوت ہے تمہارے ہاتھ میں۔'' وہ اس نوجوان خاتون سے مخاطب تھا، جس نے لارنس کے حکم پر اس کے سر پر وار کیا تھا۔

''آئی ایم ویری سوری......'' اس کے چہرے پر شرمندگی نمایاں تھی۔ ''میرا نام لورنا ہے اور میں کچھ رقم نکالنے آئی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔

''لیکن تم تو میرا بھیجا ہی نکال دینے والی تھیں۔''

''میرا ارادہ ہرگز ایسا نہ تھا۔'' وہ خجالت سے مسکرائی۔

''میں مذاق کر رہا تھا محترمہ۔'' وہ مسکرایا۔ ''شکر ہے بات صرف گومڑے پر ہی ٹل گئی۔'' اس نے ایک بار پھر سر کا پچھلا حصہ سہلایا۔ ''لگتا ہے برف کی ٹکور کارگر ہوگی۔''

اسی دوران ایمبولینس اور پولیس سائرن کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے اپنے زخمی ہونٹ پر ہاتھ لگایا۔ وہ کچھ سوجا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن خون کا رساؤ بند ہو چکا تھا۔

آدھا گھنٹے تک پولیس تفتیش میں لگی رہی۔ میں اور گومڑ والے دونوں نے ہی اسپتال جانے سے انکار کر دیا تھا۔ ایمبولینس کو خالی واپس جانا پڑا۔ دونوں کسٹمر عورتوں کو بیانات لے کر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

بینک کے اندر دو پولیس والے، ایک سراغرساں، مس کٹی، ڈیلٹن، گومڑے والا اور میں باقی رہ گئے تھے۔ پولیس والوں نے ڈاکو کا حلیہ تو نوٹ کر لیا تھا تاہم انہیں پورا یقین تھا کہ جس طرح واردات کی کوشش کی گئی تھی، اس سے لگتا یہی ہے کہ وہ روپ بدل کر آیا تھا۔ اسی لیے ڈاکو کا خاکہ بنوانے کا ارادہ بھی ترک کر دیا گیا۔

بینک سے کوئی شے لوٹی نہیں گئی تھی، پھر بھی پولیس تندہی سے ثبوت تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی دوران ایک پولیس والا میرے برابر کھڑے سراغرساں کے پاس آیا۔ ''کیش کاؤنٹر کے قریب سے یہ پرچی ملی ہے۔''

''میں ایک ڈاکو ہوں اور پستول میری جیب میں ہے۔ خاموشی سے سارا کیش میرے حوالے کر دو۔'' سراغرساں نے بہ آواز بلند پرچی پہ لکھی عبارت پڑھی۔

''کیا......'' مس کٹی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔

''یہ پرچی ڈاکو نے تمہیں دی تھی۔'' سراغرساں مس کٹی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ پہلے ہی یہ جان چکا تھا کہ واردات کے وقت وہ کیش کاؤنٹر پر تھی۔

''مجھے تو اس نے کوئی پرچی نہیں دی تھی۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ تو صرف اسٹرانگ روم میں جانا چاہتا تھا۔ کاؤنٹر پر موجود کیش میں اس کی کوئی دلچسپی نظر نہیں آرہی تھی۔''

''تو پھر یہ کہاں سے آئی......'' سراغرساں نے پرچی سب کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میری پرچی ہے۔'' اوورکوٹ والا آدمی سر کا گومڑا سہلاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا۔

''کیا......'' سراغرساں نے حیرت سے کہا۔

ایک پولیس والا اس شخص پر پستول تان چکا تھا۔

''یہ تحریر میں نے ہی لکھی ہے اور میرے پاس پستول بھی تھا۔'' وہ شخص پولیس کے سامنے یہ کہتے ہوئے بھی بہت پُراعتماد دکھائی دے رہا تھا۔

ہم سب کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ ''کیا

مصیبت ہے۔ ایک وقت میں دو دو ڈاکو......"

"میں ڈاکو نہیں ہوں......" اس نے ڈیلٹن کی بات سن کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سکون سے وضاحت کی۔

"تو پھر وہ پستول......"

"نقلی تھا لیکن بالکل اصلی جیسا۔" اس نے ڈیلٹن کو بات پوری کرنے کا موقع دیے بغیر جلدی سے کہا۔

پولیس والے کرائم سین کے بجائے اب اس کی طرف متوجہ تھے۔

"یہ کیا بکواس ہے......" ڈیلٹن چلایا۔ اسے کیا، مجھے بھی کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ کون ہے یہ شخص۔

"مسٹر برانچ منیجر، میں ہوں مورگن براگ......" یہ کہہ کر وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ پولیس والے مستعد کھڑے تھے۔

میں ہکا بکا تھا۔ "لو اسے بھی آج ہی یہاں آنا تھا۔"

وہ ڈیلٹن کے قریب پہنچا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ سراغرساں اور پولیس والے بھی اس رخ بدلتی صورت حال سے چکرا کر رہ گئے تھے۔

"کچھ یاد آیا مسٹر ڈیلٹن......"

"جی سر...... بالکل یاد آ گیا۔" وہ ایسے جھینپ رہا تھا جیسے کوئی معزز دکھائی دینے والا شہری بے قیمت شے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔

کچھ دیر میں سراغرساں اور پولیس والوں پر بھی مورگن براگ کی حقیقت آشکار ہو چکی تھی۔ رسمی کارروائی کے بعد وہ رخصت ہوئے اور پھر سارا بینک اسٹاف میٹنگ روم میں جمع ہو گیا۔

"یہ تو صاف نظر آ چکا کہ بینک سیکیورٹی کا کتنا شاندار انتظام کیا ہے برانچ منیجر مسٹر ڈیلٹن نے۔" اس نے ڈیلٹن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس لیے میں نے آپ کو فارغ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آج سے آپ برانچ کے منیجر ہی نہیں رہے بلکہ ملازمت سے بھی فارغ کیے جا چکے ہیں۔"

یہ سن کر میں نے ڈیلٹن کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اتر چکا تھا۔

اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "آپ کا عہدہ کیا ہے؟"

"کچھ دیر پہلے مسٹر ڈیلٹن نے مجھے اپنے اسسٹنٹ کے عہدے پر فائز کیا تھا مگر انہیں فارغ کیے جانے کے بعد......" میں نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "سمجھ نہیں آتا۔ میرا عہدہ کیا ہے، بس اب تک کام ہی کر رہا ہوں۔"

"پھر بھی......؟" مورگن کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"ویسے میں ایک انٹرن ہوں اور کئی مہینوں سے ہوں۔"

"اب نہیں رہو گے......"

"کیا مطلب......" مس کٹی نے مداخلت کی۔ اسے شاید اتنی جلد اپنی محبت کا ڈراپ سین ہو جانے پر حیرت ہو رہی تھی۔ "انہیں کیوں۔" وہ منمنائی۔ "انہوں نے تو اپنی جان پر کھیل کر بینک لٹنے سے بچایا ہے۔" وہ میرا بھرپور دفاع کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آپ کچھ دیر خاموش رہیں۔" اس نے مس کٹی کی طرف دیکھ کر کہا اور گردن میری طرف گھمائی۔ "تو مسٹر انٹرن...... اگر تمہیں لانگ برانچ کا منیجر بنا دوں تو......"

"بالکل بھی نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں......" یقیناً میرا جواب اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ "تم نے جان پہ کھیل کر بینک لوٹنے کی کوشش ناکام بنائی ہے۔ ایک انٹرن ہو، تمہیں تو منیجر بننے پر خوش ہونا چاہیے لیکن تم ہو کہ......" مورگن نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"مجھے جان پر کھیلنے کا اتنا ہی شوق ہوتا تو فوج نہ چھوڑتا۔"

"لیکن آج تم نے......"

"بس...... وہ سب کچھ جلد بازی میں ہو گیا۔ اب لگتا ہے کہ غلطی کی تھی ورنہ اس کے پاس پستول بھی تھا۔ اس وقت میں یہاں بیٹھا ہونے کے بجائے پوسٹ مارٹم ٹیبل پر لیٹا بھی ہو سکتا تھا۔"

"تو پھر......" مورگن براگ کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"میں آج اور اسی وقت سے انٹرن شپ چھوڑتا ہوں۔"

"کیا...... تم بے وقوف ہو گیا۔"

"پتا نہیں مگر مجھے جان بہت پیاری ہے۔" یہ کہہ کر میں اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"اگر تمہیں کسی وقت غلطی کا احساس ہو جائے تو مجھ سے ہیڈ آفس آ کر ضرور مل لینا۔" پیچھے سے مورگن کی آواز سنائی دی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھے بنا دروازہ بند کیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا باہر آ گیا۔

میرا دل خوشی سے اچھل رہا تھا لیکن جان بوجھ کر سنجیدگی

طاری کیے رکھی۔ باہر نکل کر اپنی کھٹارا کار میں بیٹھا اور گھر آ گیا۔ راستے بھر من ہی من میں یہی گنگناتا رہا کہ دکھ بھرے دن بیت گئے، اب موسم بہار آ چکا۔

گھر پہنچ کر رقم گنی۔ پورے ڈیڑھ لاکھ ڈالر تھے۔ مخملی تھیلی میں دس ہیرے اور لفافے میں موجود سرٹیفکیٹ کے مطابق ہر ہیرے کی قیمت دو لاکھ ڈالر تھی۔ دولت دیکھ کر یہ بھی بھول گیا کہ آج لنچ گول ہوا تھا۔ خوشی کے مارے ڈنر بھی نہیں کیا۔ میں نے کافی بنائی اور سکون سے لمبی تان کر آنے والے دنوں کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

مجھے یقین نہیں تھا کہ سب کچھ اس طرح ہوگا لیکن جو سوچا تھا، وہ مجھے مل گیا۔ دراصل گزشتہ رات سے ہی میری نظر لاکر نمبر سترہ پر تھی۔ میں آج کے آج ہی اسے خالی کرنا چاہتا تھا۔ رات دیر تک جاگتا رہا اور یہی سوچتا رہا کہ کس طرح اس پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ یہ لاکر جارج گولڈ کا تھا۔ وہ تقریباً اسی سال کے ریٹائرڈ مافیا رکن تھے اور برسوں سے بے سعرف زندگی گزار رہے تھے۔ تقریباً دو ہفتے پہلے وہ بینک آئے تو انہیں پنڈلی میں درد کے سبب چلنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ انہوں نے مجھ سے سہارے کی درخواست کی اور میری موجودگی میں ہی ہیروں کی تھیلی اور نوٹوں کی گڈیاں لاکر میں رکھی تھیں۔ میرے منہ میں بھی پانی بھر آیا تھا لیکن کل ڈنر کے وقت ریستوران میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد تو میں تہیہ کر چکا تھا کہ آج یا کل، لاکر نمبر سترہ پر ہاتھ صاف کرنا ہے۔

ہوا یوں کہ میں کھانے کے لیے اپنے پسندیدہ ریستوران میں داخل ہوا تو وہاں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ جارج گولڈ کرسی پر بے جان ڈھلکے پڑے تھے۔ وہاں ڈنر کے لیے آئے ایک ڈاکٹر نے دل کے دورے سے موت کی تصدیق کر دی تھی۔

اتنا مجھے علم تھا کہ جارج گولڈ بے اولاد تھے اور تنہا رہتے تھے۔ میں نے سوچا اس سے پہلے کہ ان کی املاک کا کوئی دعویدار سامنے آئے اور لاکر تک پہنچے، اس کا صفایا کر دیا جائے۔

صبح جب بینک پہنچا، تب بھی موقع کی تلاش میں تھا۔ جس وقت لارنس بینک میں داخل ہوا، اس وقت میں اسٹرانگ روم میں داخل ہونے کا موقع تاڑ رہا تھا۔ ڈیلٹن نے جب مجھے بھی میٹنگ روم میں آنے کا حکم دیا، تب میں دل ہی دل میں اس پر بہت بھڑکا تھا لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ لارنس جیسا بہروپیا ڈاکو میرے لیے غیبی مدد ہے۔ بستر پر لیٹا ہوا میں اسے دعائیں دیے جا رہا تھا۔ اسی کی بدولت پرآسائش زندگی کے سپنے سچ ہونے جا رہے تھے۔ میں خطیر رقم کے ہیرے اور ڈیڑھ لاکھ ڈالر گھر پر چھوڑ کر باہر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے بھوکا سونے کو ہی ترجیح دی۔

دوسرے دن صبح کے سوا دس بج رہے تھے جب میں تیار ہو کر باہر نکلا۔ ہیرے، ان کے سرٹیفکیٹس اور نقدی میرے سیاہ چرمی ہینڈ بیگ میں تھی۔ ارادہ تھا کہ انہیں فی الحال اپنے بینک لاکر میں رکھ دیتا ہوں۔ یہ گھر کی نسبت وہاں زیادہ محفوظ رہتے۔

بینک شہر کے تجارتی حصے کے آخر میں ایک کھلی جگہ پر تھا۔ میں نے بینک کے سامنے کھڑی اسٹیشن ویگن سے چند قدم کے فاصلے پر کار کھڑی کی۔ جیسے ہی میں بینک کے سامنے پہنچا، داخلی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ تین نقاب پوش تیزی سے باہر نکلے۔ ان کا رخ اسٹیشن ویگن کی طرف تھا۔ ایک لمحے کو تو کچھ سمجھ نہیں آیا لیکن جیسے ہی سب سے آخر میں باہر آنے والے نقاب پوش ڈاکو نے میرے ہاتھ سے بیگ چھینا، سب کچھ صاف صاف سمجھ میں آ چکا تھا۔ بینک اور میں، دونوں ہی لٹ چکے تھے۔ اسٹیشن ویگن تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

میں پولیس کے آنے تک وہیں رکا رہا۔ میں نے بیان دیا تھا کہ اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکلوانے آیا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ لٹنے کا نوحہ بھی سنا دوں لیکن لوٹ کے مال کے لٹ جانے کا کیا جواز پیش کرتا۔

وہ دن میرے لیے قیامت سے کم نہ تھا لیکن کیا کر سکتا تھا۔ دوسرے دن اٹھا تو نیند پوری نہ ہونے سے سر بوجھل تھا۔ لٹنے کے بعد میرا دکھ دُگنا ہو چکا تھا۔ آخر ناشتے کے بعد میں نے خود کو تسلی دی کہ کوئی بات نہیں۔ بینک سلامت ہیں تو دولت ہتھیانے کے موقع اور بہت ملیں گے۔ فی الحال تو نوکری کا بندوبست کیا جائے۔ کافی دیر سوچنے کے بعد ایک خیال ذہن میں آیا اور فوراً ڈائریکٹری اٹھا کر نمبر ڈھونڈنے لگا۔ نمبر ملایا۔ ”ہیلو...... کیا مسٹر مورگن سے بات ہو سکتی ہے۔“

”جی نہیں......“ ایک خاتون کی سریلی آواز سنائی دی۔

”کیا وہ کہیں باہر گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ فوری طور پر ملازمت چھوڑ کر جرمنی کے لیے جا چکے ہیں۔ ہمیں کل شام ہی ان کا استعفیٰ ای میل سے ملا تھا۔“

میرے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔

بروکلین کا سینئر سراغ رساں جوائے ریزو اپنی سیاہ فورڈ کار سے باہر آیا اور پختہ سڑک پر واقع عمارت کی آٹھویں منزل پر کھلی ہوئی کھڑکی کی جانب دیکھنے لگا جس پر زرد رنگ کے باریک پردے لہرا رہے تھے۔ پھر اس کی نظر چادر سے ڈھکی ہوئی لاش پر گئی جو آدھی سڑک اور آدھی فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے چاروں طرف وافر مقدار میں خون پڑا ہوا تھا جس کے بارے میں ریزو نے فرض کرلیا کہ یہ مرنے والے کے سر سے بہا ہوگا۔ اس نے گہری سانس لی

قاتل کی تلاش میں نئی سے نئی بات سامنے آنے والی...... ایک معما کہانی کے الجھاوے

مغربی ممالک میں دوست بدلنا... محبتیں بدلنا... معمول کی بات سمجھی جاتی ہے... اپنے فائدے کے لیے کوئی بھی حسینہ کچھ بھی کر سکتی ہے... اسی معاشرے میں ایسے افراد بھی بستے ہیں جو محبت کو ہی کل کائنات سمجھتے ہیں... خودکشی کی واردات سے شروع ہونے والی غیر معمولی کہانی... ہر کوئی اسے خودکشی قرار دے رہا تھا... مگر سراغ رساں کی تمام تر تحقیق و جستجو اسے قتل ثابت کرنے پر صرف ہو رہی تھی...

قاتل کی تلاش

تنویر ریاض

اور اپنے ساتھی سراغ رساں مارک گنز برگ سے کہا۔ ”کتنا خوفناک منظر ہے؟“

”ہاں واقعی۔“ گنز برگ نے کہا اور کار کی ڈکی کھولنے لگا۔ ریزو بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ انہوں نے کار کی ڈکی سے ربر کے دستانے اور جوتے نکالے اور لاش کے قریب جانے سے پہلے انہیں پہن لیا۔

”تم نے یہاں کیا دیکھا؟“ ریزو نے لاش کے قریب کھڑے ہوئے پٹرول آفیسر سے پوچھا۔

”یہ ایک سفید فام شخص کی لاش ہے۔“ آفیسر نے جواب دیا۔ ”اسے کھڑکی سے نیچے گرتے ہوئے دیکھا گیا اور ایمرجنسی میڈیکل ٹیم نے اسے مردہ قرار دے دیا ہے۔ اس کا سر بری طرح پچک گیا ہے۔“ اس نے جھرجھری لی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں۔“ ریزو نے کہا۔ ”سر سب سے بھاری حصہ ہوتا ہے اور کششِ ثقل کی وجہ سے کھوپڑی پوری قوت سے زمین سے ٹکراتی ہے۔“

”تمہارے خیال میں اس نے خودکشی کی ہے؟“ گنز برگ نے پوچھا۔

نوجوان افسر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں جانتا لیکن ہمارے پاس ایک گواہ ہے۔“ اس نے ففتھ ایونیو پر کھڑی ہوئی نیلی اور سفید رنگ کی ریڈیو کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سراغ رساں پالسن اس سے بات کر رہی ہے۔“

ریزو نے پٹرول کار کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا پچھلا دروازہ کھلا اور سراغ رساں انجیلا پالسن اس سے باہر آئی۔ اس نے ریزو کو دیکھا تو اس کے قریب چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا نوٹ پیڈ تھا۔

”ہیلو جوئے۔“ اس نے کہا اور گنز برگ کو دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ تم دونوں اس کیس کی تفتیش کرو گے۔“

”ہاں۔“ ریزو نے سارجنٹ کا بیج اپنی جیکٹ کی جیب پر لگاتے ہوئے کہا۔

”اچھا، میں تمہاری کامیابی کی دعا کروں گی۔ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ یہ خودکشی کا کیس ہے لیکن چشم دید گواہ سے بات کرنے کے بعد مجھے اس پر زیادہ یقین نہیں رہا۔“

”کیوں؟“

پالسن نے اپنی نگاہیں نوٹ پیڈ پر جمائیں اور بولی۔ ”یہ گواہ بتیس سالہ لیزا ٹوٹو ہے۔ جو اسی عمارت میں رہتی ہے۔ وہ سڑک پار کر رہی تھی جب اس نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ سنی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا کہ ایک شخص اپنے دونوں بازو اس طرح لہرا رہا ہے جیسے اڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ اپنی جگہ منجمد کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس نے کبھی کسی شخص کو سڑک پر اس طرح گرتے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی ایسی آواز سنی تھی۔ اسے بہت زور کی قے آئی۔ اب طبی عملہ اسے اسپتال لے جا رہا ہے۔ وہ ابھی تک اس صدمے سے نہیں سنبھل سکی۔“

ریزو کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”کیا اس نے یہ کہا کہ وہ شخص نیچے گرتے ہوئے چلا رہا تھا۔“

”ہاں۔“

”کیا اس نے اسے کھڑکی سے باہر آتے دیکھا تھا؟“

”نہیں، لیکن تقریباً کہہ سکتے ہیں۔“

”گویا اس آدمی نے کھڑکی سے باہر آتے ہی چیخنا شروع کر دیا تھا؟“

”اس عورت نے یہی بتایا ہے، اس طرح یہ خودکشی کا کیس نہیں لگتا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ریزو نے کہا۔ ”فی الحال اسے ایمرجنسی روم جانے دو۔ ہم اس سے بعد میں بات کر لیں گے۔“ پالسن نے تائید میں سر ہلایا اور نوٹ پیڈ بند کرتے ہوئے بولی۔

”میں تمہارے لیے ان نوٹس کی کاپیاں بنوا دوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ واپس اپنی کار کی طرف چلی گئی اور ریزو اپنے ساتھی کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

”کیا تم نے کبھی کسی کو اتنی بلندی سے چھلانگ لگاتے دیکھا ہے؟“

گنز برگ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”کم از کم اس ملازمت کے دوران تو ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں نے اس طرح کسی کو گرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ میرے لیے ایک بالکل نئی چیز ہے۔“

”میری نظر سے ایسے دو واقعات گزرے ہیں۔ ایک شخص چھجے سے کودا اور دس منزل نیچے آ کر گرا۔ اس دوران اس کی ہلکی سی آواز بھی نہیں سنائی دی۔ دوسرے نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی لیکن آخری لمحات میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ زمین پر گرنے سے پہلے ہی چلانے لگا۔“ اس نے دس فٹ دور پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اس شخص نے فوراً ہی چلانا شروع کر دیا تھا اور یہ آدھا سڑک اور آدھا فٹ پاتھ پر آن کر گرا۔ اس سے تم کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو؟“

’’ممکن ہے کہ کسی نے اس کو ہلکے سے دھکا دیا ہو۔‘‘ گنز برگ نے کہا۔

’’ہاں، یہ ممکن ہے۔‘‘

’’خدا کرے تم اسے ثابت کر سکو۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔‘‘ ریزو نے لاش کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ اس نے قریب پہنچ کر مردے کا ہاتھ اٹھایا۔ اس کی شہادت کی انگلی پر ایک خون آلود پٹی بندھی ہوئی تھی۔

’’تازہ زخم ہے۔‘‘ گنز برگ نے کہا۔ ’’ممکن ہے کہ گہرا بھی ہو۔ اسی لیے پٹی سے بھی خون باہر آ رہا ہے۔‘‘

ریزو نے اردگرد دیکھا تو اس کی نظر ایک کرائم سین ڈیٹیکٹو پر گئی۔ اس نے آواز دے کر کہا۔ ’’روبرٹو، کیا تم لوگوں نے تصویریں لے لی ہیں؟‘‘

اس شخص نے پیڈ پر سے نظریں اٹھائیں جس پر وہ نوٹس لکھ رہا تھا اور بولا۔ ’’ہاں بیالیس تصویریں لے لی ہیں۔‘‘

ریزو نے ایک بار پھر اس کی زخمی انگلی کا معائنہ کیا اور پٹی ہٹا کر دیکھا تو اسے انگلی کی پشت پر گہرا زخم نظر آیا۔ اس نے کھڑے ہو کر بالائی منزل کی کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھا پھر قریب کھڑے ہوئے مردہ خانے کے رضا کار کو بلا کر اسے اپنا کارڈ دیا اور بولا۔ ’’اسے اپنے فارم کے ساتھ منسلک کر دو۔ ہمیں مردے کا شناختی کارڈ یا کوئی اور ذاتی شے نہیں ملی۔ تم بھی اچھی طرح دیکھ لو۔ اس کے بعد لاش کو یہاں سے لے جا سکتے ہو۔‘‘

’’ٹھیک ہے سارجنٹ۔‘‘ اس شخص نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

آٹھویں منزل کے اپارٹمنٹ پر سادہ لباس میں ملبوس دو پولیس والے پہرا دے رہے تھے۔ جب ریزو اور گنز برگ طویل راہداری عبور کر کے وہاں پہنچے تو پڑوس میں رہنے والے متجسس لوگ اپنے دروازوں سے جھانک کر انہیں دیکھنے لگے۔ ریزو نے پہلے پولیس والے کے قریب پہنچ کر اس کی جیب پر لگی ہوئی نیم پلیٹ پڑھی اور بولا۔

’’ہیلو ڈوگن۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جائے وقوعہ پر پہنچنے والے تم پہلے شخص تھے؟‘‘

’’ہاں، میں اور میرا ساتھی۔ جیسے ہی کمک پہنچی تو ہم اوپر چلے آئے۔‘‘

ریزو نے اپارٹمنٹ کا دروازہ دیکھا جو پورا کھلا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ’’جب تم یہاں آئے تو اس وقت بھی یہ دروازہ اسی طرح کھلا ہوا تھا؟‘‘

’’ہاں، بالکل اسی طرح جیسا تم دیکھ رہے ہو۔ ہم اندر گئے۔ چاروں طرف دیکھا لیکن ہمیں کوئی نظر نہیں آیا۔ ہم نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا اور سب کچھ اصلی حالت میں ہے۔‘‘

’’بہت اچھا کیا۔ تمہاری کسی پڑوسی سے بات ہوئی؟‘‘

’’نہیں۔ ہم نے صرف انہیں یہاں سے ہٹا دیا اور کہا کہ وہ اپنے اپارٹمنٹس میں موجود رہیں۔ ممکن ہے کہ ان سے پوچھ گچھ کی جائے۔‘‘

ریزو نے تائید میں سر ہلایا اور گنز برگ کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔ وہ تین کمروں پر مشتمل درمیانے درجے کا اپارٹمنٹ تھا جس کا سامنے کا دروازہ براہِ راست لیونگ روم میں کھلتا تھا اور کھلی ہوئی کھڑکی داخلی دروازے کے مخالف سمت میں تھی۔ دائیں ہاتھ والا کمرا بیڈروم کے لیے استعمال ہوتا تھا اور کھڑکی کے بالکل دائیں جانب ایک راہداری تھی جو کچن تک جا رہی تھی۔

’’اوہ میرے خدا۔‘‘ گنز برگ نے کچن میں داخل ہوتے ہی نتھنے سکیڑتے ہوئے کہا۔ ’’کیا تمہیں کوئی بو محسوس ہو رہی ہے؟‘‘

ریزو نے فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور بولا۔ ’’نہیں کیسی بو؟‘‘

’’شاید تمہاری قوتِ شامہ متاثر ہو گئی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بو ہے جو ہر ہفتے کو میری ماں کے کچن سے آیا کرتی تھی۔ اس وقت میں چھوٹا بچہ تھا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ سامنے والی دیوار تک گیا اور وہاں رکھے ہوئے اسٹین لیس اسٹیل کے ڈرم کا پائیدان دبا کر اس میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ’’میں جانتا ہوں۔ یہ بند گوبھی ہے۔ یقیناً اس نے بند گوبھی ہی پکائی ہوگی۔ گو کہ دروازہ اور کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ پھر بھی میں اس کی بو محسوس کر سکتا ہوں۔‘‘

ریزو نے بھی ڈرم میں جھانک کر دیکھا۔ پکی ہوئی گوبھی کا بچا ہوا حصہ دودھ کے ایک خالی ڈبے کے اوپر پڑا ہوا تھا جبکہ اس کے نیچے گوبھی کے پتے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ہاتھ پر دستانہ چڑھا کر ڈرم کو ٹٹولا اور کہا۔ ’’یہاں کچھ کارن بیف بھی ہے۔‘‘

’’آخری کھانے کے لیے اس نے دلچسپ انتخاب کیا۔ مجھے تو مرنے والا آئرش لگتا ہے۔‘‘ گنز برگ نے کہا۔

ریزو نے دوبارہ ڈرم میں ہاتھ ڈال کر دودھ کا خالی ڈبا باہر نکالا اور اسے جھاڑتے ہوئے اپنی ناک کے قریب لایا پھر اس پر لکھی ہوئی تاریخ پڑھی جو تین دن پہلے کی تھی پھر اس

نے وہ ڈبا گنز برگ کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس میں سے کوئی بو آرہی ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے سونگھنے کے بعد کہا۔ ''اس میں ترشی ہے۔''

ریزو نے ڈبا واپس ڈرم میں اسی طرح رکھ دیا جس طرح پہلے رکھا ہوا تھا پھر اس نے لکڑی کے تختے کو دیکھا جہاں سبزی کاٹنے والی چھری رکھی ہوئی تھی۔ اسے کہیں بھی خون کا نشان نظر نہیں آیا پھر اس نے فریج کھول کر ایک بند ڈبا نکالا جو ابھی تک گرم تھا۔ اس نے ڈھکنا ہٹا کر دیکھا۔ اس میں بھنا ہوا گوشت اور بند گوبھی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے انہیں سونگھا اور اس ڈبے کو واپس فریج میں رکھ دیا۔

گنز برگ لیونگ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے وہیں سے آواز لگائی۔ ''جوئے، یہاں آؤ۔ دیکھو یہ کیا ہے؟''

وہ اس کے پاس کھلی ہوئی کھڑکی تک گیا ہے اور اس جانب دیکھا جہاں گنز برگ انگلی سے اشارہ کررہا تھا۔ لکڑی کی چوکھٹ پر دائیں جانب نیچے کی طرف خون کا دھبا نظر آرہا تھا جو خشک ہو چکا تھا۔ ریزو پلٹا اور باتھ روم کی طرف گیا۔ وہاں اسے سنک کے اوپر ایک آئیوڈین کی بوتل رکھی ہوئی نظر آئی۔ اس نے کوڑے دان کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا۔ اس میں خون آلود ٹائلٹ پیپر کے ساتھ زخم پر باندھنے والی پٹی کا ریپر بھی نظر آیا۔

''یہ واقعی کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔'' گنز برگ نے اس کے شانوں پر سے جھانکتے ہوئے کہا۔ اسی وقت ایک دوسرا سراغ رساں دروازے پر نمودار ہوا اور کہنے لگا۔ ''کیا میں یہاں کی تصویریں لینا شروع کردوں؟''

ریزو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، ہمیں ایک گھنٹا اور چاہیے۔ ان تصویروں کی ایک فہرست بنا دوں گا، ہمیں کچن، کوڑا کرکٹ، کھڑکی اور خاص طور پر خون آلود چوکھٹ، ریفریجریٹر کے اندرونی حصے اور اس میں رکھے ہوئے سامان کی تصویریں چاہئیں۔''

اس شخص نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں کافی پینے جارہا ہوں تب تک تم مطلوبہ تصاویر کی فہرست بنالو۔''

جب وہ واپس جانے کے لیے مڑا تو ریزو نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''اپنا کوئی ٹیکنیشن بھیج دو۔ ہم مرنے والے کا کمپیوٹر چیک کرنا چاہتے ہیں۔''

اس کے جانے کے بعد ریزو نے کہا۔ ''حیرت کی بات ہے کہ مرنے والے کا سیل فون نہیں ملا اور نہ ہی اس کے اپارٹمنٹ میں لینڈ لائن ہے۔''

''ہاں۔'' گنز برگ نے ایک کاغذ لہراتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس مہینے کا سیل فون بل ہے۔''

''اس کے علاوہ ایڈریس کی فہرست بھی نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ کسی نے یہاں کی تلاشی لی ہے۔''

''بظاہر یہی معمول ہورہا ہے کہ کوئی اس جگہ سے واقف تھا۔'' گنز برگ نے کہا۔ ''لیکن وہ سیل فون کیوں لے گیا۔ اس سے معاملہ مشکوک نظر آرہا ہے۔''

''ہاں۔'' ریزو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''سنگھار میز میں سیل چارجر کے ساتھ ہی تین سو ڈالر بھی رکھے ہوئے تھے۔ اگر یہ چوری کی واردات ہے تو وہ صرف سیل فون ہی کیوں لے گیا اور رقم چھوڑ دی۔''

''شاید کوئی یہ نہیں چاہتا ہوگا کہ اس کا نام سیل فون کے ریکارڈ سے ظاہر ہوجائے لیکن وہ اسے مٹا بھی سکتا تھا۔''

ریزو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے کہ اس نے گھبراہٹ میں ایسا کیا ہو اور وقت ضائع کرنا نہ چاہتا ہو۔ خیر ناموں کی فہرست تو سم کے ریکارڈ سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔''

وہ دونوں کچھ دیر سوچتے رہے پھر ریزو نے کہا۔ ''اس وقت مرنے والے کی زخمی انگلی اہمیت اختیار کرگئی ہے جس سے لگتا ہے کہ موت کی وجہ قتل ہے۔ کوئی شخص اپنی زخمی انگلی پر چھلانگ لگانے سے پہلے پٹی کیوں باندھے گا۔''

''شاید وہ نہیں چاہتا ہو کہ مرنے کے بعد اس کی انگلی میں انفیکشن ہوجائے۔'' گنز برگ نے مزاحیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ اسے خودکشی قرار دے دو اور گھر جا کر آرام کرو۔'' ریزو نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولا۔

''ہم ایک بار پھر سب باتوں پر غور کرتے ہیں۔ مرنے والے نے اپنے کھانے کے لیے بھنا ہوا گوشت اور گوبھی بنائی۔ کوڑے دان دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اس نے انہی چیزوں سے لنچ کیا تھا اور بقیہ کھانا فریج میں رکھ دیا۔''

''اور وہ دودھ کا ڈبا۔'' گنز برگ نے کہا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک خودکشی کرنے والے شخص کو خراب دودھ پھینکنے کی فکر ہوسکتی ہے۔''

''ہاں، دودھ کے ڈبے کے نیچے گوبھی کے پتے پڑے ہوئے تھے جبکہ اس کے اوپر ضائع شدہ کھانا ڈال دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے دودھ کا ڈبا کھانا پکانے اور لنچ کے درمیان کسی وقت کوڑے دان میں پھینکا ہوگا۔ ممکن ہے

کہ جب اس نے فریج کھولا اور ڈبے پر لکھی ہوئی تاریخ پڑھی تو اسے کوڑے دان میں پھینک دیا اور کھانا ختم کرنے کے بعد پلیٹ میں بچے ہوئے اجزاء بھی کوڑے دان میں پھینک دیے جو ڈبے کے اوپر آن کر گرے۔''

گنز برگ نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولا۔ ''اور جب اس کی بو پھیلنے لگی تو اس نے دروازہ اور کھڑکی کھول دی تا کہ تازہ ہوا اندر آئے۔ اس نے بے دھیانی میں کھڑکی کی چوکھٹ کے ابھرے ہوئے کنارے پر ہاتھ رکھ دیا جس سے اس کی انگلی زخمی ہوگئی۔ وہ زخم پر پٹی باندھنے کے لیے باتھ روم گیا۔''

ریزو نے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اسی دوران تیز ہوا چلنے سے کھڑکی کا پردہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ وہ اسے ٹھیک کرنے دوبارہ کھڑکی پر گیا۔ عقب میں اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہاں سے کوئی اندر آیا اور اس نے عقب سے اسے ہلکا سا دھکا دیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چلاتا ہوا کھڑکی سے باہر چلا گیا۔ اس دھکے کی وجہ سے وہ لہراتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ اس لیے براہِ راست فٹ پاتھ یا سڑک پر نہیں گرا بلکہ اس کی لاش آدھی ادھر اور آدھی ادھر پڑی ہوئی تھی۔ قاتل نے اس کا فون اور ایڈریس بک اٹھائی اور وہاں سے چلا گیا۔''

یہ کہہ کر وہ چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔

''لوگ خودکشی کرنے سے پہلے عموماً ایک خط لکھتے ہیں لیکن ہمیں وہ بھی نہیں ملا۔''

''یہ بھی ممکن ہے کہ اسے کھڑکی سے باہر جھانکنے کا شوق ہو اور وہ حادثاتی طور پر نیچے گر گیا ہو؟''

''ہاں۔'' ریزو نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

''ہمیں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ نشے میں تھا۔ ہمیں میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کا انتظار کرنا ہوگا۔ اگر تم غور کرو تو قاتل عین اس وقت کیسے اندر آگیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور مرنے والا کھڑکی کی طرف منہ کیے کھڑا ہوا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قاتل وہاں پہلے سے موجود ہو اور یہ محض ایک حادثہ ہو۔''

''ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ ٹیکنیشن کمپیوٹر پر بیٹھا ہوا کیا کر رہا ہے۔'' گنز برگ نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ ہمیں وہاں سے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔''

جیسے ہی ریزو اپنی جگہ سے اٹھا۔ انجیلا پالسن اور اس کا ساتھی سراغ رساں بوبی ڈیل اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔

''باس نے ابھی ابھی فون کیا ہے۔'' وہ بولی۔ ''اس نے تمہاری مدد کے لیے ہمیں بھیجا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم وہی کریں جو تم کہتے ہو۔'' پھر وہ بڑے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میرے لیے کیا حکم ہے؟''

ریزو ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ ممکنہ طور پر قتل کا کیس لگتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں شواہد اکٹھے کرنا ہوں گے۔ پڑوسیوں سے بات کر کے معلوم کرو کہ مرنے والے کی ساکھ کیسی تھی۔ اگر کسی نے کچھ دیکھا ہو، سیکیورٹی کیمروں کی ویڈیوز دیکھو، وغیرہ، وغیرہ۔''

''ٹھیک ہے جو۔'' وہ ڈیل کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ''ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔''

سراغ رساں سام اینڈی، بیڈ روم میں رکھے ہوئے کمپیوٹر کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے بتایا۔ ''سارجنٹ! اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ شخص بہت زیادہ کمپیوٹر استعمال نہیں کرتا تھا۔ بس ای میل، چیٹنگ اور زیادہ تر کھیلوں کی ویڈیوز دیکھا کرتا تھا۔'' پھر اس نے اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب اس کی گرل فرینڈ کی ای میلز سے بھرا ہوا ہے۔ یہ دیکھو، چار دن پہلے اس نے جو ای میل بھیجی تھی۔''

ریزو نے جھک کر ای میل پڑھنا شروع کی۔ ''تم مجھے فون کرنا بند کر دو اور آئندہ بھول کر بھی مت بھیجنا۔ ہمارا تعلق بس یہیں تک تھا۔ تمہارا کہنا ہے کہ مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن کیا واقعی ہمارا کوئی مستقبل ہے۔ میں اس پر کوئی شرط نہیں لگا سکتی لیکن تم یقیناً ایسا کر سکتے ہو بلکہ تم تو کسی بات پر بھی شرط لگا سکتے ہو۔ ایک بار پھر کہہ رہی ہوں، مجھے فون کرنا بند کر دو۔''

ریزو نے گنز برگ کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''وہ کیا کہنے کی کوشش کر رہی تھی مارک، یہ کچھ واضح نہیں ہے۔''

گنز برگ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، یہ اشاروں کی زبان ہے۔ تم بھی نہیں سمجھ سکو گے۔''

اینڈی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ وہ لڑکی اس کی قماربازی سے تنگ آچکی تھی... اسی لیے دھتکار دیا جس پر اس نے دل برداشتہ ہو کر کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔''

''یہ مشکوک معاملہ ہے۔'' ریزو نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم مجھے اس لڑکی کا نام اور پتا بتا سکتے ہو؟''

اینڈی نے اس کا ای میل ایڈریس بتایا تو ریزو بولا۔

''بہت خوب، لگتا ہے کہ یہ بے پارک وے کے آس پاس ہی ہوگا۔''

اینڈی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''معاف کرنا

سارجنٹ۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں کہ ہم ای میل ایڈریس کے ذریعے اصل پتے تک پہنچ سکیں۔ اس کے لیے ہمیں ونڈو ورڈ کو لکھنا ہوگا کہ وہ آئی پی ایڈریس دیں پھر ہمیں مخصوص انٹرنیٹ پرووائڈر سے رابطہ کرنا ہوگا جو ہمیں اصل پتا دے سکیں۔ اس وقت سوزی ایک فرضی یا گمنام کردار ہے۔''

''تمہاری باتیں سن کر میرے سر میں درد ہونے لگا ہے۔'' ریزو نے کہا۔ ''انجیلا پالسن سے کہہ دو، وہ تمہاری منشا کے مطابق کارروائی کرے گی۔ یہ بتاؤ کہ ایسی کوئی علامت ہے جس سے معلوم ہوسکے کہ مرنے والے نے حال ہی میں اس لڑکی کو آن لائن کے ذریعے پھول بھیجے تھے؟''

چند لمحوں کی تلاش کے بعد اینڈی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔''

''ٹھیک ہے تم اپنا کام جاری رکھو۔ اگر کوئی کام کی بات معلوم ہو تو ہمیں بتا دینا۔''

مرنے والے مارٹی یونگ کی عمر انتالیس سال تھی اور وہ اپارٹمنٹ نمبر آٹھ سو سولہ میں چار سال سے رہ رہا تھا اور اس نے حال ہی میں دو سال کے لیے لیز کی تجدید کروائی تھی۔ وہ غیر شادی شدہ تھا اور ایک انویسٹمنٹ کمپنی میں کام کیا کرتا تھا۔ بلڈنگ سپرنٹنڈنٹ نے بتایا کہ اس نے مارٹن کو کئی مرتبہ ایک سنہرے بالوں والی لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا جس کا نام اس نے سوزی بتایا۔

''تم اس کی قمار بازی کے بارے میں کیا جانتے ہو سیمی؟'' ریزو نے درمیانی عمر کے سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا۔

''قمار بازی؟'' اس نے کہا۔ ''میں اس کی قمار بازی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

گنز برگ نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے قہقہہ لگایا۔ اس وقت وہ اس کے پہلی منزل پر واقع اپارٹمنٹ کے لیونگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ''ہاں سیمی، تم جانتے ہو۔ تمہاری میز پر اندراج رجسٹر پڑا ہے اور میں نے تمہارے شیلف پر پوکر سیٹ بھی دیکھا ہے۔''

''تمہارے یہاں دو ٹیلی وژن سیٹ ہیں۔'' ریزو نے اضافہ کیا۔ ''ایک پر فکس گیم اور دوسرے پر ٹینس گیم چل رہا ہے۔'' پھر وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''جواری بھی ٹشے باز لوگوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر تم دو جواریوں کو نصف شب کے وقت کسی جنگل میں چھوڑ دو تو وہ بیس منٹ میں ایک دوسرے کو تلاش کرلیں گے اور اس پر شرط لگائیں گے کہ وہاں سے پہلے کون نکلتا ہے۔''

''ہم یہاں ایک قتل کی تحقیقات کے لیے آئے ہیں۔''

گنز برگ بولا۔ ''جب تم نے کچھ نہ بتانے اور خاموش رہنے کا فیصلہ کیا تو جانتے ہو کہ میں کیا سوچ رہا تھا؟ ممکن ہے کہ تم نے ہی مارٹن کو کھڑکی سے نیچے پھینکا ہو۔''

ریزو نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔ ہم تمہیں حوالات میں بند کر کے کھانا کھانے گھر جاسکتے ہیں۔''

سیمی کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ جلدی سے بولا۔ ''ہاں، وہ جوا کھیلتا تھا اور کبھی کبھی اس سلسلے میں خاصا متحرک بھی ہو جاتا لیکن وہ کبھی خستہ حال نہیں ہوا۔ ہمیشہ وقت پر کرایہ دیتا اور اس کے پاس پیسے ہوتے تھے۔ بس وہ کبھی کبھی تھوڑی سی تفریح کرلیتا تھا۔ حلفیہ کہتا ہوں کہ وہ مجھے پسند تھا اور میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ آج میں دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس گیا ہوا تھا جب واپس آیا تو اس کی لاش فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی تھی۔ تم چاہو تو اس کی تصدیق کرسکتے ہو۔''

''وہ تو ہم کریں گے۔ تمہارا ڈاکٹر کون ہے؟'' گنز برگ نے کہا اور اس ڈاکٹر کا نام اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔

ریزو نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ کس قسم کا جوا کھیلتا تھا؟''

سیمی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''وہ زیادہ تر کھیلوں میں دلچسپی لیتا تھا۔''

''کھیلوں پر شرط لگانا غیر قانونی ہے۔ سیمی اور مارٹی آن لائن ایسا کچھ نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی اس کے کمپیوٹر سے اس بارے میں کچھ معلوم ہوا پھر وہ یہ شرطیں کس طرح لگاتا تھا؟''

''میرا اندازہ ہے کہ کسی بکی کے ذریعے۔'' سیمی نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''کون سا بکی؟''

''یہ میں کیسے جان سکتا ہوں؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

''دیکھو سیمی۔'' گنز برگ نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے تمہارے ڈاکٹر کے نام والا پرچہ کہیں گم کر دیا ہے۔ ہم حوالات کیوں نہ چلیں۔ تم ایک کوٹھڑی میں بیٹھنا۔ تب تک میں وہ پرچہ تلاش کرلوں گا۔ اگر کل موقع ملا تو تمہارے ڈاکٹر کو فون کر کے جائے وقوعہ سے تمہاری غیر موجودگی کے بارے میں معلوم کرلوں گا۔''

سیمی نے گنز برگ کو دیکھا اور پُرامید انداز میں ریزو کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ اس نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہی ایک راستہ ہے۔''

سیمی نے کرسی کی پشت سے کمر لگائی اور انہیں ایک مقامی بکی کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کی بات ختم ہوگئی تو

ریزو نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''معاف کرنا یمی۔ تم سے کچھ اگلوانے کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔''

وہاں سے روانہ ہوتے وقت ریزو کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ برابر میں بیٹھے ہوئے گنز برگ نے اپنی نوٹ بک کھولی اور اس پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''ممکن ہے کہ بکی اسے تنگ کر رہا ہو اور مارٹی نے پریشانی کے عالم میں خودکشی کر لی۔''

''اس کا امکان ہے لیکن اس کے سیل فون کا نہ ملنا ابھی وضاحت طلب ہے۔'' ریزو نے کہا۔

گنز برگ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو۔ بکی کا ٹھکانا تو دوسرے راستے پر ہے۔''

''ہاں، پہلے میں ایک اور کام کرنا چاہ رہا ہوں۔ سب سے قریبی پھولوں کی دکان یہاں سے تین بلاک کے فاصلے پر ہے۔ ہم وہیں جا رہے ہیں۔ انجیلا اپنا کام کر رہی ہے اور وہ بالآخر مارٹی کی سابق گرل فرینڈ کا پتا لگا لے گی لیکن اس طرح ہمارا وقت بچ جائے گا۔''

گل فروش نے اپنی کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، یہ شخص مارٹی یونگ گزشتہ دو ہفتوں کے دوران پانچ مرتبہ یہاں آیا تھا؟''

''کسی عورت کو پھول بھجوانے کے لیے؟''

''ہاں لیکن تم کیسے جانتے ہو؟''

''اس عورت کا نام اور پتا کیا ہے؟'' ریزو نے پوچھا۔

پھول فروش ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ حالیہ دنوں میں مسٹر یونگ بہت اچھے گاہک بن گئے تھے۔ میں انہیں ناراض نہیں کر سکتا۔''

''تم واقعی ایسا نہیں کرو گے۔'' گنز برگ نے کہا۔ ''وہ مر چکا ہے۔''

وہ شخص سکتے میں آ گیا۔ ''مر چکے ہیں۔ اوہ میرے خدا، کیسے؟ وہ تو بالکل صحت مند دکھائی دیتے تھے۔''

''ہاں، وہ آٹھویں منزل کی کھڑکی سے گر پڑا اور زمین سے ٹکرانے کے بعد صحت مند ہونا کام نہیں آتا۔'' گنز برگ نے کہا۔ ''اس عورت کا نام اور پتا بتاؤ۔ ہمارے پاس بہت کم وقت ہے۔''

جیک کو زیادہ تر لوگ کینڈی مین کے نام سے جانتے تھے۔ اس وقت وہ اپنے کینڈی اسٹور کے کاؤنٹر پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنے سامنے موجود ریزو اور گنز برگ سے کہا۔ ''ہماری گفتگو آف دی ریکارڈ ہو گی؟''

''بالکل۔'' ریزو نے چہرے پر نرم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ''ہم ایک قتل کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ پارٹ ٹائم بکی ہمارے نشانے پر نہیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے پوچھو۔''

''تم مارٹی یونگ کے بکی تھے۔ اس کی کیا دلچسپیاں تھیں؟''

''بہت محدود۔ وہ صرف تفریحاً شرطیں لگاتا تھا۔''

''ہار جیت کے اعتبار سے اس کی قسمت کیسی تھی؟''

''اکثر وہ جیت جاتا تھا لیکن دوسروں کے مقابلے میں اس کی قسمت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مجھے تو پیسوں سے غرض ہے۔ چاہے کوئی ہارے یا جیتے۔''

''کیا تم مارٹی کے مقروض تھے؟''

''نہیں، ہم نے ہمیشہ اپنا حساب صاف رکھا۔ جب وہ آخری بار یہاں آیا تو میں نے اسے مکمل ادائیگی بھی کر دی تھی اس نے فکس پر شرط لگائی اور دو سو ڈالر جیتے تھے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

جیک نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر بولا۔ ''چند روز قبل وہ یہاں آیا تھا۔''

ریزو آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''تم اب بھی بلی ترک کو اپنے کاموں کے لیے استعمال کرتے ہو؟''

''کبھی کبھی وہ میرے لیے پیغام رسانی کرتا ہے لیکن میں نے کبھی اسے مارٹی کے پاس نہیں بھیجا۔ کسی نے مارٹی کو کھڑکی سے نیچے پھینکا تو وہ بلی نہیں ہو سکتا اور اگر وہ بلی ہی تھا تو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔''

ریزو کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''شکریہ جیک۔ فی الحال میں یقین کیے لیتا ہوں کہ مجھے تمہاری بات پر یقین آ گیا ہے۔''

جب وہ فورڈ کار میں اپنی اگلی منزل کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں گنز برگ کو انجیلا کی کال موصول ہوئی۔ اس نے فون سننے کے بعد ریزو کو بتایا۔ ''انجیلا نے جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کے مطابق مارٹی کے گرنے سے بیس منٹ پہلے یمی، ڈاکٹر کے کلینک سے نکل چکا تھا۔ یہ کلینک اس کے اپارٹمنٹ سے صرف دو بلاک کے فاصلے پر ہے۔''

''گویا اتنی دیر میں وہ واپس آ سکتا تھا۔''

''ہاں، انجیلا اور بوبی نے دوبارہ اس سے ملاقات کی تو اس نے بتایا کہ وہ راستے میں ایک جگہ کافی پینے رک گیا تھا جبکہ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ اس نے یمی کے ایک دانت کی فلنگ کی تھی۔ اس کے فوراً بعد گرم کافی پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''فی الحال اس پر مزید مت سوچو۔ ابھی ہمیں بلی ترک اور اس کے بعد سوزی سے بھی ملنا ہے۔ ہمیں یہ بھی فیصلہ کرنا ہوگا کہ کہیں جیک ہم سے غلط بیانی تو نہیں کر رہا۔''

انہیں بروکلین میں واقع راگو سا سوشل کلب پہنچ کر بلی ترک کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور نہ ہی وہ انہیں دیکھ کر حیران ہوا کیونکہ اس کا واسطہ آئے دن پولیس والوں سے پڑتا رہتا تھا اور وہ ان سے نمٹنا بھی جانتا تھا۔

''کیسے آنا ہوا؟'' اس نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کہیں جانا ہے۔''

''تم مارٹی یونگ نامی کسی شخص کو جانتے ہو جو ففتھ ایونیو پر رہتا تھا؟'' گنز برگ نے پوچھا۔

''نہیں۔ اسے کیا ہوا؟''

''وہ دو گھنٹے پہلے کھڑکی سے گر کر مر گیا ہے۔''

''اگر تم سمجھتے ہو کہ اس کی موت میں میرا ہاتھ ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لو۔'' اس نے ایک دوسری میز کی طرف اشارہ کیا جہاں چار آدمی تاش کی بازی جمائے بیٹھے تھے۔ سگریٹ اور شراب کا دور بھی چل رہا تھا۔

''وہ تمہیں بتائیں گے کہ میں پورے دن یہاں سے کہیں نہیں گیا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ کوئی اور بات ہے تو وہ بھی پوچھ لو۔ میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔''

''تم جا سکتے ہو۔'' ریزو نے کہا اور گنز برگ کے ساتھ کلب سے باہر آ گیا۔

چھبیس سالہ سوزی کولن ایک شاندار اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ اب تک ریزو اور گنز برگ نے اس سے زیادہ خوب صورت عورت نہیں دیکھی تھی۔ اس نے ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں اپنے سجے سجائے لیونگ روم میں لے گئی۔

''تمہیں زحمت دینے کے لیے معذرت خواہ ہوں مس کولن۔'' ریزو نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تمہارے لیے یہ بہت مشکل وقت ہے لیکن ہمیں اس حوالے سے کچھ سوالات کرنا ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم سمجھ رہی ہوگی۔''

''ہاں سارجنٹ، میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔ مارٹی بہت اچھا انسان تھا لیکن اس کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے میں تمہارے ساتھ پورا تعاون کروں گی۔''

''کیا تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟''

''ہاں۔''

ریزو نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عمدہ جگہ ہے۔ یقیناً بہت مہنگی ہوگی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کیا کام کرتی ہو؟''

وہ اپنے خوب صورت دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔ ''میں ایک اداکارہ ہوں۔''

''اچھا، ان دنوں تم کہیں کام کر رہی ہو؟''

''ہاں، میں نے حال ہی میں ایک چھوٹا سا کمرشل کیا ہے۔ اس میں ایک ایسی عورت کی بیٹی کا کردار ہے جو ایک عمارت کی اونچی منزل سے گرتی ہے اور پھر اٹھ نہیں پاتی۔''

ریزو نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے ضرور دیکھوں گا۔ اس نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً اس کام میں تمہیں اچھے پیسے ملتے ہوں گے؟''

''ہاں رائلٹی کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب ملے۔ اشتہار کے نشر ہونے پر ہی پیسے ملتے ہیں۔ دو سال سے بہت تنگی تھی پھر میرے ایجنٹ نے یہ اشتہار دلوا دیا۔''

ریزو نے اپنا نوٹ پیڈ کھولتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں مسٹر یونگ سے ملتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟''

''دو سال سے بھی کم۔ مارٹی کے ملنے سے چار مہینے پہلے ہی میں نیویارک آئی تھی۔ میں دراصل اوہیو کی رہنے والی ہوں لیکن وہاں اداکاری کے مواقع بہت کم تھے۔ اس لیے یہاں آ گئی۔''

''گویا تمہاری گزر اوقات اسی پر ہے؟''

''یقیناً۔ اس اپارٹمنٹ میں رہتے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اس دوران جتنا کرایہ ادا کیا ہے اس سے اوہیو میں دس مکان خرید سکتی تھی۔''

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ حال ہی میں تمہاری مارٹی سے علیحدگی ہوئی تھی۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''ہاں، اس کی وجہ میں ہوں۔ دراصل ہماری حیثیت میں فرق آ گیا تھا اور میں اس سے کافی آگے بڑھ گئی تھی۔ گو کہ مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے لیکن اس کمرشل کے بعد مجھے مختلف جگہوں سے کام کی پیشکش ہو رہی تھی اور لوگوں سے ملاقاتیں بڑھ گئی تھیں۔ مارٹی بہت اچھا شخص تھا لیکن بروکلین میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے کے باوجود وہ ایک چھوٹے شہر کا بندہ لگتا تھا۔ بالکل ان لڑکوں کی طرح جن سے میرا ہائی اسکول میں واسطہ پڑتا تھا۔ اس کی وجہ سے ہمارے درمیان فاصلے بڑھ گئے تھے۔''

''اس کی قمار بازی کے بارے میں کیا کہو گی؟''

''کیا؟'' وہ چونکتے ہوئے بولی۔

گنز برگ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، جس

کا حوالہ تم نے اسے بھیجی گئی آخری ای میل میں دیا تھا۔ لگتا ہے کہ تم اسے بھی ایک مسئلہ سمجھنے لگی تھیں۔''

سوزی نے ایک اور گہری سانس لی اور بولی۔ ''وہ محض ایک ناراضی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس کی وجہ سے اس کا میل جول ایسے لوگوں سے ہو گیا تھا جنہیں میں خطرناک سمجھتی تھی۔''

''لیکن یہ علیحدگی کی وجہ نہیں تھی؟'' گنز برگ نے پوچھا۔

''نہیں۔ اسے تعلقات بگڑنے کا ایک چھوٹا حصہ سمجھا جاسکتا ہے۔''

''مارٹی نے اس علیحدگی کا کیا اثر لیا؟'' ریزو نے پوچھا۔

''وہ بہت دکھی تھا اور بتدریج اس کا غصہ اداسی میں بدل گیا لیکن وہ اتنا پریشان ہو سکتا تھا کہ اپنا خاتمہ ہی کرلے۔ اوہ میرے خدا، کیا میں اس کی ذمے دار ہوں؟''

ریزو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں نہیں معلوم کہ یہاں کیا ہوا لیکن جو کچھ بھی ہوا، اس کے لیے اپنے آپ کو الزام مت دو۔ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔'' اس نے اپنی نوٹ بک بند کرتے ہوئے طنزاً کہا۔ ''اب تم اوہیو میں نہیں رہتی ہو۔''

فورتھ ایونیو کے ایک ریستوران میں تاخیر سے ڈنر کرتے ہوئے گنز برگ نے کہا۔ ''یبی کا کہنا ہے کہ جب مارٹی کھڑکی سے گرا تو وہ دور کہیں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ یکی کا کہنا ہے کہ اس وقت اپنے کینڈی اسٹور میں تھا۔ بلی ترک نے بھی چار گواہ پیش کردیے جو بتا سکتے ہیں کہ اس وقت وہ کلب میں تھا۔ سوزی کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھی ایک اسکرپٹ پڑھ رہی تھی۔ کہیں ہم کسی خانساماں کو تو نظر انداز نہیں کررہے؟''

''انجیلا نے سیکیورٹی ویڈیو دیکھنے کے بعد بتایا ہے کہ یبی، مارٹی کے گرنے سے چند منٹ پہلے آگیا تھا۔'' ریزو نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے وہ جھوٹ بول رہا ہے کہ جب واپس آیا تو مارٹی کی لاش سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ عمارت میں آنے اور جانے والے ہر شخص کی شناخت ہو سکتی ہے۔ خواہ وہ کرایہ دار ہو، پوسٹ مین یا ڈلیوری مین۔ دو انجانے مرد اور ایک عورت مارٹی کے مرنے سے پہلے عمارت میں داخل ہوئے اور بعد میں باہر گئے۔ انجیلا کا کہنا ہے کہ ان مردوں میں سے جیک یا بلی میں سے کوئی نہیں تھا۔ اس عورت کا نام بھی معلوم نہیں ہوسکا۔ ہمیں وہ ویڈیو دیکھ کر انہیں شناخت کرنا ہوگا۔''

گنز برگ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ہم سایوں کا تعاقب کررہے ہیں۔ وہاں رہنے والے دو سو کرایہ داروں میں سے کوئی بھی یہ کام کرسکتا ہے۔''

اسی وقت ریزو کے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے انجیلا بول رہی تھی۔ ''مارٹی کا ایک بھائی جرسی میں رہتا ہے۔ وہ ایک گھنٹے میں یہاں پہنچ جائے گا۔ تم اس سے بات کرنا چاہو گے؟''

''ہاں، ہم کھانا ختم کرکے آرہے ہیں۔''

مائیکل یونگ اپنے بھائی سے دو سال بڑا تھا۔ وہ انٹرویو روم میں ریزو اور گنز برگ کے بالمقابل بیٹھا ہوا تھا۔ ریزو نے پوچھا۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی؟''

''نہیں، بلکہ سب لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ وہ بہت بردبار شخص تھا اور زندگی کو آسانی سے گزارنے کا عادی تھا۔ اگر کوئی بات اور ہوتی تب بھی وہ بہت اچھا تھا۔''

''اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' گنز برگ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ یہ محض میرا اندازہ ہے۔ وہ بعض اوقات ضرورت سے زیادہ فیاض ہوجاتا تھا۔''

''کیا تمہارا اشارہ کسی خاص جانب ہے؟'' ریزو نے پوچھا۔

اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''شاید یہ اس کی گرل فرینڈ ہوسکتی ہے جس نے اسے دھتکار دیا تھا۔ کیونکہ اب اسے کام مل رہا ہے اور وہ اپنے اخراجات خود برداشت کر سکتی ہے۔'' اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''کیا شوبزنس کے سارے لوگ ایسا ہی منافقانہ رویہ اختیار کرتے ہیں یا صرف میں ہی ایسا محسوس کررہا ہوں؟''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' ریزو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن اس کے خلاف بھی نہیں بولوں گا۔''

''تم اپنے بھائی کی قمار بازی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' گنز برگ نے پوچھا۔

''میرے پاس بتانے کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ یہ ایک طرح سے اس کا مشغلہ تھا۔ اسے تم اس کے کام کا ایک حصہ بھی کہہ سکتے ہو۔ وہ انویسٹمنٹ کمپنی میں کام کرتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ مارکیٹ میں سرمایہ کاری کرنا بھی ایک طرح کا جوا ہے۔''

ریزو نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔ ''اس کی سابق

گرل فرینڈ سوزی کے بارے میں بتاؤ۔ جو کچھ بھی جانتے ہو، چاہے تمہارے خیال میں وہ کتنا ہی غیر اہم کیوں نہ ہو؟"

اس انٹرویو سے فارغ ہونے کے بعد ریزو اور گنز برگ نے اپارٹمنٹ ہاؤس کے داخلی دروازے پر لگے ہوئے سیکیورٹی کیمرے کی ویڈیو دیکھی لیکن بار بار دیکھنے کے بعد دونوں میں سے کوئی بھی ان تین انجانے لوگوں کو شناخت نہیں کرسکا۔ گنز برگ نے مایوسی کے عالم میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ شاید اس ویڈیو میں اس کی گرل فرینڈ نظر آجائے۔"

"ہماری ایسی قسمت کہاں۔" ریزو نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"اب کیا کرنا ہے؟"

"یہ کل سوچیں گے۔" ریزو نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب گھر چلو۔"

ریزو اپنے لیونگ روم میں آرام کرسی پر نیم دراز ریموٹ ہاتھ میں پکڑے ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس کے دماغ میں دن بھر میں ہونے والے واقعات گردش کررہے تھے۔ اس کی بیوی جینیفر نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا سونے کا ارادہ نہیں ہے؟"

اس نے مڑ کر بیوی کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "ابھی نہیں۔"

"کیا اس وقت بھی اسی کیس کے بارے میں سوچ رہے ہو جس پر تم نے اب تک کوئی بات نہیں کی؟"

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "بلی کا بچہ درخت میں پھنس گیا ہے۔ ہم اسے نیچے اتارنے کی ترکیب سوچ رہے ہیں۔"

"واقعی۔" جینیفر چلاتے ہوئے بولی۔ "کیا وہ بہت پیارا ہے؟"

"ہاں۔"

"اگر تم مجھ سے شیئر کرو تو شاید تمہاری کچھ مدد کرسکوں۔"

"تم اپنے ننھے دماغ پر اتنا زور مت ڈالو اور جا کر سو جاؤ۔"

اچانک ہی ریزو کی نظر ٹی وی اسکرین پر گئی اور وہ چونک پڑا۔ وہی کمرشل چل رہا تھا جس کا سوزی نے ذکر کیا تھا۔ ایک نوجوان سیاہ بالوں والی لڑکی بوڑھی عورت کی مدد کے لیے لپکی جو سیڑھیوں کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔ پس منظر میں اس کی آواز گونجی۔ "ممی، تم ٹھیک تو ہو؟"

ریزو نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور آہستہ سے بولا۔ "یہ وہی ہے۔"

دو دن بعد ریزو اور گنز برگ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے میز پر بینک ریکارڈ پڑا ہوا تھا۔ ریزو نے کہا۔ "تم نے دیکھا مارک، اس ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ یونگ نے بینک سے کچھ رقم نکالی اور ایک دو دن بعد سوزی نے وہی رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروادی۔ یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔" گنز برگ نے کاغذات دیکھتے ہوئے کہا۔

جیجی

سردار کے گھر لڑکی پیدا ہوئی۔
بیوی: سنو جی، جب یہ بڑی ہوگی تو لڑکے اسے چھیڑیں گے۔''
سردار۔ ''ہم نے اس مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔ ہم اس کا نام ''جیجی'' رکھیں گے۔''

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور

''گزشتہ چند ماہ سے وہ جو رقم جمع کروا رہی تھی، وہ یونگ کی نکالی ہوئی رقم سے مختلف تھی۔''
''ہاں، غالباً یہ کمرشل سے ہونے والی آمدنی ہوگی۔ اس کا ریکارڈ کمپیوٹر سے لینا ہوگا۔''
تھوڑی سی تلاش کے بعد ریزو کو سوزی کولن کے ایجنٹ کا پتا چلا گیا۔ اس نے فوراً ہی اس کا نمبر ملایا تو اس نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، کچھ عرصہ سے اسے کمرشل میں کام کرنے کی پیشکشیں ہو رہی تھیں اور اس کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو گیا تھا۔ اگر تمہیں تفصیل چاہیے تو اس کے لیے مجھے اپنے وکیل سے مشورہ کرنا ہوگا۔''
''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ریزو نے کہا۔ ''یہ معمول کی پوچھ گچھ ہے۔ تمہیں اس کمرشل کے بارے میں معلوم ہے جس میں وہ بیٹھی بنی ہے۔''
''ہاں، میں نے ہی وہ کمرشل اسے دلوایا تھا۔''
''کیا اس کمرشل کے لیے اس نے اپنے بال سیاہ کیے تھے یا وگ لگائی تھی؟''
''ہاں، یہ ڈائریکٹر کی خواہش تھی چنانچہ اس کے لیے اس نے وگ استعمال کی۔''
''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایکٹرز شوٹنگ کے دوران پہننے والے کپڑے اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ کیا وگ بھی واپس نہیں ہوتی؟''
''ایسا ممکن ہے۔ وہ ایک بہت بڑی ایجنسی کا شوٹ تھا اور وہ لوگ پانی کی طرح پیسا بہاتے ہیں۔ اگر سوزی نے وہ وگ اپنے پاس رکھنے کی خواہش ظاہر کی ہوگی تو انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''
''اس وگ کے بارے میں کس سے بات کروں۔ تم مجھے اس کا نمبر دے سکتے ہو؟''
''ہاں، میرا اسسٹنٹ تم سے بات کرلے گا لیکن......''
''میری بات غور سے سنو۔'' ریزو نے کہا۔ ''مجھے اس کا نمبر چاہیے اور تم اس گفتگو کے بارے میں سوزی کو کچھ نہیں بتاؤ گے، سمجھ گئے۔ یہ ایک معمول کی کارروائی ہے اور ہم قتل کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ تمہیں اس بارے میں اپنا ذہن صاف کر لینا چاہیے۔''
''ٹھیک ہے۔ میں اپنے اسسٹنٹ سے تمہاری بات کروا دیتا ہوں۔''
گنز برگ نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے سیکیورٹی ویڈیو کا منجمد فریم دیکھا اور بولا۔ ''تم نے صحیح اندازہ لگایا، یہ واقعی وہی ہے لیکن میں نے اسے کبھی اس حلیے میں نہیں دیکھا کیونکہ وہ تو سنہری بالوں والی پرکشش لڑکی ہے۔''
ریزو نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم اس کی جسامت پر غور کرو اور اسے دیکھو۔'' اس نے ویڈیو کے ایک ایک فریم کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ ''گو کہ اس نے پرانی وضع کا لباس پہن رکھا ہے لیکن اس میں بھی اس کا جسم نمایاں ہے۔ پروڈکشن اسسٹنٹ اور اشتہاری ایجنسی نے بھی تصدیق کر دی ہے کہ اس نے وہ وگ اپنے پاس رکھی تھی۔''
''گویا پہلے اس کا جھکاؤ پیسوں کے لیے مارٹی کی طرف تھا اور وہ اس سے رقمیں بٹورتی رہی پھر جب اس کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو گیا تو اس نے مارٹی سے قطع تعلق کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ بھیس بدل کر اس کے اپارٹمنٹ گئی اور اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا لیکن ایک سوال اب بھی باقی ہے۔''
''ہاں، میں جانتا ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ قتل کا محرک کیا تھا؟''
''بالکل اور ہم یہ سب کس طرح ثابت کر سکیں گے۔ وہ اس کی گرل فرینڈ تھی۔ کوئی بھی اچھا وکیل کہہ سکتا ہے کہ ٹھیک ہے۔ ماضی میں وہ اس سے پیسے بٹورتی رہی لیکن قتل کیوں کرے گی۔ اگر وہ اس سے دوبارہ رجوع کرنا چاہتی تو صرف ایک فون کر کے کہہ سکتی تھی کہ میں تمہاری بہت زیادہ کمی محسوس کر رہی ہوں۔''
ریزو نے ویڈیو پلیئر بند کیا اور بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ ہم اس سے ایک اور ملاقات کریں گے اور اس سے مزید اگلوانے کی کوشش کریں گے۔ پچھلی بار تو اس نے اپنی عمدہ اداکاری سے بے وقوف بنا دیا تھا۔''
''ٹھیک ہے تو پھر چلیں۔'' گنز برگ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
''ابھی نہیں۔ انجیلا نے مجھے بتایا ہے کہ کیمی کی جائے وقوعہ سے غیر موجودگی کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ڈینٹسٹ کے یہاں سے واپسی پر وہ میکڈونلڈ میں رکا

عید کے خوشنما رنگ جولائی 2016ء کے رنگا رنگ پاکیزہ کے سنگ
ماہنامہ پاکیزہ کراچی
نگہت سیما نے اعتبار وفا کا دکھایا دل پزیر اختتام
انجم انصار اور درثمن بلال کے ناولوں کی نئی اقساط
مدیحہ شاھد کے قلم کا جادو پتھر کا دیس بنا
نایاب جیلانی نے وا کیے وفا کے انوکھے باب
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی روح پرور کاوش...... یادوں کی مالا
معروف مصنفہ، اور دلنواز شاعرہ
ناھید فاطمہ حسنین
TO DOWNLOAD VISIT
PAKSOCIETY.COM
رضوانہ پرنس اور عالیہ حرا کی خوب صورت تحریریں
عید نمبر کے لیے بطور خاص
سیما بنت عاصم، نزہت جبین ضیا، سحرش فاطمہ،
غزالہ فرخ و دیگر قابل فخر لکھاریوں کی حسین کاوشیں
اس کے ساتھ ساتھ خوب صورت موضوعات و حکایات لیے دل خوش کن سلسلے صرف آپ جیسے خوش ذوق قارئین کے لیے

تھا لیکن وہاں کسی نے اس کی تصدیق نہیں کی۔"

"کیا ہم اب بھی اس پر نظر رکھے ہوئے ہیں؟"

"کچھ باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ پہلے یمی نے ٹالنے کی کوشش کی کیونکہ وہ بھی کو ملوث نہیں کرنا چاہ رہا تھا پھر اس نے اپنی واپسی کے بارے میں جھوٹ بولا لیکن اب ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ وہ مارٹی سے کتنا قریب تھا۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسی بات جانتا ہو جو سوزی کے لیے قتل کا محرک بن گئی۔"

"ہاں، ہم کافی قریب تھے۔" یمی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ وہ کرایہ دار تھا اور میں عمارت کا سپرنٹنڈنٹ۔ اس لحاظ سے ہمارے درمیان ایک تعلق تھا۔"

"اس کی گرل فرینڈ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

یمی کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ ان کا تعلق ختم ہو گیا تھا۔ اس نے مارٹی کو دھتکار دیا تھا۔"

"کیا مارٹی نے اس کی وجہ بتائی؟"

"اس لڑکی نے کوئی کہانی سنائی ہو گی لیکن مارٹی کو شک ہو گیا اور ایک رات اس نے لڑکی کا پیچھا کیا تو اسے ایک اور شخص کے ساتھ دیکھا۔ وہ کوئی پروڈیوسر تھا۔ مارٹی سمجھ گیا کہ وہ اپنے کیریئر کے لیے اس سے کھیل رہی ہے۔" یمی نے آنکھیں نیچی کرتے ہوئے کہا۔ "مارٹی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس سے بھی کھیلتی رہی تھی۔"

گنز برگ کو غصہ آ گیا اور وہ بولا۔ "یہ سب باتیں تم ہمیں پہلے نہیں بتا سکتے تھے؟"

"اس وقت تم مجھے حوالات میں بند کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ اس لیے میرے دماغ نے کام نہیں کیا۔ اب اگر تم ان خطوط پر کام کرو تو بہتر نتائج مل سکتے ہیں۔"

اینڈریو جیکب نے اپنے شاندار دفتر میں بیٹھے ان دونوں سراغ رسانوں کو دیکھا اور بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "تم کیا جاننا چاہتے ہو؟"

"گزشتہ ہفتے چار راتوں تک پولیس نے مس سوزی کولن کی نگرانی کی۔ ایک رات اس نے تمہارے ساتھ ڈنر کیا۔ دوسری شب وہ تمہیں ہوٹل سوفی ٹیل کے بارے میں ملی۔ تم دونوں نے ووڈ کا مارٹینی سے شغل کیا اور پھر ایک کمرے میں چلے گئے۔"

"اس سوال کا مقصد کیا ہے؟" جیکب نے پوچھا۔ "میری اپنی بیوی سے چھ سال پہلے طلاق ہو چکی ہے۔ میری بیٹی کالج میں پڑھتی اور میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔ اس لیے ہوٹل میں کمرا لینا مجبوری تھی لیکن میں اب بھی تمہارا مقصد نہیں سمجھا۔"

"ٹھیک ہے۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔" ریزو نے کہا۔

وہ دونوں ایک ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ریزو نے برگر پر کیچپ لگاتے ہوئے کہا۔ "گویا سوزی نے بیک وقت مارٹی اور اس پروڈیوسر سے تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ جب اسے کمرشلز ملنے لگے تو مارٹی اس کے لیے ناکارہ ہو گیا اور اس نے اسے دھتکار دیا۔ مارٹی نے اس کا تعاقب کر کے اسے پروڈیوسر کے ساتھ دیکھ لیا پھر بہت سی چیزیں جمع ہوتی گئیں جس کے نتیجے میں وہ اپنی جان سے گیا۔"

"ممکن ہے کہ اس نے سوزی کو دھمکی دی ہو کہ وہ جیکب کو سب کچھ بتا دے گا۔" گنز برگ نے کہا۔ "جیکب ناراضی کے عالم میں چند فون کرتا اور سوزی کے سارے خواب چکنا چور ہو جاتے۔ اس لیے ضروری تھا کہ جیکب تک پہنچنے سے پہلے مارٹی کا قصہ ختم کر دیا جائے۔"

یہ کہہ کر گنز برگ نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور بولا۔ "انجیلا اور بوبی نے مزید کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ اس کے مطابق سوزی کے پاس اوہیو میں ایک اعشاریہ بائیس کا ریمنگٹن آٹومیٹک ریوالور بھی تھا جسے وہ اپنے سامان میں باندھ کر یہاں لے آئی تھی۔"

"سوزی یہ ریوالور لے کر مارٹی سے ملنے گئی ہو گی۔"

"لیکن اس نے پہلے فون کر کے معلوم کر لیا تھا کہ وہ گھر پر ہی ہے۔ انجیلا نے اس کے سیل فون کا ریکارڈ چیک کیا ہے۔ اس نے مارٹی کے گرنے سے چند منٹ پہلے اسے عمارت کے قریب سے ہی فون کیا تھا۔"

"اب میں سمجھا کہ اس نے کھڑکی اور دروازہ کیوں کھولا تھا تاکہ سوزی کے آنے سے پہلے اپارٹمنٹ میں پھیلی ہوئی بو ختم ہو جائے۔ اسی جلد بازی میں اس نے اپنی انگلی زخمی کر لی۔ جب وہ آئی تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور مارٹی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا پردہ ٹھیک کر رہا تھا۔ اس کی پشت سوزی کی طرف تھی۔ اسے فوری طور پر خیال آیا۔ وہ آگے کی طرف لپکی اور اسے دھکا دے کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا پھر اس نے سوچا کہ مارٹی کے سیل فون میں کہیں جیکب کا نام اور نمبر نہ ہو اور کسی کو جیکب کے ساتھ اس کے تعلق کا پتا نہ چل جائے۔ چنانچہ وہ اس کا سیل فون اور ایڈریس بک بھی ساتھ لے گئی۔"

گنز برگ نے کہا۔ "یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن ہم اسے ثابت کیسے کریں گے؟"

"اس کے لیے ہمیں سوزی کو گھیرنا ہو گا۔" ریزو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے کہ وہ گھبراہٹ میں کچھ اگل دے۔ ہم اسے گرفتار کر کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لے سکتے

ہیں۔ اگر اس کے پاس سے ریمنگٹن برآمد ہوا تو اسے نیویارک میں رکھنا غیر قانونی ہے اور اگر وگ مل گئی تو ہم اسے ویڈیو سے ملا کر دیکھ سکتے ہیں۔"

"میں تم دونوں سے تنگ آچکی ہوں۔" سوزی کولن نے کہا۔ "تمہاری ہمت کیسے ہوئی اینڈریو جیکب سے بات کرنے اور اسے میرے بارے میں کچھ بتانے کی؟"

گنز برگ نے کہا۔ "ہم نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ تم ایک موقع پرست عورت ہو لہٰذا ہم نے صرف اس جانب اشارہ کیا تھا۔ ہم نے پتا لگا لیا ہے کہ تم ہی وقوعہ کے روز مارٹی کے اپارٹمنٹ میں گئی تھیں۔ سیکیورٹی کیمرے میں وہی چہرہ محفوظ ہے جو تمہارے کمرشل میں نظر آرہا ہے۔ دونوں میں ایک ہی وگ استعمال کی گئی ہے۔ تم نے ہم سے غلط بیانی کی کہ جب مارٹی کو حادثہ پیش آیا تو تم اپنے اپارٹمنٹ میں کوئی اسکرپٹ پڑھ رہی تھیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تم نے مارٹی کے گرنے سے چند منٹ پہلے اسے عمارت کے بالکل قریب سے فون کیا۔ تمہارے ٹیلی فون وائس میل پر بھی انہی اوقات میں دو پیغامات آئے جن کا تم نے جواب نہیں دیا۔"

"پڑھتے وقت میں فون کال اٹینڈ نہیں کرتی۔"

"ہم تمہارا کمپیوٹر بھی چیک کریں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ جس وقت مارٹی کا قتل ہوا۔ اس وقت یہ بند تھا بلکہ فیس بک اور سوشل میڈیا بھی......"

"میں نے تمہیں بتایا ہے کہ جب اسکرپٹ پڑھ رہی ہوتی ہوں تو......"

"یہ تم جیوری کو بتانا۔"

"کیا تم مجھے گرفتار کر رہے ہو؟" سوزی نے کہا۔ "یہ ناممکن ہے۔"

گنز برگ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہارا خیال ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ سب کچھ تمہیں وضاحت سے سمجھا دوں۔ ہمارے پاس ایک گواہ ہے۔ مارٹی کا دوست اور عمارت کا سپرنٹنڈنٹ۔ اس نے تمہیں اس حلیے میں دیکھا تھا اور وہ ویڈیو دیکھتے ہی پہچان گیا۔"

"نہیں۔" وہ پوری قوت سے چلائی اور ریزو کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا سارجنٹ ریزو۔ کسی نے نہیں۔"

ریزو مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمہیں گنز برگ کی کہی ہوئی ہر بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال اب تم اعتراف کر چکی ہو کہ تمہیں مارٹی کی عمارت میں جاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ گفتگو ریکارڈ ہو چکی ہے اور میں تمہیں مارٹن یونگ کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔ تمہیں حق ہے کہ......"

"بکواس مت کرو۔" وہ غراتے ہوئے بولی۔ "میں وکیل کو بلاتی ہوں۔ تم اسے کبھی ثابت نہیں کر سکو گے۔"

جب انجیلا پالسن، سوزی کو ابتدائی کارروائی کے لیے اسکواڈ روم لے گئی تو ریزو اور گنز برگ نے اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لے ڈالی۔ انہیں وہاں سے وہ تمام چیزیں مل گئیں جن کی تلاش تھی یعنی ریمنگٹن کا ریوالور، وگ، مارٹی کا سیل فون، ایڈریس بک اور وہ کپڑے جو اس نے قتل کے وقت پہن رکھے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ وہ یہ وگ لگا کر اپنے آپ کو زیادہ خوب صورت سمجھتی ہوگی۔ اسی لیے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔"

ریزو نے تمام چیزیں ایک بیگ میں رکھیں اور بولا۔ "انہیں ایسی چیزوں کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔"

جینیفر ریزو نے دو پیالیوں میں کافی انڈیلی اور اپنے شوہر سے بولی۔ "گویا تمہارا مشن کامیاب ہو گیا؟"

"ہاں۔" ریزو نے چسکتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ ایک دلچسپ کیس تھا لیکن مجھے خدشہ ہے کہ اس پر فردِ جرم عائد ہونے میں کچھ مشکلات پیش آئیں۔ ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن اس کے وکیل دفاع میں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"میں سمجھتی ہوں کہ تم نے زبردست کام کیا ہے۔"

ریزو نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "تم نے اس عورت کو نہیں دیکھا۔ اگر میں اس کا وکیل ہوتا تو اسے مشورہ دیتا کہ وہ جیوری کے لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے اپنی اداؤں اور جلوؤں سے کام لے۔ شرطیہ کہتا ہوں کہ دوسرے دن وہ سب اپنی بہترین قمیص پہن کر آتے۔"

"صرف مرد۔" جینیفر نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں۔" ریزو کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "تم اس سپرنٹنڈنٹ یکی کو جانتی ہو۔ وہ مارٹی کو بہت چاہتا تھا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اگر وہ یہ گواہی دے سکے کہ اس نے سوزی کو دیکھا تھا۔"

جینیفر نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور بولی۔ "اب اس قصے کو ختم کر دو۔ بلکہ وہاں جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تمہیں نظامِ انصاف پر بھروسا ہونا چاہیے۔ قانون اپنا راستہ خود نکال لے گا۔"

ریزو نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمارا کام قاتل کو تلاش کرنا تھا اور وہ ہم نے کر دیا۔"

آوارہ گرد

قسط 27

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ یہ پتا نہیں تھا کہ وہ ماں تھی کہاں؟ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا، ایک نئی عورت بھی اب اس کی آنکھوں کے سامنے تھی مگر اس کے ساتھ اس کا رویہ اچھا نہ تھا۔ چند ہی دنوں بعد باپ اسے نئی عورت کے ایما پر اطفال گھر میں چھوڑ کر چلا گیا جو یتیم خانے کی جدید شکل تھی، وہاں بوڑھے بھی رہتے تھے، جن کے بچوں نے انہیں یہاں چھوڑ کر خود کو یتیم سمجھنے میں زیادہ عافیت محسوس کی تھی۔ یہاں زیادہ تعداد ایسے بچوں کی تھی، جو ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ ادارہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ یہاں روایتی یتیم خانوں والی کوئی بات نہیں تھی بلکہ بچوں کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا۔ ادھر ہی شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرد بابا سے ہوگئی، جن کی حقیقت جان کر شہزی کو تکلیف دہ حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا مگر اس کے جوان اکلوتے بیٹے نے بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں اچانک چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ دینی و دنیوی تعلیم و تربیت کے ساتھ یہ ادارہ کامیابی سے چل رہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ یہاں رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا قبضہ ہونے لگا، پھر سب کچھ بدلنے لگا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں شوکت حسین، اس کی بہن شکیلہ، بلال، اشرف، ثریا، عابدہ سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گنگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گنگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ انسپکٹر روشن خان، چوہدری ممتاز خان کا کارندہ تھا۔ جو ان کے خفیہ اور گھناؤنے مقاصد کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ شہزی کا دشمن بن جاتا ہے اور اسے بے گناہ قانونی شکنجے میں جکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ، جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی ہے۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی ہے۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ ثریا اور شکیلہ وغیرہ کو کسی نائکہ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے شہزی اور اول خیر ملتان سے لاہور کا قصد کرتے ہیں۔ راستے میں بڑی سیاسی شخصیت زبیر خان کے لاڈلے اور بگڑے ہوئے بیٹے شفقت راجا کے ساتھ شہزی کی مڈبھیڑ ہوجاتی ہے۔ چنی بائی کے چنگل سے چھڑا کر شہزی، ثریا اور شکیلہ وغیرہ کو لاہور دارالامان پہنچا دیتا ہے۔ چھمنے کے معاملے میں شہزی اور اول خیر، کمیل دادا سے بھڑ جاتے ہیں، وہ زہرہ بانو المعروف ”بیگم صاحبہ“ اول خیر کو گروہ سے بے دخل کر دیتی ہے، بیگم صاحبہ کے سخت ترین حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا ہے، تب ہی یہ بھید کھلتا ہے کہ ممتاز خان کے باپ چوہدری الف خان نے ایک مغنیہ ستارہ بیگم سے محبت کی دوسری شادی کی تھی۔ ستارہ بیگم کی پہلے سے ایک بیٹی تھی، جو گود میں تھی، یہی زہرہ بانو تھی۔ زہرہ بانو، نسیم شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی بھی ہے۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ”اسپیکٹرم“ کا زونل چیف ہے، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں لگے ہوتے ہیں، لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی کارڈ کی حمایت حاصل ہونے کے باعث میجر ریاض کسی ٹھوس ثبوت کے وزیر جان اور چوہدری تھے، اس لیے لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو آزیری طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو مصلحتاً ڈراپ کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ کے علاج کے سلسلے میں امریکا روانگی کے وقت عابدہ اس کے ہمراہ ہوتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ جو ایک عالمی سطح کا ڈان ہے لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے والوں کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے اور اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہے جسے اپنی جان بچانے کی زیادہ فکر ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھے ہوئے ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنی ماں اور باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ ایک بھارتی جاسوس کے تعاقب میں وہ سرحد پار کر جاتا ہے اور بھارتی فرعون افسروں کے چنگل میں جا پھنستا ہے، مگر وہ دشمن کی ایک گھناؤنی سازش کو بے نقاب بلکہ ناکامی سے دوچار کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی کے افسران کی وہ لابی جو وطنِ عزیز کو دولخت کرنے کی مذموم سازش میں شامل رہی تھی، اپنی اسی سازش کی ناکامی پر تاج دین شاہ پر تشدد کی انتہا کر ڈالتی ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹکسی پے در پے ذلت آمیز شکست اٹھانے کے بعد دونوں کا آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ ہوجاتا ہے۔ بی آر بی کے کنارے شہزی اپنے دوستوں اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا وغیرہ کی مدد سے بلیو ٹکسی کے کرنل سی جی بھجوانی کا ایک منصوبہ ناکامی

سے دو چار کرتا ہے اور اپنے باپ کو اس کے چنگل سے بھی چھڑا لیتا ہے۔ شہزی، گمبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں گمبیل دادا کا شہزی کے سلسلے میں نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کا دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس نیویارک سٹی کی لبرل اینڈ اوور سیز سوسائٹیز کی عدالت سے سی آئی اے اینٹی ٹیریز کورٹ میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ٹاپ ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شپرز کے سلسلے میں لولوش آج کل برما (رنگون) میں مقیم ہے۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک سپر ٹاپ لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام جھلگری سے ہوتی ہے جو لاڑکانہ کا رہائشی ہے۔ شہزی کو میجر ریاض باجوہ کی بریفنگ کے دوران یاد آ جاتا ہے کہ یہ وہی آرکیالوجسٹ ہشام جھلگری ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لاڑکانہ میں روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولوش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے اسے ہائی جیک کر کے اب خود اس کا سربراہ بن بیٹھا تھا۔ ہشام پہلے تو شہزی پر شک کرتا ہے مگر جب اسے اس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک محبِ وطن شخص ہے تو پھر وہ اسے پاکستان میں موئن جو دڑو کے مقام سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے۔ جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک کے جنگی جنونی اور ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ جنگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ بلیو تکسی کے چندر ناتھ، شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو تکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو تکسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک بڑی تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے ایک جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوگ کو بے بس کر دیتا ہے، اس میں اس کی مدد چندر کلا کرتی ہے۔ سوشیلا بھی اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ بعد میں چندر کلا دھوکا دیتی ہے اور سے جی کوہارا اور بھوگ کی بربریت کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈ وانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہوتی ہے۔ وہ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونگوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا ہے۔ شہزی کے دشمن تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آ پہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جوگی بابا کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ سوشیلا بھی اس جانب دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ سامنے ڈاکٹر لیکھ رام کھڑا تھا، حواس باختہ اور گھبرایا ہوا سا......

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا......؟'' مجھ سے پہلے سوشیلا نے بدستور اس کی طرف تکتے ہوئے پوچھا تو وہ قریب آکر بولا۔

''وہ......وہ حویلی سے کچھ لوگ آئے ہیں۔ تمہیں اور شہزی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔'' سوشیلا کے چہرے پہ خوف کی پرچھائیں سی چمکی، خود میں بھی تشویش زدہ سا ہو گیا پھر سوشیلا نے ہی اس سے کہا۔

''مم......مگر کیوں؟ ہمارا ان سے بھلا کیا لینا دینا ہے؟ وہ کیوں ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا۔'' لیکھ رام بولا۔ ''مگر تم دونوں کو ان کے ساتھ جانا تو پڑے گا ہی۔''

''یہ اچھی زبردستی ہے۔ ہم ہرگز نہیں جائیں گے ان کے ساتھ۔'' سوشیلا نے کہا تو میں لیکھ رام کی طرف دیکھ کر اس سے بھانپنے والے انداز میں مستفسر ہوا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ ہمیں کیوں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں؟ اور...... کیا یہ بلاوا کہیں اسی مہارانی کا تو نہیں ہے؟ جس کے ساتھ جوگی بابا کا کوئی پُراسرار تعلق تھا؟''

''حویلی والوں کا مطلب، مہارانی ہی ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر لیکھ رام ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن...... مجھے تو یہی لگتا ہے کہ اُن تک جوگی بابا کی ہلاکت

کی خبر پہنچ چکی ہوگی اور ظاہر ہے تم اس پوروائی میں نووارد ہو۔ اس لیے پہلا شک تم دونوں پر ہی گیا ہوگا مہارانی کا......"

"تمہارا کیا خیال ہے، ہمیں ان کے ساتھ چلے جانا چاہیے؟ زیادہ سے زیادہ اپنی صفائی ہی پیش کرنا ہوگی اور کیا ہوگا؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں! میرا بھی یہی مشورہ ہوگا کہ تم دونوں کا انکار اُنہیں مزید شبہے میں مبتلا کرسکتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ آپ چلے ہی جائیں، ورنہ وہ آپ کے ساتھ زبردستی بھی کر سکتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ ایسی کوئی نوبت آئے۔"

"یہ مہارانی کیا کسی راجے مہاراجے کی پتنی ہے یا......" استفسار یہ کہتے ہوئے سوشیلا نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، اُس عورت کا نام ہی مہارانی ہے، ایک جوان خوب صورت بیوہ عورت ہے۔ بس ذرا زمیندارنی قسم کی خاتون ہے، اس کا پتی پوروائی کا مکھیا ہوا کرتا تھا۔ بڑی رعب داب والی عورت ہے، اگر تم اس کے ساتھ ادب احترام سے پیش آئے اور اُسے قائل کر دیا تو وہ تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں پیدا کر سکتی۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ کم تشویش والی بھی نہیں ہے کہ جونگی بابا کو اس کا خاص التفاف حاصل تھا۔ وہ ذرا مشکل سے ہی قائل یا رام ہوسکتی ہے۔"

"چلو پھر، ہم تیار ہیں ساتھ جانے کے لیے۔" میں نے دل ہی دل میں ایک مسکت سا فیصلہ کیا۔ سوشیلا نے میری طرف ذرا حیرت سے دیکھا تھا، میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو ایک تشفی آمیز سی جنبش دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ڈاکٹر لیکھ رام کے ساتھ اس کے کلینک نما گھر سے باہر آئے۔ سامنے دیکھا تو ایک پرانے ماڈل کی لمبی سی جیپ کھڑی تھی۔ اس کے پاس چار تیم تیم افراد کھڑے تھے، جنہوں نے کھلے گھیر والی شلوار قمیصیں پہن رکھی تھیں۔ ان کی پشت سے رائفلیں جھول رہی تھیں اور سروں پہ پرانے اسٹائل کے پگڑ بندھے ہوئے تھے۔ چہرے پہ بڑی بڑی گھنی مونچھیں، ان کے تیوروں کو مزید کرخت بنائے ہوئے تھیں۔ وہ خاصی تیز نظروں سے ہماری طرف گھور رہے تھے، جس سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ہمارے انکار پر ہمیں زبردستی بھی ساتھ لے جانے کے لیے پر تولے ہوئے تھے۔

ہمیں انہوں نے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا، ایک نے جیپ کا عقبی دروازہ پہلے ہی کھولے رکھا تھا، ڈاکٹر لیکھ رام واپس گھر میں جانے لگا تو ایک حواری نے اُسے بھی درشت سی آواز میں پکارا۔

"ہے...... ڈاکٹر! تجھے بھی ہمارے ساتھ چلنا ہے۔" اس کی آواز پر ڈاکٹر لیکھ رام کی پیشانی پر تفکر کی ایک ذرا سلوٹ سی ابھری، پھر وہ بھی بے چون وچرا...... ہمارے ساتھ ہی جیپ کے عقبی حصے میں سوار ہوگیا۔ بستی کے دیگر لوگ بھی کھڑے ہماری طرف آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے، ان کے لیے یہ سب جیسے کوئی بغیر ٹکٹ کا تماشا ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جیپ روانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

کچے اور بل کھاتے راستے پر جیپ ہچکولوں کے درمیان دوڑی جارہی تھی۔ آبادی اور کچے گھروں کا سلسلہ پیچھے رہ گیا تھا، دائیں بائیں کھیت کھلیان پھیلے ہوئے تھے۔ سہ پہر اب شام میں ڈھلنے لگی تھی۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ تھوڑی دیر میں کھیتوں کے سلسلے عنقا ہونے لگے تو اس کی جگہ بنجر سے میدان نے لے لی۔ کچھ دور چلنے کے بعد درختوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس مختصر سے نظر آنے والے جنگل کے بیچوں بیچ ایک قدرے بلند اور مسطح قطعہ اراضی پر ایک قدیم طرز کے چبوتروں والی مٹیالے رنگی اینٹوں کی بلند و بالا حویلی کے بڑے سے چوبی پھاٹک کے سامنے جیپ ذرا رکی تو اگلے ہی لمحے دونوں دروازے جیسے خودکار انداز میں وا ہوتے چلے گئے، جیپ اندر داخل ہوگئی۔

جیپ رینگنے کے انداز میں تھوڑا اور آگے بڑھی تو مجھے دو تین شکاری طرز کے کتے دکھائی دیے تھے۔ تاہم کچھ مخصوص لباس میں خدام ٹائپ کے افراد بھی وہاں متر گشت کرتے نظر آئے۔ سامنے حویلی کا محراب والا مرکزی دروازہ تھا۔ جیپ ادھر ہی رکی تھی۔ دو رائفل بردار دروازے کے دائیں بائیں تنے کھڑے تھے۔ ہمیں دو افراد جیپ سے لے کر اترے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ میں اطراف کا جائزہ لیتا ہوا اندر داخل ہوا تو مجھے ایک خوشگوار سی خنکی کا احساس ہوا، پہلے تو مجھے اس پر ائرکنڈیشنڈ کا گماں ہوا تھا، جلد ہی مگر پتا چلا کہ یہاں اس نام کی کوئی شے سرے سے نہ تھی۔ ہاں، حویلی کی بناوٹ ہی کچھ ایسے احرام کے طرز کی تھی کہ یہاں سے ہوا گزر کر خنک ہو جاتی تھی۔ تاہم ایک بات میں محسوس کیے بنا نہ رہ سکا تھا کہ یہ جتنی بڑی حویلی تھی اس کے مکین اتنے ہی کم تھے۔ ابھی تک

خدام اور خادمائیں ہی نظر آئی تھیں، ممکن تھا اندر اور بھی کچھ ظہور پذیر ہوتا۔ ہم ایک بلند چھت والے ہال میں داخل ہو چکے تھے۔

مجھے اور سوشیلا کو ایک بوسیدہ سے فرنیچر والے گوشے کی طرف لاکر بٹھا دیا گیا جبکہ ڈاکٹر لیکھ رام کو ہال کے ابتدائی گوشے میں ٹھہرے رہنے کا حکم ملا تھا۔

تھوڑی دیر گزری تو ایک خاصی دراز قامت عورت اندر داخل ہوئی، جو میرے تصور سے بالکل مختلف تھی اور اس پر مجھے کافی حیرت بھی ہوئی تھی، وہ اگرچہ اتنی کم عمر بھی نہ تھی، تاہم مہارانی جیسے لقب اور پوری بستی سمیت حویلی میں اس کا جو رعب و دبدبہ نظر آرہا تھا، اس کے مطابق اسے کم از کم تیس، پینتیس سے تو اُوپر ہی ہونا چاہیے تھا مگر وہ اس کے برعکس بمشکل چوبیس، پچیس کی ہی نظر آتی تھی۔ رنگ قدرے سانولا مگر پُرکشش تھا۔ بال گھنے تھے اور شانوں پر سیاہ گھٹاؤں جیسے پھیلے ہوئے تھے۔ نرم گالوں سے تازگی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی اور گداز لب خاصے سیکس اپیل لگتے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی کشادہ اور قدرتی کاجل لیے ہوئے تھیں، مگر ان آنکھوں میں نامعلوم سی اداسی کا شائبہ سا ہلکورے لیتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ سوشیلا سے چند سال ہی چھوٹی لگتی تھی۔ اس وقت اس کا پُرکشش اور حسین چہرہ برہمی اور غصیلے پن کی وجہ سے خاصا بگڑا ہوا ہی نظر آرہا تھا۔

اس نے ایک نگاہ سوشیلا اور پھر میرے چہرے پر ڈالی۔ رفتہ رفتہ اس کے چڑھے ہوئے تیور بھی معمول پر آتے محسوس ہونے لگے۔ اس کے ہمراہ وہی تندو نامی شخص بھی تھا جسے میں جونگی بابا کی مڑھی میں دیکھ چکا تھا، تب مجھے فوری اندازہ ہو گیا تھا کہ اسی نے اب تک کی حقیقت سے مہارانی کو آگاہ کیا ہوگا اور یوں ہمارا حویلی میں فوری طور پر 'بلاوا' آگیا تھا۔

''رام...... مہارانی جی!'' سوشیلا نے اس کی طرف دیکھ کر احتراماً کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو میں بھی کھڑا ہو گیا اور سوشیلا کی طرح میں نے بھی محض اپنے سر کے خفیف اشارے سے اسے سلام کیا تھا۔ اندازہ مجھے ہو چلا تھا کہ یہی وہ مہارانی صاحبہ تھیں جس کی طرف سے زبردستی بلاوا آیا تھا۔

''کون ہو تم دونوں؟ اور کہاں سے آئے ہو؟'' مہارانی نے خاصے درشت لہجے میں ہم دونوں کے چہروں کا باری باری جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''میرا نام سوشیلا ہے اور یہ میرا ساتھی شہزاد احمد ہے۔ ہم ممبئی سے ایک سفری لانچ میں احمد آباد جا رہے تھے۔''

میری دانستہ خاموشی پر سوشیلا نے ہی اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''راستے میں ہماری لانچ میں خرابی پیدا ہو گئی اور ساتھ ہی ہم ایک طوفان کا شکار ہو گئے تھے۔ بالاسور کے ساحل پر ہم کسی طرح تیرتے ہوئے پہنچے اور پھر......''

''جونگی بابا کو تم نے کیوں ہلاک کیا تھا؟'' مہارانی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے درشتی سے پوچھا تو اس بار میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مہارانی صاحبہ! آپ کو اس بارے میں شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم دونوں تو خود خاصے زخمی حالت میں بالاسور کے ایک ویران ساحل سے آن لگے تھے، کیونکہ ہماری لانچ پر بحری قزاقوں کے ایک ٹولے نے ہلا بول دیا تھا۔ ہمیں جنگل میں ایک مڑھی نظر آئی اور جان بچانے کے لیے ہم نے اسی طرف رخ کیا تھا، کیونکہ بالاسور کا یہ ساحل قریب ہونے کی وجہ سے وہ بحری قزاق ساحل تک ہمارا تعاقب کرتے ہوئے آ گئے تھے۔ جونگی بابا تو ہمارا محسن تھا، اس نے میری اور میری ساتھی سوشی کی مرہم پٹی کی تھی اور اپنی جونکوں سے علاج کیا تھا کہ اسی دوران قزاقوں کے ساتھی وہاں آن پہنچے، میں اپنی ساتھی کے ساتھ کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلا تھا، پھر بعد میں وہاں کیا ہوا، اس کا ہمیں علم نہیں...... لیکن مجھے خود ذاتی طور پر بھی جونگی بابا کے مرنے کا افسوس ہے۔''

میں نے پوری صفائی کے ساتھ آدھے سچ میں آدھا جھوٹ شامل کرتے ہوئے مہارانی سے پورے اعتماد بھرے لہجے میں کہا تو اس کے چہرے پر کچھ اُلجھے ہوئے سے تاثرات ابھرے تھے اور پھر اس نے اپنے ساتھ کھڑے خاص حواری تندو کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے اس کی مستفسرانہ نگاہوں کا مطلب جان کر مؤدبانہ بولا۔

''مہارانی جی! جب میں وہاں گیا تھا تو یہ واقعی وہاں جونگی بابا کی مڑھی میں ایک چارپائی پر بیمار حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ بعد کا تو مجھے بھی صحیح علم نہیں کہ پھر وہاں کیا ہوا تھا؟'' اس کے جواب پر میں نے بے اختیار دل میں طمانیت محسوس کی۔

میری نظریں مہارانی کے اُلجھے ہوئے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ شاید اب تک ہمیں جونگی بابا کا قاتل سمجھے ہوئے تھی (اگرچہ یہ غلط بھی نہ تھا) لیکن: میرے محتاط انداز کے جواب اور تندو کی بات نے اُس کا یہ 'یقین' متزلزل کر کے رکھ دیا تھا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے مزید کہا۔

''آپ دیکھ ہی رہی ہیں مہارانی صاحبہ ہماری حالت کو...... اس سے زیادہ ہم اپنی صفائی میں اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

''ڈاکٹر لیکھ رام کو پیش کرو یہاں......'' اچانک مہارانی نے بہ آواز بلند کہا۔

ذرا ہی دیر بعد ڈاکٹر لیکھ رام کو وہاں پیش کردیا گیا۔ مہارانی نے اس کی طرف غضب ناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''یہ دونوں تم تک کس حالت میں پہنچے تھے؟''

''مہارانی صاحبہ! ان دونوں کو جے پرکاش لایا تھا۔ اپنی بیل گاڑی میں بٹھا کر۔ تب شہزاد کی حالت بہت خراب تھی، اسے بڑا تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔''

''جھوٹ مت بولنا ہم سے...... ڈاکٹر لیکھ رام! جانتے ہو ناں ہمیں، ہم بال کی کھال نکال کر اصل مجرم کو بالآخر ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ جونکی بابا کے ہمارے ساتھ کیسے تعلقات تھے اور وہ ہمارے لیے کس قدر اہم آدمی تھا، یہ تم سمیت پوری بستی کے لوگ جانتے ہیں۔ ہم اس کے قاتل کو نہیں چھوڑ سکتے، اسے تلاش کرکے ہی رہیں گے۔''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں مہارانی صاحبہ! جے پرکاش دور نہیں، اس سے آپ پوچھ سکتی ہیں۔'' ڈاکٹر لیکھ رام نے کہا۔ وہ مہارانی سے کچھ زیادہ خائف نظر نہیں آرہا تھا اور ٹو دی پوائنٹ بات کررہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے یہاں کے حالات کا بہت کچھ علم تھا۔

''ہوں ں ں......'' مہارانی نے گہری اور پُرسوچ ہمکاری بھری، پھر ایک نگاہ سوشیلا پر ڈالنے کے بعد براہ راست مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔

''تم دونوں ابھی کچھ روز ادھر ہی رہو گے، جب تک ہمیں تمہارے سلسلے میں پوری تسلی نہیں ہوجاتی۔'' اُس نے جیسے اپنا زبردستی کا فیصلہ ہمارے سر تھوپ دیا جس پر میں پریشان سا ہوگیا اور فوراً ہی احتجاجی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو آپ ہمارے ساتھ زیادتی کریں گی مہارانی صاحبہ! جبکہ میں نے تو اپنی صفائی پورے ثبوت کے ساتھ، آپ کے سامنے پیش بھی کردی ہے۔ لہٰذا ہمیں جانے دیا جائے اب......''

''ہرگز نہیں۔'' وہ مسکت لہجے میں بولی۔ ''ہم تم دونوں کو یہاں قیدی کی صورت نہیں بلکہ مہمان کی حیثیت سے رکھیں گے۔ اسے ہماری طرف سے ایک خاص رعایت سمجھو، یہ چند روز تم ہمارے مہمان گاہ میں گزارو گے۔ بس! اس حویلی سے باہر جانے کی اجازت نہیں حاصل ہوگی تم دونوں کو...... یہی ہمارا آخری فیصلہ ہے۔''

میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ڈاکٹر لیکھ رام نے مجھے آنکھ کے مخصوص اشارے سے خاموش رہنے پر مجبور کردیا اور میں ایک ٹھنڈی سانس خارج کرکے رہ گیا۔

مہارانی نے جاتے جاتے میری طرف دیکھ کر قدرے نرمی سے کہا۔ ''تم دونوں آج رات جل بھوجن (کھانا وغیرہ) ہمارے ساتھ کرو گے۔''

''شکریہ مہارانی صاحبہ!'' میں نے سر کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ اُس نے ایک گہری گہری نگاہ مجھ پر ڈالے رکھی اور پھر پلٹ کر باوقار قدموں کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ نندو کے کان میں البتہ اس نے جاتے وقت کچھ کہا تھا، یہی وجہ تھی کہ مہارانی کے جاتے ہی وہ ہماری طرف بڑھا اور بولا۔

''آیئے۔'' اس کے انداز میں بھی ہمارے لیے احترام در آیا تھا۔ ہم اس کے ساتھ ہولیے۔ وہ ہمیں ایک زینے کے ذریعے بالائی منزل کے ایک قدرے کشادہ کمرے میں لے آیا۔

''آپ یہاں آرام کریں۔ اندر الماری میں زنانہ و مردانہ کپڑے موجود ہیں۔ اپنے ناپ کے دیکھ کر پہن لیجیے گا۔ وہ سامنے ہودی (غسل خانہ وغیرہ) ہے۔'' اس نے اشاروں کے ساتھ بتایا۔ اس کے بعد چلا گیا۔

''مہمان بلائے جان تو سنا تھا، یہاں تو معاملہ ہی الٹا نکلا، میزبان بلائے جان ہوگیا......'' نندو کے جاتے ہی سوشیلا نے جل کر کہا۔ میں اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگیا۔ کمرے میں مجھے فقط دو دریچے ہی نظر آئے تھے، ایک وسیع احاطے اور لان میں کھلتا تھا جبکہ دوسرا حویلی کی عقبی سمت۔ میں اسی طرف کو بڑھا اور چوبی کواڑوں پر لگی ''ملی'' ہٹا کر کواڑ تھوڑا کھول کے دیکھا اور پُرسوچ انداز میں باہر دیکھنے لگا۔

میرے سامنے جنگل جلیبی اور تیندو بیج کے درختوں سے اٹا پڑا گھنا جنگل تھا جو اس وقت شام کی ملگجی سی تاریکی میں خاصا پُراسرار نظر آرہا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر اپنا سر دریچے سے باہر نکال کر نیچے جھانکا۔ ایک اندازے کے مطابق اُوپری منزل سے نیچے کا فاصلہ اتنا بہرحال نہیں تھا کہ کوئی یہاں سے فرار ہونے کے لیے نیچے چھلانگ لگانے کی بے وقوفی کرتا، جو ظاہر ہے سیدھے سبھاؤ خودکشی کے ہی

مترادف ہوتا۔

"ایک لمبی رسی میسر آجائے تو یہاں سے فرار آسان ہوسکتا ہے۔" سوشیلا نے ہولے سے میرے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔ میں ذرا چونکا۔ وہ نجانے کب میرے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھی۔ زیرک دماغ تھی اسی لیے فوراً بھانپ گئی تھی کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔

"تمہاری بات ٹھیک ہے۔" میں دریچے کا کواڑ آدھ کھلا چھوڑ کر واپس پلٹ آیا۔

"لیکن اگر ہم ناکام ہو گئے تو اس خود ساختہ مہارانی صاحبہ کا پورا پورا یقین ہم پر ہو جائے گا کہ ہم ہی جوگی بابا کے......"

"شش......" میں نے اُنگلی ہونٹوں پہ رکھ کر اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ "دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں......"

"یہ کوہارا کی یوٹ نہیں ہے، جو ہماری گفتگو ایک ڈیوائس پر دوسرے کمرے میں آرام سے بیٹھ کر سن رہے ہوں۔" وہ بولی۔

"لیکن باہر دروازے پر تو کوئی کان لگائے ہماری گفتگو سن سکتا ہے ناں بے وقوف!" میں نے سوشیلا کو ہلکے سے جھڑکنا مناسب سمجھا تو وہ اس بار پہلے سے بھی زیادہ مدھم سی آواز میں بولی۔

"ہم کھل کر آپس میں باتیں نہیں کریں گے تو آئندہ کی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیسے کریں گے؟" اس کی بات بھی ٹھیک تھی۔ میں نے اس بار ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

"ہاں! اتنے والیم میں باتیں کرنا ٹھیک رہے گا۔"

"ہمیں سنجیدگی سے اور جلد از جلد یہاں سے فرار ہونے کا کوئی لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا......" وہ ہلکی آواز میں بولی۔ "مت بھولو کہ ہمارے دشمنوں کا مشترکہ ٹولا یہاں آن پہنچا ہے اور اُنہیں اب تک بستی کے لوگوں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم اسی بستی میں ہیں اور کس کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"مجھے اسی بات کی تو سب سے زیادہ تشویش ہو رہی ہے۔ اگر وہ ادھر آنکلے تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ زمیندارنی ٹائپ مہارانی ان کا راستہ روک سکے گی بلکہ ہمارا بھی پول کھل جائے گا۔"

"پھر تو ہمیں رات کا انتظار کرنا ہوگا، تب ہی فرار کی یہ کہانی مکمل ہو سکے گی۔" سوشیلا نے کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں نہا دھو کر ذرا فریش ہو جانا چاہیے، پتا نہیں کب یہ نیچے سے مہارانی صاحبہ کا جل بھوجن کا بلاوا آجائے۔"

وہ مسکرائی، ان حالات میں سوشیلا کی زندہ دلی میرے حوصلوں کو بھی تقویت بخش رہی تھی۔ میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا، ساتھ ہی ہولے سے کہا۔ "پھر بھی ہمیں ہر لحہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر لیکھ رام کے ہاں کسی خادم کو بھیج کر میری دوائیاں اور مرہم پٹی کا سامان منگوالیا گیا تھا، جو مجھے تندوہی دینے آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سوشیلا نہا دھو کر نکلی تو کمرے کی روشنیوں میں، وہ مجھے کھلتے گلاب کی طرح نظر آنے لگی۔ وہ بڑا سا باتھ ٹاول لپیٹے ہی باہر نکل آئی تھی۔ شاخِ گل جیسا اس کا سیم تن وجود پر بہار سا نظر آرہا تھا، سوشیلا واقعی ایک حسین اور طرح دار عورت تھی۔ اس کے گیلے بال نیم برہنہ شانوں پر پھیلے ہوئے تھے، دھلے نکھرے چہرے پر ہی نہیں اس کے بدن پر بھی شبنمی قطرے، موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

میں نے اس کی طرف سے نظریں پھیر لیں، میں اپنے ناپ کے کپڑے الماری سے نکال چکا تھا۔ ایک سیاہ پینٹ اور ہلکے بلیو کلر کی شرٹ پسند کی، اس کے بعد تولیا سنبھالے میں نے باتھ روم کا رخ کیا۔ تھوڑی دیر بعد نہا کر نکلا تو سوشیلا بھی اپنے لیے کپڑے نکال چکی تھی۔

وہ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑی میں ملفوف تھی، اور خاصی حسین لگ رہی تھی۔ ساڑی کس کر اور خاص انڈین کاٹھیاواڑی اسٹائل میں باندھی گئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی اور میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ، ان حالات میں تمہیں کیا سوجھی؟"

"کیا مطلب؟" وہ اپنی گھنیری پلکیں جھپکا کر میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"میں نے کوئی مشکل بات نہیں کی۔" میں متانت سے بولا۔ "ہمیں کسی بھی وقت یہاں سے فرار ہونا ہے اور ایسے میں تمہیں کوئی عام سا شلوار سوٹ پہننا چاہیے تھا۔ یہاں کوئی دعوت تو نہیں ہو رہی کہ تم نے یہ بھاری بھرکم ساڑی پہن لی۔"

میری بات پر وہ خاص بھیدوں بھری مسکراہٹ سے بولی۔ "میں اس میں خود کو کافی ریلیکس فیل کر رہی ہوں۔ اسی طرح ہم پر خفیہ کڑی نگرانی کرنے والے بھی ریلیکس ہی رہیں گے، یعنی ہماری طرف سے ان کو یہ پتا نہیں چلے گا کہ ہم یہاں سے فرار کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔"

پتا نہیں اس میں واقعی اس کی چالاکی کا دخل تھا یا پھر یہ

اس کی دانستہ حرکت تھی، میں نے خاموشی اختیار کرلی۔

تھوڑی دیر گزری، مجھے سے مہارانی کا بلاوا آگیا۔ ایک نوعمر لڑکی نے آکر ہمیں مطلع کیا تھا کہ مہارانی جی نیچے کھانے کی میز پر ہمارا انتظار کررہی ہیں۔

میں اور سوشیلا مذکورہ خادمہ کے ساتھ نیچے پہنچے۔ وہ ہمیں ایک ایسے کمرے میں لے آئی جہاں معمول کے مطابق ہر شے سادہ تھی، سادہ فرنیچر، اور عام سے درو دیوار، وہ بھی بغیر رنگ و روغن کے۔ حیرت کی بات تھی کہ مہارانی کے سوا اب تک مجھے یہاں اور کوئی حویلی کا مکین دکھائی نہیں دیا تھا۔

بہرحال ہم دونوں خاموشی سے میز کی جانب بڑھے اور ساتھ ساتھ دو کرسیوں پر بیٹھ گئے، ہمارے سامنے والی کرسی پر مہارانی براجمان تھی۔ ذرا فاصلے سے تندو بھی موجود تھا۔ میں نے دُزدیدہ نظروں سے مہارانی کے چہرے کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ سوشیلا کو بڑی خاص نگاہوں سے تکے جارہی تھی۔ پھر میری بھانپتی ہوئی نظروں نے اس کے ملیح چہرے پر ہلکی تلخ سی مسکراہٹ ابھرتے دیکھی، جس میں طنز کا عنصر غالب تھا۔ تاہم ایک خاص قسم کی چمک بھی اس کی آنکھوں سے مترشح محسوس ہوتی تھی، جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔

مہارانی کی سنگت میں رات کا کھانا قدرے خاموشی میں کھایا گیا۔ کھانا بلاشبہ پُرتکلف تھا۔ کھانے کے اختتام پر جب میں اور سوشیلا رخصت ہونے کے لیے میز سے اُٹھنے لگے تو مہارانی نے سوشیلا کو تو کمرے میں جانے کی اجازت دے ڈالی البتہ مجھے روک لیا۔ سوشیلا میری طرف قدرے اُلجھن آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگی تو میں نے اُسے اپنے سر کا مخصوص اثباتی اشارہ کیا۔ وہ پلٹ گئی۔ میں مہارانی کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے مجھ سے بولی۔

''آؤ...... میرے ساتھ'' میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک طرف کو چلی تو میں نے بھی اس کی تقلید کرڈالی۔ ہم نچلی منزل کی ایک تنگ سی راہداری سے گزرنے لگے، یہاں نیم تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔ میں مہارانی سے صرف تین چار قدموں کے فاصلے سے چل رہا تھا۔ اس نے سفید رنگ کا مہین سا سوٹ پہن رکھا تھا، جس کے آرپار اس کے ہوشربا جسمانی نشیب و فراز کی جھلک بھی نظر آجاتی تھی، مگر میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی، اُلجھن تو مجھے یہ تھی کہ یہ مجھے کہاں اور کیوں لے جارہی تھی؟ جہاں ہم پہنچے، یہ کوئی مختصر سی نشست گاہ تھی۔

ہم یہاں دو صوفہ ٹائپ کرسیوں پر آمنے سامنے براجمان ہوگئے۔ میں نے ایک بات محسوس کی تھی، یہاں بھی روشنی ہلکی ہی تھی یا دانستہ مدھم رکھی گئی تھی اور مہارانی جس کرسی پر براجمان تھی، وہاں روشنی کا زاویہ کچھ یوں تھا کہ اس کا چہرہ نیم تاریکی میں چھپ کررہ گیا تھا، جبکہ میرے چہرے پر روشنی پڑرہی تھی۔

وہ چند ثانیے شاید میری ہی طرف تکتی رہی تھی، پھر اس کی آواز اُبھری۔ ''جوگی بابا سے تمہاری ملاقات کا دورانیہ کتنا رہا تھا؟''

''کچھ زیادہ تو نہیں، میں خود زخمی تھا اور مجھے خود ہوش نہیں تھا۔'' میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا کہ نہ جانے وہ میرے منہ سے ایسا کیا اُگلوانے والی تھی جس سے اس کا یہ شبہ یقین میں بدل جاتا۔

''جوگی بابا نے تمہیں میرے متعلق کچھ بتایا تھا؟''

''نہیں۔''

''میرے آدمی تندو کو تو تم پہچان گئے ہوگے، وہ اس وقت جوگی بابا کے جھونپڑے میں آیا تھا، جب تم بھی وہاں تھے؟'' مجھے اس کا لہجہ دم بہ دم اسرار بھرا سا محسوس ہونے لگا۔

''ہاں! میں نے اسے وہاں دیکھا تھا۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

''پھر تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ تندو وہاں کیوں آیا تھا؟'' یہ کہتے ہوئے مہارانی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا تو ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ روشنی میں آیا۔ مجھے مہارانی کا چہرہ کچھ کچھ بدلا بدلا سا دکھائی دیا تھا، جیسے اس کا سانولا رنگ، جو ایک خاص کشش کا باعث تھا، ایکا ایکی بے کشش اور سیاہ پڑنے لگا ہو۔ ایسے ہی وقت مجھے اپنے وجود میں پھریری سی اُترتی محسوس ہوئی تھی تاہم میں نے جواباً کہا۔

''کچھ زیادہ تو نہیں، بس اتنا ہی اندازہ مجھے ہو پایا تھا کہ وہ شاید کچھ لینے کے لیے وہاں آیا تھا۔''

''کیا؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم......'' کہتے ہوئے میں نے دانستہ پہلو بدل کر اپنے وجود کو کچھ اس طرح جنبش دی کہ میں ذرا اس کا چہرہ دیکھ پاؤں، میں اس کا پورا چہرہ تو نہیں دیکھ پایا تھا، البتہ ناک اور ہونٹ ہی دیکھ سکا، جو ناگستری رنگت کے ہونے لگے تھے۔ یہ سوچ کر کہ کیا مہارانی کے چہرے کی رنگت یا ہیئت بدل رہی تھی، بے اختیار مجھے ایک جھرجھری سی

آگئی۔ میں نے اسے اپنا واہمہ ہی قرار دیا کہ یہ شاید اس عجیب اور الگ قسم کے ماحول کا اثر ہو۔

''روپا.......!'' معاً اس نے کسی کو پکارا۔ ایک دبلی پتلی لڑکی اندر آئی اور اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر مؤدبانہ انداز میں مہارانی سے بولی۔

''جی مہارانی صاحبہ؟''

''انہیں ان کے کمرے تک چھوڑ آؤ......'' مہارانی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس خادمہ سے کہا۔

مجھے اس بار مہارانی کی آواز بھی بدلی ہوئی سی لگی تھی۔ میں خود اس ماحول میں ایک تکدر سا محسوس کر رہا تھا، اس پر شکر کیا اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''آیئے میرے ساتھ......'' روپا نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ میں نے جاتے وقت بھی مہارانی کے چہرے پر نظر ڈالنے کی کوشش چاہی تھی مگر مہارانی نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا تھا، میں فقط اس کی گردن ہی دیکھ سکا تھا جس کی جلد مجھے بالکل کالی سیاہ دکھائی دی تھی۔

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا، پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ شاید ایسا کم روشنی یا نیم اندھیرے کی وجہ سے تھا، لیکن اس قدر گہری سیاہ رنگت کی میں کوئی توجیح نہ پیش کر سکا اور خاموشی سے روپا کے ساتھ چلتا ہوا، اوپری منزل پہ پہنچا۔

اس دوران مجھ پر نیند کا بھی غلبہ محسوس ہونے لگا۔ میری آنکھیں جیسے نیند سے بھاری ہونے لگی تھیں۔ مہارانی نے مجھ سے بہت تھوڑی اور مختصر باتیں کی تھیں۔

مجھے کمرے میں چھوڑنے کے بعد روپا خاموشی سے پلٹ گئی تھی۔ میں سمجھا تھا کہ کمرے میں سوشیلا بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔

میرے یہ سوچنے کی دو وجوہات تھیں، پہلی تو یہ کہ وہ مجھ سے پوچھنا چاہتی ہوگی کہ آخر مہارانی مجھے اپنے ساتھ کہاں لے گئی تھی اور کیا باتیں کیں؟ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہم نے آج رات ہی اس منحوس حویلی سے فرار کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ سوشیلا اپنے بستر پر بے سدھ اور گہری نیند سو رہی تھی۔ یہی حال اب میرا بھی ہونے لگا تھا۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا، بلکہ سوشیلا کو جگا کر اس سے بات کرنے کا ارادہ کیے ہوا تھا، لیکن مجھ میں تو اب جیسے اپنے پیروں پہ بھی کھڑے ہونے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، کہ گر ہی نہ پڑوں۔ میں فوراً اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا اور بستر پر گر پڑا۔ دفعتاً ہی مجھے احساس ہوا کہ دال میں کچھ کالا تھا، مہارانی کا چند سیکنڈوں میں مجھ سے جوگی بابا کے بارے میں مختصر ترین سوالات پوچھ کر رخصت کرنا، مجھے خالی ازعلت نہیں لگا تھا۔ دوسرے یہ کہ میرے اور سوشیلا کے کھانے میں ضرور کوئی ایسی چیز دانستہ شامل کی گئی تھی جس سے ہم پر نیند کا غلبہ سا طاری ہونے لگا تھا۔ اسے اگرچہ بے ہوشی کی کیفیت تو نہیں کہہ سکتے تھے، کیونکہ بستر پر گرنے کے بعد بھی میں پوری طرح ہوش میں تھا۔

اچانک میرے تھکے ہوئے ذہن میں ایک جھماکا ہوا، جوگی بابا نے بھی مجھے ایسا ہی کچھ پلا کر اعصابی اور جسمانی طور پر معذور کر دیا تھا، کہیں ویسی ہی شے تو اس مہارانی نے ہمیں نہیں پلا دی تھی؟ جوگی بابا اور مہارانی کا سمبندھ بھی تو پُراسرار تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے سر کو دو تین بار زور زور سے جھٹکے دیے، تاکہ نیند کا خمار اُتر جائے، کامیابی ہوئی مگر چند سیکنڈوں کے لیے، مجھ پر بے ہوشی نما نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا اور میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں، میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی شاید ایک بھرپور جماہی لی اور پھر گہری نیند میں ڈوب گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے کچھ شور سنا اور چند لوگوں کو اپنے قریب پایا، مجھے کسی کے زور زور سے بولنے کی آوازیں بھی آئی سنائی دی تھیں۔ ذرا غور کیا تو پتا لگا کہ یہ مہارانی تھی۔ میری نیم غنودہ آنکھوں نے نندو کو بھی وہاں موجود پایا، خادمہ روپا بھی تھی اور دو ادھیڑ عمر کے مرد عورت بھی موجود تھے۔ وہ بھی حویلی کے ملازم ہی نظر آتے تھے۔

''کیسے بھاگ گئی وہ......؟ تم کیا سو رہے تھے سب؟'' مجھے مہارانی کی پُرطیش آواز سنائی دی تھی۔

''ہمیں کیا پتا تھا مہارانی صاحبہ کہ وہ اتنی چالاک ثابت ہوگی کہ اتنی بُلندی سے چھلانگ......'' ایک ملازم نے صفائی میں کچھ کہنا چاہا مگر مہارانی کی غصیلی آواز نے اُس کی بات کا گلا گھونٹ دیا۔

''بکواس بند کرو اپنی...... یہ دیکھ نہیں رہے ہو۔ رسی، یہ چارپائی کی دوائن کھول کر، اس کی رسی بنا کر وہ نیچے اُتری ہوگی، جاؤ سب اُس چنڈال کو ڈھونڈ کر آؤ ورنہ میں تم سب کو زندہ جلا دوں گی۔'' مہارانی بری طرح بپھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ آخر یہ کس ''چالاک'' اور ''چنڈال'' کے فرار کی باتیں ہو رہی تھیں؟ اور پھر اچانک جیسے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

''کہیں یہ سوشیلا کے فرار کی باتیں تو نہیں ہو رہی تھیں؟ لیکن کیوں......؟ بھلا سوشیلا میرے بغیر اور مجھے اس طرح

چھوڑ کر کیوں کر خود اکیلے فرار ہو گئی تھی؟ کیا اس نے بھی مجھے اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے چندر کلا کی طرح دھوکا دیا تھا؟

میری شاید نیند پوری ہونے کے باعث خمار کم ہونے لگا تھا۔ میں نے مہارانی کی طرف دیکھا اور لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مم...... مہارانی صاحب! کیا ہوا......؟ کون فرار ہو گیا ہے یہاں سے......؟“

”تمہاری ساتھی، سوشیلا......“ اس نے برہم نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا......؟“ مجھے جیسے یقین نہیں آیا۔ ”یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ ہو چکا ہے، دیکھو یہاں آ کر ذرا......“ مہارانی نے مجھ سے کہا، لہجہ خاصا طنزیہ تھا، اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا، جو تیندو پتے کے جنگل میں کھلتی تھی، میں اپنے چہرے پر غیر یقینی سے تاثرات لیے بستر سے اُٹھا، تو مجھے چکر سا آ گیا، میرے قدم ذرا لڑکھڑائے بھی تھے، میں شاید ابھی تک رات والے کھانے میں متوقع طور پر ملائی گئی نشہ آور دوائی کے زیرِ اثر تھا، تاہم اب وہ نشہ کافی حد تک اُتر چکا تھا۔

میں مذکورہ کھڑکی کی طرف آیا تو کیا دیکھتا ہوں وہاں ایک پلنگ نما چار پائی کی نواڑ جھول رہی تھی، جسے لپیٹ کر موٹا اور دراز کیا گیا تھا، اس کا ایک سرا کھڑکی کے اندر بندھا ہوا تھا اور دوسرا کھڑکی سے باہر حویلی کی عمارت سے نیچے جھول رہا تھا۔ لگتا تو صاف یہی تھا کہ سوشیلا ہی کی یہ حرکت ہو سکتی تھی۔ مگر پتا نہیں کیوں میرا دل یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ سوشیلا اس طرح مجھے اکیلا چھوڑ کر خود ہی فرار ہو جائے گی؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ پیش آمدہ حالات سے خوف زدہ ہو گئی ہو اور اس نے اکیلے ہی راہِ فرار ہونے میں عافیت جانی ہو۔ میرا ساتھ دینے کا اپنا وعدہ وہ بھول گئی ہو شاید۔

”کیا اب بھی تمہیں وشواش نہیں آ رہا ہے؟ مگر چنتا مت کرو، میرے آدمی اُسے تلاش کر کے ہی لوٹیں گے۔“ مہارانی نے مجھے متذبذب سوچ میں مبتلا پا کر کہا۔ اس کے یقین بھرے لہجے سے مجھے سچائی کی بو آ رہی تھی۔ مگر میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا کہ سوشیلا ایسی حرکت بھی کر سکتی ہے۔

”جس کی جان پر بنی ہو تو وہ اپنوں تک کو چھوڑ کر بھاگ لیتا ہے، یہ تو تم تھے، اب پتا نہیں، تم دونوں کے بیچ کیسا سمبندھ تھا کہ اس نے تمہاری بھی پروا نہ کی، لیکن اس کے فرار نے یہ ضرور ثابت کر دیا کہ تم دونوں جوگی بابا کے مجرم ہو۔“

مہارانی کی اس بات پر مجھے تشویش نے آلیا، اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”نہیں مہارانی صاحبہ! آپ کا اندازہ غلط ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں بھی آپ کو یہاں نہیں نظر آرہا ہوتا۔ اگر ہم نے یہاں سے فرار ہونا ہی ہوتا تو دونوں ایک ساتھ فرار ہوتے جبکہ گزشتہ رات جب میں آپ کے ساتھ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کے اُوپر اپنے کمرے میں آیا تو میں نے سوشیلا کو اپنے بستر پر بے سُدھ سویا ہوا پایا تھا۔ خود میرا اپنا نیند سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ خود میں بھی بستر پر گرتے ہی سو گیا تھا۔ لیکن ہاں! مجھے ایسا ضرور لگا تھا جیسے میں نے کوئی نشہ آور چیز کھالی ہو۔ وہ نیند قدرتی نہیں بلکہ کسی دوا کے زیرِ اثر تھی۔“ بالآخر میں نے مہارانی سے یہ کہہ ڈالا۔ یکایک ہی مجھے احساس ہوا تھا کہ یہ سب جان بوجھ کر اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جا رہا تھا۔ نیز مجھے سوشیلا کا فرار بھی ایک ڈراما لگا جو مہارانی نے ہی رچایا ہوگا۔

مہارانی نے میری بات پر ایک ناگواری نگاہ میرے چہرے پہ ڈالی اور پھر اسی لہجے میں بولی۔

”تمہارا کیا مطلب ہے کہ ہم نے تمہارے کھانے میں بے ہوش کر دینے والی کوئی شے ڈالی تھی؟“

”کھانا کھاتے ہی مجھ پر غنودگی اور ایک نشہ سا طاری ہونے لگا تھا جو بہ ظاہر نیند کا ہی تاثر دیتا محسوس ہوا تھا، لیکن ایسی نیند تو پہلے کبھی کھانا کھاتے ہی مجھے نہیں آئی تھی، میں پھر کیا سمجھتا؟“ میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو اس کے حسین و دل کش چہرے پہ ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں نے مزید کہا۔

”میرے شبہ کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ خوامخواہ ہی سوشیلا کے نامعلوم فرار پر ہمیں مجرم ثابت کرنے پر تُلی ہوئی ہیں جبکہ میں نے اور نہ ہی میری ساتھی سوشیلا نے جوگی بابا کے ساتھ کچھ کیا ہے، میں پھر کہہ رہا ہوں، وہ ہمارا محسن تھا، اس نے میرا علاج کیا تھا اور ہمیں اس کی موت پر دکھ ہوا ہے۔“

میں نے دیکھا کہ میری اس بات پر مہارانی کے چہرے کے برہم سے تاثرات پل کے پل ایک اُلجھن آمیزی میں بدلنے لگے تھے۔ مجھے کچھ ادراک ہوا کہ مہارانی بعض محتاط اندازوں سے یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ آیا ہم جب تک جوگی بابا کی مڑھی میں رہے تھے، تو کیا ہمیں (مجھے اور سوشیلا) کو جوگی بابا کی ”اصلیت“ جاننے کا موقع مل چکا تھا یا نہیں...... کیونکہ اس نے گزشتہ رات کھانے کے بعد مجھ سے سوالات کی جو مختصری نشست جمائی تھی، اس سے مجھے اب یہی لگ رہا تھا کہ وہ ابھی تک اسی مخمصے کا شکار تھی کہ کیا ہم واقعی جوگی بابا کی اصلیت بہ شمول اس کے (مہارانی کے) اور جوگی بابا کے درمیان پُراسرار تعلق سے واقفیت حاصل کر چکے تھے یا نہیں؟ وہ اسی لیے شاید ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی اور جوگی بابا کے قتل کی تفتیش کے بہانے وہ یہ سب اپنے طور پر بھی جاننا چاہتی تھی۔ اُسے یقیناً اس بات کا بھی ڈر ہوگا کہ کہیں ہم یہاں سے جا کر اس کے جرم کا پول نہ کھول ڈالیں جبکہ اسے کیا پتا تھا کہ ہم تو خود اپنے دشمنوں سے سر چھپاتے پھر رہے تھے۔

بلاشبہ یہ خود ہمارے لیے بھی ایک بلاوجہ کی ”ٹینشن“ تھی۔ اس لیے میں نے بھی اب ذرا محتاط لہجہ اختیار کر لیا تھا مگر سوشیلا کے سلسلے میں، میں مہارانی سے کسی قسم کا ”کمپرومائز“ کرنے کے ہرگز موڈ میں نہیں تھا۔

تاہم ان سب باتوں کے باوجود میں ایک فطری تجسس کا شکار ضرور ہو گیا تھا کہ آخر جوگی بابا اور مہارانی کے درمیان ایسا کیا تعلق ہو سکتا تھا، جس کی وجہ سے وہ ہماری طرف سے خدشات کا شکار تھی؟ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس پردۂ تعلق کے پیچھے کوئی جرم چھپا ہوا تھا۔ یہ بھی تھا کہ جوگی بابا کے مرنے کے بعد اس جرم کی ’بیماری‘ بھی انتقام کو پہنچی تھی جس کے در پردہ مہارانی کا وہ مفاد بھی ختم ہو چکا ہوگا، جو جوگی بابا اور مہارانی کا مشترکہ ہی ہو سکتا تھا۔

بہرکیف...... ! مہارانی نے چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد مجھ سے کہا۔ ”تمہیں وہم ہوا ہے۔ تمہیں کوئی بے ہوشی کی دوا نہیں دی گئی تھی نہ ہی تمہاری ساتھی سوشیلا کو...... وہ ویسے ہی تمہیں دکھانے کے لیے سوتی بن گئی ہوگی، تاکہ تم بھی سو جاؤ اور وہ بہ آسانی فرار ہو سکے۔“

”نہیں، یہ میرا وہم نہیں تھا۔“ میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ”سوشیلا میری ساتھی تھی۔ وہ کافی عرصے سے میرے ساتھ تھی، میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں، وہ مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتی بلکہ اُسے تو خود میری ضرورت تھی۔“

مہارانی کا اپنی بات پہ اڑے رہنا ہی اس کے جھوٹے ہونے کی دلیل تھی، بولی۔ ”ٹھیک ہے، سب معلوم ہو جائے گا ابھی، میں نے سوشیلا کی تلاش میں اپنے آدمی دوڑا دیے ہیں، بہت جلد وہ ہمارے سامنے پیش کر دی جائے گی۔“

مہارانی نے یہ بات مجھ سے دوسری بار اور بھرپور یقین سے کہی تھی کہ خود مجھے بھی کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا تھا

جیسے وہ سچ کہہ رہی ہو۔

نواڑ نما رسی اُوپر کھینچ لی گئی تھی، وہ تندو کے ہاتھ میں تھی، میں نے اس سے لے کر اس کا بغور جائزہ لیا۔ پھر کچھ سوچ کر اسی پلنگ نما چارپائی کی طرف بڑھا، جہاں سے یہ نکالی گئی تھی، میں نے بہت باریک بیں نظروں سے اس نواڑ کو سوشیلا اور اپنے پلنگ کی نواڑ سے ملا کر دیکھا، پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مہارانی سمیت وہاں موجود سب میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے مہارانی سے کہا۔ ''اس رسی اور پلنگ کی رسی کے رنگ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آپ غور سے دیکھ لیں، پھر میں دوبارہ آپ کو یہ رسی دیکھنے کے لیے دوں گا۔''

مہارانی نے ایک نگاہ رسی پر ڈالی، اس کے بعد میں نے نواڑ کا ایک سرا تندو کو پکڑنے کے لیے دیا اور کہا کہ وہ اسے مضبوطی سے تھامے رکھے۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مہارانی کی بھی اُلجھی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں نواڑ نما اس رسی کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دبا کر یوں رگڑا کہ میرے دونوں ہاتھ پھسلتے ہوئے اُس آخری سرے تک چلے گئے، جو تندو کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے بعد میں نے رسی کو دوبارہ پلنگ کی نواڑ سے ''میچ'' کیا۔ واضح طور پر دونوں کے رنگ میں فرق آچکا تھا۔ میں نے سیدھے کھڑے ہو کر مہارانی سے کہا۔

''مہارانی صاحبہ! اب دوبارہ اس رسی کو غور سے دیکھیں، میرے اس پر ہاتھ گھمانے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس کا رنگ بدل گیا ہے، نواڑ کا رنگ کتنا سفید تھا پہلے......''

''کیا کہنا چاہتے ہو تم کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟'' مہارانی نے تیز نگاہوں سے مجھے گھورا، لیکن میں خائف ہوئے بغیر اس سے ترکی بہ ترکی بولا۔

''آپ جھوٹ بول رہی ہیں یا نہیں، لیکن مجھے اب یقین ہو گیا ہے یہ سب میری ساتھی سوشیلا کے فرار کا محض ایک ناٹک رچایا گیا ہے۔ وہ اسی حویلی کے کسی قید خانے میں موجود ہے۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر تم باہر کیوں ہو اس قید خانے سے......؟'' مہارانی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''بقول تمہارے اگر ہم نے سوشیلا اور تمہارے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی اور تم دونوں ہی بے سدھ ہو کر سو گئے تھے تو پھر تمہیں کیوں چھوڑا گیا؟''

اپنے تئیں مہارانی نے بڑا مضبوط جواز گھڑا تھا، لیکن میں پھر بھی اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا، بولا۔ ''اس کی وجہ آپ کو معلوم ہو گی۔ بہتر ہو گا کہ آپ میری ساتھی کی گمشدگی کی پولیس کو اطلاع دے دیں۔''

''یہ ہماری راجدھانی ہے، ہم ہی یہاں کی پولیس ہیں اور ہم ہی کرتا دھرتا ہیں اس پوروائی کے۔'' مہارانی کا لب و لہجہ جارحانہ اور طیش ناک ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے ایک لمحے کو لگا کہ وہ اب کسی بھی وقت میرے خلاف کوئی سخت فیصلہ صادر کرنے والی تھی۔ لیکن میں بھی نچلا ہونے والا نہیں تھا۔ اس بار استہزائیہ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''پھر تو مجھے انصاف ملنے کی اُمید بالکل ہی نہیں رکھنی چاہیے۔''

''اس گستاخ کو تہ خانے میں لے جا کر ڈال دو......''

دفعتاً ہی کمرے میں مہارانی کی زہریلی پھنکار سے مشابہ آواز اُبھری اور اسی وقت تندو نے چلا کر مخصوص انداز میں کسی کو پکارا۔ آن کی آن میں وہاں پانچ چھ مسلح افراد باادب حاضر ہو گئے۔ وہ چوکنے بھی نظر آرہے تھے۔ تاہم ان کی جارحانہ نظریں میرے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔

''اس گستاخ کو تہ خانے میں لے جا کر قید کر دو۔'' تندو نے ان سے تحکمانہ کہا۔ حواریوں نے مجھے دبوچ لیا۔ میں نے دانستہ ایک استہزائیہ سی نظر مہارانی کے پرتپش چہرے پہ ڈالی تھی۔ مجھے وہاں کچھ ایسے آثار دکھائی دیے جیسے وہ خود اپنا یہ فیصلہ صادر کرنے پر ناخوش تھی۔ اس کے مسلح حواری مجھے لیے ابھی کمرے کے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ اچانک ایک آدمی گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ ہم بھی رک گئے۔ وہ مہارانی سے گھبرائے لہجے میں بولا۔

''مہارانی صاحبہ! وہ...... وہ باہر...... پپ...... پولیس آئی ہے۔'' اس اطلاع پر مہارانی کا چہرہ پریشان سا دکھائی دینے لگا، خود مجھے بھی تشویش سی ہونے لگی، اگرچہ خود میں نے ذرا دیر پہلے ہی مہارانی کو پولیس کا مشورہ دیا تھا، مگر حقیقت یہی تھی کہ پولیس کے بیچ میں پڑنے سے میرا معاملہ بھی خراب ہو سکتا تھا۔ وہ میرے بارے میں بھی پوچھ تاچھ کر سکتی تھی۔ گویا پولیس کی آمد کے ذکر پر مہارانی کی طرح میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔ مگر اپنے چہرے سے میں نے کسی فکر کو ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔ مسلح حواری مجھے ساتھ لے جاتے ہوئے رک کر اب سوالیہ نظروں سے مہارانی کی طرف تکے جا رہے تھے۔

''اسے لے جاؤ......'' مہارانی نے تحکمانہ انداز میں

اپنے حواریوں سے کہا۔ میرے لیے بھی سرِدست شاید یہی بہتر تھا۔ وہ مجھے مختلف راہداریوں سے گزارتے ہوئے ایک تنگ و تاریک تہ خانے میں لے آئے۔ تہ خانے تک پہنچتے پہنچتے، یہ حواری دو بچے تھے، باقی ادھر اُدھر ہو گئے تھے۔ وہ مجھے کوئی عام سا ہی انسان سمجھے ہوئے تھے شاید۔ البتہ باقی دونوں خاصے چوکنا تھے۔ ایک نیچی چوکھٹ والے دروازے کے سامنے لا کر مجھے کھڑا کر دیا گیا۔

تہ خانے کا یہ اس قدر نیچا اور تنگ دہانہ دیکھتے ہی مجھے ہول سے آنے لگے تھے۔ مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ دروازہ خاصا بھاری اور زنگ آلود تھا۔ ایک تو اُسے کھولنے اور دھکیلنے میں مصروف ہو گیا، جبکہ دوسرا میرے ساتھ چوکنا کھڑا تھا۔ تب ہی میرے وجود میں جیسے برق سی دوڑ گئی۔

میں نے سب سے پہلے اپنے ساتھ کھڑے حواری کی رائفل پر ہاتھ مارا اور اس کی نال کا رخ بدلنے کے ساتھ ہی اس کے پیٹ پر زوردار پنچ رسید کر دیا، وہ کراہ نما سی آواز نکال کر جھکا اور رائفل میرے ہاتھ میں آ گئی، تب تک تہ خانے کے دروازے سے ''مصروف کار'' دوسرا حواری اپنی رائفل سنبھال کر میری طرف پلٹا تھا کہ میں نے اس کی پشت پر بھی لات رسید کر دی، وہ تہ خانے کے اندر جا پڑا۔ تب تک پہلے والا اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے اپنے حلق سے غراہٹ خارج کرتا میری طرف لپکا تو میں نے جھکائی دی اور وہ بھی اپنی جھونک میں اندر تھا۔ میں۔نے بہ سرعت حرکت کی اور تہ خانے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ ایک لیور مجھے دکھائی دیا تھا، اُسے میں نے جلدی سے دبا دیا۔ تہ خانے کا دروازہ اب باہر سے لاک ہو گیا تھا۔

رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ایک لمحہ اس کا جائزہ لیا۔ وہ عام سی رائفل تھی۔ جس میں تین انچ کی سات گولیوں کا میگزین ڈلتا تھا۔ میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور چند ثانیے وہیں تہ خانے کے سامنے کھڑا رہا۔

میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اندر مقید حواریوں کے چیخنے چلانے یا مدد کے لیے پکارے جانے کی آوازیں باہر سنائی دیتی ہیں یا نہیں، حسبِ توقع میرا اندازہ درست ثابت ہوا، اندر سے کوئی آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اب تسلی کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

مجھے اطمینان تھا کہ حویلی میں اچانک پولیس کی آمد کی وجہ سے سب کی مصروفیت ادھر ہی ہوگی، میں تب تک اپنی خفیہ کارگزاری دکھانے کا موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں بجائے پیچھے لوٹنے کے آگے بڑھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں اس تنگ و تاریک راہداری میں اور کتنے تہ خانے یا کمرے تھے۔ راہداری میری توقع کے برخلاف آگے سے مختصر ثابت ہوئی۔

چند قدموں کے بعد وہ دائیں جانب گھوم گئی تھی اور آگے سپاٹ دیوار آ گئی تھی، مگر یہاں پہنچ کر میں چونکا تھا، مجھے میرے کے بائیں جانب ایک دروازہ نظر آیا، جس پر بھاری قفل لگا ہوا تھا۔

میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس پر رائفل کا ٹھوس کندا مارنا شروع کر دیا، تالا زنگ آلود اور خستہ حال تھا، تین چار زوردار ضربات کے بعد ہی کھل گیا، میں نے جلدی سے کنڈا کھولا اور دروازہ اندر دھکیلا ایک عجیب سی ناگوار بدبو کا بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا اور میری طبیعت منغض سی ہونے لگی۔ تب ہی مجھے اندر سے ایک لرزتی سی نسوانی آواز سنائی دی۔

''کک......کون؟'' اس آواز کو پہچانتے ہی میں جیسے شانت ہو گیا، یہ سوشیلا کی آواز تھی، میرے محتاط ذہن رسا میں یہاں آتے ہی، پہلا خیال بھی ابھرا تھا کہ اگر سوشیلا کو کہیں مقید رکھا ہوگا تو وہ یہیں کہیں ہو سکتی تھی۔

''سوشی......! جلدی سے باہر آ جاؤ......'' میں نے اندر داخل ہونے کے بجائے باہر ہی کھڑے کھڑے اسے آواز دی، وہ بھی میری آواز پہچان گئی تھی، مگر باہر نہیں آئی، بولی۔

''شش......شہزی......! ام......میں......آہ......'' وہ جملہ کراہ میں بدل کر اُدھورا رہ گیا۔ میں سمجھ گیا اندر معاملہ کچھ اور تھا۔ میں بدبو کی پروا کیے بغیر اندر داخل ہو گیا اور اندھیرے میں سوئچ ٹٹول کر لائٹ آن کی تو ایک دہشت انگیز منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

☆☆☆

جو انسانیت سوز منظر میں نے جوگی بابا کی مڑھی میں دیکھا تھا، کم و بیش اسی سے ملتا جلتا منظر مجھے یہاں بھی نظر آیا تھا۔ کمرے میں فقط ایک ہی بلب روشن تھا۔ سامنے دائیں بائیں انسانی ہڈیوں کے پنجر بکھرے پڑے نظر آئے۔ ایک طرف ویسی ہی پاؤچ نما سلوفین تھیلیاں ایک بڑے سے چوبی ریک پر پڑی دکھائی دی تھیں، جن میں سرخ اور گاڑھا خون بھرا ہوا تھا۔ کچھ زمین پر گری پڑی تھیں۔ جبکہ میری نظروں کے بالکل سامنے ایک چارپائی پر سوشیلا رسیوں سے بندھی پڑی تھی۔ وہ ہوش میں تھی اور بری طرح دہشت زدہ نظر آ رہی تھی، جیسے اس نے کوئی ڈراؤنا منظر دیکھ رکھا ہو۔

اس کی دہشت سے پھٹی پھٹی نگاہوں میں التجا تھی۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر پہلے اسے رسیوں سے آزاد کرایا تو وہ ایک دم مجھ سے لپٹ گئی اور اس کا پورا وجود خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

''وشش...... شہزی...... مم...... مجھے یہاں سے لے چلو، بھگوان کے لیے...... وہ...... وہ، مہارانی ایک ڈ...... ڈائن ہے۔'' وہ خوف زدہ اور بے ربط جملوں کے درمیان بولی اور میں اس کی ڈائن والی بات پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں نے اسے پہلے حوصلہ اور تسلی دینا ضروری سمجھا، تاکہ وہ اپنے حواسوں میں آجائے، یوں بھی سے جی کوہارا اور بھومک جیسے درندہ صفت شیطانوں کی قید میں رہی، اس سے پہلے وہ جنرل کے ایل ایڈوانی کی چپقلشوں کا بھی شکار رہی تھی، بعد میں وہ اس سفاک اور جنونی انسان کے ہاتھوں اپنی بہن اور اس کے دو چھوٹے معصوم بچوں کی ہلاکت کے غم ناک سانحے سے بھی گزری تھی، اور میرے ساتھ اس نے جنرل کے ایل ایڈوانی سے نا صرف بھرپور انتقام لینے کا عزم کر رکھا تھا بلکہ وہ ہیرا (طلسم نور) بھی اس کے قبضے سے برآمد کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔ ان حالات نے اُسے اعصابی طور پر اب تک خاصا مضبوط تو بنا دیا ہوگا، نیز وہ اسپیکٹرم کی فعال رکن رہی تھی (جب تک اسپیکٹرم واقعی ایک معتبر ادارہ کہلاتا رہا) مگر شاید اس نے جو دل دہلا دینے والا منظر دیکھا ہوگا، وہ ان پیش آمدہ حالات سے مختلف ہوگا، جس نے اسے یوں دہشت زدہ اور مخبوط الحواس کر ڈالا تھا۔ جونکی بابا اور مہارانی کے حوالے سے اگرچہ خود مجھے بھی کسی گھناؤنی سی پُراسراریت کی بو آتی محسوس ہو رہی تھی۔ بالخصوص اس رات کو جب میں اور مہارانی ایک نیم تاریک سے کمرے میں باتیں کر رہے تھے اور مجھے اس کے چہرے کی جھلک صاف نظر نہیں آرہی تھی، وہ بدلا بدلا سا مجھے محسوس ہوا تھا، میں کھٹک گیا تھا لیکن ابھی بہت کچھ در پردہ تھا۔

میں نے آہستگی کے ساتھ سہمی ہوئی اور خوف زدہ سی سوشیلا کو خود سے الگ کیا اور اُسے مختصراً الفاظ میں اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ کچھ سنبھلی اور بولی۔

''اس رات کھانے کے بعد میری بھی یہی حالت ہوئی تھی، جب تمہیں مہارانی نے روک لیا تھا اور میں اپنے کمرے میں آکر تمہاری واپسی کے انتظار میں جاگنے کی کوشش کر رہی تھی کہ تم سے پوچھوں آخر مہارانی نے تمہیں اپنے پاس روک کر کیا باتیں کیں؟ لیکن مجھے ایسی نیند آئی کہ میں جیسے بے ہوش ہونے کے قریب ہوگئی۔ اس کے بعد میری آنکھ یہاں کھلی تھی۔ کمرے میں تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا، پہلے تو میں یہی سمجھی تھی کہ میں اپنے ہی کمرے میں ہوں اور لائٹ آف ہے، مگر جب میں نے اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش چاہی تو قاصر رہی، تب ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں رسیوں سے بندھی ہوئی ایک چارپائی پر پڑی ہوں۔ میں خوف سے چیخنے چلانے لگی تو کوئی دروازہ کھولے اندر داخل ہوا، کمرے میں روشنی ہوگئی، میں اسے پہچان گئی، وہ تندو تھا۔ اس نے مجھے دھمکایا کہ شور مچانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ حویلی کا یہ حصہ پاتال کہلاتا ہے۔ یہ...... تم جو ریک دیکھ رہے ہو ناں...... شہزی......!'' اس نے کپکپاتی آواز میں اس سالخوردہ سے ریک کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ وہی خون ہے جو تندو، جونکی بابا کی مڑھی سے لاتا تھا۔ یہ جونکوں کا چوسا ہوا خون ہے۔ جونکی بابا نے اپنی مڑھی میں جونکوں کا جو فارم بنا رکھا تھا۔ وہ خاص مہارانی کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ جونکیں جب خون پی کر موٹی اور اپنے سائز سے بھاری ہو جاتی تھیں تو جونکی بابا انہیں پھوڑ کر ان سے نکلنے والا خون ایک تھیلی میں جمع کر لیا کرتا تھا۔ اُف...... کس قدر گھناؤنے عمل کی یہ کہانی ہے۔'' وہ بے اختیار کپکپا گئی پھر بولی۔

''پلیز! پہلے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو، میں بعد میں سب کچھ تمہیں تفصیل سے بتادوں گی۔'' میں نے ہونٹ بھینچ کر پرسوچ انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں اسے لیے کمرے سے باہر آگیا۔

یہ سب پتا نہیں کیا گھن چکر تھا، جس سے میرا دل و دماغ عجیب و غریب کیفیات کا شکار ہونے لگا تھا۔ یہ بالکل مختلف اور عجیب و غریب حالات تھے، جن سے میں دوچار تھا، نجانے اب پردۂ غیب سے کیا کیا کچھ ظاہر ہونے والا تھا۔ اس کی ایک ہولناک سی توقع ہی کی جاسکتی تھی۔

نیم تاریک سی راہداری سنسنان پڑی تھی۔ حواری سے چھینی ہوئی رائفل ہنوز میرے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ اس کی سات گولیاں پوری تھیں۔ سوشیلا کو اپنے عقب میں کیے ہوئے میں قدرے تیز مگر محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

جن دونوں حواریوں کو میں نے تہ خانے میں بند کیا تھا، یہ عین ممکن تھا کہ ان کے ساتھی ان کی طرف سے زیادہ دیر تک غافل نہیں رہ سکتے تھے۔ اگرچہ اس وقت اُوپر سب پولیس کے ساتھ مصروف تھے اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔ اس موقع سے ہم جلد از جلد فائدہ اُٹھا کر حویلی

سے باہر بھی نکل سکتے تھے۔ میں سوشیلا کو لیے ہاتھ میں رائفل سنبھالے تنگ سی سیلن زدہ سیڑھیاں چڑھتا بالآخر اوپر اس دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا، جدھر حویلی کا گراؤنڈ فلور تھا۔ وہ مسلح حواری مجھے اسی راستے سے اندر لائے تھے اور وہ مجھے ازبر تھا کہ مجھے پہلے کس کمرے میں قدم رکھنا تھا جو ہمارے لیے قدرے محفوظ بھی ہوتا۔

مذکورہ کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے کانوں میں مہارانی کے پُرجلال انداز میں چلانے کی آوازیں آنے لگیں، وہ کسی تفتیشی پولیس افسر کے ساتھ خاصی برہمی سے باتیں کررہی تھی۔ ایک لمحے کو رک میں نے ان کی باتیں سننا ضروری سمجھا تاکہ معاملے کی تہ تک پہنچنے کے ساتھ ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل بھی تیار کرنے میں آسانی ہوتی۔ جبکہ سوشیلا کا خیال تھا کہ ہمیں اس سنہری موقع سے فائدہ اُٹھا کر پہلے فرار کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا، کیونکہ میں نے مہارانی کو کہتے سنا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ کو ہمارے کسی دشمن نے ورغلایا ہوگا اور آپ بھی کسی کے ایک گمنام سے خط پر پوری پولیس پارٹی کے ساتھ بغیر تصدیق کے، یہاں دوڑے چلے آئے......؟"

"میرے پاس اس حویلی کی تلاشی کا سرچ وارنٹ ہے، مہارانی صاحبہ!" جواباً ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی جو خاصی رعب دار تھی، یہ یقیناً اسی انسپکٹر کی آواز تھی جس سے مہارانی مخاطب تھی۔ اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مہارانی سے ذرا بھی خائف یا مرعوب نہیں تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اور ہم صرف کسی گمنام فون یا خط پر بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے کوئی قدم نہیں اُٹھاتے ہیں، پہلے اس کی خفیہ طور پر مکمل تحقیقات کرتے ہیں، اس کے بعد ہی عملی طور پر آگے بڑھتے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے اس بستی میں ہی نہیں بلکہ اریب قریب کے گاؤں دیہاتوں کے بھی لوگ پُراسرار طور پر غائب ہونے لگے ہیں، جن میں سے کچھ کی نچڑی ہوئی لاشیں اور ہڈیوں کی صورت میں استخوانی پنجر ملے ہیں۔ جنہیں زمین میں گاڑھا گیا تھا۔" انسپکٹر کی بات جاری تھی، مگر میرے لیے اب یہاں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ پولیس کو مہارانی پر یقین کی حد تک شبہ ہو چکا تھا اور وہ اس کے پیچھے پڑ چکی تھی۔ یوں بھی اگر مہارانی کوئی خونی کھیل کھیلنے میں مصروف تھی تو وہ اب جوگی بابا کے واصلِ جہنم ہونے کے بعد ختم ہو چکا تھا۔ مہارانی کے پریشان اور چڑچڑے مزاج کی وجہ بھی یہی رہی ہوگی۔ باقی آگے کی کیا حقیقت تھی وہ، بقول سوشیلا کے اُسے معلوم تھی، جو میں بعد میں بھی اس سے پوچھ سکتا تھا۔

"نکل چلو اب......" سوشیلا نے مجھے ٹھوکا دیا اور میں آگے بڑھ گیا۔ نکاسی کا ہمیں ایک ہی راستہ معلوم تھا جہاں سے ہمیں لایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی اگر تھا تو اس سے ہم دونوں ہی لاعلم تھے۔ پھر بھی میں محتاط روی کے ساتھ حویلی کے ان گوشوں کا ہی انتخاب کیے ہوئے تھا، جہاں سے مجھے کوئی ایسا راستہ دکھائی دے جائے کہ ہم بہ آسانی یہاں سے نکل سکیں۔

ایک غلام گردش کے عقبی خلا میں دیوار پر مجھے خاصی بڑی کھڑکی نظر آئی۔ یہاں سے میں نے باہر جھانکا تو مجھے حویلی کا بیرونی حصہ نظر آیا جہاں میں نے پولیس کی ایک پرانے ماڈل کی لمبی سی جیپ کھڑی دیکھی، وہاں کچھ انڈین پولیس کی وردی میں افراد خاصے چوکس کھڑے تھے۔

ابھی میں کھڑکی سے ہٹ کر آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک میری نظر حویلی کی طرف آنے والے بل کھاتے چوڑے کچے راستے پر پڑی اور میں بُری طرح چونک پڑا۔ وہاں دو تین بھاری بھرکم گاڑیاں خاصی رفتار کے ساتھ حویلی کی طرف بڑھی چلی آرہی تھیں۔ یکلخت میرے اعصاب تن گئے اور آنکھیں پھیل سی گئیں۔ وہ پولیس کی گاڑیاں نہیں تھیں، مگر میں جان سکتا تھا کہ اس میں کون لوگ سوار ہو سکتے تھے! میں نے کھڑکی سے ہٹنے کا ارادہ ترک کیا اور ان گاڑیوں پر نظریں گاڑ دیں۔

"یہ...... گاڑیاں......؟" معاً مجھے سوشیلا کی اٹکتی آواز سنائی دی۔ وہ بھی میرے قریب کھڑی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی کانپتی ہوئی سی آواز میں اندیشوں کی تھرتھراہٹ تھی۔

"مجھے دیکھنے دو......" میں نے بدستور اپنی عقابی نظریں انہی گاڑیوں پر مرکوز رکھتے ہوئے مختصراً کہا۔

گاڑیاں احاطے کے بڑے سے چوبی دروازے کے قریب پہنچ کر رک چکی تھیں۔ اب ان کا زاویہ کچھ اس طرح بن گیا تھا کہ یہ تینوں گاڑیاں میری نظروں سے تقریباً اوجھل ہو چکی تھیں۔ گیٹ پر تعینات مہارانی کے مسلح گارڈز نے شاید انہیں روک لیا تھا اور ضروری پوچھ تاچھ میں مصروف تھے۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان گاڑیوں میں کون لوگ ہو سکتے تھے! پھر بھی میں ان کے اندر داخل ہونے کا بے چینی سے منتظر تھا، میں تب ہی انہیں دیکھ کر پہچان سکتا تھا، جب

انہیں اندر داخل ہونے کی اجازت مل جاتی۔

''شہزی......! یہ وہی لوگ ہیں، ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔'' سوشیلا نے سرگوشی میں کہا۔ وہ خود کو کافی سنبھال چکی تھی۔ میں نے جواباً کہا۔

''ٹھہرو...... مجھے پہلے تصدیق کر لینے دو، تب ہی کچھ کرتے ہیں۔ ہمارے لیے ان لوگوں نے دروازے وا نہیں کررکھے ہیں کہ ہم بڑے آرام سے نکل جائیں گے۔''

وہ میری بات کا مطلب سمجھ کر چپ ہو رہی۔

میری یک ٹک نظریں بدستور دروازے کے اندرونی حصے پر مرکوز تھیں۔ دروازے کے باہر کیا ہو رہا تھا، مجھے اس کا کچھ اندازہ نہیں تھا، یہ ضرور پتا چلتا تھا کہ انہیں روک لیا گیا تھا۔ پھر اچانک میں نے اس دیوہیکل چوبی گیٹ کا بغلی دروازہ کھلتے دیکھا۔

ایک حواری تیزی سے اندر داخل ہوا تھا۔ اس کا رخ حویلی کے مرکزی دروازے کی طرف تھا۔ وہ شاید اندر مہارانی سے یہ اجازت لینے کے لیے جا رہا تھا کہ ان نو وارد گاڑی سواروں کو اندر داخل ہونے دیا جائے یا نہیں۔

اس سارے عمل میں تھوڑی دیر لگ سکتی تھی۔ گزرتا ہوا ہر لمحہ چیخ چیخ کر مجھے خبردار کر رہا تھا کہ ایسے وقت میں بہت سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے، نہ صرف کسی قسم کی جلد بازی بلکہ بلاوجہ کی تاخیر بھی ہمارے لیے کوئی بڑی مصیبت کھڑی کر سکتی تھی۔ میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے اسی طرف دیکھتا رہا۔ یہ فوری فیصلے کی گھڑی تھی، سوشیلا زیادہ پریشان اور تشویش زدہ نظر آنے لگی۔ پل کے پل میں نے سوچا۔ ہماری تلاش میں سرگرداں، اگر یہ ہمارے مشترکہ دشمنوں کا ٹولا ہی تھا، یعنی بلیو ٹکسی اور اس کے اتحادی کوہارا (اسپیکٹرم) اور یہ لوگ بلاشبہ ہماری ہی تلاش میں یہاں تک پہنچے تھے، تو کم از کم مہارانی انہیں ہمارے بارے میں کبھی نہیں بتا سکتی تھی بلکہ وہ کیا، مہارانی نے تو اس پولیس انسپکٹر کو بھی ہمارے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا ہوگا، جس کے ساتھ وہ برہمی سے پیش آ رہی تھی، نہ ہی وہ بتا سکتی تھی، وجہ اس کی ظاہر ہے یہی تھی کہ وہ مجھے اپنی طرف سے تہ خانے میں مقید کروا چکی تھی اور سوشیلا تو پہلے ہی اس کی ''قید'' میں تھی۔

یہی بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ پولیس انسپکٹر جو کسی گمنام اطلاع پر مہارانی کے کسی جرم کو بے نقاب کرنے کی غرض سے تفتیش کے لیے آیا ہوا تھا وہ حویلی کی تلاشی کے لیے بضد تھا۔ یوں، ہمارے دشمنوں کو بھی ''لگے ہاتھوں'' یہ موقع حاصل ہو سکتا تھا۔ میرے دشمنوں میں بلیو ٹکسی ٹولا اندر موجود پولیس کو ہی نہیں بلکہ مہارانی کو بھی کسی خفیہ ادارے کی کارروائی یا غیر ملکی جاسوس کی تلاش کے سلسلے میں اپنا تعارفی حوالہ دے کر ان سب کو بہ آسانی مرعوب کر سکتا تھا۔ کیونکہ بلیو ٹکسی ٹولے کو بہرحال ایک خفیہ (بھارتی) ملکی ادارے کی حیثیت اور رعب و دبدبہ حاصل تھا، اور ان کی مرضی کے سامنے مہارانی بھی مجبور ہو سکتی تھی۔

پولیس کی بات تو اور تھی لیکن بلیو ٹکسی اور اسپیکٹرم والے میری تلاش میں اس حویلی کا چپا چپا چھان سکتے تھے۔ کیونکہ اب تک ہماری تلاش میں ان لوگوں نے پوری بستی چھان ماری ہوگی اور یہ بھی انہیں پتا چلا ہوگا کہ اس بستی میں دو نو وارد اجنبی افراد کو دیکھا گیا ہے۔ پھر ان کی تلاش اور تفتیش کا دائرہ کار ڈاکٹر لیکھ رام سے لے کر بالآخر یہاں مہارانی کی حویلی تک پہنچ ہوا ہوگا یوں انہیں پورا یقین ہو چلا ہوگا کہ ہم انہیں اسی حویلی میں ہی مل سکتے تھے۔

مہارانی ان کے آگے نہیں ٹھہر سکتی تھی، وہ کوئی اصلی والی راجاؤں مہاراجاؤں والی مہارانی نہیں تھی، ایک عام سی زمیندارنی تھی اور تنہا تھی، نجانے اس کے باقی افرادِ خانہ کہاں تھے؟ تھے بھی یا نہیں، میں نہیں جانتا تھا۔ تاہم یہاں اس کے رکھ رکھاؤ سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ دبدبے والی نہیں تھی۔

بہرکیف ذہن میں تیزی سے چلتے خیالات کی اس چھین میں، میں چند سیکنڈوں کے اندر اندر ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا اور اسی وقت میں نے سوشیلا سمیت حرکت کی۔

اب میری کوشش تھی کہ میں حویلی کے اندرونی گوشوں میں چھپتا چھپاتا ہوا کوئی ایسا چور یا قدرے متبادل راستہ ڈھونڈ لوں جہاں سے میں سوشیلا سمیت بہ خیر و عافیت اس منحوس حویلی سے نکل جاؤں ورنہ یہ حویلی کسی وقت بھی ہمارے لیے چوہے دان بن سکتی تھی۔

میں نے ایک بات محسوس کی تھی، حویلی کے بیشتر گوشے دن کی روشنی میں بھی نیم تاریکی میں غرق تھے، میں اور سوشیلا اسی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کسی کی نظروں میں آئے بغیر کسی چور نکاسی کے راستے کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

حویلی کے ایک بعید ترین گوشے میں، جہاں خاصی خاموشی تھی، مجھے ایک کمرے کا دروازہ کھلا ملا۔ اندر سے روشنی آ رہی تھی، مگر یہ روشنی کسی بلب کی نہیں لگتی تھی، یہ سورج کی روشنی تھی۔ میں نے سوشیلا کو ایک طرف کھڑے رہنے کا کہا اور خود گربہ قدمی سے کمرے کی دیوار سے لگے، اس کے

دروازے کی طرف بڑھا اور اندر جھانکا۔ کمرا بھائیں بھائیں کر رہا تھا مگر اندر یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک سی اُبھری تھی کہ کمرے کی ایک کھڑکی چوپٹ کھلی ہوئی دکھائی دی۔

میں نے سوشیلا کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود بھی آگے بڑھا۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر میں نے بڑے دھیان سے باہر جھانکا تو میرا دل کامیابی کے احساس تلے یکبارگی زور سے دھڑکا۔

یہ کھڑکی قدرے بلندی پر سہی مگر جنگل کی طرف واقع تھی اور وہاں کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔

''آؤ سوشیلا......! ہمیں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے اس سے کہا۔

کھڑکی آدم گزار تھی۔ تھوڑا اسکڑ سمٹ کر باہر کودا جا سکتا تھا۔ یہ بمشکل سات، آٹھ فٹ ہی بلند تھی۔ پہلے میں باہر کودا، اس کے بعد سوشیلا اپنی ساڑی سنبھالے کھڑکی کی چوکھٹ پر اُبھری۔

اسی وقت اس کی تیز چیخ اُبھری، میں بری طرح ٹھٹکا۔ میں نے دیکھا وہ باہر نکلنے کے لیے زور آزمائی کر رہی تھی، لیکن شاید کوئی اسے اندر سے پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں پریشان ہو گیا۔

''کیا ہوا......؟ کون ہے تمہارے پیچھے؟'' میں نے اوپر کھڑکی کی چوکھٹ میں پھنسی سوشیلا سے نیچی آواز میں کہا۔ اسی وقت سوشیلا نے خود ہی کوئی ہمت دکھائی تھی اور عقب سے اسے دبوچنے والے پر اس نے لات چلا دی تھی، پھر ایک جھٹکے سے وہ اُچھلی اور سیدھی نیچے آ رہی، میں نے آگے بڑھ کر اس کے گرتے ہوئے نرم و نازک جسم کو تھام لیا۔ وہ خاصی دہشت زدہ سی ہو رہی تھی۔ تاہم میری مضبوط بانہوں کی گرفت میں آتے ہی اس نے قدرے سکون کا سانس لیا تھا۔ رائفل میں نے پشت پر لٹکا رکھی تھی، دوڑنے سے پہلے میں نے ایک نظر کھڑکی پر ڈالنا ضروری سمجھا تھا کہ کہیں وہاں سے سوشیلا کو دبوچنے والا ہم پر فائر ہی نہ کھول دے۔

کھڑکی کے چوکھٹے پر مجھے مہارانی کے ایک حواری کی صورت نظر آئی تھی۔ اس نے ''قیدیوں'' کو بھاگتے دیکھ کر اپنی رائفل سیدھی کر لی۔ مگر اس سے پہلے میں خطرہ بھانپتے ہی سوشیلا کو زمین پر لٹا کر اپنی رائفل ہاتھ میں لے چکا تھا اور سوشیلا میرے عقب میں کھڑی تھی۔ میری رائفل نے ایک زوردار دھماکے سے گولی اُگلی تھی، جو اس حواری کے شانے پر لگی، وہ کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ پیچھے کی طرف اُلٹ گیا۔

''بھاگو سوشیلا......!'' میں نے اس سے کہا اور جنگل کی طرف دوڑ لگا دی۔ سوشیلا نے فوراً میری تقلید کی تھی۔ ہم دونوں اندھا دھند جنگل کی طرف دوڑتے چلے گئے۔

☆☆☆

ہم دونوں جنگل میں داخل ہونے کے باوجود اس وقت تک دوڑتے رہے، جب تک کہ حویلی سے کافی دور نہیں ہو گئے۔ سوشیلا ایک نازک اندام عورت ہونے کے باوجود اس کڑے وقت میں بھرپور ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کر رہی تھی، یا یہ اس جذبے کی کارفرمائی تھی جو اس کے اندر ان وحشی دشمنوں کے دوبارہ ہتھے چڑھنے کے خوف کی وجہ سے پوری طرح بیدار تھا۔

جنگل خاصا گھنا تھا۔ ہم ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکے تھے۔ ہاں، کبھی دوڑتے تو کبھی تیز تیز قدموں سے چلنے لگتے، ابھی ہم حویلی سے بہ مشکل چند ہی کوس دور تھے کہ ہمیں اپنے عقب میں گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔

''دشمن......!'' یکبارگی میرے ذہن میں اُبھرا۔ میں نے سوشیلا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''دوڑو سوشیلا! دشمن ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔''

بدقسمتی سے یہ وہ وقت تھا جب سوشیلا کا سانس بُری طرح پھول چکا تھا اور اس کی دوڑنے کی تو کیا، بے چاری کے چلنے کی بھی ہمت جواب دے چکی تھی۔ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''ہے بھگوان......! مجھ سے تو اب چلا بھی نہیں جا رہا...... میں تو...... ذرا دیر رک کر سستانے کا سوچ رہی تھی۔'' میں اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔ گاڑیوں کی آوازیں لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ لگتا کچھ ایسا ہی تھا کہ عین آخری لحات میں ہمارے فرار کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا اور یہ سب اسی حواری کی مداخلت سے ہوا تھا جس نے سوشیلا کو کھڑکی سے باہر کودتے ہوئے جانے کیسے اچانک دیکھ لیا تھا اور بعد میں فائر بھی کر ڈالا تھا، اپنی اس بے وقوفی کا تو اسے بعد میں احساس ہوا ہوگا کہ یہ وہ وقت تھا جب مہارانی پولیس سے ہمارے سلسلے میں اپنی جان چھڑانے کی کوشش میں تھی اور اس پر مستزاد ہمارے دشمن بھی وہاں آ دھمکے تھے۔ فائر کی آواز نے انہیں بھی ضرور چونکا دیا ہوگا اور پھر کوئی معاملہ پوشیدہ نہیں رہا ہوگا۔

پولیس سے قطع نظر میرے دشمن فوراً سے پیشتر ہمارے تعاقب میں نکل گئے ہوں گے، کیونکہ بستی والوں کی

زبانی انہیں پہلے ہی سے ہمارے سلسلے میں بھنک پڑ چکی تھی۔

''سوشی! ہمت کرو پلیز ...... ! آگے بڑھو...... دشمن سر پہ پہنچنے والے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ میرا ہاتھ چھوڑ کے بے دم ہو کر گرنے لگی، مگر میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، وہ سسک پڑی۔

''شہزی...... ! تم بھاگ جاؤ...... مجھے یہیں چھوڑ دو......'' اس کی سسکتی آواز میں بڑی بے چارگی آمیز بے بسی تھی۔ اس کے لہجے کی شکست خوردگی میں حسرت و یاس کی بے چارگی ایک آس بن کر ٹپکتی محسوس ہوئی تھی مجھے۔

''نہیں سوشیلا...... ! میں تمہیں ہرگز ان وحشی درندوں کے حوالے نہیں کروں گا۔'' میں نے نجانے کس جذبے کے تحت ایک جوش بھری آواز میں کہا اور پھر سوشیلا کے نرم و نازک وجود کو اپنی بانہوں میں اٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا۔ اس کے حلق سے ایک ''آہ'' سے مشابہ سسکی ابھری تھی اور میں نے دوڑ لگا دی۔

خود میرا اپنا بھی تھکن اور ہانپنے سے برا حال ہو رہا تھا۔ میرے زخم اگرچہ مندمل ہونے لگے تھے، لیکن اس بھاگم دوڑی سے ان میں دوبارہ سے دکھن ہونے لگی تھی، لیکن ڈاکٹر لیکھ رام کی ٹریٹمنٹ وغیرہ سے مجھے جادو اثر فائدہ تو ہوا تھا۔ مگر ان حالات میں میری طبیعت دوبارہ بگڑنے کا اندیشہ تھا۔ لیکن میں نے پہلے کب ان باتوں کی پروا کی تھی۔ میں رکا نہیں تھا، سوشیلا کو کاندھے پر اُٹھائے اسی طرح دوڑتا رہا۔

آگے جنگل کچھ چھدرا چھدرا سا ہو گیا تھا۔ عقب میں ...... گاڑیوں کی آوازیں قریب آتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس طرح بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، میں بھی آخر انسان تھا اور بیماری سے اُٹھا تھا۔ کب تک ایک بوجھ کو اُٹھائے دوڑتا رہتا۔ جبکہ دشمن تیز رفتار گاڑیوں میں تھے اور جدید اسلحے سے لیس بھی، میرے پاس فقط ایک عام سی رائفل تھی۔

جلد ہی اطراف میں گردش کرتی ہوئی میری آنکھوں نے ایک موٹے اور جڑواں تنوں والے ایسے درخت کو تاڑ لیا، جس کے درمیان ... ایک کھالا سا بنا ہوا تھا۔ کھالے کے سرے پر خودرو قدِ آدم جھاڑیاں بھی اُگی ہوئی تھیں۔

ٹھیک اسی وقت میرے عقب میں برسٹ فائر ہوا، غیر ارادی طور پر میرا پاؤں کسی جھاڑی سے رپٹا، میں نیچے آ رہا۔ سوشیلا کے حلق سے بھی بے اختیار ایک خوف زدہ سی چیخ خارج ہو گئی۔ میں نے گرتے گرتے اسے سنبھالا اور پھر اُٹھ کر اسی موٹے اور جڑواں تنوں والے درخت کی طرف لپکا۔

مجھے اندازہ تھا کہ دشمن نے یا تو ہماری جھلک دیکھ لی تھی یا پھر یوں ہی ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے برسٹ فائر کیا تھا۔

بہرکیف میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سوشیلا کا ہاتھ تھامے اس کھالے کے اندر گھس گیا بلکہ ''سما گیا'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کے تاریک سے خلا میں ہم دونوں چھپ تو گئے تھے، مگر میں ایک مشکل میں پھنس گیا تھا۔

کھالے کا خلا کتنا گہرا تھا، مجھے اس کا اندر گھسنے کے بعد ہی اندازہ ہو سکا تھا، چھدرے جنگل سے اگرچہ سورج کی کرنیں چھن کر زمین پر پڑ رہی تھیں، لیکن کھالا قدرے گہرا ہونے کے باعث دور سے تاریک ہی نظر آتا تھا۔

اب مشکل یہ تھی کہ دشمنوں سے بچنے کے چکر اور جلد بازی میں کھالے کے اندر ہماری پوزیشن کچھ ایسی بن گئی تھی کہ ہم اندر سکڑ سمٹ کر ایک دوسرے سے باہم پیوست سے ہو گئے تھے۔ میں کھالے کی اندرونی تہ کی دیوار سے چپکا کھڑا تھا اور سوشیلا پشت کے بل میرے سینے سے لگی کھڑی تھی۔ اس کی نرم و گداز اور سبک خرام پشت کو اپنے تنے ہوئے وجود پر برداشت کرنا میرے لیے خاصا ''مہلک'' ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے سوشیلا کو خود سے تھوڑا آگے دھکیلنے کی اپنی سی کوشش چاہی تھی، مگر اس طرح اس کے ظاہر ہونے کا خدشہ بڑھنے لگتا تھا۔ وہ کسمسا کر پھر اندر میرے ساتھ پیوست ہو جاتی تھی۔ میں نے کھالے کے دہانے کے سرے پر اُگی ہوئی جھاڑیوں کو مزید آگے کر کے پھیلا لیا تھا، اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ میں تو کھالے کے اندر سے باہر، سامنے کے رخ پر دیکھ سکتا تھا، مگر باہر والے اندر دیکھنے سے قاصر تھے، جب تک کہ وہ قریب آ کر اندر جھانک کر نہیں دیکھ لیتے۔ لیکن ایسا ممکن ہو سکتا تھا کہ کسی کو یہاں شک ہو جاتا تو وہ یہ بھی کر کے دیکھ سکتا تھا۔ اب میں اور سوشیلا یہی دعا مانگ رہے تھے کہ کوئی اس طرف متوجہ نہ ہوتا۔

میری اور سوشیلا کی دھڑکتی نظریں، آگے تنی ہوئی جھاڑیوں کے آرپار جمی ہوئی تھیں۔

دفعتاً ہی میں نے وہی تین بھاری گاڑیاں تیزی سے قریب آتے دیکھیں، جو میں حویلی کے باہر دیکھ چکا تھا۔ وہ چھوٹے موٹے موڑ کاٹتی، ہچکولے لیتی اسی طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ میری عقابی نظریں گاڑی میں سوار افراد کو بھانپنے کی کوشش میں تھیں اور ساتھ ہی میں یہ دعا بھی مانگے جا رہا تھا کہ یہ گاڑیاں ادھر نہ رکیں اور اسی طرح آگے بڑھ جائیں۔

گاڑیاں لمحہ بہ لمحہ اسی درخت کے قریب آتی جا رہی تھیں اور جیسے جیسے قریب ہو رہی تھیں، ہمارے دل کی

دھڑکنوں میں بھی تیزی آتی جارہی تھی۔ یہاں تک تینوں گاڑیاں ہمارے بالکل قریب آگئیں اور میری بدستور ان پر جمی ہوئی نظروں نے گاڑیوں میں سوار چند شناسا چہروں کو فوراً پہچان لیا، جن میں چندرناتھ، شیام اور کورنیلا سوار تھے، ان میں سے جی کوہارا اور تین اسی رنگ ونسل کے برمی بھی سوار تھے، جبکہ بلیوتلسی کا مسلح ونگ بھی موجود تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے یہ خوفناک شکاری تھے اور اپنے چھپے ہوئے شکار کو ڈھونڈنے بلکہ انہیں دیکھتے ہی ان کی تکابوٹی کرنے کو تیار تھے۔

گاڑیاں اب ہمارے درخت کے قریب سے گزر رہی تھیں۔ ہماری پھیلی پھیلی سی نظریں، جیسے ان کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھیں، یہاں تک کہ وہ ایک کے بعد دوسری اور تیسری، بھی گزرتی چلی گئیں...... اور ہم دونوں کے حلق سے بے اختیار ایک گہری طمانیت بھری سا نس خارج ہوگئی، لیکن دوسرے ہی لمحے ہم بری طرح چونک پڑے۔ تینوں گاڑیوں کی جاتی ہوئی آوازوں میں یک دم فرق آیا۔

گاڑیوں کی آوازیں معدوم ہونے کے بجائے، تھمی ہوئی سی محسوس ہونے لگیں۔ میرا دل یکبارگی اندیشنا کی سے دھڑکا۔

''گاڑیاں رک گئی ہیں...... شہزی!'' معاً میرے ساتھ چپکی لگی کھڑی سوشیلا نے سرسراتی سرگوشی کی۔

''ہاں...... لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔''

''مم...... مگر کیوں؟ کیا انہیں کچھ شبہ ہوا ہے؟''

''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے ویسے ہی رکے ہوں۔''

''نہیں شہزی! ویسے ہی نہیں رک سکتے یہ لوگ......'' سوشیلا نے جیسے پل کے پل تجزیہ کیا۔ ''یہ کوئی عام لوگ نہیں ہیں، حویلی سے لے کر اس جنگل تک انہوں نے ہمیں کسی طریقے سے واچ کیا ہوگا۔''

''تمہارا خیال ہے، قدموں کے نشانات......؟''

''ہاں!''

مجھے اس کی بات بلا مبہم لگی۔ ''تب تو یہ لوگ اس درخت کا بھی کھوج لگا سکتے ہیں۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''دعا کرو ایسا نہ ہو......'' اس کی آواز میں سراسیمگی کا شائبہ ابھرا تھا۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا......'' میں نے زیر لب کہا۔ ''تم تھوڑا اس طرف ہوجاؤ، میں ایک نظر باہر ڈالنا چاہتا ہوں۔'' میں کسمسایا، وہ میرے ساتھ چپکی ہوئی سی ایک طرف کو سرکی، میں نے پھنس پھنسا کر حرکت کی اور کھالے کے دہانے پر تھوڑا سا ابھرا۔ سر باہر نکالا اور یک دم ہی مجھے اندر ہونا پڑا۔ تینوں گاڑیاں درخت سے کچھ ہی فاصلے پر رکی ہوئی تھیں۔ ان کے انجن اب بند کر دیے گئے تھے، البتہ ان کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ وہ سب مسلح تھے اور اطراف میں تیزی سے بکھرنے لگے تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں لمبے پھلوں والے چھرے بھی تھے، جن سے وہ راہ میں آنے والے جنگلی پتوں اور جھاڑیوں کو کاٹ رہے تھے۔ سے جی کوہارا اور چندرناتھ وغیرہ کو ملا کر ان کی تعداد دس، بارہ کے قریب لگتی تھی۔ ان میں بھارتی، برمی دونوں ہی تھے۔

''کیا ہوا......؟'' مجھے چونکتا محسوس کر کے سوشیلا نے سرگوشی میں پوچھا۔

''وہ سب پھیل گئے ہیں چاروں طرف، ہم زیادہ دیر شاید اس درخت کے اندر محبوس نہیں رہ سکتے۔''

''تمہارا خیال ہے ہمیں باہر نکلنا ہوگا؟'' وہ ہراساں لہجے میں بولی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی وقت کھالے کے باہر آہٹ ابھری اور ساتھ ہی کھچا کچ جیسی آواز بھی آئی۔ شاید کوئی جھاڑیوں اور پتوں پر چھرا اچھالتا ہوا اس طرف کو آنکلا تھا۔

یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے سوشیلا کو آواز نہ نکالنے کی ہدایت کی اور محتاط ہو کر کھالے کے سرے پر سرک آیا۔ رائفل میں نے اتار کے اندر ہی کہیں ٹکا دی تھی۔ یہ عام سی رائفل ابھی کسی کام کی نہیں تھی۔

میں نے دو برمیوں کو اس طرف آتے دیکھا تھا۔ وہ جڑواں تنوں والے اس درخت کے خاصے قریب آگئے تھے اور میں کھالے کے دہانے پر بکھری ہوئی جھاڑیوں کے روزنوں سے انہیں گھور رہا تھا۔ وہ ان جھاڑیوں کے بھی بہت قریب آگئے تھے، میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا اور میں نے جیسے اپنی سانس تک روک لی تھی۔ دونوں برمی اگر ان جھاڑیوں پر چھرے چلاتے تو یہ یقینی امر ہوتا کہ جڑواں تنوں والے اس درخت کا یہ خلا ان کی نظروں میں آجاتا اور پھر یہ دریغ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے اسے ہمارے سمیت، نکمیوں کا چھتا بنا ڈالتے۔

دونوں برمی ان جھاڑیوں کے قریب آکر یوں خاموشی سے کھڑے ہوگئے تھے، جیسے ''شکار'' کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ جھاڑیوں کے چھدرے رخنوں

کے پار میری دھڑکتی ہوئی نظریں ان کے بشروں پہ جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ان کی پشت پر رائفلوں کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

تب ہی ایک برمی کی چندھی چندھی سی مکار آنکھوں کو میں نے کھالے کی جھاڑیوں پر اٹکتے دیکھا۔ اس کے حلق سے آوازسی خارج ہوئی، شاید اس نے اپنے ساتھی کی بھی توجہ اس طرف مبذول کروانے کی کوشش کی تھی اور دوسرے ... ہی لمحے ان دونوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے چھروں کو حرکت دی اور کھچاکھچ کی آواز کے ابھرنے کے ساتھ ہی تیزی سے کھالے کے سامنے سے جھاڑیاں صاف ہوتی چلی گئیں۔ میں تھوڑا پیچھے کو سرک گیا۔

میرا پورا وجود اس وقت اندیشناک خطروں کی دھمک محسوس کرتے ہوئے بُری طرح سنسنانے لگا تھا۔ برمیوں کو کھالا دکھائی دے گیا تھا۔ ان کے باقی ساتھیوں کی آوازیں بھی اطراف میں گونج رہی تھیں، ان میں گاہے بہ گاہے چندرناتھ اور سے جی کوہارا کی تحکمانہ آوازیں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔ پھر میں نے ان دونوں کو کھالے پر بہ غور نظریں جماتے ہوئے دیکھا، تب ہی ان میں سے ایک، اپنا لمبے پھل والا چھرا لیے آگے بڑھا۔ اب میرا محبوس رہنا عبث تھا۔ میں کھالے کے اندر سے ہی اس پر عقابی نظریں جمائے ہوئے آگے کو سرکا۔ وہ چند قدم مزید قریب آیا اور کھالے کے دہانے کے پاس رک گیا۔ اس نے اپنی بیلٹ میں اڑسی ہوئی چھوٹی ٹارچ نکالی۔ ابھی وہ اسے روشن کرنے ہی والا تھا کہ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی اور اسے گردن سے دبوچ لیا۔ گردن دبوچتے ہی میں نے اس کی رگِ حساس مسل ڈالی، وہ وہیں جھول کر رہ گیا۔ میں نے اسے اندر کھینچ لیا اور اس کے بے سدھ وجود کو سوشیلا کے ساتھ لِٹا دیا۔ ساتھ ہی اس سے سرسراتی سرگوشی میں بولا۔

''اس کی گن قبضے میں کرلو...... جلدی۔''

میں نے اس کا چھرا اپنے قبضے میں کرلیا تھا، وہ اب میرے دائیں ہاتھ میں تھرک رہا تھا۔

دوسرا برمی اپنے ساتھی کو اچانک غائب پاکر ذرا متحیر سا ہوا تھا اور اس نے شاید اسے آواز بھی دی تھی، جواب میں، میں نے بھی اپنے حلق سے عجیب سی آواز خارج کی۔ برمی کا ساتھی چونکا اور اس نے یک دم اپنی گن پشت سے اتار کر ہاتھ میں پکڑلی، چھرا اس نے اپنی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔

وہ گن تھامے کھالے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اسے دبوچنے کے لیے چیتے کی طرح کھالے کے تاریک سے خلا میں چپکا کھڑا تھا کہ اچانک اس برمی نے کسی خطرے کی بو سونگھ لی اور وہ ہیں رک گیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے گردن موڑ کر متلاشی نظروں سے اپنے دیگر ساتھیوں کو دیکھنا چاہا تھا، یہ بھانپتے ہی کہ وہ انہیں آواز دے کر اس طرف متوجہ کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا، میں نے چیتے جیسی سبک خرامی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور چھرا تولے ہوئے، کھالے کے دہانے سے کسی آفت کی طرح نازل ہوا اور اس برمی کی اپنے ساتھیوں کو آواز دینے کی حسرت سینے میں ہی دم توڑ گئی۔

میرے چھرے کے تیز دھار پھل نے اس کا پیٹ چیر ڈالا تھا، مگر شاید اس بدبخت کی اُنگلی اپنی گن کے ٹریگر پر اٹکی ہوئی تھی، جو غیر ارادی طور پر حرکت میں آ گئی تھی۔ ایک کریہہ انگیز اور گھٹی گھٹی سی کراہ خارج کرتے ہوئے وہ گرا تو اس کی گن کسی وحشیانہ دہاڑ کے ساتھ گرجی۔ میں نے اس کی گن پر ہاتھ مارا اور اچک لی۔ پھر سوشیلا کو آواز دی۔ وہ پہلے والے برمی کی گن ہاتھ میں لیے کھالے سے نمودار ہوئی۔

''اس طرف...... جلدی......'' میں نے اشارے سے اتنا ہی کہا اور اس طرف کی جھاڑیوں کی طرف لپکا، جو خاصی قدِ آدم تھیں بلکہ وہاں دشمنوں کی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔

میرے ہاتھ میں دشمن کی جدید گن لگ چکی تھی۔ میں نے پل کے پل اس کا جائزہ لیتے ہوئے بھانپ لیا تھا کہ یہ ڈیڈیسٹ اسالٹ سیریل کی ایک ملٹی فنکشنل کروشیئن مشین گن تھی۔ اس کے ساتھ ہینڈ گارڈ اٹیچ تھا، جسے میں نے الگ کر کے پھینک دیا تھا۔ اسی وقت مجھے شور سنائی دیا۔

''اس طرف...... وہاں دوڑو سب...... ہری اپ اینڈ فلش گن آن......''

یہ بلیوٹلسی کے کرنل سی جی بھجوانی کے نائب چندرناتھ کی پُرغیض آواز تھی۔ وہ اس وقت غالباً سے جی کوہارا اور اس کے برمی ساتھیوں پر بھی حکم صادر کرنے کا مجاز نظر آرہا تھا۔

اسی وقت جنگل کا یہ حصہ تیز روشنیوں میں نہا گیا اور مجھے اپنے سامنے محض چند قدموں کے فاصلے پر تین مسلح افراد دکھائی دیے، جن میں دو اپنے مخصوص چست لباس اور وضع قطع سے بھارتی اور ایک برمی دکھائی دیا۔ وہ اسی طرف ہی گھوم رہے تھے، جدھر میں اور سوشیلا سرک رہے تھے۔

میری گن کا رخ اسی طرف ہی تھا اور انگلی لبلبی پر، جس نے پلک جھپکتے ہی حرکت کی تھی۔ پورا برسٹ میری گن کی نال سے چلا اور وہ تینوں حلق سے کریہہ انگیز چیخیں خارج کرتے ہوئے زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ تب ہی ہم پر بیک وقت

کئی گنیں گرجی تھیں۔ مجھے اس کا پہلے ہی اندازہ تھا، اسی سبب میں نے سوشیلا سمیت خود کو پاس کی گھنی جھاڑیوں میں گرالیا تھا۔ گولیوں کی سنسناتی ہوئی بوچھاڑ ہمارے سروں سے گزری تھی۔

''آگے بڑھو...... رکنا مت......'' میں نے اس سے کہا اور بہ سرعت کرولنگ کرتا، اس جیپ کی آڑ میں آگیا، جو دشمنوں کی لاشوں سے ذرا فاصلے پر ہی کھڑی تھی۔ مگر میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ کیے بغیر فوراً پشت کے بل ہوگیا اور سوشیلا کو بھی یہی ہدایت کرتے ہوئے اسے اپنی تقلید کرنے کا کہا۔

میری انگلی بدستور گن کی لبلبی پر ایک ذرا سی جنبش لینے کو بے قرار تھی۔ اسے حرکت دی اور میری گن نے اسی طرف ہی جوابی برسٹ اُگلا تھا، جس طرف سے ہم پر گولیاں برسائی گئی تھیں۔ سوشیلا نے بھی میری تقلید کرتے ہوئے مذکورہ سمت فائر کھولا تھا، ایک سے زائد اُبھرنے والی دشمنوں کی چیخوں نے ہمارے نشانے کی تصدیق کر ڈالی تو میں نے فوراً حرکت کی اور سوشیلا کو مجھے کور دینے کا کہہ کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور پھر اس میں سوار ہونے کے لیے ذرا اُونچا ہوا ہی تھا کہ ایک برسٹ فائر ہوا، کئی گولیاں ''زٹا...... زٹ زٹ......'' کی آواز سے گاڑی کی فولادی باڈی سے ٹکرائی تھیں اور ایک آدھ ہی کھڑکی کے شیشوں سے آر پار ہوئی تھی، شکر تھا کہ میں نے بروقت جھکائی دی تھی۔ تاہم گولی سے شیشوں کے ٹوٹ کر ان سے اُچھلنے والی کرچیاں میرے چہرے پر پڑی تھیں اور خراشیں ڈال گئی تھیں۔ میں نے ہلکی کراہ خارج کی تو سوشیلا کی تشویش زدہ آواز اُبھری۔

''شہزی...... !یو اوکے......؟''

''گاڑی کے عقبی دروازے سے اندر سوار ہو جاؤ......'' میں نے کہا اور ذرا اُبھر کر ٹوٹے ہوئے شیشوں کی کھڑکی کے آر پار سے اسی جانب ایک برسٹ فائر کر دیا۔ میرے کانوں نے ایک ہی چیخ سنی تھی۔ اس سے قریب موجود دشمن کی افرادی قوت کا ادراک کرتے ہی میں بلاخیز پھرتی کے ساتھ جیپ میں سوار ہوگیا۔ تب تک سوشیلا بھی جیپ کے پچھلے حصے کا دروازہ کھول کر اندر جا گھسی تھی۔ میں نے تلے اوپر فائرنگ کی ہدایت دیتے ہوئے جیپ کے اگنیشن سوئچ میں پہلے سے موجود چابی گھما دی اور کلچ دبا کر گاڑی کو گیئر میں ڈالتے ہی پوری ریس دیتے ہوئے کلچ کو اس طرح چھوڑا کہ جیپ کسی طوفانی بگولے کی طرح حرکت میں آتے ہی دوڑ پڑی۔ توقع کے عین مطابق عقب سے جیپ پر تابڑ توڑ فائرنگ اُبھری۔ جیپ کو میں جتنی مہارت سے کسی بھی گولی کی زد میں آنے سے بچانے کی خاطر دوڑا سکتا تھا، دوڑاتا چلا گیا۔ اگرچہ کئی گولیاں جیپ کی باڈی میں پیوست بھی ہوئی تھیں۔ سوشیلا کو جھکے رہنے کی تاکید کے ساتھ خود بھی اس پر عمل کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ کچھ گولیاں جیپ کی عقبی اسکرین کو توڑتی ہوئی، اندر بھی در آئی تھیں اور ونڈ اسکرین کو توڑتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔ شکر تھا کہ ابھی تک کسی گولی نے ٹائر فلیٹ نہیں کیا تھا اور یہی میں چاہتا بھی تھا، مگر ایسے میں جیپ اور خود کو بچاتے ہوئے اندھا دھند دوڑنا بھی کم رسکی عمل نہیں تھا۔ جنگل کے ناہموار راستوں پہ جیپ بری طرح سے ہچکولے بھی کھا رہی تھی۔ شکر تھا کہ جلد ہی جنگلاتی سلسلہ اختتام کو پہنچا اور بنجر میدانی سلسلہ شروع ہوگیا۔

''شہزی...... ! دشمن تعاقب میں آرہے ہیں......'' معاً عقب سے سوشیلا کی آواز اُبھری۔ جس کی میں توقع کیے بیٹھا تھا اور اس کا حل بھی سوچے ہوئے تھا۔ لہٰذا جیسے ہی سوشیلا نے یہ اطلاع دی تو میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس سے بولا۔

''سوشی...... ! تم اپنی گن پچھلی سیٹ پر چھوڑ کر فوراً آگے اسٹیئرنگ سنبھالو...... جلدی......''

سوشیلا نے میری ہدایات پر فوراً عمل کیا اور ذرا سی کوشش اور چابک دستی سے ہم دونوں اپنی سیٹیں تبدیل کر چکے تھے۔ ابھی میں گن سنبھالے عقبی سیٹ پر آکے ٹکا ہی تھا کہ اچانک عقب سے گولیوں کے برسٹ چلنے کی آواز اُبھری، میں نے گن سنبھالتے ہی چلا کر سوشیلا سے کہا۔

''جیپ کو زگ زیگ دوڑانے کی کوشش کرو......''

میں نے عقبی سیٹ سے اپنا سر اُبھار کر دیکھا تو دو جیپیں ہمارے تعاقب میں دوڑی آرہی تھیں۔ میں نے ٹوٹی ہوئی عقبی اسکرین سے گن کی نال نکالی اور ایک جیپ کو نشانے پر لے کر ٹریگر دبا دیا۔ گو یہ ایک آسان عمل نہیں تھا کیونکہ میری ہدایت کے مطابق سوشیلا بھی اپنی جیپ کو زگ زیگ انداز میں دوڑائے جارہی تھی۔ تاہم میرا نشانہ بھی شاید خطا نہیں گیا تھا۔ میری گن دہاڑی اور میں نے دشمنوں کی ایک جیپ کو بری طرح لہراتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اُلٹتے اُلٹتے رہ گئی، کیونکہ اس کے ڈرائیور کو گولی چاٹ گئی تھی اور کسی اور نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اسے مزید بے قابو ہونے اور اُلٹنے سے بچا لیا تھا، اب فقط ایک جیپ ہمارے پیچھے آرہی تھی، مگر اس کے ساتھ ہی اس سے فائرنگ کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

ٹھیک اسی وقت میں نے دیکھا کہ دوسری جیپ بھی دوبارہ ہمارے تعاقب میں آنے لگی۔ لیکن چونکا میں تب تھا جب میں نے اگلی جیپ کی کھڑکی سے ایک دشمن کو چھت کی طرف سوار ہوتے دیکھا۔ اس کے پاس مجھے راکٹ لانچر نظر آیا تھا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے...... میری گن خالی ہو چکی تھی۔ میں نے سوشیلا کی گن اُٹھالی۔

اسی وقت سوکھی جھاڑیوں والے ٹیلے ٹبوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں ابھی راکٹ لانچر والے دشمن کو نشانہ بنانے کی کوشش میں تھا کہ سوشیلا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"آگے ایک سڑک آرہی ہے۔ اس پر گاڑی کو ڈال دوں یا......"

"سڑک پر ڈال دو جیپ کو......" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور اپنی گن سے جیپ کی چھت پر سوار مذکورہ راکٹ لانچر سنبھالے ہوئے دشمن کا نشانہ لیا۔ برسٹ فائر ہوا۔ لیکن چونکہ دونوں ہی گاڑیاں زیگ زیگ دوڑ رہی تھیں، شاید اسی لیے میرا نشانہ بھی خطا گیا اور دشمن اپنا کام کر گیا۔ اس نے راکٹ فائر کر دیا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔ مجھے کچھ بھی کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ راکٹ اپنے عقب میں دھوئیں کی لکیر چھوڑتا ہوا ہمارے تعاقب میں آیا۔

میرے پاس وقت نہیں تھا کہ میں سوشیلا کو خبردار کرتے ہوئے کوئی ہدایت دیتا۔ راکٹ ہمارے قریب آیا اور ہماری جیپ کے بالکل قریب سے "شائیں" کی آواز سے گزرتا چلا گیا۔ اس کی ہولناک جھلک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی سوشیلا نے بھی دیکھی اور اس کے حلق سے عجیب سی آواز اُبھری تھی۔

خوش قسمتی سے دشمن کا نشانہ خطا جاتے دیکھتے ہی میں نے اسے کوئی اور راکٹ فائر کرنے کا موقع دیے بغیر اس جیپ پر فائر کھول دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرے پاس آخری راؤنڈ والی یہ گن بچی تھی اور دشمن ابھی تک ڈٹے ہوئے تھے اور مجھے مالِ غنیمت کے طور پر جو محدود اسلحہ ہاتھ آیا تھا اسے بے حد دھیان سے استعمال کرتا تاکہ یہ ضائع نہ ہونے پائے۔ مگر بدقسمتی سے صورتِ حال ایسی تھی کہ میرے پاس اس کے سوا۔۔۔ کوئی چارہ نہ تھا کہ مجھے کہیں کہیں اندھا جوا بھی کھیلنا پڑ رہا تھا۔ سو میں کھیل رہا تھا۔ دشمن پر اندھا دھند گولیاں داغنے کا میرا مقصد بھی یہی تھا کہ کسی طرح جیپ کی چھت پر سوار وہ راکٹ لانچر بہ دست ہلاک ہو جائے، جس کا ایک ہی کامیاب نشانہ ہمیں عبرت ناک شکست سے دوچار کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بدبخت اب دوسرا راکٹ فائر کرنے کے لیے پر تولے ہوئے تھا۔

ہماری جیپیں ایک دوسرے کے نشانوں سے بچنے کی خاطر لہرا رہی تھیں اور زگ زیگ انداز میں دوڑ رہی تھیں۔ دشمن اس پوزیشن میں تھا کہ وہ اندھا دھند کافی دیر تک اپنا اسلحہ اندھے جوئے کے نام پر خرچ کر سکتا تھا، لیکن ہماری اس کے مقابلے میں پوزیشن نازک تھی کہ ہمارے پاس ایک ہی گن تھی وہ بھی کافی "خرچ" ہونے لگی تھی۔

میں نے اندھا دھند گولیاں بھی محض قسمت کے یاور ہونے کی اُمید پر برسائی تھیں مگر حتی المقدور کوشش کے تحت یہ سعی بھی چاہی تھی کہ وہ نشانے پر آتی رہیں، دشمنوں کی طرف سے بھی فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ سوشیلا شاید جیپ کو سڑک کی طرف نہیں موڑ سکی تھی، ٹھیک اسی وقت دوسرا راکٹ فائر ہوا۔ اس بار میری بھانپتی آنکھوں نے پل کے پل اپنی طرف آتے ہوئے راکٹ کے "ٹارگٹ" کا ادراک کیا۔ وہ نشانے پر تھا اور ٹارگٹ ہماری جیپ تھی۔ میں حلق کے بل چلایا۔

"سوشی......! جیپ فوراً دائیں جانب موڑ لو......"

سوشیلا نے بھی شاید ایسے کسی خطرے کو بھانپ لیا تھا، اس نے ایک لمحے کی بھی دیر لگائے بغیر اسٹیئرنگ کاٹا اور جیپ گھوم گئی، راکٹ ایک اور سنسناتی ہوئی "شائیں" کی آواز سے ہماری جیپ کے قریب سے گزر گیا۔ ٹھیک اسی وقت قسمت نے ایک اور یاوری کی۔ میری گن کی برستی گولی، دشمن کی اگلی جیپ کا کوئی ایک ٹائر چاٹ گئی، کیونکہ میں نے ایک دھماکے سے اسے بُری طرح ڈولتے دیکھا، یہاں تک کہ وہ سنبھلتے سنبھلتے اُلٹ گئی، اس کی چھت پر سوار، ہمارے لیے مصیبت بنا لانچر بہ دست دشمن بھی نیچے آرہا۔

"جیپ سڑک کی طرف موڑنے کی کوشش کرو......" میں نے سوشیلا کو پھر ہدایت دی۔

"میں کوشش کر رہی ہوں...... تم نے ایک جیپ اُلٹا دی......" وہ جواباً بولی۔ اس کے لہجے میں مسرت چہکی تھی۔

میں نے کوئی توجہ دیے بغیر دوسری جیپ کو تاڑا...... وہ بھی بدستور ہمارے تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔ وہاں سے فائرنگ کا سلسلہ موقوف ہو گیا تھا۔ دشمن کی اصل "کمانڈ" (چندر ناتھ اور کوہارا وغیرہ) شاید اسی جیپ میں سوار تھے، کیونکہ وہ اپنے ساتھیوں کی جیپ اُلٹتے دیکھ کر بھی نہیں رکے تھے۔

جیپ سڑک پر آگئی۔ سڑک پر آتے ہی آگے موڑ آگیا، بائیں جانب موڑ مڑتے ہی ایک ہیوی ٹریلر ٹرک اپنے بھونپو کو بنکارتا ہوا اچانک ہی نازل ہوا، اس کے

ڈرائیور بے چارے نے ہمیں اس کی زد سے بچاتے ہوئے یا پھر بوکھلاہٹ میں اسٹیئرنگ کاٹ دیا۔ نتیجے میں وہ بدمست ہاتھی کی طرح ڈول گیا اور اس کا لمبا ٹریلر گھوم کر ہمارے تعاقب میں آنے والی دشمن کی جیپ سے ٹکرا گیا۔ اگرچہ اس کے ڈرائیور نے بھی اس کی ٹکر سے اپنی جیپ کو بچانے کی پوری کوشش چاہی تھی، لیکن وہ فقط اتنا ہی کامیاب ہوسکا کہ ٹکر کی شدت ہی کم کر پایا، مگر اتنی ٹکر بھی کافی تھی، جیپ کا توازن بگڑا اور وہ ایک طرف کو سائڈ میں ..... اُلٹ گئی۔

''جیپ کی رفتار نارمل کرلو......'' میں نے کہا اور ایک دم اُچھل کر اگلی سیٹ پر سوشیلا کے برابر آکر بیٹھ گیا۔

''بال بال بچے ہیں......'' میں جیسے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے خود کلامیہ بڑبڑایا۔ اس اعصاب شکن معرکہ آرائی کے بعد مجھے تھکن کا سا احساس ہونے لگا تھا اور حلق جیسے سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔

''یہ سب تمہاری بروقت قوتِ فیصلہ اور چابک دستی کی بدولت ہوا ہے کہ ہم خطرناک دشمنوں کے نرغے سے بچ نکلے...... ورنہ تو میں نراش ہی ہو چلی تھی۔ اسلحے کے نام پر بھلا ہمارے پاس تھا ہی کیا؟'' سوشیلا نے توصیفی لہجے میں کہا۔ اس نے اب جیپ کی رفتار مناسب کرلی تھی۔

''آگے کی منزل کا تعین اب تمہارے سپرد ہے......'' میں نے جیپ کے ڈیش بورڈ کے خانوں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے کی منصوبہ بندی کی غرض سے پوچھا۔ مجھے پانی وغیرہ کی بوتل کی تلاش تھی جو نہ ملی۔

''ہم بالاسور سے بھگت گڑھ کی طرف جارہے ہیں۔'' اس نے ایک گہری مسکراتی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور پھر سامنے ٹوٹی ہوئی اسکرین سے باہر تکاتے ہوئے جواب دیا۔

''میری مراد کسی قریبی اور محفوظ ٹھکانے تک پہنچنے سے تھی۔'' میں نے وضاحت کی۔

''کیا تم اب بھی دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''ہاں......!'' میں نے سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈال کر جواب دیا۔

''تمہارا اسٹیمنا کمال کا ہے۔ مجھے اب پورا یقین ہے کہ تم ہی جنرل کے ایل ایڈوانی کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہو۔'' وہ متاثر کن لہجے میں بولی۔ وہ اب کافی مطمئن نظر آنے لگی تھی۔ آگے بولی۔ ''مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ میں نے درست آدمی کا انتخاب کیا ہے۔''

''یہ سارا علاقہ خلیج کھمبات کہلاتا ہے؟'' میں نے اس کی بات سے صرفِ نظر ہو کر پوچھا۔

''خلیج کھمبات اور یہاں......؟'' وہ حیرت سے بولی۔

...... میں چونکا۔ کیونکہ میں اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ سارا ساحلی علاقہ، یعنی بالاسور وغیرہ اسی میں شامل تھا۔ چندر کلا اور اس کے بھارتی ساتھیوں سے ہی اس کا تذکرہ کرتے میں نے سنا تھا۔ درحقیقت میں بلیو ٹکسی کے ہیڈ کوارٹر کی جگہ کا تعین کرنا چاہتا تھا، جب واپسی میں اُنہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی تھی جس کا ایک کونا کسی وجہ سے میری ایک آنکھ سے سرک گیا تھا اور میں نے واپسی تک کا راستہ اور کسی حد تک بلیو ٹکسی کے ہیڈ کوارٹر کا محلِ وقوع ذہن نشین کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ جاتی دفعہ بھی میں نے ذہن میں وقت کا دورانیہ یاد رکھا تھا۔ جو ایک تیز رفتار لانچ اور پھر ہیلی کاپٹر پر منتج ہوا تھا۔

''خلیج کھمبات تو ممبئی کے ساحل کے قریب بھارت کے ایک مشہور شہر ''سورت'' میں واقع ہے۔'' سوشیلا نے بتایا۔

''اوہ......'' میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے اور ذہن کو کھنگالا۔ اس کا مطلب تھا کہ بلیو ٹکسی کا ہیڈ کوارٹر سورت کے ہی گرد و نواح میں کہیں واقع تھا۔ چندر کلا سے حاصل شدہ معلومات کو ذہن میں تازہ کرتے ہوئے میں نے اندازہ لگایا۔ جس وقت میں سے جی کوہارا کی لانچ میں تھا وہ مقام برما کی بندرگاہ میانمار (myanmar) کے قریب خلیج بنگال (bay of bengal) تھا، جبکہ مجھے چندر ناتھ وغیرہ کے حوالے کیا گیا تھا تو وہ مجھے ایک تیز رفتار بوٹ میں لیے خلیج بنگال کسی نامعلوم ساحل پر جو قریب تھا، وہاں سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے کھمبات پہنچایا گیا تھا۔

''کیوں......؟ تم نے کھمبات میں کیا کرنا تھا؟'' مجھے سوچتا ہوا پا کر اس نے پوچھ لیا۔

''نہیں، کچھ خاص نہیں......'' میں نے بات بنانی چاہی۔ ''میرا اندازہ تھا کہ میرے دشمنوں کا اصل ٹھکانا وہیں ہے۔'' میں اسے بلیو ٹکسی والے معاملے سے ابھی بے خبر رکھنا چاہتا تھا۔ البتہ اسے بھارتی خفیہ ادارے کا نام دے کر سوشیلا کو بھی باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ یہ لوگ بھی طلسمِ نور ہیرے کے حصول کے سلسلے میں سے جی کوہارا کے ساتھ منسلک تھے۔

''لیکن اب یہ لوگ تمہاری بو سونگھتے ہوئے ابھی بالاسور کے گرد و نواح میں ہی منڈلاتے رہیں گے۔'' وہ بولی۔

''تمہیں اس علاقے (بالاسور) کی کس حد تک جان

کاری ہے؟"

"کچھ زیادہ تو نہیں لیکن اتنی تو ہے کہ تمہارے مشن کی تکمیل تک ہم ادھر ہی کہیں کسی محفوظ ٹھکانے تک کچھ روز آرام سے گزار سکتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ اس کی مشن والی بات پر میرے چشمِ تصور میں بلیو نخلستی کے کرنل سی جی بجوانی کا مکروہ چہرہ گردش کرنے لگا۔

"پھر تو اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔"

"کیا تم اپنے ان دشمنوں کے ٹھکانے سے واقف ہو؟" سوشیلا نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"ہاں!" میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ "اسی لیے تو میں ابھی اس علاقے سے باہر نہیں نکلنا چاہتا۔"

"گویا تم دریا میں رہتے ہوئے ان مگرمچھوں سے بیر لیتے رہو گے؟" وہ ایک خاص مسکراہٹ اور مخصوص لہجے میں بولی۔ اس کی زندہ دلی میرے لیے سود مند تھی، جسے مزید ابھارتے ہوئے میں مسکرا کر بولا۔

"اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔"

"جنرل ایڈوانی کا کیا کرو گے؟" اس نے یاد دلایا اور آگے بولی۔

"کیا تم بھول گئے ہو کہ تمہارے ملک کی امانت وہ نادر و نایاب طلسمِ نور ہیرا اس کے قبضے میں جا چکا ہے؟"

"اتنی بڑی حقیقت میں کیسے بھول سکتا ہوں بھلا۔" وہ مجھے شاید رفتہ رفتہ اپنے "مقصد" کی طرف لانے کا ارادہ کیے ہوئے تھی جو ہمارا مشترکہ ہی تھا۔ وہ بہرصورت، اپنی بہن اور اس کے شوہر اور معصوم بچوں کے بیدردانہ قتل کا انتقام اس درندہ صفت جنرل کے ایل ایڈوانی سے لینے کے لیے بے چین تھی۔

"لیکن پہلے میں اپنے ان دشمنوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں جو یہاں میری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ ان کے خاتمے کے بعد ہی میں اس طرف توجہ دوں گا۔" میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔ پھر بات بدلی۔

"لیکن اس وقت ہمیں کسی محفوظ مقام پر پہنچنے سے پہلے اس جیپ سے چھٹکارا پانا ہوگا، وہ بھی کسی ویرانے میں، تاکہ دشمن ہمارے تعاقب میں آئیں، جس کی مجھے پوری توقع ہے تو وہ اپنی اس جیپ کو موجود پا کر کسی ایسی آبادی کی نشاندہی نہ کر پائیں جہاں ہم فروکش ہوں......"

"یہی خیال میرا بھی ہے، مگر......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"مگر کیا......؟" میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"یہاں سے مجھے کوئی سواری ملنے کا امکان کم ہی نظر آتا ہے۔"

"آبادی کتنی دور ہے؟ جہاں ہم پہنچنا چاہتے ہیں؟"

"ایک آبادی قریب ہی پڑے گی، جبکہ دوسری آبادی اس سے بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔"

"اس آبادی کا نام؟"

"ابھی بتایا تو تھا، بھگت گڑھ۔"

"وہاں تمہارا کوئی جاننے والا ہے؟"

"ہاں!" اس نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے ایک عجیب سی مسکراہٹ سے کہا۔

"وہاں میرا ایک بدھو عاشق رہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے دیکھتے ہی کہیں حیرت و مسرت سے مر ہی نہ جائے......"

"تو کیا ہم اس کے گھر پہ رہیں گے؟"

"نہیں، اس کا وہاں ایک پرانی طرز کا سرائے ہے۔"

"واٹ......؟" سرائے کے لفظ پر میں چونکے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ بھارت جیسے ملک میں مجھے کسی ہوٹل ہی کی اُمید ہو سکتی تھی، مگر......"

"کمال ہے، بھارت میں اب بھی سرائے نام کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔"

"بھارت ایک وسیع و عریض ملک ہے لیکن اس کے دور اُفتادہ علاقے اب بھی افریقہ کے کئی پسماندہ ریاستوں کی طرح خاصے بیک ورڈ ہیں۔ کیا تم کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں رہنے کی خواہش رکھتے ہو......؟" اس نے یہ بتاتے ہوئے آخر میں مجھ سے پوچھا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ پر طنز کر رہی ہو۔ میں نے جھینپی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، بس ویسے ہی مجھے کچھ حیرت ہوئی تھی بلکہ میں تو خوش ہوں کہ ایسی دور افتادہ اور بیک ورڈ جگہ ہی میرے لیے سردست محفوظ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ میرے پاس اس ودیشی ملک میں رہنے کے لیے کوئی اجازت نامہ نہیں ہے، اور نہ ہی ایسے ضروری کاغذات کا کوئی ایک ایسا ٹکڑا بھی جو یہاں کے کسی چھوٹے سے اہلکار کو میری طرف سے مطمئن کر سکے۔"

"ایگزیکٹلی......! میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا۔" وہ بولی۔ "لیکن اپنے مشن کی تکمیل کے سلسلے میں اگر تمہیں بھارت میں زیادہ عرصہ رہنا پڑ

جائے تو تمہیں یہاں کے شناختی کاغذات بنوانے کے بارے میں سوچنا پڑے۔''

اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں، میں نے اس کی طرف دیکھا۔ بلاشبہ سوشیلا کی بات میرے لیے دلچسپی کا باعث تھی۔ اگر وہ یہ سب کسی مناسب وقت میں کرسکتی تھی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ اپنے ملک کے وسیع تر مفادات کے لیے مجھے یہاں اور مزید کتنے مشن سرانجام دینے تھے، اس کا مجھے اندازہ ہوتا تھا۔ وطنِ عزیز کے خلاف بھارتی دراندازی سمیت اس کے جاسوسوں اور آلۂ کاروں کا جال روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ پاکستان میں پکڑے جانے والے بھارتی جاسوس سندرداس سکسینہ...... جو''را'' کے ایک تازہ کارونگ ''بلیوٹلسی'' کا ٹاپ ایجنٹ تھا، اس کی مثال سامنے تھی بلکہ اگر میں سندرداس کو جو پہلے ہی ''اسپیکٹرم'' کا نامزد ''ہینڈلر ایجنٹ'' بھی تھا، بروقت بے نقاب نہ کرتا تو پاکستان میں رہتے ہوئے وہ بیک وقت بلیوٹلسی اور اسپیکٹرم کے مشترکہ خفیہ مذموم مفادات کے لیے ایک خطرناک ''ڈبل ایجنٹ'' کا رول ادا کرتے ہوئے وطنِ عزیز کی جڑیں کھوکھلی کرتا رہتا (خاکم بدہن) مگر اسے گرفتار کروا کے میں نے بلیوٹلسی کو ہی نہیں بلکہ ''را'' والوں کو بھی بڑی چوٹ پہنچائی تھی، لیکن میں بالکل نیک نیتی کے ساتھ اس کامیابی کا کریڈٹ مرحومہ ثریا کے ساتھی.... کو دیتا ہوں۔

بہرکیف یہی سب تھا کہ مجھے سوشیلا کی یہ بات سودمند محسوس ہوئی تھی۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت تھی کہ سوشیلا بھی ایک بھارتی عورت تھی۔ عین ممکن تھا کہ میرا اصل مشن جاننے کے بعد اس کی رگِ حمیت وحب الوطنی کسی وقت بھی پھڑک سکتی تھی، ابھی تو اس کی آنکھوں پر صرف جنرل ایڈوانی سے انتقام لینے کی عینک چڑھی ہوئی تھی، جس کے اُترنے کے بعد وہ میرے خلاف بھی ہوسکتی تھی، لہٰذا میں نے اسے ابھی اپنے اصل مشن سے پوری طرح آگاہ ہی نہیں ہونے دی تھی۔ ماسوائے اس کے کہ یہ سارا چکر اور مارا ماری اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کی وجہ سے تھی، وغیرہ......

''کیا سوچنے لگے......؟'' مجھے پُرسوچ خاموشی میں پاکر سوشیلا نے کہا تو میں بے اختیار اس کی تائید میں بولا۔

''میں تمہاری ہی بات پر غور کررہا تھا سوشی......!'' میں نے بات بنائی۔ ''سوچ رہا تھا کہ نجانے جنرل ایڈوانی کو جہنم واصل کرنے میں کتنے روز لگیں اور اس کے لیے ظاہر ہے مجھے بھی تمہارے ساتھ بھارت کے بڑے گنجان آباد شہروں کا رخ کرنا پڑے۔ اسی لیے مجھے تمہاری بات ٹھیک لگی تھی، ورنہ تو میرے لیے اس میں کوئی خاص دلچسپی کا عنصر نہ تھا۔''

''ہم بالاسور کراس کرچکے ہیں، بھگت گڑھ کی حدود شروع ہوچکی ہے، یہاں سے ہمیں سواری مل جائے گی، یہ بتاؤ اس جیپ سے کہاں چھٹکارا پانا ہے؟'' اس نے موضوع بدل دیا۔ میں نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر اطراف کا جائزہ لیا۔ کچھ شہری سی آبادی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ کہیں فیکٹری اور کارخانوں کے شیڈ تھے، ان میں فارم ہاؤس اور کھیت کھلیان بھی نظر آتے تھے۔

''سڑک سے اُتار کر اس طرف موڑلو جیپ......'' میں نے کہا تو سوشیلا نے جیپ کو بائیں جانب کچے میں اُتار لیا۔ اُس طرف مجھے ایک پلیا کی منڈیری دکھائی دی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ یہاں کوئی چھوٹی سی نہر بھی بہتی تھی۔ اسی نہر کے کنارے پہنچ کر سوشیلا نے جیپ روک دی۔ ہم دونوں نیچے اُتر آئے۔ دونوں گنیں ہم نے جیپ میں چھوڑ دیں، یوں بھی اب وہ ہمارے کام کی نہیں رہی تھیں۔ جیپ کا رخ نہر کی طرف کرکے ہم نے اسے آگے دھکیل دیا، جیپ نہر میں جاگری۔ وہاں سے ہم دوبارہ پیدل چلتے ہوئے سڑک پر آگئے۔ گرمی اور دھوپ پڑرہی تھی۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔

میں نے یہاں آتے وقت چند مسافر لاریوں کی آوک جاوک دیکھی تھی۔ ایسی ہی ایک لاری ہمیں بالاسور سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ قریب آنے پر سوشیلا نے ہاتھ لہرا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر ہم دونوں اس میں سوار ہوگئے۔

''کرائے کا کیا کریں گے؟ میرے پاس تو ابھی پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔'' میں نے مسافروں سے کھچاکھچ بھری لاری میں سوار ہونے کے بعد سوشیلا کے ساتھ لگے کھڑے ہوکر اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ بولی۔

''اس کی چنتا نہ کرو تم...... یہ ساڑی اور کپڑے نکالتے وقت میرے ہاتھ کچھ روپے لگے تھے، کم ہیں مگر بھگت گڑھ تک کا کرایہ ادا تو ہو ہی جائے گا۔''

میں نے قدرے اطمینان کی سانس لی۔ کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ کر میں نے سوچ رکھا تھا کہ پاکستان فون کرکے سوشیلا کے اکاؤنٹ کے ذریعے اپنے ساتھیوں سے کچھ روپے منگوالوں گا۔ وہاں میرا اور اول خیر کا مشترکہ اکاؤنٹ تھا۔ نہ بھی ہوتا تو بھی کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہوتا، وہاں میرے بہی خواہوں کی کوئی کمی نہ تھی، ماسٹر کارڈ یا ویسٹرن

یونین کے ذریعے بھی میں پاکستان سے یہاں پیسے وغیرہ منگوا سکتا تھا۔

لاری کا سفر جاری تھا۔ احتیاط کے پیشِ نظر (اگرچہ اس میں خود سوشیلا کا بھی مشورہ شامل تھا) خود کو عام لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے میں اپنے چہرے کو بھی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے اپنی شرٹ کے کالر دانستہ کھڑے کر رکھے تھے۔ بہ قول سوشیلا کے...... بلیو ٹکسی والے اپنا کوئی "ہارپ ایجنٹ" جو عام لوگوں میں گھلا ملا ہوتا ہے، ہماری ریکی میں لگا سکتے تھے، یا میرے سلسلے میں "غیر ملکی جاسوس" کا لیبل لگا کر دیوار گیر اور پبلک مقامات پر "پوسٹر بازی" کر سکتے تھے۔

بھارت میں بھی غضب کی گرمی پڑتی تھی، اس کا اندازہ مجھے آج ہوا تھا۔ نیز پاکستانی اور بھارتی دیہاتوں کا حال بھی ایک ہی جیسا نظر آتا تھا۔ لاری مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور حبس و گھٹن کی کیفیت بھی طاری تھی۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ سہ پہر ہونے لگی تھی۔ سوشیلا کے مطابق بھگت گڑھ پندرہ، بیس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہی بس کا آخری اسٹاپ بھی تھا۔ یہی سبب تھا کہ آگے مزید کچھ سواریاں اُتریں تو ایک ڈبل سیٹ خالی ہوگئی، میں اور سوشیلا جلدی سے اس پر براجمان ہوگئے۔ سوشیلا کرایہ دے چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بس خالی ہونے لگی تو کھلی کھڑکیوں سے بھی در آتی ہوا لگی، جس سے پسینا خشک ہونے لگا اور طبیعت بہتر ہونے لگی۔

ذرا دیر بعد میں نے دیکھا کہ کچے پکے مکانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آبادی بھی نظر آنے لگی تھی، لوگ باگ بھی اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دینے لگے، مختصر بازار اور دیگر چھوٹے موٹے پبلک مقامات اور پارک وغیرہ بھی دکھائی دینے لگے۔

ہم شاید بھگت گڑھ پہنچ چکے تھے اور یہ مجھے خاصا بڑا نواحی علاقہ محسوس ہوا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ دشمن ہماری تلاش میں اس علاقے کو ضرور ٹارگٹ بنا سکتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ ہماری، بالخصوص میری تصویر دکھا کر ہمیں ٹریس بھی کرنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ ایسے میں، میں نہیں جانتا تھا کہ سوشیلا کے سرائے والا وہ "بدھو عاشق" ہماری کس حد تک مدد کر سکتا تھا؟

بالآخر لاری خالی ڈبے کی طرح کھڑکھڑاتی ہوئی اپنے مستقر پر پہنچی اور ہم دونوں اُتر گئے۔ سامنے تانگے اور رکشے نظر آنے لگے، جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے حلق کے بل چیخ رہے تھے، سوشیلا ایک تانگے پر سوار ہوگئی جس میں ایک گھوڑا جتا ہوا تھا۔ میری سوئی پھر کرائے اور پیسے پر اٹک گئی، مگر بولا کچھ نہیں، کیونکہ جب سوشیلا بس کنڈیکٹر کو اپنی ساڑی کے پلو سے بندھے روپوں میں سے اپنا اور میرا کرایہ دینے لگی تو اُس کے پاس پھر بھی چند روپے باقی بچے تھے۔

میں اور سوشیلا تانگے پر سوار ہو کر سرائے کی طرف روانہ ہوگئے۔ سوشیلا نے اپنے اس بدھو عاشق کا نام کاشی رام بتایا تھا۔ بھگت گڑھ میں اس کا ایک ہوٹل اور ایک سرائے تھی۔ وہ ایک شادی شدہ آدمی تھا۔ وہ اپنے دو چھوٹے بچوں اور بیوی کے ساتھ ایک مکان میں رہتا تھا، جو سرائے سے زیادہ دور نہ تھا۔ سرائے وہ خود سنبھالتا تھا۔ ہوٹل بھی سرائے سے ہی متصل تھا۔ سیٹھ ٹائپ آدمی تھا اور کسی زمانے میں وہ سوشیلا کا کلاس فیلو ہی نہیں بلکہ کولیگ بھی رہ چکا تھا۔ سوشیلا کے مطابق وہ بھی اسپیکٹرم میں انچارج ریکارڈ کیپر تھا، مگر جلد ہی اُس کا اس نوکری سے دل بھر گیا۔ سوشیلا نے بھی اسے کچھ خاص رخ نہیں دیا تو وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ بالاسور (بھگت گڑھ) اس کا آبائی شہر تھا، باپ کی اکلوتی اولاد تھا، وہ ممبئی سے واپس آگیا اور ادھر ہی باپ کا ہوٹل اور سرائے سنبھالنے لگا۔ پھر یہیں کا ہی ہو کر رہ گیا۔ وہ کامیڈین ٹائپ تھا اور درحقیقت وہ ممبئی فلم میں چانس ملنے کی خواہش سے آیا تھا، ابتدا میں چھوٹے موٹے کامیڈین رول پلے کیے مگر کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکا تو بددل ہوگیا۔ اسی دوران اسے اسپیکٹرم جیسے معتبر ادارے میں نوکری مل گئی، وہ چاہتا تھا کہ وہ ممبئی کو نہ چھوڑے اور دوبارہ بھارتی فلم نگری میں قسمت آزمانے کی کوشش کرے۔ تب تک وہ پیسے بھی کماتا رہے تاکہ اُسے باپ سے نہ منگوانے پڑیں، لیکن اس کا یہاں سے بھی دل اُچاٹ ہوگیا، ایک بڑی وجہ سوشیلا کی بے رخی بھی تھی۔ جلد مایوس ہو جانا اس کی فطرت میں شامل تھا، بالآخر وہ اپنے آبائی شہر ہی پلٹ گیا۔

سوشیلا کی زبانی کاشی رام کی یہ کہانی میرے لیے اپنی جگہ دلچسپ سہی لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اب سوشیلا کی بھلا کیا مدد کر سکتا تھا؟ ماسوائے اس کے کہ وہ اسے اپنے سرائے نما ہوٹل میں رہنے کے لیے چند دنوں کے لیے کوئی کمرا دے ڈالتا۔ جب میں نے اشارتاً اس کا ذکر سوشیلا سے کیا تو وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولی۔

"رازداری اور بوقتِ ضرورت یہ ہمارے لیے مددگار تو ثابت ہو سکتا ہے۔"

"وہ تم نے ٹھیک کہا۔" میں بھی جواباً بے اختیار مسکرا دیا۔ "ہمارے لیے ان حالات میں رازداری سب سے زیادہ اہم ہے۔"

تھوڑی دیر بعد تانگہ ایک پرانی سی عمارت کے سامنے جارکا۔

ہم نیچے اُتر گئے۔ سرائے کے اندر باہر کچھ خاص گہما گہمی دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ عام سے مسافر مرد عورت اِدھر اُدھر منڈلاتے نظر آئے۔ جو سرائے سے نکل کر اس کے ساتھ ہی نیچے متصل ایک چھپر نما ہوٹل میں کھانا اور چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ سرائے کی عمارت دو منزلہ تھی۔ سامنے احاطہ تھا۔ ایک پھاٹک اور اس کے بعد سیمنٹ کے تین یا چار فٹ اُونچے قدمچے تھے۔

پہلی ہی نظر میں مجھے یہ بھوت سرائے معلوم ہوا۔ طویل سے برآمدے میں کمرے ایک قطار کی صورت میں بنے ہوئے تھے۔ وہیں ایک بوڑھا آدمی، آنکھوں پر گول عدسوں والی نظر کی عینک لگائے رجسٹر اور قلم رکھے بیٹھا تھا۔ مجھے تو کہیں سے یہ کاشی رام نہیں لگا تھا۔

"چاچا...... پرنام!" سوشیلا نے اس کے قریب جاکر اُسے سلام کیا۔ بوڑھے نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور فوراً رجسٹر اور اس پر رکھا قلم سنبھال لیا۔ وہ ہماری وضع قطع سے شاید ہمیں کوئی موٹی آسامی سمجھ بیٹھا تھا۔ جواب دینے کے بعد وہ فوراً پیشہ ورانہ انداز میں اپنی عینک درست کرتے ہوئے بولا۔

"ایک دم فرسٹ کلاس والا کمرا خالی ہے۔ آپ دونوں شاید یہاں ہنی مون منانے آئے ہیں؟" وہ ہم دونوں کو شاید کوئی نیا شادی شدہ جوڑا سمجھ بیٹھا تھا۔ میں کچھ کہنے والا تھا کہ سوشیلا نے دھیرے سے میرا ہاتھ دبا دیا اور اس سے بولی۔

"چاچا......! کاشی رام سے ہمیں ملنا تھا، وہ کہاں ملے گا اس وقت......؟" اس پر وہ بوڑھا تھوڑا خاموش سا ہو کر ہماری طرف تکنے لگا پھر جواباً بولا۔

"ہاں! وہ ہے تو ادھر ہی...... مگر تمہیں اس سے کیا کام ہے؟"

"ہمیں اسی سے ملنا ہے، آپ پلیز، ہمیں کاشی رام سے ملوا دیں۔" سوشیلا نے کہا۔

بوڑھے نے غور سے ہمیں سرتاپا دیکھا پھر ایک طرف دھری لکڑی کی بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی کسی کو آواز لگائی۔ ایک چھوکرا ٹائپ لڑکا وہاں نمودار ہوا۔

"اے او...... جا جا کر اپنے بابو کاشی رام کو بتا جا کر اس کے کچھ مہمان آئے ہیں۔" بوڑھے نے اس سے کہا اور رجسٹر کھولے ایک بار پھر اس پر جھک گیا۔ میں اور سوشیلا خاموشی سے پاس والی چوبی بینچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے یہاں سے آگے کے معاملات سوشیلا پر چھوڑ رکھے تھے۔ وہی حالات کے مطابق کوئی بہتر راستہ بنائے رکھتی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ میں نے اسی چھوکرے ٹائپ لڑکے کے ساتھ ایک عجیب سی شے کو لُڑھکتے ہوئے انداز میں آتے دیکھا...... میں نے سوچا اگر تو یہی کاشی رام تھا تو میں سمجھ گیا کہ سوشیلا جیسی حسین عورت نے اسے کیوں مایوس کیا تھا؟ نیز کاشی رام کا یہ فیصلہ بھی درست تھا کہ وہ بھارتی فلم انڈسٹری میں ہیرو کے بجائے کامیڈین بننے کیوں نکلا تھا، بلکہ ٹھیک ہی نکلا تھا۔ وہ کامیڈین حرکات وسکنات کے بغیر بھی اگر صرف خاموش ہی کھڑا رہتا تو اُسے دیکھ کر ہنسی چھوٹ جاتی تھی، یہی حال میرا ہوا تھا۔

وہ تیس، پینتیس کے پیٹے میں ہوگا۔ رنگ گہرا سانولا تھا اور آنکھیں بہت چھوٹی تھیں۔ اتنی چھوٹی کہ چھچھوندر کی بھی بڑی لگیں۔ ناک چہرے سمیت لمبوتری تھی۔ سر کے بال چار و ناچار ہی تھے۔ یعنی واقعی دو چار ہی تھے۔ گنج زیادہ ابھری ہوئی نظر آتی تھی۔ قد بھی ایسا تھا کہ جیسے کوئی بونا چلا آرہا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ چل رہا تھا تو چلتا کم اور جھومتا زیادہ نظر آتا تھا۔

اس کی شاید نظر بھی کمزور تھی یا پھر جتنے سائز کی اس کی آنکھیں تھیں، اس سے اتنا ہی اسے نظر آتا ہوگا۔ کیونکہ وہ ہمارے خاصے قریب آنے کے بعد مجھے تو نہیں البتہ سوشیلا کو ضرور پہچان گیا اور اسی وقت میں نے اس کے چہرے کی رنگت سانولی سے قدرے سرخ ہوتے دیکھی، مسرت کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جگنو جیسی چمک ابھرتے ہی اس کے حلق سے باریک سی آواز بھی ابھرتے میں...... نے سنی تھی۔

"وسس...... سوشیلا...... یہ تم ہو؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت میں بولا۔

"آف کورس...... یہ میں ہی ہوں، تمہاری نظریں کمزور تو نہیں ہوئی ہیں نا......؟" سوشیلا نے اس کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھ کر ہلکی سی دوستانہ مسکراہٹ سے کہا تو کاشی رام کے منہ سے پھنسی پھنسی سی آواز برآمد ہوئی۔

"ن...... نہیں تو، مم...... میری نظریں تو بالکل ٹھیک ہیں۔ سس...... سکس بائی سکس...... مگر تمہیں اچانک یہاں دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا ہے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ خود

مجھے اس کی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اس قدر چھوٹی اور چنی چنی آنکھوں سے دیکھتا کیسے ہوگا؟

''کیا تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی مجھے یہاں دیکھ کر......؟'' سوشیلا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے اُسے اکسایا۔ سوشی کی اس ادا پر کاشی رام چاروں شانے چت ہو گیا۔ فوراً پرنام کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''ارے...... سوشیلا جی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، مجھے تو آپ کو یہاں اپنے غریب خانے پہ دیکھ کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ بیان سے باہر ہے، دراصل یہ میرے لیے ایک ناقابلِ یقین سرپرائز ہے۔ خیر...... پدھاریے......''

اُس نے ہمیں اپنے ساتھ آنے کا کہا لیکن پھر اچانک اسے میرا خیال آیا۔ سوشیلا کو دیکھ کر اس کی عقل شاید خوشی سے خبط ہو گئی تھی، اب اسے میرا خیال آیا تو اس نے سوشیلا سے پوچھ لیا۔

''یہ...... یہ کون ہیں سوشیلا جی؟!''

''یہ میرے پتی ہیں، شنکر راج......'' سوشیلا نے جواب دیا اور میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ یوں جیسے کسی بلب کا فیوز اُڑ جاتا ہے۔ مجھے اپنے حلق میں کڑواہٹ سی گھلتی محسوس ہوئی۔ لیکن پھر شاید وقت کے تقاضے اور حالات کے پیشِ نظر یہی کہا جا سکتا تھا جو سوشیلا نے بہتر محسوس کیا ہو اسی لیے میں پی گیا۔ تاہم میں نے دیکھا کہ ''پتی'' کے لفظ پر کاشی رام کا چہرہ اُتر سا گیا تھا۔ مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ سوشیلا اگر اسے بے وقوف بنائے رکھنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی تو پھر خود کو اسے شادی شدہ ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر راج صاحب......!'' اس نے میری طرف زبردستی اور پھیکی سی مسکراہٹ پھینکتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ طبیعت مکدر ہونے کے باوجود میں نے بھی اس کی طرف جبراً مسکراہٹ سے دیکھنا ضروری سمجھا۔

وہ ہمیں ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ شاید اسی کا کمرا تھا۔ کیونکہ وہاں، ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ ایک چھوٹا ٹی وی، بیڈ، میز کرسی اور ایک بڑا سا کاؤچ۔ فریج بھی تھا، ساتھ ہی ایئر کولر بھی رکھا تھا۔ کمرا ہوا دار تھا اور اس کی فضا بھی خاصی ٹھنڈک آمیز تھی۔ یہاں آکر ہمیں کچھ سکون ملا۔

''تمہارا کمرا تو بہت اچھا اور ٹھنڈا ہے۔ اُف...... باہر کس قدر حبس اور گرمی تھی۔ ہمیں بھی ایسا ہی کمرا چاہیے رہنے کے لیے۔'' سوشیلا نے اس سے کہا تو کاشی رام اس کی بات پر قدرے چونکا اور اسی لہجے میں اس سے بولا۔

''کیا آپ واقعی یہاں رہنے کے لیے آئی ہیں، سوشیلا جی؟''

''ہاں! ہم ذرا شہر کے ہنگاموں اور شور سے بھاگ کر یہاں کچھ روز سکون اور آرام سے بتانے کے لیے آئے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں یہاں تمہارے سرائے سے بڑھ کر رہنے کے لیے اور کوئی جگہ اچھی نہیں لگی، سو یہاں چلے آئے۔''

''سوشیلا جی......! یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔'' وہ خوشی سے بولا۔

''مگر ہمیں کمرا ذرا الگ تھلگ اور آرام دہ چاہیے۔ کرائے کی تم چنتا مت کرنا۔''

''ارے سوشیلا جی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میں اور آپ سے کرایہ لوں گا؟'' وہ ایک دم پھر اس پر ریشہ خطمی سا ہوتے ہوئے بولا تو سوشیلا، کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ کر اپنی ناک کی پھنگی کو چھو کر ہولے سے کھنکاری، تو کاشی رام کو ایک دم اس بات کا ہوش آیا کہ اس کا ''شوہر'' بھی ساتھ کھڑا ہے، اور سوشیلا نے اس پر اشارے سے بھی شاید یہی باور کرانے کی کوشش چاہی تھی، جس کا کاشی رام کو فوراً احساس ہوا اور ذرا سنبھل کر فوراً بات بناتے ہوئے بولا۔

''مم...... میرا مطلب ہے کہ...... اب دیکھیں ناں...... آپ اور ہم پرانے دفتری ساتھی رہ چکے ہیں، کچھ اچھا نہیں لگتا آپ سے کرائے کی بات کرتے ہوئے۔''

''نہیں، کرایہ تو ہم آپ کو دیں گے ہی کاشی رام صاحب! لیکن وہ کیا ہے کہ ہمارے ساتھ یہاں آتے ہی ایک ٹریجڈی ہو گئی ہے۔'' سوشیلا نے آخر میں اُترے ہوئے چہرے سے کہا تو وہ یکدم ڈھیر ہوتے ہوئے بولا۔

''کک...... کیسی ٹریجڈی سوشیلا جی......؟''

''یہاں آتے ہوئے کسی اُچکے نے لاری کے اندر ہی ہماری جیب کاٹ لی ہے، وقتی پریشانی تو ہوئی ہے مگر تم اس کی چنتا نہ کرو...... یہاں بینک تو ہوں گے ناں......؟ ہم جلد ہی پیسے منگوا لیں گے۔ اگرچہ تھوڑی دیر لگے شاید......''

''نہیں...... نہیں، اس کی بھی کیا ضرورت ہے...... آپ مجھ سے پیسے......'' وہ پھر پٹری سے اُترنے لگا تو سوشیلا نے اپنی ناک کی پھنگی کو چھوا ہی تھا کہ اُسے ہوش آ گیا۔ ایک بار پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔

''مم...... میرا مطلب تھا کہ جب تک آپ کے پیسے

نہیں آجاتے، میں اُدھار دے دوں گا۔" وہ شاید اب سوشیلا کا چٹکی پکڑ کر کھنکھارنے کا اشارہ سمجھنے لگا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ سوشیلا نے مجھے اس کے سامنے اپنا "پتی" ظاہر کر کے اس کے جذبات کو "بریک" لگانے کی ہی غرض سے ایسا کیا تھا۔ ممکن تھا اور بھی کوئی وجہ رہی ہو، تاہم مجھے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان حالات میں کاشی رام جیسا ہنسوڑ سا کردار اچانک ہی ابھر آیا تھا، ورنہ میری زندگی میں ایسے کردار کہاں تھے۔ ہاں! البتہ اول خیر اور شکیلہ کی آپس میں نوک جھوک سے بھی میں محظوظ ہوتا تھا۔

اپنے ساتھیوں کی یاد آتے ہی میں اُداس سا ہو گیا۔ اس پر مستزاد عابدہ کی یادوں کا تو جیسے ایک مقبرہ آباد ہو گیا تھا۔ میرے سینے میں، نجانے وہ بے چاری کس حال میں تھی اور کہاں تھی؟ باسکل ہولارڈ جیسے غبی، سفاک اور متعصب یہودی درندے نے اُسے نجانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہوگا اب تک...... اس تصور سے ہی مجھے ہول آنے لگا تھا۔ خود میں ایسے حالات میں گھرا ہوا تھا کہ ابھی تک مجھے آنسہ خالدہ سے اس کے بارے میں کوئی خیر خیریت کا فون بھی نہیں کر سکا تھا۔ اب یہاں آکر مجھے اُمید ہو چلی تھی کہ شاید خالدہ سے ٹیلی فونک بات کرنے کی کوئی سبیل نکل آئے۔ وہ خود بھی یقیناً پریشان ہوگی۔ میں اچانک منظرِ عام سے کہاں غائب ہو گیا تھا، وہ بھی ایسے نازک موقع پر جبکہ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کو اینٹی ٹیریر کورٹ میں گھسیٹنے کی مذموم سازش اور تگ و دو میں مصروف تھا۔ اُدھر پاکستان میں عارفہ اور سیٹھ نوید جیسے زہریلے سانپوں کا جوڑا میرے اس طرح اچانک "غیاب" پر خوشی کے جشن میں محوِ رقص و سرور ہوگا۔

کاشی رام نے ہمیں فوراً ہی مطلوبہ کمرا فراہم کر دیا۔ یہاں ہم زیادہ عرصہ نہیں ٹک سکتے تھے۔ دشمن ہر طرف ہمارے خون کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں نے یہاں محض ضرورتاً "اسٹے" کیا تھا، تاکہ جب تک اپنے بہی خواہوں سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے انہیں اپنی خیریت اور ان کی خیریت کے وغیرہ کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکوں۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے سوشیلا کو سب سے پہلے اسی بات کا پابند کیا تھا کہ وہ کاشی رام کے ذریعے اولین فرصت میں ٹیلی فون کے بندوبست کی بات بھی کرے، جس میں ٹرنک کال کی بھی سہولت ہونی چاہیے۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس میں تھوڑی دیر لگی، تاہم رات تک کاشی رام نے

ہمارے کمرے میں ایک عدد ٹیلی فون سیٹ بھی رکھوا دیا تھا۔

سہ پہر اب رات میں ڈھل چکی تھی۔

کچھ وقت ملا تو میں نے سوشیلا کو یاد دلایا کہ وہ مجھے جونکی بابا اور مہارانی کے بیچ پُراسرار تعلق کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی تھی۔ اس نے بتایا......

کئی برس پہلے انڈیا میں پھیلنے والے طاعون کی وبا نے مہارانی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ان کا پورا خاندان ختم ہوگیا، صرف یہی زندہ بچی تھی۔ اسی علاقے میں ڈاکٹر لیکھ رام کو بھارت سرکار نے اپنی ٹیم کے ساتھ یہاں بھیجا تھا۔ وہ خود بھی اس وبا کا شکار ہو کر ختم ہوگئے صرف لیکھ رام ہی زندہ بچا اور پھر اس نے ادھر ہی رہتے ہوئے لوگوں کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا اور بعد میں اپنی پتنی کو بھی بلوا لیا۔ ان کا کوئی بچہ نہیں تھا۔

ابتدا میں ڈاکٹر لیکھ رام ہی مہارانی کا علاج کر رہا تھا مگر پھر مہارانی جونکی بابا نامی ایک آدمی سے علاج کروانے لگی جو خود کو بڑا وید کہتا تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ مہارانی، جونکی بابا کے علاج سے زیادہ خوش اور مطمئن نظر آنے لگی۔ وہ درحقیقت مجرم ذہنیت کا انسان تھا، زندہ انسانوں کا خون جونکوں کے ذریعے "سک" کروا کر وہ طاعون کے مریضوں کو پلاتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق جونکوں کے تھوک میں، چوسے ہوئے خون میں ایک مادہ جو ایک خاص پروٹین ہوتا ہے، وہ اور ہجانم نامی ایک خامرہ، اور کیمیائی مرکبات اس چوسے ہوئے خون میں شامل ہو جاتے ہیں اور اس قدرتی مرکبات سے بننے والے خون میں حیرت انگیز طبی تاثیر شامل ہو جاتی ہے جو بقول جونکی بابا کے، طاعون کے علاج میں فائدہ دیتی ہے۔

"تمہیں یہ سب باتیں کس نے بتائیں؟" میں نے پوچھا۔

"اسی ڈاکٹر لیکھ رام نے ہی بتائی تھیں مجھے، آگے سنو اب......" وہ بولی۔

"اس علاج پر ڈاکٹر لیکھ رام نے بھی تحقیق کی اور اسے Hirudotherpy کا نام دیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک افریقہ کے کسی قدیم کینی بال قبیلے کا طریقہ علاج ہے مگر اس سے انسان کے اندر آدم خوری پرورش پاتی ہے۔ تمہیں یاد ہے ناں جب تم نے مجھے اس تہ خانے والی جگہ کے ایک کمرے سے نکالا تھا تو میں نے خوف زدہ ہو کر تم سے یہی کہا تھا کہ یہ مہارانی ایک ڈائن ہے، اس کی وجہ بھی ہے کہ وہ انسانی لہو پی کر آدم خور بن چکی ہے۔ جونکی بابا کے مرنے کے بعد اس نے یہ طریقہ نکالا تھا کہ وہ اپنے خاص حواری تندو کے ذریعے بستی سے انسانوں کو پکڑ کر لاتا تھا اور رات کی تاریکی میں مہارانی اس کے ساتھ یہ شیطانی کھیل کھیلا کرتی تھی۔ اپنے تئیں اس نے حویلی میں بھی ایک "کیچ" بنا کر جونکوں کا فارم بنانے کی کوشش کی تھی۔ میرے سامنے اس نے ایک انسان کو ہلاک کیا تھا۔ جونکوں کے ذریعے جونکی بابا، انسانی خون نکالنے کا طریقہ اپناتا تھا وہ مہارانی کو معلوم نہ تھا، مگر انسانی خون کی اسے لت لگ گئی تھی۔ اس نے ایک قیدی کا میرے سامنے، اپنے دانتوں سے اس کی شہ رگ کاٹ خون پیا تھا، اُف...... بھگوان......! کیسا ڈراؤنا منظر تھا وہ...... جب میں ایک انسان کو ایک دوسرے انسان کا اس طرح خون پیتے دیکھ رہی تھی، مجھے مہارانی کوئی "ویمپائر" لگ رہی تھی۔ میں تو مارے دہشت کے ہی بے ہوش ہوگئی تھی۔

"مہارانی کو انسانی خون پی پی کر خود بھی بڑی عجیب و غریب بیماریاں لگ چکی ہیں، اس کا رنگ بدلنے لگتا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے حسین عورت سے ایک بدصورت ڈائن دکھائی دینے لگتی تھی۔" سوشیلا اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔ مہارانی اور جونکی بابا سے اگر میرا سامنا نہ ہوا ہوتا تو میں سوشیلا کی اس بات کا یقین ہی نہیں کرتا۔ تاہم میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ بھارت کے ایک شہر میں پولیس نے تین آدم خور بھائیوں کو گرفتار کیا تھا۔ بعد میں انہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ اب شاید مہارانی کا بھی یہی حال ہونے والا تھا۔ کیونکہ پولیس کو اس پر یقین کی حد تک شبہ ہو چکا تھا اور شاید اس کی بستی والوں کو بھی بھنک پڑ چکی تھی۔

بہرکیف رات کا کھانا ہم نے اپنے کمرے میں منگوا کر کھایا اور سوشیلا نے دانستہ کھانے میں کاشی رام کو بھی شامل رکھا تھا۔ اس دوران میں موقع ملتے ہی میں نے سوشیلا کو کان میں ہدایت کی کہ وہ کسی طرح کاشی رام کو کچھ دیر کے لیے باہر لے جا کر اپنے ساتھ مصروف گفتگو کرے تاکہ میں آرام سے اپنے ساتھیوں سے گفتگو کر سکوں......

اس نے ایسا ہی کیا۔ کھانے کے اختتام پر میں نے دانستہ جماہی لیتے ہوئے نیند کے غلبے کا ذکر کیا اور بیڈ پر جا کر سوتا بن گیا۔ ایسے میں مجھے سوشیلا کے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

"انہیں فوراً ہی کھانا کھا کر نیند آجاتی ہے۔ میرا تو ابھی بہت سی باتیں کرنے کا جی چاہ رہا تھا۔" اس نے شاید ایک توبہ شکن انگڑائی بھی لی تھی۔ جس کی آواز میرے کانوں

تک پہنچی تھی۔

''چلو کاشی! باہر کہیں کھلی فضا میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' سوشیلا، اس سے کہہ رہی تھی اور میرے کانوں میں کاشی رام کی ایسی آواز ٹکرائی جیسے اُس نے ہچکی لی ہو۔ یہ شاید اس جھلّے آدمی کی مسرت کے اظہار کرنے کا کوئی انداز تھا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ سوشیلا میرے کہنے کے مطابق اپنا ''رول'' خوب نبھا رہی تھی۔

ان کے کمرے سے نکلتے ہی میں بہ سرعت بیڈ سے اُٹھا، دروازے کی جھری سے ذرا باہر جھانکا، پھر اپنی تسلی کرنے کے بعد میں نے دروازے کو بند کیا، مگر اندر سے کنڈی نہیں لگائی۔ اس کے بعد ٹیلی فون کی جانب بڑھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ آنسہ خالدہ کے سیل فون کا نمبر ملایا۔

ایک دو بار لائن ڈراپ ہوئی مگر تیسری بار رابطہ ہو گیا۔

''ہیلو......!'' دوسری جانب سے آنسہ خالدہ کی آواز اُبھری اور میرے دل و دماغ کی عجیب و غریب کیفیات ہونے لگیں۔ کیونکہ امریکا میں مقیم، میرے لیے یہی وہ واحد شخصیت تھی جو کسی نہ کسی طرح عابدہ کے ساتھ رابطے میں تھی یا اس کی خبر گیری کی آگاہی رکھے ہوئے تھی۔ اب میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے پاس عابدہ سے متعلق کیا اچھی بری خبریں تھیں؟ نیز وہ کہاں اور کس حال میں تھی؟ آنسہ خالدہ اس کے متعلق مجھے کیا بتانے والی تھی، امر واقعہ تو یہی تھا کہ اب آنسہ خالدہ سے بات کرتے ہوئے میں اپنے اندر پہاڑ جیسا حوصلہ اور طاقت مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب دوسری جانب سے آنسہ خالدہ کی آواز سننے کے بعد چند ثانیوں بعد بولا تو میری اپنی آواز میں واضح طور پر لڑکھڑاہٹ تھی۔

''ہہ...... ہیلو......! آنسہ خ خالدہ صاحبہ......!''

''ارے ے ے...... تم! شہزی......!'' میری آواز پہچانتے ہی دوسری طرف خالدہ بھی سخت متحیر و متغیر سی ہو گئی۔

''تت...... تم کہاں اور کیسے ہو شہزی......! کہاں پہنچے ہو......؟ خدانخواستہ تم کہیں ٹائیگر گینگ...... او...... مائی گاڈ! میں کیا کہوں......؟'' اس کے لہجے سے پریشانی کے ساتھ تشویش بھی ہویدا ہو رہی تھی۔ غالباً اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے!

''بس! خالدہ صاحبہ! کیا کہوں میں...... خود مجھے نہیں یقین تھا کہ میں اچانک کن حالات کا شکار ہو جاؤں گا......!'' میں نے پژمردہ سے لہجے میں کہا اور پھر اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے سب سے پہلے دل مضبوط کر کے عابدہ کی خیریت پوچھی تو دوسری جانب سے آنسہ خالدہ کی ایک آہ سے مشابہ ہمکاری خارج کرنے کی آواز سنائی دی اور خاموشی سی چھا گئی اور میرا اندر ہولنے لگا۔

''شہزی...... اب میں کیا بتاؤں تمہیں...... میں نے تو اپنی طرف سے عابدہ کو بچانے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی، تمہیں بھی اس بے چاری سے متعلق خبریں پہنچاتی رہی...... مگر افسوس......'' وہ اتنا کہتے کہتے چپ ہو گئی تو میں جیسے گم ہو کر رہ گیا۔ حلق میں گویا کانٹے اُگ آئے، بولنے اور اُس سے عابدہ کے متعلق مزید کچھ استفسار کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ کیونکہ اس کا ٹوٹا ٹوٹا اور مایوس لہجہ، عابدہ سے متعلق میرے ان سارے اندیشہ ناک اور ہولناک خدشات کی غمازی کرتا محسوس ہو رہا تھا، جو کوڑیالے سانپوں کی طرح اب تک مجھے ڈستے رہے تھے۔

''کچھ...... پھر بھی آنسہ خالدہ......! امم...... مجھے بتاؤ تو سہی کہ وہ غریب، ہے کن حالوں میں......''

''مجھے پہلے تم اپنے بارے میں......''

''نہیں خالدہ! پہلے مجھے عابدہ کے متعلق بتاؤ...... خدا کے لیے......'' میں بہ یک ترنت اس کی بات کاٹتے ہوئے غمگین لہجے میں بولا۔

''عارفہ اور اس کی اہم گواہی کی عدم موجودگی و دستیابی کے باعث ہم عابدہ کا مقدمہ نیو یارک کی اوورسیز سیول سوسائٹی کی کورٹ میں ہار گئے اور باسکل ہولارڈ عابدہ کا مقدمہ واشنگٹن کی اینٹی ٹیریٹر کورٹ تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا، وہاں اُس خبیث نے معصوم اور بے گناہ عابدہ کو بالآخر، اس الزام تلے کہ اس سے امریکا کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہے، امریکی ریاست کیلی فورنیا کی ایک خطرناک جیل...... کورکوران (corcoran) میں قید کروا دیا ہے۔ وہاں باسکل ہولارڈ کا اثر چلتا ہے۔

''سوری ٹو سے...... مسٹر شہزی......! یہ ساری باتیں تمہیں بڑے صبر اور حوصلے سے سننا ہوں گی...... میرا مقصد تمہیں وقتاً فوقتاً اُن تلخ حقائق سے آگاہ کرتے رہنا ہے، جن سے میں نے اپنے تئیں پردہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ میرا پروفیشن بھی ہے اور ایک مسلم بے گناہ اور معصوم لڑکی کو ایک یہودی کی گھناؤنی سازش کے پھندے سے بچانا بھی...... کیونکہ ایسے ہی لوگ اس خبیث باسکل ہولارڈ کے نشانے پر ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ باسکل ہولارڈ یہاں بھی چپکا بیٹھنے والا نہیں ہے، وہ وہاں عابدہ پر جیل کی اذیت ناک اور انسانیت سوز سختیاں کرنے کے بعد اُسے

اپنے کسی مذموم مقاصد کے لیے بلیک میل کر کے استعمال کرنا چاہتا ہے اور خدا نہ کرے کہ عابدہ کو وہ مجبور کر کے کسی اندھے گڑھے میں پھینک دے، لیکن اب تک کی میری کھوج یہی ہے......"

آنسہ خالدہ بولے جارہی تھی اور میرے وجود کا رواں رواں تڑپ رہا تھا۔

"شہزی......! آر یو دیئر......؟" مجھے یک ٹک خاموش پا کر وہ استفساریہ بولی۔

"ج...... جی! میں سُن رہا ہوں......" میں آنسوؤں کے گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

"تم بتاؤ اب...... کہاں اور کیسے ہو؟ ویسے میری زہرہ بانو سے بھی بات ہوئی تھی۔ اُس نے تو مجھے یہی بتایا تھا کہ تم کہیں اچانک غائب ہو چکے ہو......"

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ میں نے آنسہ خالدہ کو اپنے سیل فون کے علاوہ "بیگم ولا" کے لینڈ لائن کا بھی نمبر دے رکھا تھا۔ میں نے جواباً کہا۔

"میں بھی کچھ غیر تسلی بخش حالات سے دوچار ہوں...... اس کی تفصیل ابھی بتانا مناسب نہیں...... آپ اب کیا سمجھتی ہیں کہ عابدہ کے سلسلے میں آپ کیا کر سکتی ہیں؟"

میری بات پر، دوسری جانب سے مجھے اس کے ایک گہرے سانس لینے کی آواز سنائی دی تھی۔

"شہزی......! میں تم سے پہلے بھی یہ بات کہہ چکی ہوں کہ میں امریکا میں صرف عابدہ کے لیے ہی نہیں بلکہ نائن الیون کے واقعے کے بعد سے، یہاں مقیم مسلم کمیونٹی کی فزیکل اور سوشل پروٹیکشن کے لیے سرگرم ہوں، نیز اس واقعے کی وجہ سے دنیائے مسلم پر پڑنے والے منفی اثرات اور اس کے محرکات کی خفیہ طور پر کھوج اور پتا لگانے میں مصروف ہوں کہ اس عالمی سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں کافی حد تک کامیاب جارہی ہوں۔ اس کا ثبوت میرا حال ہی میں چھپنے والا وہ آرٹیکل ہے۔ جس کے مطابق سی آئی اے کا باسکل ہولارڈ اپنی ذاتی فورس "ٹائیگر ٹیگ" کے ذریعے، ایف بی آئی کے ساتھ مل کر...... امریکی ایف بی آئی نے یہاں مقیم مسلمانوں، خصوصاً پاکستانی نوجوانوں کو دہشت گردی کے جھوٹے مقدمات میں پھنسانے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ٹائیگر ٹیگ اور ایف بی آئی کے مشترکہ ایجنٹس مسلم نوجوانوں سے "جعلی جہادی" بن کر دوستی کرتے ہیں اور پھر ان کو دنیا بھر میں مسلمانوں پر جاری مظالم کے خلاف جہاد اور جنگجوئیت پر اغب کرتے ہیں۔ بعدازاں انہیں "اسٹنگ آپریشن" کے نام پر گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ باسکل ہولارڈ اس عالمی سازش کے سرغنوں کا خفیہ ٹاسک لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔ جن کا تعلق کسی مسلم سرزمین سے نہیں بلکہ امریکا سے ہی ہے جس کے تانے بانے جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) سے جا کر ملتے ہیں۔ جس نے امریکا کی معاشیات اور اقتصادیات پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے اور شہزی......! میں ہی نہیں بلکہ تم بھی یہ بات جانتے ہو کہ عابدہ کو بھی ایسی ہی کسی سازش کا ہی نشانہ بنایا جارہا ہے۔ اب میں اپنے منہ سے کیا کہوں......؟ کہ اس مہم میں میری اپنی جان کو بھی شدید خطرات رہنے لگے ہیں، کئی بار مجھ پر حملے کیے گئے۔ مگر مجھے اللہ کی ذات پر کامل بھروسا ہے۔ وہی میری اس نیک مقصد میں مدد فرماتا رہے گا۔ عابدہ کا معاملہ بے شک گمبھیر صورت اختیار کر گیا ہے مگر خاموش میں بھی نہیں بیٹھی ہوں۔ اب تم بتاؤ، تم وہاں کن حالات کا شکار ہو چکے ہو؟"

آنسہ خالدہ نے اپنی بات ختم کی تو میں نے کہا۔

"میں ابھی آپ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا لیکن میں آپ کے ساتھ وقتاً فوقتاً رابطے میں رہوں گا۔ آپ اس کا یہ مطلب مت سمجھیے گا کہ میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں، یوں سمجھیے میں اپنے تئیں ان لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کے لیے کوشاں ہوں جنہوں نے عابدہ کو پھنسایا ہے۔"

"کیا تم پاکستان سے باہر ہو......؟"

"جی! یہی سمجھ لیں۔"

"کس ملک کی سرزمین پر ہو تم اس وقت؟" اس نے پوچھا۔

مگر اسی وقت کسی وجہ سے لائن کٹ گئی اور ساتھ ہی دروازے پر بھی آہٹ اُبھری۔ میں جلدی سے جا کر بیڈ پر دراز ہو کر سوتا بن گیا۔ اتنے میں سوشیلا، کاشی رام کو "گڈ نائٹ" کہہ کر اندر داخل ہوئی اور دروازہ بند کر دیا۔ میں فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"مجبوراً اس باگڑ بلے کے ساتھ اتنا وقت گزارنا پڑا...... لگتا ہے یہ کڑوا گھونٹ اب مجھے بار بار پینا پڑے گا۔" وہ ایک تھکی تھکی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "تم نے اپنے ساتھیوں سے بات کر لی؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ "چینجنگ وائف" کا رول پلے کرتے ہوئے تم خاصی انجوائمنٹ فیل کر رہی ہو گی، مگر......" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ

دیا۔

”توبہ ہے، باتیں بہت کرتا ہے۔ اب میں اس کے ساتھ تنہا نہیں نکلوں گی۔“

”کیا اس نے تمہارے ساتھ کوئی ”معنی خیز“ جسارت تو نہیں کرڈالی؟“ میں اس کا دل بہلانے کی کوشش کررہا تھا۔ تاکہ اس کا موڈ ٹھیک ہوسکے۔ وہی ہوا، وہ میری بات پر بے اختیار ہنس پڑی اور شاور لینے کے لیے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ میں اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے تھوڑا کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ میں دروازہ بند کرکے اندر آگیا اور دوبارہ ٹیلی فون کا ریسیور اُٹھالیا اور پاکستان میں بیگم ولا کا نمبر ملایا۔

اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے اور میرے حساب سے پاکستان کا وقت آدھا گھنٹا پیچھے ہی تھا، یعنی وہاں اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے ہوں گے۔

”ہیلو......“ دوسری جانب سے شناسا آواز ابھری۔ یہ زہرہ بانو ہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میرے ہی فون کے انتظار میں تھی۔

”ہیلو...... زہرہ! یہ میں بول رہا ہوں...... شہزی......!“ میں نے ہولے سے کہا۔

”شہ...... شہزی...... شہزی......! تم کہاں ہو اور کیسے ہو......؟“ دوسری جانب سے اس کی تشویش زدہ سی بے قرار آواز ابھری۔

”میں جہاں ہوں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں، وہاں سب خیریت ہے ناں......؟ اماں ابا جی اور...... اول خیر وغیرہ......سب کیسے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ سب ٹھیک ہیں مگر ہم تمہاری طرف سے بہت فکر مند رہتے ہیں۔“ وہ جیسے چڑھی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ ”کبیل دادا اور اول خیر انڈیا آنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ شکیلہ بھی بہت پریشان رہتی ہے تمہارے لیے۔“

”ابھی کسی کو آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ سب سے رابطے میں رہوں گا، جیسے جیسے مجھے موقع ملتا رہے گا۔ یہ بھی میں خطرہ مول لے کر فون کرلیتا ہوں، کچھ پتا نہیں کہ بلیو تلسی یا را والے میری کالز بھی ٹریس کررہے ہوں...... اس لیے میرے پاس بہت کم وقت ہوتا ہے، یہ بتائیں، مجھے کچھ پیسے بھجواسکتی ہو؟“

”ہاں! ہاں کیوں نہیں؟ کتنے پیسے چاہیے تمہیں؟ مجھے اسی بات کی تو زیادہ فکر ہورہی تھی مگر تم واپس کیوں نہیں آجاتے؟“ زہرہ بانو نے کہا تو میں فراخ دلی سے بولا۔

”مجھے شاید یہ تقدیر نے ہی موقع دیا ہے۔ میں اسے ضائع نہیں کروں گا اور تم سب بے فکر رہو، مجھے یہاں بھی کچھ ایسے مواقع حاصل ہوگئے ہیں کہ میں اپنا مشن آسانی سے پورا کرسکوں...... میں تمہیں ایک اکاؤنٹ نمبر دے رہا ہوں، کسی طرح پیسے بھجوادیں، میرا اور اول خیر کا پاکستان میں مشترکہ اکاؤنٹ ہے۔“

”یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو شہزی؟ میں تمہیں پیسے بھجوادوں گی۔ اس کی کیوں فکر کرتے ہو؟“ وہ بڑے رسان سے بولی۔ میں نے اسے سوشیلا کا نام اور اکاؤنٹ نمبر بتا دیا۔ ساتھ ہی کہا کہ چند لاکھ روپے سے زیادہ مت بھیجیں جائیں وغیرہ...... اس کے بعد میں نے رابطہ منقطع کردیا۔

اس اثنا میں سوشیلا بھی غسل وغیرہ کرکے نکل آئی۔ نہانے کے بعد وہ خاصی نکھری نکھری نظر آرہی تھی اور اس نے ڈھیلا ڈھالا سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہمارے پاس سامان بھی کچھ نہیں تھا۔ ہنی مون پہ آنے والے جوڑے کو خالی ہاتھ پا کر بھی کاشی رام کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ تاہم مجھے یاد آیا کہ سوشیلا نے اسے یہی بتایا تھا کہ ہمارا سامان راستے میں چوری ہوگیا تھا۔ اس لیے اس بھلے مانس نے کچھ ہلکے پھلکے کپڑے بھجوادیے تھے۔

ہم سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ میں نے سوشیلا کو بتا دیا کہ کل تک اس کے ممبئی والے اکاؤنٹ میں پیسے آجائیں گے۔

”اس کی کیا ضرورت تھی شہزی؟ پیسے تھے میرے پاس۔“ وہ بولی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس نے یہ بات محض مروتاً کہی تھی یا خلوصِ نیت سے، تاہم میں نے دوسرا موضوع چھیڑ دیا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”کل صبح تمہیں، کاشی رام سے بات کرنا ہوگی۔ وہ ہمارے رہنے کے لیے کوئی الگ بندوبست کردے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ تب تک تم ممبئی جاکر روپے نکلوا لانا۔ ہوسکے تو چھوٹی موٹی گاڑی کا بھی بندوبست ہوجائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ کاشی رام کا بھی حساب ساتھ کے ساتھ چکتا کرتے رہیں گے۔“ میری بات پر سوشیلا نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔

”ہزاری سی کی ایک کار ہے میرے پاس، جو وہیں ممبئی میں میرے مکان کے گیراج میں کھڑی ہے۔ میری موسی پریشان ہورہی ہوگی۔ میں اسے بھی فون کیے دیتی ہوں ذرا......“

اس نے اپنی موسی کو فون کیا اور میری ہدایت کے

مطابق اُسے نہیں بتایا کہ وہ کہاں تھی اس وقت۔ تاہم اپنے جلد گھر پہنچنے کی تسلی اُسے ضرور دے دی تھی۔

"میں جنرل کے ایل ایڈوانی سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہوں۔ اس کے لیے میں جلد سے جلد ممبئی کا رخ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ وہیں دیار میں رہتا ہے۔"

"تمہیں اس سے جان کا خطرہ ہے؟" میں نے کسی خیال کے تحت اچانک اس سے پوچھا۔

"ہاں! کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں اس کے گھناؤنے عزائم سے واقف ہوں اور وہ کوئی بھی ایسی شے نہیں چھوڑتا جو اس کے معمولی سے راز سے بھی واقف ہو۔"

"تو پھر اس کے لیے ہمیں بہت محتاط ہو کر قدم اُٹھانا ہوگا، کسی قسم کی جلد بازی جانی نقصان اور مشن کے فیل ہونے پر بھی منتج ہو سکتی ہے۔" میں نے گہری متانت سے کہا۔

"لیکن تم یہاں اپنے دشمنوں سے بھی نبرد آزما ہو۔ ہمارے پاس ہتھیار بھی نہیں ہیں اور وہ شکاری کتوں کی طرح ہمارے خون کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے وہ یہاں بھی کسی وقت پہنچ سکتے ہیں۔" سوشیلا نے متوحش سے لہجے میں کہا تو میں بے پروانہ انداز میں بولا۔

"تم اگر اتنی ہی خوف زدہ ہو تو میری طرف سے اجازت ہے تمہیں، تم میرا ساتھ چھوڑ کر ممبئی اپنے گھر جا سکتی ہو۔ میں اپنا مشن پورا کر کے تمہارے پاس ممبئی آجاؤں گا اور پھر جنرل ایڈوانی سے نمٹ لیں گے۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو شہزی؟" وہ روٹھے ہوئے سے لہجے میں بولی۔ "میں اتنی خود غرض نہیں ہوں کہ اپنے مطلب کی خاطر تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں، تمہیں ابھی میری ضرورت رہے گی، اس لیے کہ تمہارے پاس شناختی کاغذات نہیں ہیں اور تم کسی بھی انڈین اہلکار کی نظروں میں آسکتے ہو۔ میں ساتھ رہوں گی تمہارے تو ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ اگر ہوا بھی تو میں اس کمی کو کور کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔"

اس کی بات بھی غلط نہیں تھی۔ میں چپ رہا، وہ آگے بولی۔

"مجھے تو بس اس بات کی پریشانی ہو رہی ہے کہ تم اپنے اتنے خطرناک اور طاقت ور دشمنوں سے تن تنہا بغیر کسی ہتھیار کے کیسے مقابلہ کرو گے؟"

"میرا عزم اور حوصلہ ہی ہمیشہ سے میرے ہتھیار رہے ہیں سوشی!" میں نے مستحکم لہجے میں کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے خالی ہاتھ بھی اب تک اپنے ان دشمنوں کو مقابلہ کیا ہے۔ اب تک تمہارے ساتھ رہتے ہوئے میں اس کی جھلک دیکھتی رہی ہوں۔ اسی لیے تم پر پورا بھروسا بھی کیے ہوئے ہوں۔"

"بس! تو پھر اپنا یہی بھروسا قائم رکھو۔ ہم جلد اپنی منزل پالیں گے۔"

"بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔"

بہت سا وقت گزر گیا۔ سوشیلا غسل وغیرہ کرنے کے بعد بیڈ پر پڑی گہری نیند سو رہی تھی جبکہ میں نے اپنے لیے ایک پرانے صوفے پر سونے کی جگہ بنالی تھی۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ اچانک میری آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلنے کی بہ ظاہر وجہ معلوم نہ ہو سکی، یوں بھی میں "کھٹکے" کی نیند سوتا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا اور اسی روشنی میں، مجھے بیڈ پر سوشیلا گہری نیند میں ڈوبی دکھائی دی۔ باقی کمرے میں خاموشی کا راج تھا، لیکن میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں میں اچانک ہی گونج کی سی آواز سنائی دی۔ میں بدکا۔ یہ آواز کسی گاڑی کے انجن کی تھی۔ میں بہ سرعت صوفے سے اُٹھ کر کمرے کی اس کھڑکی کی طرف لپکا جہاں سے بیک وقت سرائے کے احاطے اور پھاٹک کا نظارہ کیا جا سکتا تھا اور اسی باعث میں نے اسی لوکیشن پر یہ کمرا لیا تھا۔

کھڑکی کے کواڑ کھلے ہوئے تھے، میں نے وہاں سے باہر جھانکا اور یکلخت جیسے میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ گاڑی ایک ہی تھی اور اسے میں پہچان گیا تھا۔

"دشمن......" میرے اندر ابھرا اور میں طوفانی بگولے کی طرح پلٹا، بیڈ کی طرف بڑھا، پھر سوشیلا کو بُری طرح جھنجوڑ کر جگایا...... وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

"دشمن یہاں آپہنچے ہیں، جلدی نکلو......" میں نے اتنا کہا اور اسے لیے دروازے کی طرف لپکا۔ اسے کھولا اور راہداری میں آگیا۔ یہ تو شکر تھا کہ میں احتیاط کے پیش نظر یہاں "فروکش" ہونے سے پہلے، سرائے کے محل وقوع کا اچھی طرح گھوم پھر کر جائزہ لے چکا تھا اسی لیے میں نے سیدھا ان سیڑھیوں کا رخ کیا جو سرائے کی چھت کی طرف جاتی تھیں۔

راہداری سنسان تھی اور اس کی چھت پر کہیں ہلکے

پاور کے بلب روشن تھے۔ سیڑھیوں پر آ کر کچھ سوچ کے میں نے سوشیلا کو اپنے پیچھے چپکے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور خود دیوار کی آڑ لے کر اسی طرف دیکھنے لگا جہاں سے ممکنہ طور پر دشمن اندر داخل ہوتے وقت میری نظروں میں آ سکتے تھے۔

سرائے کے باہر شبینہ چوکیدار موجود تھا۔ گاڑی میں مجھے چندر ناتھ اور سے جی کوہارا سمیت پانچ چھ کے قریب دشمن نظر آئے تھے۔ باقی میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے اور کئی تتر بتر ہو گئے تھے۔

بھاری قدموں کے دھمک کی آواز ابھری اور اگلے ہی لمحے میں نے ان پانچوں کو راہداری میں دوڑتے ہوئے آتے دیکھا، یہ سب مسلح تھے۔ چندر ناتھ اور کوہارا کے ہاتھوں میں آٹومیٹک پستول تھا۔ جبکہ شیام اور کوریلا اور ان کا ایک ساتھی ایجنٹ رائفلیں اٹھائے ہوئے تھے۔ انہیں شاید اس بات کی بھنک پڑ چکی تھی کہ یہاں آنے والا ”نیا جوڑا“ کون سے کمرے میں مقیم تھا اسی لیے انہوں نے سیدھا اسی کمرے کا رخ کیا تھا، جہاں تھوڑی دیر پہلے میں اور سوشیلا تھے۔ گینڈے جیسی جسامت کے حامل سے جی کوہارا نے ہی دروازے پر ایک زوردار لات مار کے اسے کھولا تھا۔ (جو ظاہر ہے اندر سے پہلے ہی کھلا ہوا تھا)۔ وہ سب دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ ذرا فاصلے سے دیوار کی آڑ لیے ان کی یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ وہی ہوا، ہمیں وہاں نہ پا کر وہ سب بپھرے ہوئے انداز میں وہاں سے برآمد ہوئے تھے اور پھر تیزی سے ادھر ادھر پھیل گئے۔ میں نے چندر ناتھ کو جھلائے ہوئے انداز میں یہ کہتے سنا۔

”وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ادھر ہی تھے۔ انہیں ہماری آمد کا علم ہو چکا ہے۔“

ساتھی ایجنٹ اور کوریلا کو چندر ناتھ نے باہر پھاٹک اور احاطے کی طرف ناکا بندی کے لیے بھیج دیا تھا۔ شیام اسی طرف جہاں میں دبکا کھڑا تھا، جبکہ وہ خود اور کوہارا مخالف سمت کی طرف بڑھ گئے۔ مگر وہاں سے ٹلے نہیں تھے۔ وہ ایک ایک کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑا رہے تھے اور کھلتے ہی اندر گھس کر تلاشی لے رہے تھے۔ شیام ہاتھ میں رائفل تھامے اسی طرف آ رہا تھا اور اسے شاید اندازہ ہو چکا تھا کہ اوپر چھت کی طرف جانے والی سیڑھیاں اسی طرف ہو سکتی تھیں۔

وہ جیسے ہی اس طرف پہنچ کر گھوما، میں چیتے کی طرح اس پر جھپٹا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس کی گردن اپنے ایک بازو کے شکنجے میں جکڑ لی اور دوسرا ہاتھ اس کی گن پر ڈالا۔ مگر شیام نے بھی کم پھرتی کا مظاہرہ نہیں کیا، وہ قابو میں آتے ہی بڑی تیزی کے ساتھ مچلا تھا اور میرے بازو کی گرفت سے نکلنے کی کوشش چاہی، اور اسی دوران، چونکہ اس کی ایک انگلی گن کے ٹریگر پر تھی، اسے اس نے جنبش دے ڈالی۔ گولی چلنے کے دھماکے کی گونج ابھری، ادھر میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا، کڑاکے کی آواز کے ساتھ ہی شیام کا میری گرفت میں تنا ہوا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا، مگر مرتے مرتے بھی وہ کم بخت میرے لیے مشکل کھڑی کر گیا تھا۔ اس نے گن چلا دی تھی۔ جو اب میرے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ گولی کی آواز ابھرتے ہی چندر ناتھ اور سے جی کوہارا کا اس طرف متوجہ ہونا عین ممکن تھا، پھر میری جھلک دیکھتے ہی ان دونوں نے بیک وقت مجھ پر برسٹ فائر کیا، میں اس سے پہلے پیچھے ہو گیا تھا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھرنے کے دوران ہی میں سوشیلا کو لیے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

سرائے کی چھت پر خنک ہوائیں سبک خرام تھیں، اوپر چاند پوری طرح روشن تھا۔ تارے بھی ٹمٹما رہے تھے۔

رات کے اس سمے، سرائے میں اچھی خاصی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ یہ بھی ہمارے لیے بہتر ہی ہوا تھا۔ لیکن یہ کچھ اچھا نہیں ہو سکتا تھا، اسی لیے میں نے اپنی سی کوشش جاری رکھتے ہوئے چھت پر آتے ہی، بائیں جانب رخ کیا جہاں سے نیچے احاطے اور پھاٹک کی طرف دیکھا جا سکتا تھا، وہاں منڈیر کے قریب جھکے جھکے انداز میں پہنچ کر میں نے ذرا سر ابھار کر نیچے دیکھا اور اسی وقت ایک ریڈ ڈاٹ کو تھرکتے ہوئے اپنی پیشانی پر جمتے دیکھا، ایک پل کے ہزارویں حصے میں اپنے سر کو میں نے جنبش دے کر جھکایا اور اسی وقت گولیوں کی بھیانک آواز ابھری۔ مجھے اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میرے سر کے پرخچے اڑ چکے ہوتے۔ نیچے باہر موجود کوریلا اور اس کے ساتھی ایجنٹ نے اندر فائرنگ کی آوازیں سنتے ہی سب سے پہلے چھت کی منڈیروں پر عقابی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ یہ ان کی بروقت ذہانت تھی، میری قسمت ہی یاور تھی کہ میں ایک بھیانک موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچا تھا۔ فائر اس کے ساتھی ایجنٹ نے کیا تھا، اتنے قریب سے موت کی جھلک دیکھنے پر میرا فطری جنون بیدار ہو گیا تھا۔ میں نے پل کے پل محتاط اندازے کے ساتھ اعداد شماری کی اور سوشیلا سے کہا۔

”تم منڈیر سے جھانکنے کی غلطی مت کرنا۔“ اس کے بعد میں نے کوئی شے بھانپ کر اٹھائی، یہ کسی لکڑی کی بینچ کا

ٹوٹا ہوا لکڑی کا ٹکڑا تھا، وہ میں نے ایک طرف منڈیر پر اُچھالا اور اپنی گن سمیت سر ابھارا۔ نیچے پھاٹک کے پاس مجھے کوریلا اور اس کا ساتھی ایجنٹ سر اُٹھائے منڈیروں کو تاڑتے ہی نظر آئے، پھر میرے نشانے پر کوریلا کا ساتھی ایجنٹ آگیا، اسی نے مجھ پر برسٹ فائر کیا تھا۔ کم بخت نے اپنی گن پر اسنائپر رائفل میں لگنے والی ''ڈاٹ'' لائٹ لگا رکھی تھی۔ میں نے اسی کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی، جب تک کوریلا یا اس کی نگاہ مجھ پر پڑتی، وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گرا اور اسی وقت کوریلا نے مجھ پر ایک برسٹ داغا، میں بھلا اب اس کے نشانے میں کہاں آنے والا تھا، میں اپنا ''کام'' کر کے پھرتی سے پلٹ چکا تھا۔

نیچے سرائے میں مقیم مسافر اور لوگ بے سروپا انداز میں چیختے چلاتے، ادھر اُدھر دوڑنے بھاگنے میں لگے ہوئے تھے۔ رات کے اس پہر اچھی خاصی افراتفری مچ گئی تھی۔

میں نے سوشیلا سمیت اس بڑی سی پانی کی ٹینکی کی آڑ لے رکھی تھی، یہ سیمنٹ کی بنی ہوئی تھی اور اس کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ اس قدر کہ اس کا پلستر جگہ جگہ سے جھڑ چکا تھا اور وہاں سے اب زنگ آلود سریئے جھانکنے لگے تھے۔

یہاں سے مجھے، چندر ناتھ اور کوہارا سیڑھیوں کی اختتامی چوکھٹ سے نمودار ہوتے دکھائی دیے۔ چندر ناتھ اور کوہارا مجھے چھاپنے کے لیے جنونی بنے ہوئے تھے، ان کی یہ دیوانہ وار حرکت ان کے لیے جانی نقصان کا پیام لاسکتی تھی، مگر میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کو کور کیے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے سوشیلا کے کان میں کچھ کہا اور وہ تیزی سے منڈیر کی دوسری جانب بڑھی، وہاں اس نے اپنے منہ سے کچھ عجیب سی آواز نکالی، میں نے ذرا ابھر کر چندر ناتھ اور کوہارا کا ردعمل دیکھنا چاہا، کوہارا نے اسی طرف رخ کیا تھا جبکہ چندر ناتھ اپنا پستول سنبھالے اس سمت بڑھنے لگا جدھر میں چھپا کھڑا تھا۔ ٹھیک اسی وقت کوہارا کی گن گرجی، منڈیر کے سنگ ریزے اُڑے تھے، جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ کوہارا نے اندھا فائر جھونکا ہے۔ مجھے سوشیلا کی فکر ہوئی، مگر میری نظریں چندر ناتھ پر جمی ہوئی تھیں جو چھت پر بکھرے ہوئے کاٹھ کباڑ اور الا بلا کی آڑ لیے ٹینکی کے اسی گوشے کی طرف بڑھ رہا تھا، جہاں میں دبکا کھڑا تھا۔ میں اسے نشانہ بنانے کی کوشش میں تھا، لیکن مجھے کوہارا کی جانب سے خطرہ تھا، وہ میرے چندر ناتھ پر حملہ کرنے پر چونک سکتا تھا۔ یوں بھی چندر ناتھ ابھی پوری طرح سے میرے نشانے پر نہیں آیا تھا۔

''شہزی......''

معاً سوشیلا چیخی۔ میں پلٹا اور اپنے عقب کی منڈیر پر میری نگاہ پڑی جہاں سے کوریلا چڑھنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور اب میرا نشانہ باندھنے کی کوشش میں تھی کہ سوشیلا کی بروقت اس پر نگاہ پڑ گئی۔ کوریلا نے اپنی گن سے برسٹ داغا اور میں اس سے ایک ثانیے قبل بہ سرعت اپنی جگہ بدل چکا تھا۔ سیمنٹ کی سال خوردہ ٹینکی سے سنگ ریزے اُڑے اور میرے چہرے اور آنکھوں پر پڑے۔ مجھے شدید چبھن کا احساس ہوا اور بے اختیار میرے حلق سے تکلیف کے باعث سسکاری خارج ہو گئی۔ یہ ایک خطرناک عمل تھا، کوریلا مجھ پر دوسرا برسٹ بھی داغ سکتی تھی، اس لیے میں نے اس تکلیف کی پروا کیے بغیر اپنی جگہ بدلتے ہی، ایک محتاط اندازے سے اس پر برسٹ جھونک مارا، کیونکہ میری آنکھوں میں سنگ ریزے پڑنے کی وجہ سے میں عارضی اور فوری طور پر دیکھنے سے قاصر تھا، جب تک میں اپنی آنکھیں مسلتا، کوریلا مجھے دوبارہ نشانہ بنا سکتی تھی اور ظاہر ہے اس بار اس کا نشانہ خالی نہیں جا سکتا تھا، میرے محتاط انداز کی فائرنگ نے اسے پچھاڑ کر رکھ دیا۔ میری سماعتوں میں اس کی چیخ سنائی دی جو دور ہوتے ہوئے ایسی ہی معلوم ہوئی تھی جیسے وہ گہرے کنوئیں میں جا گری ہو۔ وہ سرائے کی چھت سے نیچے جا پڑی تھی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور تیزی سے ٹینکی کی چھت پر چڑھ گیا۔ اس کی صفائی وغیرہ کے لیے ایک زنگ آلودہ مختصر سی فولادی سیڑھی کو میں نے استعمال کیا تھا۔ ابھی میں چھت پر پہنچا ہی تھا کہ مجھے سوشیلا کے چیخنے کی آواز سنائی دی، میں چھت پر سینے کے بل لیٹ کر چیخ کی سمت رینگ گیا اور نیچے جھانکا تو دھک سے رہ گیا۔

سے جی کوہارا نے سوشیلا کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

پلان

سلیم انور

کوشش اور ہمت سے بڑے سے بڑے معرکے سر ہو جاتے ہیں... مگر بعض صورتِ حال میں جدوجہد کے ساتھ خوش قسمت ہونا بھی ضروری قرار پاتا ہے... ایک کامیاب منصوبہ ساز کی بہترین کارکردگی کی دلچسپ روداد... عین وقت پر قسمت نے اپنا داؤ آزما ڈالا...

حسیناؤں کے جھرمٹ میں رہنے کا خواب دیکھنے والے شائق کا المیہ

میں ایک سستے سے موٹیل کے سستے سے کمرے میں رہ رہا تھا۔ مجھے انشورنس کے چیک کی آمد کا انتظار تھا اور میں وقت گزار رہا تھا۔ بیمے کی رقم حاصل کرنے کے بعد میرا میکسیکو منتقل ہونے کا پروگرام تھا تاکہ اسٹرانگ بیئر اور لاطینی دوشیزاؤں کے شباب سے لطف اندوز ہوسکوں۔

بہرحال یہ میرا پلان تھا۔

میری بیوی اس آگ میں جل کر مر گئی تھی جس نے ہمارا مکان خاکستر کردیا تھا۔ یہ ایک المناک حادثہ تھا لیکن میرے

اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات زیادہ خوش گوار نہیں تھے تو حقیقت میں، میں غم یا صدمے سے بہت زیادہ نڈھال نہیں تھا۔

ہمارا مکان ایک متمول علاقے میں تھا۔ سرمایہ کاری کے لحاظ سے یہ قدرے مہنگا علاقہ تھا۔ ہمارا یہ محلہ درحقیقت پانچ مکانات پر مشتمل تھا جو نصف دائرے نما ایک پختہ سڑک پر بنے ہوئے تھے اور یہ سڑک ایک بند گلی کے مانند تھی۔ یہاں بے شمار درخت، جھاڑیاں اور وسیع قدرتی نظارہ تھا۔

رہائش کے لحاظ سے یہ ایک آئیڈیل جگہ تھی۔

جس رات ہمارے گھر میں آگ لگی تو اس وقت تمام پڑوسی سٹی کاؤنسل کی ایک میٹنگ میں علاقے میں ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کی تعمیر کے خلاف احتجاج کرنے گئے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ محلے کی خبر گیری کرنے اور عقابی نگاہوں والی بڑھیا بر تھا بھی اس شب گھر سے دور کہیں گئی ہوئی تھی۔

میں خود بھی اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ میں ایک شراب خانے میں تھا۔ میں ویسے بھی انجمنوں، تنظیموں کی رکنیت کا شائق نہیں ہوں۔

اسی رات ہمارے نصف دائرے کے مکانات میں سے سب سے آخری مکان میں چوری بھی ہوئی تھی۔ چونکہ محلے کی خبر گیری کرنے والی عقابی چشم بڑھیا بر تھا اپنے گھر میں موجود نہیں تھی اس لیے کوئی چشم دید گواہ بھی نہیں تھا۔ مجموعی طور پر یہ ہمارے محلے کے لیے ایک منحوس اور بری رات تھی۔

بیمے کی رقم خاصی تگڑی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی میں سے ہر ایک کی بیمہ پالیسی دس دس لاکھ ڈالر کی تھی۔ اور حادثاتی موت کی صورت میں (جیسے کہ گھر میں آگ لگنے سے موت واقع ہو جائے) تلافی کی رقم دگنی ہونے کا تحفظ حاصل تھا۔ پھر مکان کا بیمہ الگ تھا۔ رہن کی رقم کی ادائی کے بعد تین لاکھ ڈالر مزید ملنے تھے۔

سو میں اس سستے سے موٹیل کے کمرے میں بیٹھا بیمے کی رقم کے چیک کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ دن میں میرا زیادہ وقت ٹیلی وژن دیکھنے میں گزر جاتا تھا۔ میں نے اس علاقے کا کوئی شراب خانہ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے علاوہ میں سیاہ بالوں والی ان حسیناؤں کے تصور میں کھو جاتا تھا جن کی رفاقت سے میں نے بھرپور لطف اندوز ہونے کا پلان بنایا ہوا تھا۔

☆☆☆

کسی نے دروازے پر دستک دی۔

میں اس وقت کمرے میں موجود چھوٹی سی میز پر بیٹھا وہ چند فارم پُر کر رہا تھا جو ریاست کے وکیل نے مجھے بھیجے تھے۔ یہ وکیل بھی عجیب شے ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس ڈیل سے وہ چند سو ہزار ڈالر اینٹھ لیں گے۔ لیکن وہ میرے پلان سے واقف نہیں تھے۔

دستک خاصی زوردار تھی۔ میں قدرے اُچھل پڑا اور میرا اسدرن کمفرٹ کا گلاس الٹتے الٹتے بچ گیا... میں نے اپنا گلاس احتیاط سے میز پر رکھا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ ایک دراز قامت ہسپانوی تھا جس کا قد چھ فٹ کے قریب رہا ہوگا۔ اس نے اپنے لمبے بال پیچھے کی طرف کھینچ کر گردن کی پشت پر باندھے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں رخسار پر ایک زخم کا نشان تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''جی؟'' میں نے کہا۔

''میں اپنی رقم لینے کے لیے آیا ہوں۔''

''ایکسکیوزمی؟''

''میں تمہاری بیمے کی رقم میں سے اپنا حصہ لینے کے لیے آیا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ ''مجھے اندر آنے نہیں دو گے؟''

اس سے قبل کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ مجھے دھکیلتا ہوا اندر کمرے میں آگیا اور پلٹ کر میرے مقابل کھڑا ہو گیا۔

''بہتر ہوگا کہ تم دروازہ بند کر دو۔'' اس نے کہا۔ ''میں ایسی جگہ موجود ہونا پسند نہیں کرتا جہاں گزرنے والے لوگ مجھے دیکھ سکیں۔''

''سنو، تم......'' میں اسے تنبیہ کرنے ہی والا تھا کہ اس نے میری بات تیزی سے کاٹ دی۔

''میں اس شب وہاں موجود تھا۔'' اس نے کہا۔ اب اس کے ہونٹوں پر سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

''ہوں؟''

''اس شب جب تمہاری بیوی مری تھی اور تمہارا مکان جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔ میں وہاں موجود تھا۔ تمہارے گھر سے تین مکان کے فاصلے پر۔'' اس دراز قامت ہسپانوی نے کہا۔

اس شخص کی بات سمجھنے کے لیے راکٹ سائنس داں ہونا ضروری نہیں تھا۔ پانچ مکانوں پر مشتمل ہمارے اس محلے میں اس شب جو واحد فرد موجود تھا، وہ وہ چور تھا جس نے رابنسن کے گھر میں چوری کی تھی اور رابنسن کا گھر ہمارے

گھر سے عین مکان کے فاصلے پر تھا۔

میں نے دروازہ بند کردیا۔

''بہتر!'' اس نے کہا۔ اس کی مسکراہٹ دوبارہ لوٹ آئی تھی۔

''یہ سب کیا ہے؟ تم کون ہو؟ تمہیں یہ خیال کیوں کر آیا کہ میں......'' میرے ذہن میں ایسے درجنوں سوالات تھے جو ایک ساتھ میری زبان سے ادا ہونے کی کوشش کررہے تھے۔

''کیا خیال ہے اگر میں آرام دہ حالت میں آجاؤں؟'' اس نے اپنا لیدر جیکٹ اتارتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں کچھ وقت ایک ساتھ گزارنا پڑے گا۔''

اس نے اپنے جیکٹ کی بائیں ہاتھ کی جیب سے ایک سیلولر فون نکالا اور اپنے بیلٹ سے کلپ کرلیا۔ ''اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''بالکل ضرورت پیش آسکتی ہے اگر کوئی نشے باز کوئی منشیات خریدنا چاہتا ہو؟'' میں نے کہا۔

اس تبصرے پر اس نے تیز نظروں سے مجھے گھورا اور بولا۔ ''تمہارے ساتھ کوئی پرابلم ہے؟''

''مجھے بس سیل فونز سے نفرت ہے۔''

یہ سُن کر اس نے شانے اچکا دیے اور اپنے جیکٹ کی داہنی جیب میں سے ایک چھوٹی نال کا ریوالور نکال کر چند لمحوں تک اس کا جائزہ لیتا رہا، پھر اسے اپنی کمر میں اڑس لیا۔ اس کا داہنا ہاتھ ریوالور کے ابھرے ہوئے دستے پر جما رہا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنا جیکٹ کاؤچ پر اچھال دیا۔

آتشی اسلحے کے بارے میں، میں کوئی ماہر نہیں ہوں لیکن مجھے شبہ تھا کہ یہ چھوٹی سی شے میرے بیش قیمتی جسم میں ایک خاصا بڑا سوراخ کھول سکتی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ بہتر یہی ہوگا میں اس دراز قامت ہسپانوی کی بات دھیان سے سنوں۔

''بات سیدھی ہے۔'' اس ہسپانوی نے کہنا شروع کیا۔ ''میں اس رات وہاں موجود تھا۔ نیم دائرے والی سڑک کے آخری مکان میں۔ کیا تمہیں کبھی اس مکان میں جانے کا اتفاق ہوا ہے؟ ویل یقیناً ہوا ہوگا کیونکہ تم اس کے پڑوسی ہو۔ بہرحال، وہاں ڈائننگ روم میں ایک بوفے ہے، بے ونڈو کے عین مقابل۔ میں وہاں بوفے کی اشیا کو ٹٹول رہا تھا کہ شاید میرے مطلب کی کوئی شے ہاتھ آجائے۔

''تب میں نے تمہیں سڑک کی جانب سے آتے ہوئے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے تم چپکے چپکے چوری چھپے ادھر آرہے ہو۔ میں تمہیں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک تم اس مکان میں داخل نہیں ہوگئے۔ پھر تمہیں اس مکان سے واپس باہر نکلتے ہوئے بھی دیکھا۔ پھر اسی طرح تم چپکے چپکے چوری چھپے واپس سڑک کی طرف چلے گئے۔ پھر اس مکان سے جس میں تم داخل ہوکر نکلے تھے، دھواں نکلنے لگا۔ پھر اس کی کھڑکیوں سے شعلے بلند ہونے لگے اور مکان میں آگ لگ گئی۔

''بتاؤ، تم نے اس عورت کو کس طرح بیڈ تک محدود کیے رکھا تھا؟ خبرنامے میں انہوں نے بتایا تھا کہ بے احتیاطی سے جلتی ہوئی سگریٹ اس مکان میں آگ لگنے کا سبب بنی تھی۔ یہ ایک ہولناک ٹریجڈی تھی۔ تو کیا تم نے گھر سے روانہ ہونے سے پہلے اس عورت کو اضافی خواب آور گولیوں کی خوراک دے دی تھی جس سے وہ سوتی رہی اور آگ نے اسے بھسم کردیا۔ ایسی ہی بات تھی نا؟

''بہرحال اب ہم سیدھی اور کھری کام کی بات کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ مسکرانے لگا۔

''تم مجھے خبطی لگتے ہو اور یہ تمہاری خام خیالی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میری بیوی ایک آرٹسٹ، ایک پینٹر تھی اور بہت عمدہ فنکارہ تھی۔ لگتا ہے کہ اس کے اسٹوڈیو میں موجود رنگ کے کسی تھنر یا کسی اور شے نے آگ پکڑلی تھی۔ یہ سب کچھ اخبارات میں آچکا ہے۔''

''مضحکہ خیز صفحات تمام اخبارات شائع کرتے ہیں۔'' اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

سو وہ میری کہانی کے جھانسے میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی وقت ہے میں اپنا پینترا بدل لوں۔

میں نے شانے اچکا دیے اور بولا۔ ''تو کیا ہوا۔ تم نے ایک کہانی گھڑی ہے اور میرا سراغ لگاتے ہوئے مجھ تک آن پہنچے ہو۔ تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو، یہی بات ہے نا؟''

''تم اتفاقات پر یقین رکھتے ہو، دوست؟''

''ہوں۔''

''میں تمہاری تلاش میں بالکل بھی نہیں تھا لیکن تم تو جانتے ہو کہ تم شراب خانوں میں جانے کے بے حد شوقین ہو۔ مجھے بھی شراب خانوں میں جانے کا بے حد شوق ہے۔ اب تم جمع تفریق کرلو، یہ حساب کا سیدھا اور آسان سوال

ہے۔

اب مجھے غصہ آنے لگا تھا۔

''تمہارے پاس کسی بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''مجھے کسی ثبوت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' اس ہسپانوی نے جواب دیا۔ ''جو کچھ مجھے چاہیے، وہ اگر تم مجھے نہیں دو گے تو مجھے جو کچھ بھی معلوم ہے وہ میں پولیس کو بتا دوں گا۔ یہی میرا ثبوت ہے۔''

''وہ تمہاری بات کا یقین کرلیں گے...... ایک نقب زن کا...... ایک منشیات فروش کا؟ تمہارا کیا خیال ہے؟ اس کے علاوہ تمہیں رابنسن کے مکان میں اس رات چوری کرنے کے جرم میں جیل بھیج دیں گے کیونکہ تم خود اعتراف کرو گے کہ تم وہاں موجود تھے جو تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔'' میں نے اسے احساس دلاتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھے ان نگاہوں سے دیکھا جیسے کہ میں کوئی چھوٹا بچہ ہوں۔ ''تمہارے خیال میں کیا پولیس مجھے سزا سے مستثنیٰ قرار نہیں دے گی؟ ایک بڑے قاتل کے عوض ایک چھوٹی سی چوری کی واردات کے تبادلے کے طور پر؟ میں پولیس کو اچھی طرح جانتا ہوں، دوست۔ ہوسکتا ہے کہ بیمہ کمپنی مجھے کسی انعام سے بھی نواز دے...... اس تمام رقم کی بچت کے عوض جو تم دھوکے سے ان سے بٹورنے کی کوشش کررہے ہو۔ ہوش میں آجاؤ، دوست۔ حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش مت کرو۔''

اس نے حقیقت میں مجھے پوری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ لیکن میں اسے اس بات کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا، پھر سانس باہر نکالا اور اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا اپنے ہاتھ کو پیچھے اپنی گردن تک لے گیا۔

وہ سمجھ گیا کہ میں وقت گزاری کررہا ہوں۔ میری اس حرکت پر وہ صرف مسکراتا رہا۔

''فرض کیے لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کہ تم درست ہو۔ ایک لمحے کے لیے یہ تصور کرلیتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تھا۔''

''اس میں فرض کرنا کوئی ضروری نہیں ہے، میرے دوست۔'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''جیسا کہ میں کہہ رہا تھا ہم تصور کرلیتے ہیں صرف گفتگو کی خاطر کہ میں نے ایسا کیا تھا جیسا کہ تمہارے خیال میں، میں نے کیا ہے۔ صرف تصور کی حد تک، اوکے؟'' میں نے کہا۔

''تم اپنے طور پر کھیل جاری رکھو، دوست۔''

''اوکے۔ ہم تصور کررہے ہیں۔ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تمہارا تعلق پولیس سے نہیں ہے، کوئی چرچرا خفیہ پولیس ایجنٹ جو مجھ سے ایک قتل کا اعتراف کرانے کی کوشش کررہا ہو؟'' میں نے اپنے خدشات کو زبان دیتے ہوئے کہا۔

''میں؟ اور پولیس مین؟ ہاہا!''

''ہاں...... میں کیوں کر یقین کرلوں کہ تم پولیس والے نہیں ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''تمہیں میری زبان پر اعتبار کرنا ہوگا، مین۔ میری زبان پر! میں کوئی پولیس والا نہیں ہوں۔''

''تمہاری زبان پر؟ بس یہی کچھ؟ بلا کسی ثبوت کے؟'' میں بدستور اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

''دیکھو دوست ہمارے کام کی لائن میں ایک شخص کا سب کچھ اس کی زبان ہوتی ہے۔ تم تو جانتے ہوگے؟ اگر تم کسی کی زبان پر اعتبار نہیں کرسکتے تو پھر تم زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ تمہارا وجود دیرپا نہیں ہوسکتا۔ تمہارے الفاظ جیسے کہ مقدس ہوتے ہیں۔ سمجھ گئے؟ میری زبان پر سوال مت اٹھاؤ، دوست۔''

وہ قدرے جھنجلایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم یہ میرے حق میں اچھا تھا یا برا۔ اگر وہ قدرے غصے سے بھرا ہوا تھا تو پھر اس سے ڈیل کرنا قدرے آسان ہوتا؟ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔

''اوکے، اوکے۔ مان لیا کہ تمہارا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔ سو ہم ایک بار پھر تصور کیے لیتے ہیں کہ میں تمہیں کیا دوں؟ دس ہزار؟''

اس نے اپنا منہ ایک طرف پھیر لیا اور یوں مسکرانے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''تم مجھ سے مذاق کررہے ہو؟''

''پچاس ہزار...... اس سے زیادہ میرے پاس نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ تم کل دوبارہ لوٹ کر نہیں آؤ گے اور ایک لاکھ ڈالرز کا مطالبہ نہیں کرو گے؟'' میں نے اپنا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''میری زبان۔'' اس نے جواب دیا۔ ساتھ ہی ان نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ کیا اب بھی میں

اس کی بات پر اعتبار کرنے میں جھجک محسوس کر رہا ہوں؟

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ یہ یقینی طور پر میرے پلان کا حصہ نہیں تھا۔ مجھے کچھ پینے کی طلب ہونے لگی۔

پینے کے تصور سے میرے ذہن میں اچانک ایک اچھوتا خیال عود کر آیا۔

''آل رائٹ...... ہوں، ویسے تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے اس دراز قامت ہسپانوی سے پوچھا۔

''مائیکل۔ دوست مجھے مکی کہہ کر پکارتے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ ہم بھی آج سے دوست ہو جائیں گے۔ سو تم بھی مجھے مکی کے نام سے پکار سکتے ہو۔''

''رائٹ مکی، او کے! تم کچھ پینا چاہو گے؟ میرے پاس کچھ سدرن کمفرٹ موجود ہے۔''

''کیوں نہیں دوست۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی۔'' اس نے قدرے بے تابی سے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور چھوٹی سی اس میز کی جانب گھوم گیا جس پر شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

بوتل تین چوتھائی بھری ہوئی تھی۔ میں نے بوتل کے اوپری حصے کو اپنے داہنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور تیزی سے بائیں جانب گھومتے ہوئے بوتل کے نچلے حصے سے مکی کی پیشانی پر ایک زوردار ضرب لگا دی۔

وہ اس اچانک افتاد پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کا سر ضرب پڑتے ہی پیچھے کی طرف چلا گیا اور کاؤچ کی پشت سے ٹکرانے کے بعد دوبارہ آگے کی جانب آگیا۔ مکی نے اپنے بیلٹ میں اڑسے ہوئے ریوالور کے دستے کی جانب ہاتھ بڑھانا چاہا۔ اس مرتبہ میں نے الٹے ہاتھ سے بوتل کو واپس پوری قوت سے گھمایا۔ نشانہ اس کی داہنی کنپٹی تھی۔

ایک چٹاخ کے ساتھ اس کا سر بائیں جانب گھوم گیا۔ وہ ایک طویل لمحے تک یونہی ساکت بیٹھا رہا اور پھر دھیرے دھیرے پھسلتے ہوئے نیچے فرش پر گر پڑا۔

میرے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ میں نے بوتل واپس میز پر رکھ دی اور مکی کے تڑے تڑے بدن پر جھک گیا۔ حیرت انگیز طور پر اس کا چہرہ زیادہ خون آلودہ نہیں تھا۔ اس کی پیشانی پر خون کے صرف چند قطرے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے اس کی نبض ٹٹولی...... نبض ساکت تھی!

اب مکی مجھے کبھی تنگ نہیں کر سکتا تھا۔

میرا پلان دوبارہ ٹریک پر آگیا تھا۔

اب مجھے بس اس کی لاش سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا لیکن میں نے پہلے کچھ پینے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران میں لاش کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں اطمینان سے سوچا جا سکتا تھا۔

میں نے تھوڑی سی وہسکی گلاس میں انڈیلی اور کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں اپنے سابقہ پارٹنر کی لاش پر جمی ہوئی تھیں۔

وہسکی پینے کے دوران میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مکی کی لاش کو ٹھکانے لگانا زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔ بس مجھے رات کی تاریکی کا انتظار کرنا ہوگا۔ میں مکی کی لاش کو اس کی کار میں ڈال کر سڑکوں پر گھومتا رہوں گا اور کوئی ویران تاریک گلی تلاش کروں گا جہاں کار سمیت اسے چھوڑ سکوں۔ پھر پیدل واپس موٹل آجاؤں گا۔

پھر یہ اندازہ لگانا پولیس کا کام ہوگا کہ مکی کی موت کی وجہ اس کے منشیات کے کاروبار کے کسی سودے میں اختلاف کا نتیجہ ہے یا اس کی لائن کے کسی حلیف سے مڈبھیڑ ہونے پر اسے موت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

بات سیدھی اور آسان تھی۔ میں مطمئن ہو گیا۔

تبھی دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے ایک بار پھر مجھے چونکا دیا۔ اب کیا مصیبت ہے؟

میں نے ایک نگاہ مکی کی لاش پر ڈالی۔ اب کیا، کیا جائے؟ میں نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھا تاکہ میری آواز گھٹ جائے۔ یوں لگے جیسے کہ میں باتھ روم میں ہوں یا کچھ کر رہا ہوں۔ ''ایک منٹ پلیز۔'' میں نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

میں مکی کی ڈھیلی ڈھالی لاش کو کروٹیں دلاتا ہوا کاؤچ کے نیچے تک لے گیا۔ وہ بمشکل تمام کاؤچ کے نیچے فٹ ہو رہی تھی۔ مجھے اسے کاؤچ کے نیچے دھکیلنے کے لیے خاصا زور لگانا پڑ رہا تھا۔ تب میں فرش پر بیٹھ گیا اور اپنے دونوں پیروں سے زور لگاتے ہوئے اسے کاؤچ کے نیچے پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔

اب وہ لاش نیچے جھکے بغیر دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔ میں تیزی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کاؤچ پر پڑا ہوا مکی کا جیکٹ دبوچا اور اسے بھی مکی کی لاش کے پاس کاؤچ کے نیچے گھسیڑ دیا۔

پھر میں نے اپنا رومال نکالا اور خون کے اس چھوٹے سے دھبے کو صاف کر دیا جو مکی نے صوفے کے اوپر چھوڑا ہوا تھا۔ میں نے رومال واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں تیزی سے باتھ روم کی جانب لپکا ایک تولیا جھپٹا اور

دروازے کی جانب بڑھ گیا جیسے کہ میں باتھ روم سے نکل کر اپنے ہاتھ پونچھ رہا تھا۔

دروازے پر موجود شخص ایک باوردی پولیس مین تھا۔ دراز قامت اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک۔ اس کی ناک کسی بلب کے مانند تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں تھے۔ اس کے ساتھ ایک پارٹنر بھی تھا۔ جو اس کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ وہ بھی ایک باوردی پولیس مین تھا۔ وہ پارٹنر پستہ قد تھا۔ دیکھنے میں وہ جابر اور بدمزاج لگ رہا تھا۔

دراز قامت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جبکہ اس کا پارٹنر صرف گھورے جا رہا تھا۔

”گڈ ڈے، سر۔ میں آفیسر ملرونی ہوں۔ اور یہ میرا پارٹنر آفیسر ڈاؤنس ہے۔ ہم یہاں سرکاری کام کے سلسلے میں آئے ہیں۔“

”جی؟“

”یس سر۔“ وہ خود کو خوش مزاج ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”ایک کار جس کی ڈیوکس یوزڈ کارس سے چوری کرنے کی رپورٹ درج ہے وہ یہاں عین باہر موٹل کی پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے، سر؟“

”نہیں، یقیناً نہیں۔ بھلا مجھے کیونکر علم ہو سکتا ہے؟“ میں نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

”ویل سر، دالان کے عین مقابل کمرے میں مقیم مسز اوڈویل کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس کار کے ڈرائیور کو اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اور ان کا کہنا ہے کہ وہ شخص کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ مسز اوڈویل ہر چیز پر کڑی نگاہ رکھتی ہیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟ وہ اجنبیوں کے معاملے میں ہمیشہ چوکس رہتی ہیں۔“

گریٹ! عقابی نگاہ والی ایک اور بڑھیا! اور وہ بھی یہاں ریورسٹی میں!

”ویل، میرے خیال سے مسز اوڈویل غلطی پر ہیں۔ میں یہاں تمام دن موجود رہا ہوں اور تنہا! میں اپنے قانونی کاغذات اور دیگر معاملات پر کام کرتا رہا ہوں۔ کیا مسز اوڈویل بہت زیادہ تو بیتی نہیں ہیں۔ دکھائی تو ایسا دے رہا ہے۔ ہے نا؟“

”مجھے علم نہیں ہے، سر۔ سو آج تم سے ملنے کے لیے کوئی نہیں آیا؟“ آفیسر ملرونی نے کہا۔

”نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔ کمرے میں صرف میں، میری بوتل اور کاغذات کا پلندہ ہے۔“

آفیسر ملرونی نے اپنے بریسٹ پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر ایک تصویر باہر نکالی۔ اس نے وہ تصویر میرے چہرے کے سامنے کر دی۔

وہ نکی کی تصویر تھی۔

آفیسر ڈاؤنس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری رکھنے کی کوشش کی۔

”یہ وہ شخص ہے جس کے بارے میں ہم معلومات کر رہے ہیں، سر۔ اس کا نام نکی ہے۔ مائیکل اور ریسٹس سانچیز۔ یہ پولیس اسٹیشن پر خاصا معروف ہے۔ مسز اوڈویل اس بارے میں پُریقین ہیں کہ انہوں نے جس شخص کو کار سے نیچے اترتے، یہاں آتے اور اس کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا، وہ یہی شخص ہے، سر!“ آفیسر ملرونی نے کہا۔

”میں نے بتایا نا کہ مسز اوڈویل غلط ہیں۔“

”ایسا ممکن ہو سکتا ہے، سر۔ لیکن اپنی رپورٹ کی توضیح کرنے کی خاطر اگر تم بُرا نہ مانو تو کیا ہم اندر آ کر ایک نظر جائزہ لے لیں؟“

”کیا تمہارے پاس تلاشی کا وارنٹ ہے، آفیسر؟“ میں نے پوچھا۔

میرے اس سوال پر آفیسر ڈاؤنس کے چہرے کے تاثرات نمایاں طور پر بدل گئے۔ البتہ آفیسر ملرونی صرف شانے اچکا کر رہ گیا۔

”نہیں، سر۔ لیکن میں دوڑ کر عدالت سے تلاشی کا وارنٹ لا سکتا ہوں۔ میرے پاس مسز اوڈویل کی شناخت کا مناسب جواز موجود ہے۔ لیکن میں تمہیں یہ صاف صاف بتا دوں سر کہ اگر مجھے وارنٹ کے حصول کے لیے عدالت جانا پڑا تب بھی میں اپنے پارٹنر کو یہاں پارکنگ لاٹ میں نگرانی کے لیے چھوڑ جاؤں گا تاکہ وہ اس کمرے پر نگاہ رکھے رہے۔ صرف اس صورت میں کہ اگر نکی حقیقت میں یہاں موجود ہوا اور حقیقت میں یہاں سے کھسکنے کی کوشش کرے گا تو پھر......؟ اس لیے ہم سب کے لیے یہ زیادہ سہل ہو گا کہ تم ہم دونوں کو صرف اندر آنے کی اجازت دے دو۔“ اس نے قابل فہم بات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

لیکن اس کے پارٹنر آفیسر ڈاؤنس کے ہونٹوں پر وہی بناوٹی ہنسی رقصاں تھی۔

”ویری ویل، آفیسر ملرونی۔ پلیز، اندر آ جائیں۔“ میں نے دروازے سے ایک جانب ہٹتے ہوئے کہا۔

جب میں کمرے میں پلٹا تو تب میری نگاہ خون کے

اس چھوٹے سے دھبے پر پڑ گئی جو کاؤچ پر موجود تھا۔

لعنت ہو، میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میرا خیال تھا کہ میں سب کچھ صاف کر چکا ہوں۔ میں نے تیزی سے اپنے ہاتھ خشک کرنے کے بعد کیا کرنا ہے۔ تولیا عین اس مقام پر جا گرا جہاں خون کا وہ دھبا پڑا ہوا تھا۔ تولیے نے اس دھبے کو اب مکمل طور پر چھپا لیا تھا۔

وہ دونوں پولیس آفیسر اندر آگئے۔

آفیسر ملرونی کمرے کے وسط میں آکر رک گیا۔ البتہ آفیسر ڈاؤنس دروازے کے اندر ایک جانب اس طرح کھڑا ہو گیا کہ وہ کمرے کے اندر دیکھنے کے ساتھ ساتھ دروازے سے باہر بھی نگاہ رکھ سکے۔

آفیسر ملرونی نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کی۔ اس نے سب طرف دیکھ ڈالا۔ حتیٰ کہ جھک کر بیڈ کے نیچے بھی جھانک لیا۔ میں اس دوران یہی دعا مانگتا رہا کہ کہیں وہ کاؤچ کے نیچے نہ جھانک لے۔

لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

''اگر میں باتھ روم کے اندر کا جائزہ لے لوں تو کوئی حرج تو نہیں ہے، سر؟''

''بڑی خوشی سے آفیسر!''

وہ باتھ روم کے دروازے کی جانب چل پڑا۔ چھوٹے سے اس کمرے میں داخل ہونے سے قبل اس نے اپنے ہولسٹر کا فلیپ کھول کر اپنا سروس ریوالور باہر نکال لیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ آفیسر ڈاؤنس نے بھی بالکل یہی کیا۔

کچھ دیر بعد آفیسر ملرونی واپس کمرے میں آگیا۔ اس نے اچٹتی نگاہ اپنے پارٹنر پر ڈالی اور شانے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''یہاں سب کچھ کلیئر ہے، پارٹنر۔''

ان دونوں نے اپنے ہتھیار واپس رکھ لیے۔

پھر آفیسر ملرونی پلٹ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''زحمت کے لیے معافی چاہتے ہیں، سر۔ لگتا ہے کہ مسز اوڈویل واقعی غلطی پر تھیں۔''

''دیٹ از او کے۔ کوئی آزار نہیں پہنچا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں، سر۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے ہم ایک دو دن تک اس گاڑی پر نگاہ رکھیں گے۔ اگر کوئی اسے لینے کے لیے نہیں آیا تو پھر ہم اسے ٹو کر کے لے جائیں گے۔''

بیپ، بیپ، بیپ......

میں اچھل پڑا۔ آفیسر ڈاؤنس نے بھی یہی کیا۔ البتہ آفیسر ملرونی مجھے گھورنے لگا۔

ایک طویل لمحے تک ہم تینوں میں سے کسی نے کوئی حرکت نہیں کی......

بیپ، بیپ......

آفیسر ملرونی بولا۔ ''یہ سیل فون کی آواز لگتی ہے۔''

''اوں، ہاں، یہ اسی کی آواز ہے۔ اس نے تو مجھے چونکا دیا۔'' میں نے کہا۔ اوہ گاڈ، مجھے سیل فون سے شدید نفرت ہے۔

آفیسر ملرونی نے اپنا سر کاؤچ کی جانب جھکایا اور بولا۔ ''کیا تم اپنا سیل فون ہمیشہ کاؤچ کے نیچے رکھتے ہو؟ کیا ایسا ہی ہے؟''

بیپ، بیپ......

میں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔

آفیسر ملرونی نے معنی خیز نظروں سے اپنے پارٹنر کی طرف دیکھا اور دونوں نے ایک بار پھر اپنے ہتھیار نکال لیے۔

بیپ، بیپ...... اس مرتبہ گھنٹی آدھی بج کر بند ہو گئی۔

آفیسر ملرونی کاؤچ کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ کاؤچ کے نیچے ڈال دیا جیسے کچھ ٹٹول رہا ہو۔

اس نے اپنا ہاتھ کاؤچ کے نیچے سے نکالنے کے بعد میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا، پھر آفیسر ڈاؤنس کو سر کی جنبش سے اشارہ کیا۔

آفیسر ڈاؤنس نے اپنے سروس ریوالور کا رخ میری جانب کر دیا۔

پھر آفیسر ملرونی گھٹنوں کے بل فرش پر الٹا لیٹ گیا اور کاؤچ کے نیچے جھانکنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور آفیسر ڈاؤنس کی طرف دیکھتے ہوئے دانت نکال دیے۔

''گڈ اولڈ مسز اوڈویل!'' اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔

میرا بیمے کی رقم حاصل کرنے اور سیاہ بالوں والی حسیناؤں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کا پلان اب خاک میں مل چکا تھا۔

میرے خیال میں مجھے اب ایک نئے پلان پر کام کرنے کی ضرورت تھی۔

جیل سے فرار ہونے کے پلان پر!

بلاعنوان

بابر نعیم

ایک چالاک چور کی ہوشیاری... اپنی دانست میں اس نے ڈیڑھ ہوشیاری دکھائی تھی... مگر کبھی کبھی ایک معمولی سی غلطی... پھانسی کا پھندا بن جاتی ہے...

ہوس و لالچ میں پڑوسی، پڑوسی کا دشمن بن بیٹھا تھا

میں نے اپنی بڑی سی کار ایک چرچراہٹ کے ساتھ اس چھوٹے سے صاف ستھرے لینڈ اسکیپ مکان کے سامنے لے جا کر روک دی۔ میرا پارٹنر ڈیٹیکٹو ڈینی ڈیشن ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے ایک باوردی پولیس مین کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

"فارنسک اور میڈیکل ایگزامنر کا عملہ راستے میں ہے اور بس پہنچنے والا ہے، کونی۔" ڈینی نے مجھے بتایا۔ "بظاہر مقتولہ ریگینا کرافٹ شاپنگ سے گھر واپس لوٹی تو وہاں ایک چور پہلے سے موجود تھا۔ اس نے ریگینا کی اچانک آمد پر بوکھلا کر اس پر حملہ کر دیا۔ ریگینا کی لاش اور بکھرے ہوئے سودا سلف نے داخلی دروازے کو بلاک کیا ہوا ہے۔ میرے ساتھ مکان کے عقبی حصے میں چلو۔ میں وہاں سے تمہیں مکان کے اندر لے جاؤں گا۔"

میں اپنے پارٹنر ڈیٹیکٹو ڈینی کے پیچھے چل پڑا۔ ہم عقبی راستے سے مکان میں داخل ہو گئے۔ اندر کا منظر بالکل وہی تھا جیسا کہ ڈینی بیان کر چکا تھا۔ مقتولہ درمیانی عمر کی ایک عورت تھی۔ اس کی لاش داخلی دروازے کے عین اندر پڑی ہوئی تھی۔ سودا سلف کے تھیلے اس کے اطراف میں بکھرے ہوئے تھے۔

"کوئی گواہ؟" میں نے پوچھا۔

ڈینی نے شانے اچکا دیے۔ "باہر موجود پٹرول مین کا کہنا ہے کہ مکان کے دونوں اطراف کے لوگوں اور سڑک پار لیڈی ان تمام نے چیخوں کی آواز سنی تھی۔ وہ تفتیش کے سلسلے میں اپنے گھروں میں موجود ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔"

میں نے اپنی بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ "تو پھر بہتر ہو گا کہ ہم ان سے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیں۔"

سب سے پہلے ریگینا کے پڑوسی وین ملر اور اس کی بیوی ماریسا کا نمبر تھا۔ ان کی عمریں ساٹھ برس سے زیادہ کی تھیں اور وہ دونوں ریگینا کے برابر کے مکان میں رہتے تھے۔

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگوں نے چیخیں سنی تھیں؟" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"یقیناً سنی تھیں۔" وین ملر نے جواب دیا۔ "اس وقت اندھیرا پھیلنا شروع ہوا تھا اور میں اپنی آرام کرسی پر نیند کا جھونکا لے رہا تھا۔ ماریسا مکان کے عقب میں کوڑا کرکٹ سمیٹنے گئی ہوئی تھی۔"

"مجھے دو چیخیں سنائی دی تھیں۔" اس کی بیوی ماریسا نے بتایا۔ "مجھے چیخیں سن کر ایسا لگا جیسے کہ ہارٹ اٹیک ہونے والا ہو۔ میں دوڑ کر مکان کے اندر آ گئی تو دیکھا کہ وین اپنا کوٹ پہن رہا تھا۔"

"مجھے کامل یقین تھا کہ چیخوں کی آواز ریگینا کے گھر سے آئی ہے۔ میں نے سوچا بہتر ہو گا چل کر چیک کرتے ہیں۔" وین ملر نے کہا۔

"اور؟" میں نے پوچھا۔

"اور میں وہاں چلا گیا۔ ریگینا کے گھر کے مقابل رہنے والا نوجوان جارج فیرلی وہاں باہر موجود تھا۔ اس نے چیخ کر کہا کہ اس نے کسی کو یہاں سے دوڑتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ بھی اسی طرف دوڑ پڑا۔ میں نے ریگینا کے دروازے کی گھنٹی بجائی اور اسے پکارا لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔" وین ملر یہ کہہ کر رک گیا۔

"پھر کیا ہوا؟" میرے پارٹنر ڈینی نے پوچھا۔

"میں نے داخلی دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ وہ بس اتنا ہی کھل رہا تھا کہ صرف سر اندر جا سکے۔ ریگینا کی لاش اندر کی جانب سے دروازے کو اس طرح دبائے ہوئے تھی کہ

دروازہ بلاک ہو کر رہ گیا تھا اور کھل نہیں سکتا تھا۔"
جب ہم ان دونوں میاں بیوی سے سوالات پوچھنے کے بعد پلٹے تو ایک بھاری بھر کم عورت تیزی سے ہماری طرف آئی اور بولی۔ "کیا تم پولیس کے لوگ ہو؟"
میں مسکرا دیا۔ "ہاں۔ میں ڈیٹکٹیو کونی ہوں اور یہ میرا پارٹنر ڈیٹکٹیو ڈینی ڈیٹن ہے۔ اور تم......؟"
"میرا نام سینڈرا بشپ ہے۔ میں سڑک پار رہتی ہوں۔" اس عورت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔
"ہمیں کچھ بتانا چاہتی ہو؟" میں نے اسے شہ دیتے ہوئے کہا۔
"ہاں...... بہ شرطیکہ وین طر اور مارسیا نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا ہو۔"
"کیا؟"
"یہی کہ یقیناً معاملہ ریگینا کی دولت اور جیولری کا لگتا ہے۔" سینڈرا بشپ نے جواب دیا۔
ڈینی اور میری نظریں بے ساختہ ایک دوسرے کی جانب اٹھ گئیں۔ "نہیں، انہوں نے تو اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔
"ہوں۔ اوکے، ریگینا کو حال ہی میں ورثے میں نہایت قیمتی سکے اور جیولری ملی تھی۔"
"اس بات سے کون کون واقف تھا؟" ڈینی نے پوچھا۔
"وین طر کی فیملی، جارج فیئرلی اور میرے خیال سے بیشتر پڑوسی۔" سینڈرا بشپ نے بتایا۔
"کیا تم ہمیں اور کچھ بتا سکتی ہو؟" میں نے پوچھا۔
سینڈرا بشپ نے اپنے ہاتھ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ڈالتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "صرف یہ کہ میں نے چند ہولناک چیخیں سنی تھیں جو ریگینا کے گھر کی جانب سے آئی تھیں۔ شاید ریگینا کا دوسرا پڑوسی جارج فیئرلی اس بارے میں کچھ جانتا ہو۔"
جارج فیئرلی کو جب میں نے وین طر کے اس بیان کے بارے میں بتایا کہ کس طرح چیخوں کی آواز سن کر وہ حقیقت جاننے کے لیے گھر سے باہر نکلا تھا اور اس کا سامنا جارج فیئرلی سے ہوا تھا جس نے کسی کو مخالف سمت بھاگتے ہوئے دیکھا تھا تو جارج فیئرلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ساتھ ہی اس نے ہمیں اندر بلا لیا۔
"وین طر، ریگینا کو چیک کرنے چلا گیا تھا اور میں اس چور کو پکڑنے کی کوشش میں اس کے پیچھے لپک گیا تھا۔"

''چور کو پکڑنے کی کوشش میں؟'' ڈینی نے قدرے حیرانی سے کہا۔ ''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''ریگینا کی چیخیں سن کر میں بروقت باہر نکل آیا تھا تو میں نے کسی کو اس کے داخلی دروازے سے نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا۔'' جارج فیئرلی نے کہا۔

''وہ کوئی مرد تھا یا عورت تھی؟''

''میں یہ بتا نہیں سکتا۔ اس لیے کہ سورج ڈھل چکا تھا۔ بہرحال وہ جو کوئی بھی تھا۔ حقیقت میں بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔''

''کس سمت بھاگا تھا؟''

''مکر کے مکان کے عقبی حصے کی جانب۔ اس طرف کوئی نہیں رہتا۔ وہ بھاگنے کے لحاظ سے بہترین راستہ ہے۔''

میں اپنے پارٹنر ڈینی کو ایک طرف لے گیا۔ ''چلو دیکھتے ہیں کہ فارنسک اور میڈیکل کے لوگوں نے کیا تلاش کیا ہے۔''

''چور نے ابتری مچا دی تھی۔'' ایک فارنسک ڈیٹیکٹو نے ہمیں بتایا۔ ''تمام درازیں بکھری ہوئی ہیں۔ لیونگ روم کی میزیں الٹی پڑی اور ان کا سامان الٹ پلٹ ہے۔''

''اور اس کے علاوہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، عقبی بیڈروم کی کھڑکی پوری طرح کھلی ہوئی ہے۔''

''پرانے سکے اور جیولری؟'' ڈینی نے سوال کیا۔

''ان میں سے کوئی چیز ہمیں نہیں ملی۔ البتہ باہر ایک بریسلیٹ پڑا ہوا ملا ہے جو دیکھنے میں خاصا قیمتی لگ رہا ہے۔''

''مکان کے سامنے کے حصے سے ملا ہے؟''

''نہیں، مکان کے عقب سے۔ بیڈروم کی کھلی ہوئی کھڑکی کے عین نیچے زمین پر سے۔''

''تھینکس۔'' میں نے کہا۔

پھر ڈینی اور میں میڈیکل ایگزامنر کی تلاش میں نکل گئے۔

میڈیکل ایگزامنر نے ہمیں بتایا کہ اسے شیشے کا بنا ہوا وزنی بک اینڈ ملا ہے جو کتابوں کی قطار کو سیدھا رکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ آلۂ قتل ہو سکتا ہے جو اس نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ لیکن اس پر کسی کی انگلیوں کے نشانات موجود نہیں ہیں۔

''موت کا سبب سر پر پڑنے والی کاری ضرب ہے۔'' میڈیکل ایگزامنر نے کہا۔ ''موت فوری طور پر واقع ہو گئی تھی۔''

''تو وہ بس فرش پر گری اور مرگئی۔'' ڈینی غائب دماغی سے بولا۔ ''میں تو مزید کچھ اور کی توقع کر رہا تھا۔''

پھر ڈینی نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''قاتل تو غالباً اب تک بہت دور نکل گیا ہوگا، کوئی۔''

''اس کے برعکس میرے خیال میں وہ قاتل چور بالکل ہماری دسترس میں ہے۔ آؤ، تلاشی کا وارنٹ حاصل کرتے ہیں۔''

''تلاشی کا وارنٹ؟'' ڈینی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اس مجرم کے ہاتھ سے جیولری کا ایک پیس بھاگنے کے دوران نیچے گر گیا ہوگا لیکن اس کی بقیہ کمائی غالباً اس کی رہائش گاہ میں موجود ہوگی۔'' میں نے جواب دیا۔

''کس کی رہائش گاہ میں؟ وہ مجرم کون ہے؟'' ڈینی جیسے پھٹ پڑا۔

''جارج فیئرلی۔''

''وہ کیسے؟''

''اس نے بتایا ہے کہ اس نے کسی کو ریگینا کے داخلی دروازے سے نکل کر باہر کی جانب بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ اس کے پیچھے لپکا تھا۔ لیکن یہ بات سچ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ ریگینا کی لاش نے دروازے کو اس حد تک کھلنے سے روکا ہوا تھا کہ کوئی اس راستے سے نکل کر بھاگ نہ پاتا.... اس دروازے میں صرف سر ڈالنے کی حد تک گنجائش تھی۔ کوئی اپنے پورے وجود کے ساتھ اس دروازے سے دوڑتا ہوا نہیں نکل سکتا تھا۔''

''ہاں، یہ بات تو درست ہے۔'' ڈینی نے اتفاق کیا۔

میں مسکرا دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور چونکہ ریگینا کی موت فوری طور پر واقع ہو گئی تھی تو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ قاتل کے بھاگ نکلنے کے بعد وہ گھسٹتی ہوئی دروازے تک پہنچی ہوگی۔ اس کے بجائے مجھے یقین ہے کہ جارج فیئرلی بیڈروم کی کھڑکی سے فرار ہوا ہوگا اور اس عجلت میں بریسلیٹ اس کے ہاتھوں سے بیڈروم کی کھڑکی کے باہر گر گیا ہوگا جو فارنسک کے سراغ رساں کو وہاں زمین پر پڑا ہوا ملا ہے۔''

''اور چوری کا باقی تمام سامان غالباً اس کے مکان میں چھپا ہوا ہوگا۔'' ڈینی نے بے ساختہ کہا۔

بعد میں تحریری اجازت نامے کی رو سے تلاشی لینے پر مسروقہ سامان جارج فیئرلی کے گھر سے برآمد ہو گیا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔

تفتیش پر جارج فیئرلی کی مدافعت جواب دے گئی اور اس نے اقرارِ جرم کر لیا۔

میراث

منظر امام

کسی بھی انسان کے لیے سب سے قیمتی شے کیا ہے... مختلف لوگ اس کا مختلف جواب دیں گے... منظر امام کے تخلیق کردہ کردار بھی ایسے ہی انوکھی نوعیت کے ہوتے ہیں... جن کے ظاہر شعلے جیسی صفت رکھتے ہیں تو باطن شبنم کی طرح نرم و نازک... ہمارے قرب و جوار میں سانس لیتی کہانی کے خوب صورت موڑ...

ایک بددماغ شخص کا قصہ جو اپنے پیچھے ایک میراث چھوڑ گیا......

بہت مزے کے لوگ تھے۔

اور بہت مزے کی شرارتیں۔ شرارتیں تو آج بھی ہوتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ آج کی شرارتوں میں بدتمیزی اور گستاخی زیادہ ہوا کرتی ہے جبکہ اس زمانے کی شرارتوں میں ذہانت بھی شامل ہوتی تھی۔

یا تو آبادی زیادہ نہیں تھی یا پھر لوگ پرسکون ہوتے تھے۔ بہرحال وہ افراتفری نہیں تھی جو آج ہماری زندگی کا

حصہ بن گئی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس زمانے میں ہر طرف ایک خواب ناک اور مسرور کن سا اطمینان ہوتا تھا۔

ایسا اطمینان شاید اس وقت ہوتا ہے جب پیسوں کی بھاگ دوڑ نہ لگی ہو۔ ایسا نہیں تھا کہ اس وقت لوگ امیر نہیں ہوا کرتے تھے یا غربت کا وجود نہیں تھا۔

یہ سب تھا لیکن ہر کوئی اپنے اپنے حلقے میں اطمینان کی زندگی گزار رہا تھا۔ کسی کو کسی سے کوئی جلن یا حسد وغیرہ نہیں تھی۔ کاش آج کے عہد کے بچے اگر اس دور کی ایک جھلک دیکھ پاتے...

بہرحال تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس زمانے میں بھی شرارتیں ہوا کرتی تھیں لیکن بہت ذہین شرارتیں۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ ہمارے محلے کے بازار میں ایک حکیم صاحب نے آ کر مطب شروع کر دیا۔ وہ خود کو حکیم الامت کہلایا کرتے اور ان کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے بنارس کے مستند حکیموں سے حکمت سیکھی ہے۔

ایک بار میں یوں ہی ان کے پاس چلا گیا تو وہ بہت دلچسپ آدمی ثابت ہوئے۔ میں کئی دفعہ اپنی کہانیوں میں یہ بتا چکا ہوں کہ ہم اس زمانے میں دل چسپ کرداروں کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ یہ کردار ہمارے لیے تفریح کا بہت بڑا ذریعہ بن جاتے تھے۔ تو وہ حکیم صاحب بھی ایک ایسا ہی کردار ثابت ہوئے۔

میں جب ان کے سامنے پہنچا تو انہوں نے پہلا سوال یہ کیا ''میاں تمہارا تعلق... سے تو نہیں ہے۔'' ان کے اس سوال نے مجھے حیران کر دیا۔

''فرض کریں جناب۔ اگر میرا تعلق وہیں سے ہو تو پھر...''

''تو پھر میں علاج نہیں کروں گا۔'' انہوں نے بہت اطمینان سے فرمایا۔

''وہ مارا۔'' میں دل ہی دل میں اچھل پڑا۔ ایک اور دلچسپ کردار سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ ''یہ کیا بات ہوئی جناب۔'' میں نے کہا۔ ''مریض تو مریض ہوتا ہے۔ چاہے اس کا تعلق کہیں سے بھی ہو۔''

''برخوردار اتنا فلسفہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ بس میں بعض لوگوں کا علاج نہیں کرتا۔''

اب حکیم صاحب سے لطف لینے اور ان کا اعتبار حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دوں۔ میں نے بھی فوراً پینترا بدلا۔ ''جناب۔ آپ بالکل ٹھیک کرتے ہیں۔ مجھے بھی ایسے لوگ پسند نہیں ہیں۔ میں بہت دور رہتا ہوں ان سے۔''

''واہ میاں، تم تو میرے ہمنوا نکلے۔'' حکیم صاحب نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''تم جیسے نوجوانوں سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کس سلسلے میں میرے پاس آئے ہو لیکن ایک بات میں ابھی سے کہے دیتا ہوں۔''

''جی فرمائیں۔''

''میاں، تم جو بھی علاج کرواؤ گے، میں تم سے پیسے نہیں لوں گا۔''

''وہ کیوں؟''

''ارے بھئی، تم میرے ہم خیال جو ہو۔'' حکیم صاحب نے کہا۔ ''ایسے ہم خیال لوگ ملتے کہاں ہیں؟''

اس کے بعد تو ایک نئی تفریح ہاتھ آ گئی تھی۔ مجھے جب بھی فرصت ملتی میں حکیم صاحب کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔ عام طور پر وہ بے چارے فارغ ہی ہوتے تھے۔

میں جاتے ہی اس مخصوص علاقے کے لوگوں کی برائی شروع کر دیتا۔ کبھی کبھی کوئی من گھڑت واقعہ بھی سنا دیتا کہ دیکھیں جناب۔ اس آدمی نے میرے ساتھ کیا بدتمیزی کی ہے اور کیوں نہ ہو۔ اس کا تعلق تو وہاں سے ہے نا اور اتنا سنتے ہی حکیم صاحب شروع ہو جاتے۔ میرے لیے چائے منگوائی جاتی۔ میں نے اس زمانے میں تمباکو نوشی شروع کی تھی۔ حکیم صاحب سگریٹ تک منگوا دیتے۔

ایک دن میں نے ان سے دریافت کیا۔ ''قبلہ، آج مجھے یہ بتا دیں کہ آخر اس علاقے کے لوگوں سے آپ کو شکایت کیا ہے؟''

اس پر انہوں نے ایک دردناک کہانی سنا دی اور کہانی صرف اتنی تھی کہ انہوں نے ایک لڑکی سے محبت کی تھی اور اتفاق سے اس لڑکی کی شادی کہیں اور ہو گئی اور حکیم صاحب یہ سمجھنے لگے کہ اس نے انہیں دھوکا دیا ہے۔

بس اس بات پر انہیں لڑکی کے ساتھ اس کے شہر حتیٰ کہ علاقے تک سے چڑ ہوتی چلی گئی۔

ایک دن حکیم صاحب نے مجھ سے کہا۔ ''میاں کل اگر تمہارے پاس فرصت ہو تو میرے ساتھ ایمپریس مارکیٹ تک چلنا۔ کچھ دوائیں خریدنی ہیں۔ اکیلے جانے سے وحشت ہوتی ہے۔''

میں اس زمانے میں فارغ ہی ہوا کرتا تھا اس لیے حکیم صاحب سے وعدہ کر لیا۔ دوسرے دن میں حکیم صاحب کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ہمارے لیے آمدورفت کا بڑا ذریعہ

بسیں ہوا کرتی تھیں۔ بس میں بیٹھے اور ایمپریس مارکیٹ آ گئے۔

مجھے چائے کی خواہش ہوئی تو میں نے حکیم صاحب سے کہا۔ ”قبلہ کیوں نا چائے پی لی جائے۔“

”ضرور۔“ حکیم صاحب جلدی سے بولے۔ ”لیکن پہلے یہ معلوم کرلو کہ اس ہوٹل میں اس علاقے کا کوئی شخص تو کام نہیں کرتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں ان کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

”ہاں بھئی۔ یہ میرا اصول ہے۔ میں صرف اسی ہوٹل میں کھاتا پیتا ہوں۔ جہاں اس جگہ کا کوئی شخص نہ ہو۔ چاہے وہ ہوٹل کا مالک ہو یا ملازم۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ بس اس علاقے سے تعلق نہیں ہونا چاہیے۔“

اتفاق دیکھیں کہ اس ہوٹل میں اسی علاقے کے لوگ تھے اور صرف وہی نہیں بلکہ چائے پینے یا کچھ کھانے کے لیے جس ہوٹل بھی گئے، وہاں کوئی نہ کوئی اس علاقے کا آدمی ضرور ملتا رہا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ حکیم صاحب نے کچھ بھی کھانے پینے نہیں دیا اور تقریباً چار پانچ گھنٹوں تک دواؤں کی خریداری کرتے رہے۔ اس سلسلے میں بھی ان کی احتیاط کا وہی عالم تھا۔

میں ان کے پاگل پن کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اب ایسا بھی کیا کہ کسی ایک جگہ کی کسی لڑکی نے بے وفائی کی ہو تو اس علاقے کے ہر آدمی سے نفرت ہو جائے۔ ایسا جنون میں نے صرف ان ہی میں دیکھا تھا۔ کمال کے آدمی تھے حکیم صاحب۔

جب ان سے خاصی بے تکلفی ہوگئی تو میں نے ان سے کہا۔ ”قبلہ، آپ کہاں تک اس علاقے کے لوگوں سے پرہیز کرتے پھریں گے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ آپ جو کچھ کھاتے ہیں۔ یعنی سبزیاں دالیں اور اناج وغیرہ۔ یہ سب اسی علاقے سے آتا ہے۔ آپ کو ایسا ہی جنون ہے تو آپ فاقے کرنا شروع کر دیں۔“

”میاں۔ یہی تو وہ بات ہے جو تم نہیں جانتے۔“ حکیم صاحب مسکرا کر بولے۔ ”تمہیں اگر اس سلسلے میں میرا تقویٰ دیکھنا ہے تو میرے ساتھ چلنا اتوار کے دن۔“

”کہاں؟“

”تم چلو تو سہی۔ میں تمہیں کچھ خاص دکھانا چاہتا ہوں۔“

میں بھی اس کہانی کو انجام تک پہنچانے پر تُل گیا تھا۔ اسی لیے اتوار کی صبح حکیم صاحب کے ساتھ چل پڑا۔ ہم لی مارکیٹ آ گئے۔

اس زمانے میں لی مارکیٹ سے اندرونِ شہر کی بسیں چلا کرتی تھیں۔ اب تو ایسی بسیں پورے شہر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ حکیم صاحب ایک بس میں سوار ہو گئے۔ یہ بس اندرونِ سندھ جا رہی تھی۔ میں بھی خاموشی سے ان کے ساتھ چل رہا تھا۔

مختصر یہ کہ دادو پہنچ کر ہم بس سے اُتر گئے۔ یہاں آڑھتی موجود تھے۔ اناج کا لین دین کرنے والے۔ ان ہی میں سے ایک حکیم صاحب کا خاص آدمی تھا۔ پربھو رام نام تھا اس کا۔

اس نے بڑے تپاک سے حکیم صاحب کا استقبال کیا۔ حکیم صاحب اس کے اور اس کے گھر کی کسی عورت کے لیے کچھ دوائیں بھی لے کر آئے تھے۔

اور اس دن پتا چلا کہ حکیم صاحب اپنا اناج اور سبزیاں وغیرہ سندھ کے اسی آڑھتی سے لیا کرتے تھے۔ باقاعدہ پندرہ دنوں کے بعد یا تو خود حکیم صاحب اس طرف آ جاتے یا وہ آڑھتی کھانے پینے کی چیزیں حکیم صاحب کو پہنچا دیا کرتا اور اس میں بھی یہ احتیاط رکھی گئی تھی کہ حکیم صاحب جو کچھ کھا رہے ہیں، اس میں اس علاقے کے لوگوں کی شمولیت نہ ہو۔

اس پاگل پن کا کوئی علاج نہیں تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا جنونی آدمی نہیں دیکھا تھا۔

ہم دوست اکثر اس موضوع پر بات کیا کرتے۔ ہمیں حکیم صاحب کے اس انتہائی پاگل پن پر حیرت ہوتی تھی۔ کمال کے آدمی تھے موصوف۔

ایک بار میں نے حکیم صاحب سے کہا۔ ”جناب۔ بات چاہے کچھ ہی ہو، اس علاقے کے لوگوں نے اردو زبان کی بہت خدمت کی ہے۔“

”ارے رہنے دیں۔“ حکیم صاحب نے بُرا سا منہ بنا لیا۔ ”میں تو اسی لیے وہ شاعری نہیں پڑھتا جو اس علاقے کے کسی فرد نے کی ہو۔“

”حکیم صاحب، یہ تو زیادتی ہے آپ کی۔“

”نہیں میاں، بس اپنے اپنے اصول کی بات ہے۔“

ایک بار میرے کچھ دوستوں نے شرارت کے طور پر ایک عورت کو پکڑ لیا۔ وہ بہت تیز عورت تھی۔ اس کی ساکھ بہت خراب تھی۔ وہ کچھ پیسوں کے عوض کچھ بھی کر گزرنے کو

تیار ہو جاتی تھی۔ ہم لوگوں نے اسے حکیم صاحب سے بھڑا دینے کا پروگرام بنایا اور لطف کی بات یہ تھی کہ اس کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ جو حکیم صاحب کی چڑ تھا۔ اس عورت سے گفتگو کی ذمے داری میری تھی۔ میں نے جب اسے حکیم صاحب کے اس پاگل پن کے بارے میں بتایا تو وہ اچھل پڑی۔ ''ارے اس کی تو ایسی کی تیسی۔ میں دو منٹ میں اسے سیدھا کر دوں گی۔''

''لیکن بہت ہوشیاری کے ساتھ۔'' میں نے کہا۔

''تم اس کی فکر ہی نہ کرو۔ میں اسے اپنے جال میں ایسے پھانسوں گی کہ وہ ساری اکڑ بھول جائے گا۔''

''اب یہ بتاؤ کہ اس کام کا معاوضہ کتنا ہوگا؟''

''ارے لعنت بھیجو معاوضے پر۔ میں تو ثواب سمجھ کر یہ کام کروں گی۔''

''اب میرا کام یہ تھا کہ میں اس سلسلے میں ماحول تیار کروں اور ماحول کی تیاری کے لیے میں نے ایک دن حکیم صاحب سے کہا۔ ''قبلہ، مجھے آپ کی ایک بات پسند نہیں آئی۔''

''ہاں ہاں کہو۔''

''آپ محبوبہ کے جانے کے بعد اس نعمت سے محروم رہ گئے ہیں حالانکہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔''

''میاں، تمہارے کہنے کا مطلب کیا ہے؟''

''میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ابھی آپ کی عمر بھی ایسی نہیں ہے۔ آپ کم از کم ایک شادی تو ضرور کر سکتے ہیں۔''

حکیم صاحب دل ہی دل میں یقیناً خوش ہو گئے ہوں گے کیونکہ میں نے تحریک ہی ایسی دی تھی۔ وہ اس وقت تو کچھ نہیں بولے لیکن دو چار دنوں کے بعد انہوں نے خود ہی یہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔ ''میاں، تم اس دن جو کہہ رہے تھے۔ میں نے اس پر غور کیا ہے۔''

''غور کیا کرنا ہے جناب۔ بس کسی کو دیکھنا شروع کر دیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور یہ کام آپ کے بس کا نہیں ہے تو مجھے حکم دیں۔ میں کہیں نہ کہیں سے کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈ ہی لاؤں گا۔''

''بھئی۔ تم خود ہی کوئی مناسب رشتہ دیکھ لینا۔'' حکیم صاحب نے اشارہ دے دیا۔ ''بس عمر زیادہ نہ ہو۔''

واہ حکیم صاحب۔ میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ اب آئے ہو جال میں۔

گرین سگنل مل گیا تھا۔ ہم دوست پھر اسی عورت کے پاس پہنچ گئے۔ ''بس اب تم مریضہ بن کر حکیم صاحب کے پاس جانا شروع کر دو۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارا لب و لہجہ بالکل صاف ہے۔ تم آسانی سے انہیں چکر دے سکتی ہو۔''

''کیا وہ یہ پوچھیں گے؟''

''ان کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے۔'' میں نے بتا دیا۔ ''اگر تم نے یہ بتا دیا کہ تمہارا تعلق فلاں جگہ سے ہے تو وہ تمہارا علاج نہیں کریں گے۔ بھگا دیں گے تمہیں۔''

''عجیب خبطی آدمی ہے۔''

بہرحال وہ عورت (شاہینہ) منصوبے کے مطابق حکیم صاحب کے پاس پہنچ گئی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے پہلی ہی ملاقات میں بے چارے حکیم صاحب کو چت کر دیا تھا۔

اس کا اندازہ حکیم صاحب سے ملاقات کے بعد ہوا۔

''بھئی، آج ایک بہت عجیب مریضہ میرے پاس آئی تھیں۔'' انہوں نے بتایا۔

''کیوں قبلہ، اس میں ایسی کون سی بات تھی جو آپ کو عجیب محسوس ہوئی؟''

''بھئی۔ وہ تو۔ اب کیا بتاؤں۔ اس نے تو پہلی ملاقات میں مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس میں دلچسپی لینے لگوں۔''

''یہ کیسے ہوا حکیم صاحب؟''

''وہ انتہائی مہذب خاتون ہیں۔'' حکیم صاحب نے بتایا۔ ''شادی کو صرف دو برس ہوئے تھے کہ شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بے چاری ایک صاف ستھری زندگی گزار رہی ہیں۔''

میں مسکرا کر رہ گیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مہذب خاتون کیسی صاف ستھری زندگی گزار رہی ہے۔ شاہینہ ہفتے میں ایک بار حکیم صاحب کے پاس علاج کے بہانے آ جایا کرتی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے حکیم صاحب کو پوری طرح اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔

شاہینہ سے جب ملاقات ہوئی تو اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو میں نے ابتدا کی ہے۔ تم لوگ دیکھتے رہنا۔ میں اس بوڑھے کو کس طرح اپنا دیوانہ بناتی ہوں۔''

''دیوانے تو وہ بن گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''بس ان پر ہاتھ ذرا ہلکا رکھنا۔''

اور کچھ دن گزر گئے۔ حکیم صاحب سے جب ملاقات ہوئی تو وہ اسی کی باتیں کرتے۔ شاہینہ کا جادو ان کے سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔

ایک بار انہوں نے کہا۔ ”میاں، تمہیں یاد ہے تم ایک بار کیا مشورہ دیا تھا؟“

”بہت اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے کہا تھا کسی کو اپنا ہم سفر بنالیں۔ زندگی سکون سے گزر جائے گی۔“

”تو بس میاں، میں ان ہی خاتون کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”اور خود ان خاتون کا کیا خیال ہے؟“

”بھئی انسان کا رویہ اس کے دل کا حال بتا دیتا ہے۔ ان کا رویہ یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے بھی مجھے قبول کر لیا ہے۔“

ہم لوگوں کا پلان یہ تھا کہ کچھ دنوں کے بعد جب حکیم صاحب پوری طرح اس کی محبت میں گرفتار ہو جائیں گے تو پھر ان پر یہ انکشاف کر دیا جائے گا کہ محترمہ شاہینہ اسی جگہ سے تعلق رکھتی ہے... جہاں کے لوگوں سے آپ نفرت کرتے ہیں۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آسکی۔

حکیم صاحب پر دل کا دورہ پڑا اور راتوں رات انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اس زمانے میں آج کی طرح نہ اتنے اسپتال تھے اور نہ جدید سہولیات تھیں۔ حکیم صاحب کو جناح میں داخل کر دیا گیا تھا۔

اب یہاں سے اس کہانی کا ایک نیا رخ سامنے آتا ہے۔

شاہینہ کو جب حکیم صاحب کے بارے میں بتایا گیا تو وہ بے چین ہو گئی اور ہمارے ساتھ اسپتال پہنچ گئی۔ ہم اس عورت کو بہت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جو معاشرے میں بہت بری کہلاتی تھی اور وہی بری عورت حکیم صاحب کی خدمت میں لگی ہوئی تھی۔

اس نے گویا حکیم صاحب کے سارے معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے۔ وقت پر دوا... کھانے پینے کا خیال، اگر کوئی قیمتی دوا بازار سے لانی ہوتی تو وہ خود جا کر لے آتی۔

حکیم صاحب اس کے انتہائی ممنون تھے۔ خود میرے سامنے کئی بار حکیم صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا لیکن اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ ”ارے حکیم جی، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔“

ہمیں امید تھی کہ شاہینہ کی توجہ اور محبت سے حکیم صاحب کی صحت بحال ہو جائے گی۔ اصل چیز ہوتی ہے، سکونِ قلب اور وہ انہیں مل رہا تھا۔

لیکن ایک رات اچانک ان کی حالت بگڑ گئی۔ یہ اتفاق تھا کہ اس رات میں بھی اسپتال میں موجود تھا۔ اس لیے مجھے فوراً پتا چل گیا۔ شاہینہ اس وقت بھی ان کے ہمراہ تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں حکیم صاحب کے بستر کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اس وقت حکیم صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میاں، اب میرے رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ میں اب زندہ نہیں رہوں گا۔“

”ارے نہیں حکیم صاحب، ایسا نہیں کہتے۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”جانے دو میاں۔“ حکیم صاحب زیرِلب مسکرائے۔ جیسے چراغ بجھتے بجھتے بھڑک نے لگتا ہے۔ ”بس دل کا ایک بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد سکون مل جائے گا۔“

”جی فرمائیں حکیم صاحب، میں سن رہا ہوں۔“

”میاں، اب احساس ہوا ہے کہ محبت شاید سب سے طاقت ور جذبہ ہے۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ ”میں جس جگہ کے لوگوں سے نفرت کرتا تھا، وہاں کی ایک عورت نے میرا ساتھ دیا ہے۔ میں شاید اس کا یہ احسان قیامت میں بھی ادا نہ کرسکوں۔“

”حکیم صاحب کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں میاں، اس لیے تو دل پر بوجھ ہے۔ اس نے تو دو چار ملاقاتوں ہی میں بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے اور اسے میرے پاس کیوں بھیجا گیا ہے۔ تم لوگوں نے تو شاید شرارت کی تھی لیکن اس شرارت نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ خدا معاف کرے۔ میں نے لوگوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں۔“

اور حکیم صاحب مر گئے۔

ایک حیرت انگیز کردار کی ایک حیرت انگیز کہانی ختم ہو گئی۔ لیکن ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ کیا آپ کے ارد گرد حکیم صاحب جیسے اور شاہینہ جیسے لوگ موجود نہیں ہیں۔ خدارا انہیں احساس دلائیں کہ محبت کسی ایک جگہ... علاقے... طبقے یا زبان کی میراث نہیں ہے بقول شاعر محبت ایسا دریا ہے کہ بارش روٹھ بھی جائے تو پانی کم نہیں ہوتا۔

فتنۂ دلگیر

سلیم فاروقی

روح کے اندر کے خزانے آدمی کے چہرے پر حُسن بن کر جھلکتے ہیں... دلوں میں اس کے لیے محبت اور عقیدت پیدا کر دیتے ہیں... ہر فرد کی روح اس کے چہرے... اس کی آنکھوں اور اس کے جسم کی ہر جنبش سے جھانکتی ہے... نیک اور پاکیزہ روح کا دار و مدار افعال و اعمال پر ہوتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کی زندگی کی پرت در پرت... جو اپنے عزائم کو مکمل کرنا چاہتا تھا... چاہے اس کے لیے اپنے چہرے... اپنے جسم اور اپنی روح کو کتنا ہی گھائل کیوں نہ کرنا پڑے... وہ صرف خود ہی گھائل نہیں ہو رہا تھا... اپنے سے جڑے رشتوں کو بھی غیر معتبر بنا رہا تھا... وقت کی گردشوں اور واقعات کی کروٹوں کے ہمراہ آگے بڑھتا مال و زر کا ناقابلِ یقین سلسلہ...

خواہشات کے ترازو میں محبت اور دیانت کا کڑا امتحان......

فہد گھر میں داخل ہوا تو مشتاق احمد سامنے ہی تخت پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جمیلہ بیگم ان کے نزدیک ہی بیٹھی تھیں۔ اس نے مشتاق احمد کو سلام کیا۔ ”السلام علیکم ماموں جان، السلام علیکم امی!“

”وعلیکم السلام، بیٹا جیتے رہو۔“ مشتاق احمد نے جواب دیا۔ ”ماشاء اللہ بہت بڑی عمر ہے تمہاری۔ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔“

”وہ کیسی خوش خبری ماموں جان؟“

”بیٹا! تمہاری ملازمت کے لیے میں نے اپنی کمپنی میں بات کی ہے، امید ہے کہ عثمانی صاحب میری بات ٹالیں گے نہیں۔“

”واقعی ماموں جان۔“ فہد نے بے دلی سے کہا۔ اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھی۔

”ہاں بیٹا۔“ مشتاق صاحب پُرجوش لہجے میں بولے۔ ”عثمانی صاحب بہت خیال کرتے ہیں میرا۔ تم کل میرے دفتر آ جاؤ۔ میں تمہیں عثمانی صاحب سے ملوا دوں گا۔“

”جی ماموں جان۔“ یہ کہہ کر فہد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

مشتاق احمد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھے عہدے پر ملازم تھے اور اپنی بیٹی نادیہ کے ساتھ اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ دس سال پہلے مشتاق احمد کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی صرف ایک بیٹی نادیہ تھی جو اس وقت سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔

فہد کے والد اسد علی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ بہن کی بیوگی اور کچھ نادیہ کی وجہ سے وہ جمیلہ بیگم کے ساتھ ہی رہنے لگے تھے۔ وہ مکان کے کرائے کے بہانے بہن کی مدد کرتے رہتے تھے۔

فہد انتہائی ذہین اور محنتی تھا۔ اس نے دو مہینے قبل ہی ایم بی اے میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ وہ اب اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانا چاہتا تھا۔ تعلیم کا تو صرف بہانہ تھا، وہ امریکا جا کر وہیں سیٹل ہونا چاہتا تھا۔ بچپن ہی سے اسے دولت مند بننے کا جنون تھا۔ وہ کسی بھی طرح راتوں رات دولت مند بننا

چاہتا تھا۔

اسے اپنی ماموں زاد نادیہ سے بھی بے انتہا محبت تھی۔ نادیہ بھی اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ ان کی محبت دیکھ کر مشتاق احمد اور جمیلہ بیگم نے تین سال پہلے ان کی منگنی کر دی تھی۔ فہد اور نادیہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔

وہ نہا دھو کر باتھ روم سے نکلا تو نادیہ اس کے کمرے میں موجود تھی۔

وہ اسے دیکھ کر بولی۔ ''تمہیں ابو کی بات اچھی نہیں لگی نا؟''

''کون سی بات؟'' وہ بال سنوارتے ہوئے بولا۔

''وہی جاب والی؟'' نادیہ نے اسے غور سے دیکھا۔

''وہ... نہیں تو... مجھے تو بری نہیں لگی میں تو...''

''مجھ سے جھوٹ مت بولو مسٹر پرفیکٹ۔'' نادیہ نے کہا۔ ''میں تمہارے مزاج کے ہر رنگ، ہر روپ سے واقف ہوں۔''

''ہاں۔'' فہد نے طویل سانس لی۔ ''میں ابھی جاب نہیں کرنا چاہتا۔ میں...''

''جانتی ہوں کہ تم مزید پڑھنا چاہتے ہو، بہت آگے جانا چاہتے ہو۔''

''میں تمہیں بہترین زندگی دینا چاہتا ہوں نادی۔'' فہد نے کہا۔ ''میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ...''

''اچھا تم پریشان مت ہو۔ میں ابو کو سمجھا دوں گی۔''

''نہیں۔'' فہد نے انکار کر دیا۔ ''تم ان سے کچھ مت کہنا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری کسی بات سے انہیں دکھ پہنچے۔ میں خود ہی کچھ کر لوں گا۔''

''فہد۔'' نادیہ نے آہستہ سے کہا۔ ''تم جتنی دیر لگاؤ گے، ہماری منزل اتنی ہی دور ہوتی جائے گی۔''

''بس تھوڑا سا صبر کرو مائی ڈیئر کزن۔'' فہد نے کہا۔ ''مجھے تھوڑا سا وقت اور دے دو۔''

''مسئلہ میرا نہیں، پھپھو کا ہے۔'' نادیہ نے سر جھکا کر کہا۔

''اچھا تو آپ محض امی کی وجہ سے شادی کریں گی؟'' فہد نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا بہانہ ہے۔ لڑکیوں کی تو زندگی کا

مقصد ہی شاید دلہن بننا ہوتا ہے۔"

"جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" نادیہ چڑ کر بولی۔ "مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ روٹھ کر جانے لگی۔

فہد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور محبت بھرے لہجے میں بولا۔ "تمہیں شوق ہو یا نہ ہو، مجھے تو ہے۔ میں بھی تمہیں دلہن کے روپ میں دیکھنے کو بے تاب ہوں۔ میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں نادی۔۔۔ آئی لو یو۔"

نادیہ کی خوب صورت پلکیں شرم سے جھک گئیں۔

ماموں کا دل رکھنے کو فہد دوسرے دن ان کے آفس چلا گیا۔ مشتاق احمد کا دفتر ایک کثیر المنزلہ عمارت کے پانچویں فلور پر تھا۔

مشتاق احمد کا آفس بہت شاندار تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے۔ "عثمانی صاحب تھوڑی دیر پہلے تمہارے ہی بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ اتنے مصروف آدمی ہیں، اس کے باوجود انہیں میری بات یاد تھی۔ تم بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اپنی سیٹ سے اٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد چپڑاسی اندر آیا اور اس نے کہا۔ "سر! مشتاق صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔" وہ فہد کو عثمانی صاحب کے کمرے میں لے گیا۔

عثمانی صاحب کا شاندار آفس اور قیمتی فرنیچر دیکھ کر فہد مزید مرعوب ہو گیا۔ عثمانی صاحب بہت باوقار شخصیت کے مالک تھے۔

مشتاق احمد، عثمانی صاحب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے عثمانی صاحب سے کہا۔ "سر! یہ ہے میرا بھانجا فہد۔"

فہد نے انہیں سلام کیا تو وہ بولے۔ "بیٹھو بیٹا! مشتاق صاحب بتا رہے تھے کہ تم نے ایم بی اے میں فرسٹ پوزیشن لی ہے؟"

"جی ہاں۔" فہد نے سر جھکا کر کہا۔

"آپ فہد کا انٹرویو لے لیں۔" مشتاق نے کہا۔ "میں بعد میں حاضر ہوں جاؤں گا۔"

"کیسا انٹرویو مشتاق صاحب؟" عثمانی صاحب مسکرائے، پھر فہد سے بولے۔ "بیٹا! تم بہت اچھے وقت پر آئے ہو۔ میں امریکا اور یورپ میں بھی اپنا آفس کھولنا چاہتا ہوں۔"

یہ سن کر فہد کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور اس نے پہلی دفعہ دلچسپی سے عثمانی صاحب کو دیکھا۔

"ہاں میاں، یہ بتاؤ سیلری کیا لو گے؟" عثمانی صاحب نے اچانک پوچھا۔

"سر! میں ابھی اتنا تجربے کار نہیں ہوں کہ آپ سے کوئی مطالبہ کر سکوں۔" فہد نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"بھئی مشتاق صاحب! آپ کا بھانجا تو بہت ذہین ہے۔ اس نے کس خوب صورتی سے بال دوبارہ میری طرف پھینک دی۔" پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولے۔ "فی الوقت میں تمہیں ڈیڑھ لاکھ روپے مہینا دے سکتا ہوں، ساتھ ٹیکس ہوم مع گاڑی۔"

فہد کی سانس سینے میں اٹک گئی۔ اس نے بمشکل کہا۔ "ڈیڑھ لاکھ۔"

"بہت بہت شکریہ سر۔" مشتاق احمد نے ممنونیت سے کہا۔

ان کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ فہد خود بھی بہت خوش تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ عثمانی صاحب اتنی شاندار تنخواہ دیں گے پھر گاڑی کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے مشتاق احمد کی گاڑی پر ڈرائیونگ سیکھ ضرور لی تھی۔

زندگی اچانک ہی خوب صورت ہو گئی تھی۔ جب فہد جدید ماڈل کی چمچماتی ہوئی گاڑی میں بیٹھا تو بہت دیر تک تو اسے یقین نہیں آیا کہ یہ گاڑی اس کی ہے۔

جمیلہ بیگم، فہد کی شادی کی تیاریوں میں لگ گئیں۔

نادیہ کو یہ خوشی راس نہ آئی۔ ایک دن مشتاق احمد سوئے تو پھر ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ ان کی حرکتِ قلب بند ہو گئی تھی۔

ان کی موت سے فہد کو بھی شدید صدمہ پہنچا تھا اور جمیلہ بیگم کے تو وہ بھائی تھے۔ نادیہ کی وجہ سے وہ اپنا غم بھول گئیں۔

عثمانی صاحب کو بھی مشتاق احمد کی موت کا بہت صدمہ تھا۔

آہستہ آہستہ زندگی پھر اپنی ڈگر پر آ گئی۔ فہد بہت کم وقت میں عثمانی صاحب کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ عثمانی صاحب نے چھ ہی ماہ میں اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا تھا۔ فہد اب اکثر ان کے گھر بھی جانے لگا تھا۔

وہیں پہلی دفعہ فہد کی ملاقات عثمانی صاحب کے بیٹے طارق سے ہوئی۔ طارق پیدائشی طور پر معذور تھا اور وہیل چیئر پر تھا۔ وہ اپنی اس معذوری سے شدید احساسِ کمتری میں مبتلا تھا۔ آہستہ آہستہ طارق اس سے بے تکلف ہو گیا۔ اب وہ ہر چھٹی کے دن عثمانی صاحب کے گھر جانے لگا تھا۔

جمیلہ بیگم کو بیٹے کا سہرا دیکھنے کی شدید آرزو تھی لیکن

بھائی کی موت کے باعث وہ مجبور ہو گئیں لیکن ان کی بدقسمتی کی انتہا تو یہ تھی کہ جب دوبارہ انہوں نے فہد کی شادی کی تیاریاں کیں تو خود بھی بھائی کے پیچھے روانہ ہو گئیں۔

جمیلہ بیگم کی موت نے فہد کی دنیا اندھیر کر دی۔ وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس موقع پر اگر نادیہ نہ ہوتی تو شاید فہد سنبھل نہ پاتا۔ نادیہ نے ہر ہر لمحے فہد کی دلجوئی کی، اس میں پھر سے جینے کی امنگ پیدا کی۔

وقت کے ساتھ ساتھ فہد بھی سنبھل گیا۔

فہد اور نادیہ کا دور نزدیک کا کوئی رشتے دار نہیں تھا اس لیے اس تنہا گھر میں صرف وہ دونوں تھے۔ فہد نے اس تنہائی کا کبھی بھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ نادیہ اس کے ساتھ رہتی ضرور تھی لیکن اپنا کمرا اندر سے لاک کر کے سوتی تھی۔

ایک دن فہد نے جھنجلا کر کہا۔ ''رات میرے سر میں شدید درد تھا۔ مجھے سر درد کی گولیاں نہیں مل رہی تھیں اور مہارانی اپنا کمرا لاک کیے مزے سے سو رہی تھیں۔''

''تو مجھے اٹھا دیتے۔'' نادیہ نے ہنس کر کہا۔

''یار! ایک بات بتاؤ۔'' فہد منہ بنا کر بولا۔ ''یہ تم اپنا کمرا لاک کیوں کرتی ہو، کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟''

''مجھے خود پر اعتماد نہیں ہے۔'' نادیہ نے سر جھکا کر کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو، صرف تمہارے ہی جذبات ہیں۔ میں بھی تو جذبات کے ہاتھوں بے قابو ہو سکتی ہوں۔'' پھر وہ آہستہ سے بولی۔ ''تم اب کیا انتظار کر رہے ہو، دوری کی اس دیوار کو گرا کیوں نہیں دیتے؟''

''ابھی تو میں آفس جا رہا ہوں۔'' فہد ہنس کر بولا۔ ''واپسی میں اس دیوار کو ڈھانے کی کوشش کروں گا۔''

''مذاق میں مت ٹالو فہد۔'' نادیہ نے کہا۔

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں ڈیئر کزن۔'' فہد نے کہا اور اپنا بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گیا۔

پھر فہد ایک کاروباری دورے پر کوریا اور ملائیشیا چلا گیا اس لیے نادیہ سے بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

وہ لوٹا تو اس نے عثمانی صاحب کو کامیابی کی نوید سنائی۔ عثمانی صاحب بھی خوش ہو گئے اور بولے۔ ''تم نے میرا مان رکھ لیا فہد! کمپنی کے کئی سینئر افسران کا خیال تھا کہ تمہاری وجہ سے یہ دورہ ناکام ہو جائے گا لیکن اب میں فخریہ انداز میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔''

اچانک ان کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو انہوں نے ریسیور اٹھایا اور بولے۔ ''یس، ہاں بات کراؤ... وعلیکم السلام... ہاں اکرم... کیا... اچھا، میں ابھی پہنچتا ہوں۔''

انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ شدید پریشانی کے عالم میں تھے۔

''سر! خیریت تو ہے؟'' فہد نے پوچھا۔ ''آپ اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟''

''اکرم کا ٹیلی فون تھا۔'' فہد جانتا تھا کہ اکرم ان کا گھریلو ملازم ہے۔ ''وہ بتا رہا تھا کہ طارق وہیل چیئر سمیت سیڑھیوں سے گر گیا ہے۔''

''چلیے، میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' فہد نے کہا۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو اکرم ڈاکٹر کو بلا چکا تھا اور طارق بیڈ پر لیٹا تھا۔

ڈاکٹر نے عثمانی صاحب کو بتایا کہ مسٹر طارق معمولی زخمی ہوئے ہیں۔ وہ وہیل چیئر ہی کی وجہ سے بچ گئے۔ ان کی وہیل چیئر زینے کی لینڈنگ پر الٹ کر رک گئی تھی۔ ان کے ہاتھوں اور سر میں معمولی چوٹیں آئی ہیں۔''

طارق بیڈ پر لیٹا مسکرا رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''سوری ڈیڈی! میری وجہ سے آپ کو...''

''اچھا، خاموش رہو'' عثمانی صاحب نے اسے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا۔

طارق کی وجہ سے عثمانی صاحب بہت دل گرفتہ تھے۔ فہد نے اچانک کہا۔ ''سر! آپ طارق کی شادی کیوں نہیں کرا دیتے؟''

عثمانی صاحب نے چونک کر اسے دیکھا، پھر افسردگی سے بولے۔ ''کون اس معذور کو اپنی بیٹی دے گا؟ میں نے کوشش بھی کی تھی لیکن صاحب زادے بہت حسن پرست ہیں، انہیں خوب صورت اور پڑھی لکھی بیوی چاہیے۔''

فہد اس دن گھر پہنچا تو خاصا الجھا ہوا تھا۔ اس نے کھانا بھی برائے نام کھایا۔ نادیہ اس کے لیے کافی لے آئی اور بولی۔ ''کیا پریشانی ہے مسٹر پرفیکٹ؟''

''اوں... نہیں کچھ نہیں۔'' فہد چونک کر بولا۔

''تم جانتے ہو کہ میں تمہارے مزاج کے ہر رنگ، ہر روپ سے واقف ہوں... مجھ سے مت چھپاؤ، بتاؤ کیا پریشانی ہے؟''

''کوئی پریشانی نہیں ہے۔'' فہد نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور کوئی پریشانی ہے بھی تو تم دور نہیں کر سکتیں۔''

''تم مجھے بتاؤ تو سہی۔'' نادیہ نے پوچھا۔

''میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' فہد نے بات بنائی۔ ''تم ذرا میرا سر دبا دو۔''

نادیہ اس کا سر دبانے لگی اور بولی۔ ''اب بتاؤ کیا بات ہے؟''

''کوئی بات نہیں ہے۔'' فہد نے کہا۔ ''بس آفس کی کچھ پریشانی ہے۔'' نادیہ خاموش ہوگئی۔

نادیہ کے جانے کے بعد بھی فہد بہت دیر تک سوچتا رہا۔ وہ عجیب الجھن میں پڑ گیا تھا۔ اس کا دولت مند بننے کا جنون اب پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا تھا۔ اس کی سوچ بھی مجرمانہ تھی، وہ نادیہ کو یہ سب کیسے بتا سکتا تھا لیکن اسے بتائے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ نادیہ ہی تو اس الجھن کا بنیادی کردار تھی۔

وہ بھی سوچتا سوچتا سو گیا۔

نادیہ بھی جاگ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بات یہ نہیں ہے، فہد کا مسئلہ کچھ اور ہے۔ خیر، میں بھی اس سے معلوم کر کے رہوں گی۔

صبح ناشتے کی میز پر فہد اور نادیہ دونوں ہی اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔

نادیہ نے اس کی طرف دیکھا اور چونک کر بولی۔

''فہد! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے، کیا آفس سے چھٹی کا ارادہ ہے؟''

''ہاں یار! آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آج میں تمہارے ساتھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' نادیہ پھر چونکی۔

''مطلب یہ کہ آج چھٹی انجوائے کروں گا، تم سے ڈھیروں باتیں کروں گا۔ تمہیں کچھ یاد ہے، آخری دفعہ ہماری تفصیل سے کب بات ہوئی تھی؟''

''اچھے بچوں کی طرح آفس جاؤ۔ ابھی تفصیل سے بات کرنے کا وقت نہیں آیا۔'' نادیہ نے ہنس کر کہا۔

''میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔'' فہد نے اچانک بات شروع کر دی۔ ''مجھے اور تمہیں دولت مند بننے کا ایک سنہرا موقع ملا ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم مشکل سے ایک سال میں ارب پتی بن سکتے ہیں۔''

''تم نے پھر خواب دیکھنا شروع کر دیے۔ ہم اب بھی لاکھوں بلکہ کروڑوں سے بہتر ہیں۔ اللہ نے ہمیں سب کچھ تو دے دیا ہے۔ اپنا گھر ہے، بہترین گاڑی ہے اور تمہاری بہترین جاب ہے، اب اور کیا چاہیے؟''

''احمق ہو تم۔'' فہد منہ بنا کر بولا۔ ''اگر تم نے میری بات مان لی تو اپنے جیسے لوگ تو میں خود ملازم رکھ لوں گا۔ اس ڈھائی لاکھ روپے کی تنخواہ میں کیا رکھا ہے۔ کہاں ڈھائی لاکھ اور کہاں سو کروڑ یعنی ایک ارب روپے مہینا۔''

''ایسی کون سی لاٹری نکلنے والی ہے؟'' نادیہ بھی کچھ سنجیدہ ہوگئی۔

''لاٹری ہی سمجھو نادی، بس تمہارا تعاون چاہیے، تمہاری رضامندی چاہیے میری پیاری بیوی۔'' پھر وہ جلدی سے بولا۔ ''ہونے والی۔''

''میری پیاری بیوی'' کے الفاظ سن کر نادیہ کے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگی تھیں۔ وہ تو نہ جانے کب سے فہد کی پیاری بیوی بننے کی حسرت میں زندہ تھی۔ وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''دیکھو فہد! اس قسم کے راتوں رات امیر بننے کی خواہش انسان سے جائز اور ناجائز کی تمیز چھین لیتی ہے۔''

''پہلے تم وعدہ کرو کہ میرا ساتھ دو گی؟'' فہد نے کہا۔

اب اس بحث کا آخری مرحلہ آنے والا تھا۔

نادیہ چند لمحے تک سوچتی رہی، پھر بولی۔ ''میں تیار ہوں، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مجھے غلط مت سمجھنا نادیہ، اس سے پہلے یہ ذہن میں رکھنا کہ میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں۔ میں تمہیں اپنی ذات سے بڑھ کر چاہتا ہوں۔''

''میرے بغیر تم تو ادھورے رہو گے، میں پوری مر جاؤں گی۔'' نادیہ نے کہا۔

''نادیہ... میں چاہتا ہوں کہ... تم... تم...''

''آگے بھی بولو۔'' نادیہ ہنس کر بولی۔ ''میں کیا؟''

''چاہتا ہوں کہ... تم شادی کر لو۔''

نادیہ نے طویل سانس لی اور ہنس کر بولی۔ ''یہ بات تو میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ مجھ سے شادی کر لو۔''

''مجھ سے نہیں... تمہیں... طارق سے... شادی کرنا ہوگی۔'' فہد نے گویا دھماکا کر دیا۔

نادیہ سکتے کی سی حالت میں اسے دیکھنے لگی، پھر بولی۔ ''کیا؟... کیا کہا تم نے؟'' یہ کہہ کر وہ بے تحاشا ہنسنے لگی۔ ''بس بہت مذاق ہوگیا فہد، اب سنجیدہ ہو جاؤ۔''

''میں سنجیدہ ہوں جان۔'' فہد نے کہا۔ ''اتنا سنجیدہ تو میں زندگی میں کبھی نہیں ہوا۔''

''ہاں، تو اب کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' نادیہ نے اسے گھورا۔

''تم عثمانی صاحب کے بیٹے طارق سے شادی کر لو۔''

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ میں اس معذور سے کیوں شادی کر لوں؟''

"ہاں، اب تم نے بنیادی سوال کیا ہے۔" فہد نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

نادیہ نے غور سے اسے دیکھا، پھر بولی۔ "اگر تم سنجیدہ ہو تو مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ تم مجھ سے ایسی بات کررہے ہو؟"

"تم پوری بات سنو گی تو تمہیں یقین آجائے گا۔ اگر تم نے طارق سے شادی کرلی تو ہم زیادہ سے زیادہ ایک سال میں ارب پتی ہوجائیں گے۔"

"اور ارب پتی کیسے ہوجائیں گے ذرا یہ بھی بتادو؟"

"اس بات کو یوں سمجھو، شادی کے بعد نہ عثمانی صاحب رہیں، نہ طارق تو پھر اربوں روپے کی وہ دولت اور بزنس کسے ملے گا؟ طارق کی بیوی کو ملے گا نا؟"

"تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے تمہیں ان دونوں کی موت کا علم ہے۔"

"ہاں، مجھے علم ہے۔" فہد جھنجلا کر بولا۔ "میں انہیں زندہ رہنے دوں گا تو وہ رہیں گے نا۔"

"فہد...!" نادیہ کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔

"تم... تم... نہیں۔"

"تم اس کی فکر مت کرو نادیہ۔" فہد نے کہا۔ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک سال کے اندر اندر میں عثمانی اور طارق دونوں سے تمہاری جان چھڑوا دوں گا۔"

"کیا تم واقعی یہ چاہتے ہو؟" نادیہ اب بھی بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

"ہاں، ہاں میں یہی چاہتا ہوں۔" فہد جھنجلا گیا۔

"تم تو مجھ سے محبت کے دعوے کرتے رہے ہو بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے بھی کررہے تھے۔" نادیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہی ہے تمہاری محبت؟"

"میری محبت تو پہلے سے بھی کئی گنا بڑھ جائے گی اگر تم میری بات مان لوگی۔"

"اور اگر میں انکار کردوں تو؟" نادیہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"تو پھر میرا جواب بھی سن لو، تمہارے انکار کے بعد ہمارے راستے الگ ہوجائیں گے۔"

"فہد!" نادیہ چیخ کر بولی۔

"میں اپنے دل پر پتھر رکھ لوں گا لیکن اس لڑکی کو برداشت نہیں کروں گا جو مجھ سے محبت کا دعویٰ تو کرتی ہے، عمل نہیں کرتی۔"

اس کی بات پر نادیہ بلک بلک کر رونے لگی اور اچانک اٹھ کر فہد کے سینے پر گھونسے مارنے لگی، پھر روتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے بغیر مرجاؤں گی فہد! مجھے اپنے ہاتھوں سے ماردو۔"

"مجھے مارنے کا کام تو تم کررہی ہو۔" فہد نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" نادیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اترن پہننے کا اتنا ہی شوق ہے تو میں راضی ہوں۔"

فہد نے بے اختیار اسے سینے سے لگالیا اور بولا۔ "یہ جدائی تو عارضی جدائی ہوگی۔ پھر ہم ملیں گے، کبھی نہ بچھڑنے کے لیے، اس وقت ہماری دنیا ہی الگ ہوگی۔"

"آج کے بعد ایک نئی نادیہ جنم لے گی۔" نادیہ نے کہا۔ "دو حصوں میں بٹی ہوئی نادیہ۔"

"ایسا کیوں سوچتی ہو جان، تم میری ہو صرف میری ہی رہو گی۔"

"جاؤ، پھر عثمانی صاحب سے کہہ دو کہ میں ان کے معذور بیٹے سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آگئی اور دروازہ اندر سے لاک کرلیا۔ اپنے بیڈ پر گر کر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

☆☆☆

عثمانی صاحب کے چند دوستوں اور دفتری عملے کی موجودگی میں نادیہ اور طارق کی شادی ہوگئی۔ فہد کی ہدایت کے مطابق نادیہ نے کسی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ مشتاق احمد کی بیٹی ہے۔ نکاح کے وقت عثمانی صاحب کچھ چونکے تھے۔ پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگئے کہ اس نام کے تو لاکھوں لوگ ہوں گے۔ ضروری تو نہیں کہ یہ وہی مشتاق احمد ہوں۔ فہد بھی اس نکاح میں شریک تھا۔ اس نے عثمانی صاحب کو یہ بتایا تھا کہ نادیہ اس کے ایک شناسا کی بیٹی ہے۔ ایک سال پہلے اس شناسا کا انتقال ہوچکا ہے۔

نادیہ کو رخصت کرکے فہد واپس گھر آیا تو گھر اسے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ اسے جمیلہ بیگم کا خیال آیا۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ وہ غصے میں بپھری ہوئی اسے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہی ہیں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

اچانک اس کے کانوں میں مشتاق احمد کی آواز گونجی۔ "فہد! تو نے میری بیٹی کو بھی بازار کی جنس بنادیا۔ اسے بیچ دیا دولت کی خاطر۔" فہد گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا اور پیدل ہی بے مقصد گھومتا رہا۔

دوسرے دن آفس میں عثمانی صاحب سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ بہت خوش تھے اور فہد کے احسان مند تھے

کہ اس نے اتنی خوب صورت اور پڑھی لکھی لڑکی کو ان کی بہو بنایا۔

شام کو طارق نے اصرار کر کے اسے گھر بلا لیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جانا پڑا۔ طارق تو خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔ اس کے نزدیک ہی نادیہ بیٹھی تھی۔ اس پر بھی خوب روپ چڑھا تھا۔ فہد، نادیہ سے تنہائی میں بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے نادیہ کو کچن کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ موقع دیکھ کر اس کے پیچھے لپکا اور کچن میں پہنچ گیا۔

آہٹ پا کر نادیہ مڑی اور اسے درشت انداز میں گھورا۔ ''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟'' اس کا لہجہ بھی سرد تھا۔

''تم یہاں خوش تو ہو مائی ڈیئر کزن؟''

''میں یہاں بہت خوش ہوں۔'' نادیہ نے کہا۔ ''آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نادیہ! تم مجھ سے کس انداز میں بات کر رہی ہو؟'' فہد نے تلخ لہجے میں کہا۔

''آپ بھی تمیز سے بات کریں۔'' نادیہ نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کے باس کی بہو ہوں، سمجھے۔''

فہد چند لمحے اسے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ''اچھا مذاق ہے۔ میں تمہیں...''

''مسٹر فہد!'' نادیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے کہا ہے کہ تمیز سے بات کریں۔ میں اب مسز طارق عثمانی ہوں۔ آپ میرے ملازم ہیں اس لیے ملازموں کی طرح رہیں۔''

''میں تو شروع سے تمہارا غلام ہوں نادی۔'' فہد نے جذباتی ہو کر کہا۔

''مر گئی وہ نادیہ۔'' نادیہ چیخ کر بولی۔ ''آپ نے خود ہی اپنی محبت کو سکوں میں تول دیا۔ اب پلیز یہاں سے جائیں اور آئندہ یہاں آنے کی زحمت مت کیجیے گا۔ جب آپ دولت کی خاطر مجھے بیچ سکتے ہیں تو میں بھی دولت کے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ آپ ہی کہتے تھے نا کہ پیسا ہی سب سے بڑی سچائی ہے، سب سے بڑی قوت ہے۔ بس اب آپ یہاں سے جائیں۔''

فہد دل گرفتہ سا وہاں سے واپس آ گیا۔ طارق اسے کھانے کے لیے روکتا رہا لیکن وہ ضروری کام کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

گھر آ کر وہ نادیہ کے طرزِ عمل کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر اس نے سوچا، نادیہ بہت ذہین ہے۔ وہ مجھ سے ایسا سلوک اس لیے کر رہی ہے کہ میں اسے جلد از جلد طارق سے نجات دلا دوں۔ مجھے اب جو کچھ کرنا ہوگا، بہت جلد کرنا ہوگا۔

''جلدی میں کہیں کام بننے کے بجائے بگڑ نہ جائے۔'' اس کے اندر سے آواز آئی۔ مجھے بہت محتاط ہو کر سب کچھ کرنا ہوگا۔ اور جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ نادیہ بالآخر مجھے ہی ملے گی۔ اس نے مطمئن ہو کر سوچا۔

اب اسے عثمانی صاحب کی بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ عثمانی صاحب اس پر اندھا اعتماد کرنے لگے تھے اس لیے کمپنی کے کئی اکاؤنٹس فہد ہی آپریٹ کرتا تھا۔ آصف علی صاحب اس کمپنی کے چیف اکاؤنٹنٹ تھے۔ پہلے تو وہ بھی محتاط رہے لیکن شروع شروع میں فہد نے بہت دیانت داری سے کام کیا۔ عثمانی صاحب بھی اس سے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ فہد، آصف تمہاری دیانت کی بہت تعریف کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ فہد صاحب ایک ایک پیسے کا حساب رکھتے ہیں۔

کمپنی کا آڈٹ ہوا تو فہد نے جو پیسے خرچ کیے تھے، ان کا پورا حساب موجود تھا۔

اب فہد اکاؤنٹ سے بڑی بڑی رقمیں نکالنے لگا۔ اس نے دو ماہ کے اندر اندر کمپنی کے اکاؤنٹ سے کئی کروڑ نکال کر اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کر لیے۔ آفس کے ہر ڈیپارٹمنٹ میں اس کی رسائی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کسی وقت موقع دیکھ کر اکاؤنٹس کا ریکارڈ بھی غائب کر دے گا۔ آڈٹ ہوگا تو آصف صاحب پھنسیں گے۔

ایک دن موقع دیکھ کر اس نے ریکارڈ غائب کر دیا۔

آصف صاحب گھبرائے ہوئے اس کے پاس آئے اور بولے۔ ''فہد صاحب! اکاؤنٹس کے تینوں رجسٹر غائب ہیں اور کمپیوٹر سے بھی سب کچھ ختم کر دیا گیا ہے۔ میں تو بہت مصیبت میں ہوں۔''

''آپ پریشان مت ہوں۔'' فہد نے کہا۔ ''آپ سب سے پہلے تو یہ خبر عثمانی صاحب کو دیں۔ اگر انہیں کسی اور کے ذریعے معلوم ہوا تو بات خراب ہو جائے گی۔''

''کہتے تو آپ ٹھیک ہیں۔'' آصف نے کہا۔ ''میں ابھی عثمانی صاحب سے بات کرتا ہوں۔''

اُن کے جانے کے بعد فہد کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

تھوڑی دیر بعد عثمانی صاحب نے اسے بلایا۔ وہ کچھ

پریشان نظر آرہے تھے۔ انہوں نے فہد سے کہا۔ ''کمپنی کے اکاؤنٹ سے بہت بڑی رقم غائب ہے۔''

''غائب ہیں؟'' فہد نے پوچھا۔

''ہاں، ان کا کوئی حساب نہیں مل رہا ہے۔ آصف صاحب کا ریکارڈ کھاتہ غائب ہے۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' فہد نے پریشان ہونے کی اداکاری کی۔ ''ریکارڈ یہاں سے کہاں جاسکتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں میں دیکھتا ہوں۔''

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے فہد بہت خوش تھا۔ اس نے بہت آسانی سے کروڑوں کی رقم ہڑپ کرلی تھی۔

دو دن سکون سے گزر گئے۔ تیسرے دن آصف صاحب خوشی خوشی اس کے پاس آئے اور بولے۔ ''فہد صاحب! ریکارڈ کا مسئلہ حل ہوگیا۔''

''کیسے؟'' فہد نے چونک کر پوچھا۔

''آئی ٹی میں ایک لڑکا ہے حسن۔'' آصف صاحب نے کہا۔ ''وہ آئی ٹی کا ماہر ہے، یوں سمجھ لیں کہ وہ کمپیوٹر کا کیڑا ہے۔ میری پریشانی سن کر وہ بولا کہ آپ اتنی سی بات کے لیے پریشان ہورہے ہیں۔ میں چند منٹ میں اکاؤنٹ کا پورا حساب ری اسٹور کردوں گا۔ یہ تو بہت معمولی کام ہے۔''

فہد کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا نام بتایا آپ نے حسن؟''

''ہاں حسن رضا۔'' آصف صاحب نے بتایا۔ ''بہت ذہین لڑکا ہے۔''

ان کے جاتے ہی فہد نے جاوید کو کال کی اور بولا۔

''یار! تجھ سے بہت ضروری کام ہے۔ شام کو میریٹ میں مل۔''

''یار! ضروری کام کے بغیر تو مجھے کب یاد کرتا ہے۔ چل کوئی بات نہیں، میں آٹھ بجے پہنچ جاؤں گا۔''

جاوید، فہد کا اسکول کے زمانے کا دوست تھا۔ وہ شروع ہی سے غلط لڑکوں کی صحبت میں پڑ گیا تھا۔ میٹرک میں اس نے بورڈ آفس سے پرچے چرانے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے پکڑا گیا۔ اسے چھ مہینے کی سزا ہوگئی۔ جیل جاکر تو وہ اور مشاق ہوگیا۔ وہاں اس کا رابطہ ایسے لوگوں سے ہوگیا جو اپنے اپنے فن میں طاق تھے۔

☆☆☆

فہد، جاوید کو ٹیلی فون کرکے فارغ ہوا تو اس کے ذہن سے خاصا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جاوید اسے اس الجھن سے نجات دلا دے گا۔ اسے کافی کی شدید طلب ہورہی تھی۔ وہ کافی منگانے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ انٹرکام کی بیل بج اٹھی۔

دوسری طرف عثمانی صاحب تھے۔ ''فہد، ذرا میرے روم میں آؤ۔'' انہوں نے اتنا کہہ کر انٹرکام رکھ دیا۔

فہد ایک مرتبہ پھر ٹینشن میں مبتلا ہوگیا۔ اب نہ جانے عثمانی صاحب کو کون سی نئی خبر ملی تھی؟ بہرحال جانا تو تھا۔

وہ عثمانی صاحب کے کمرے میں پہنچا تو ان کا موڈ خاصا خوش گوار تھا۔ انہوں نے فہد کو دیکھتے ہی بہت بے تکلفی سے کہا۔ ''آج کل کہاں مصروف رہتے ہو، مجھ سے بھی ملاقات نہیں ہوتی ہے؟''

''سر، کمپنی کے کام ہی اتنے ہیں، مجھے تو اکثر گھر جانے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ یوں بھی اکیلا آدمی ہوں، گھر جاکے کروں گا بھی کیا، اس لیے کمپنی کے جو کام التوا میں پڑے ہوئے ہیں، وہی نمٹاتا ہوں۔''

''ویسے آج تو تمہیں گھر چلنا پڑے گا۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔

''جی...... جی سر؟...... گھر؟'' فہد ایک دم گھبرا گیا۔

اس نے ایک ہفتے پہلے کمپنی کے اکاؤنٹ سے پانچ کروڑ مزید نکالے تھے جو اَب تک اس کے بیڈروم کی الماری میں موجود تھے۔ وہ کمپنی کے کاموں میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ اسے بینک جانے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ وہ سمجھا کہ شاید عثمانی صاحب کو کسی طرح اس رقم کا علم ہوگیا ہے۔ وہ اکاؤنٹنٹ آصف بھی کمپنی کے اکاؤنٹس پر چیل کی سی نظر رکھتا تھا۔ ''ممکن ہے اسی نے عثمانی صاحب کے کان بھرے ہوں۔'' فہد نے سوچا۔

''بھئی، تم کن سوچوں میں گم ہوگئے؟'' عثمانی صاحب کی آواز پر وہ چونک اٹھا۔

''کچھ نہیں سر...... میں سوچ رہا تھا......''

''نو ایکسکیوز۔'' عثمانی صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آج طارق کی برتھ ڈے ہے۔ وہ خود تو کبھی اپنی سالگرہ مناتا نہیں تھا لیکن اس مرتبہ نادیہ نے ضد کرکے اسے سالگرہ منانے پر مجبور کردیا۔''

فہد نے سکون کی سانس لی۔ عثمانی صاحب اس کے گھر نہیں آرہے تھے بلکہ اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے رہے تھے۔

''نادیہ کہتی ہے کہ طارق زندگی کے ہنگاموں میں

دلچسپی لیں گے تو ان کا دل بھی بہلے گا اور ان کا علاج بھی بہتر طریقے سے ہو سکے گا۔''

اسی وقت آصف دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوا اور بولا۔ ''سر، ہمارا بہت نقصان ہو جائے گا۔''

''ہاں، مجھے یاد آیا، آپ نے بتایا تھا نا کہ ہمارے آئی ٹی ڈپارٹمنٹ میں کوئی لڑکا ہے...... کیا نام ہے اس کا......''

''حسن سر!'' آصف جلدی سے بولا۔

حسن کا نام سن کر فہد بری طرح چونک اٹھا۔

''تو پھر اسی کو لاہور بھیج دیں۔'' عثمانی صاحب نے کہا، پھر فہد سے بولے۔ ''ہماری لاہور برانچ آفس کا ایک ڈیٹا ڈیلیٹ ہو گیا ہے۔ جتنی تعریف آصف صاحب نے حسن کی، کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ حسن اسے جلدی بحال کر دے۔''

''سر، امید تو ہے۔'' آصف جلدی سے بولا۔

''تو پھر اسے آج ہی لاہور روانہ کر دیں؟'' آصف نے پوچھا۔

''فہد صاحب کو اگر حسن سے کوئی ضروری کام نہیں ہے تو آج ہی بھیج دیں۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔

''نو پرابلم سر!'' فہد نے سکون کا سانس لیا۔ ''لاہور برانچ کا کام زیادہ ضروری ہے۔''

فہد کو مزید کچھ دن کی مہلت مل گئی تھی۔ وہ یوں بھی آج جاوید سے نہیں مل سکتا تھا کہ اسے طارق کی برتھ ڈے پارٹی اٹینڈ کرنا تھی۔

عثمانی صاحب کی روانگی کے بعد فہد نے حسن کو بلایا اور اسے لاہور جانے کے بارے میں بتایا۔ پھر اس نے جاوید کو کال کی اور اسے بتایا کہ یار، آج میری ایک ضروری میٹنگ ہے۔ میں بعد میں تم سے رابطہ کروں گا۔

کچھ دیر آفس میں بیٹھ کر وہ گھر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

طارق کی سالگرہ میں شہر کے تمام ہی قابلِ ذکر لوگ موجود تھے۔ تقریب بہت شاندار تھی۔ فہد کی نظریں تو صرف نادیہ پر جمی ہوئی تھیں۔ آج تو وہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور لگ رہی تھی۔ اس پارٹی میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی موجود تھی لیکن سب کا حسن نادیہ کے سامنے ماند پڑ گیا تھا۔

نادیہ اس وقت مہمانوں کی تواضع میں تتلی کی طرح پورے ہال میں گھومتی پھر رہی تھی۔

فہد نے اس کو تنہا دیکھا۔ اس وقت نادیہ کسی کام سے کوریڈور میں آئی تھی۔ کوریڈور بالکل سنسان تھا۔ سارے ملازمین بھی اس وقت ہال کمرے میں موجود تھے۔ فہد نے اچانک اس کا راستہ روک لیا اور مسکرا کر بولا۔ ''نادیہ! آج تو تم ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہی ہو۔''

''میرا راستہ چھوڑیں مسٹر فہد!'' نادیہ نے سرد لہجے میں کہا۔

''اتنی اوور ایکٹنگ مت کرو نادیہ۔'' فہد کچھ جھنجلا گیا۔ احتیاط اچھی چیز ہے لیکن......''

''تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟'' نادیہ کا لہجہ اس مرتبہ درشت تھا۔

''میں جانتا ہوں، تم اس وقت غصے میں ہو لیکن فکر مت کرو۔ میں وعدے کے مطابق ایک سال میں تمہاری جان چھڑا دوں گا۔ پہلے عثمانی، پھر طارق۔'' فہد مسکرایا۔ ''دونوں آگے پیچھے عالمِ بالا کی طرف کوچ کر جائیں گے، اب تو ہنس دو۔''

نادیہ جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کسی لڑکی نے اسے آواز دی۔ اور نادیہ اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

عثمانی صاحب اس کی تلاش میں تھے۔ وہ بہت زیادہ پریشان بھی لگ رہے تھے۔

''سر، خیریت تو ہے؟''

''بیٹا، تم کہاں غائب ہو جاتے ہو۔ میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ میرے دوست ابراہیم موتی والا پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کی ہے۔ وہ میری ہی طرف آ رہے تھے۔''

''فائرنگ کی ہے؟'' فہد چونک اٹھا۔ ''ان کی دشمنی تھی کسی سے؟''

''سب سے بڑے دشمن تو یہ بھتا خور ہیں۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''پچھلے دنوں انہیں دس لاکھ روپے بھتے کی پرچی موصول ہوئی تھی۔ عدم ادائیگی کی صورت میں انہیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔''

''سیٹھ صاحب نے پولیس کو رپورٹ نہیں کی؟'' فہد نے پوچھا۔

''کی تھی۔'' عثمانی صاحب تلخی سے بولے۔ ''پولیس نے انہیں یقین دہانی کرائی تھی کہ آپ کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے لیکن ہوا کیا؟ وہ بے چارہ شدید زخمی حالت میں اسپتال میں پڑا ہے۔ میں اب یہ پارٹی کینسل کر رہا ہوں۔''

"برتھ ڈے کا کیک کاٹا گیا اور عثمانی صاحب نے پارٹی کینسل کرنے کا اعلان کر دیا۔ وہاں آدھے سے زیادہ لوگ تاجر برادری کے تھے، سبھی کو اس واقعے کا افسوس تھا۔

اسی وقت فہد کی نظر نادیہ پر پڑی۔ وہ مہمانوں کو رخصت کر کے اندر آرہی تھی۔ فہد نے ایک مرتبہ پھر اس کا راستہ روک لیا اور کہا۔ "نادیہ! میں یہ کہہ......"

"میرے راستے سے ہٹو فہد۔" نادیہ نے بپھر کر کہا۔

"میری بات تو سن لو، پھر غصہ کر لینا۔ اب ہماری منزل زیادہ دور نہیں ہے۔ بس اب تم غصہ تھوک دو۔"

اس کی بات سنے بغیر نادیہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

فہد بھی جھنجلا گیا۔ وہ نادیہ کو بچپن سے جانتا تھا۔ وہ کسی بات پر ناراض ہوتی تھی تو ہفتوں اس کا موڈ خراب رہتا تھا۔

فہد نے بھی عثمانی صاحب سے اجازت لی اور بولا۔ "سر! میں گھر جانے سے پہلے سیٹھ موتی والا کی عیادت کو جاؤں گا۔"

"ہاں بیٹا ضرور جاؤ۔" عثمانی صاحب نے کہا۔ "اب تو کاروباری حلقے میں تقریباً سبھی تمہیں پہچانتے ہیں۔"

دوسرے دن فہد دفتر پہنچا ہی تھا کہ اس کا انٹرکام بجا۔ دوسری طرف عثمانی صاحب کی آواز سن کر اسے حیرانی ہوئی۔ عثمانی صاحب عموماً ساڑھے گیارہ بجے تک آتے تھے۔ عملاً تو پورا دفتر انہوں نے فہد کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ آواز سے خاصے پریشان لگ رہے تھے۔ انہوں نے فہد کو فوری طور پر اپنے آفس میں بلایا تھا۔

فہد ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ اس کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا۔ "بیٹا! مجھے بھتے کی کال آئی ہے! کال کرنے والے نے مجھ سے بیس کروڑ روپے مانگے ہیں۔ وہ بھی کل تک، رقم ادا نہ کرنے کی صورت میں اس نے خوفناک نتائج کی دھمکیاں دی ہیں۔ دوسری افسوس ناک خبر یہ ہے کہ سیٹھ موتی والا آج صبح اسپتال میں انتقال کر گئے۔"

"اوہ۔" فہد نے کہا۔ "ویری سیڈ۔" پھر وہ پُرتشویش لہجے میں بولا۔ "سر! آپ نے پولیس سے رابطہ کیا؟"

"پولیس!" عثمانی صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ایسے موقعوں پر پولیس سوائے تسلی، دلاسوں اور بڑے بڑے دعوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں کرتی۔" پھر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائے۔ "مجھے موت کا خوف نہیں ہے فہد بیٹا، مرنا تو ایک دن سب کو ہے لیکن مجھے ایسی موت پسند نہیں ہے۔"

"آپ پریشان مت ہوں انکل! میرا ایک دوست ڈی آئی جی کرائمز کا کزن ہے۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔ پولیس ہر صورت میں آپ کی حفاظت کرے گی۔"

فہد انہیں کسی حد تک مطمئن کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اس کا کام خود بہ خود آسان ہو گیا تھا۔ اس نے عثمانی صاحب سے جھوٹ بولا تھا۔ اس کا کوئی دوست ڈی آئی جی کرائمز کا کزن نہیں تھا۔

وہ اپنے آفس میں بیٹھ کر مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے لگا۔ عثمانی صاحب بااصول آدمی تھے۔ وہ بھتے کے نام پر بیس کروڑ تو کیا بیس روپے بھی نہیں دیتے اور اس نامعلوم بھتا خور کے ہاتھوں مارے جاتے۔ پھر اس کے راستے میں صرف طارق تھا۔ اسے ٹھکانے لگانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

اس نے سوچا، بس چند مہینے کی بات ہے پھر نادیہ ہوگی اور عثمانی صاحب کی بے اندازہ دولت۔

☆☆☆

بابر نے اپنی ہیوی بائیک پارکنگ میں کھڑی کی اور بلڈنگ کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ یہ صدر کی ایک .... سال خوردہ عمارت تھی۔ گراؤنڈ فلور پر الیکٹرانک کی دکانیں تھیں۔ دکانوں سے باہر الیکٹرانک آئٹمز، ٹھیلے پر فروخت کرنے والوں نے آدھی سے زیادہ سڑک روک رکھی تھی۔

بابر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا کیونکہ عمارت میں لفٹ نہیں تھی۔ بابر کا آفس چھٹے فلور پر تھا۔ آفس کیا بڑا سا ایک کمرا تھا جسے مالک نے درمیان میں پارٹیشن کر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اندرونی حصے میں ایک طرف چھوٹا سا ایک کچن تھا جہاں گیس نہیں تھی اس لیے چائے وغیرہ بنانے کے لیے بابر کو سلنڈر استعمال کرنا پڑتا تھا۔

بابر نے کچن کے سامنے لکڑی کا ایک مزید پارٹیشن لگا کر اس کی بدصورتی چھپانے کی کوشش کی تھی۔ کمروں میں اس نے کارپٹ ڈال لیا تھا تاکہ گندہ فرش چھپ سکے۔ سامنے کے حصے میں اس نے سیکریٹری کے لیے ایک ٹیبل، کرسی ڈال دی تھی۔ ایک طرف پرانا سا لیکن خوب صورت صوفہ سیٹ تھا۔ اندرونی کمرے میں بابر خود بیٹھتا تھا۔ سیکریٹری کا کمرا عموماً خالی رہتا تھا کیونکہ سیکریٹری سرے سے تھی ہی نہیں، اس کرسی پر عموماً بلال بیٹھ جاتا تھا۔

بابر چھ مہینے پہلے تک پولیس انسپکٹر تھا۔ اس کی محنت اور صلاحیت دیکھتے ہوئے محکمے نے اسے نہ صرف بہت جلد ترقی دی تھی بلکہ اسے خصوصی کمانڈو ٹریننگ بھی دلوائی تھی۔

اس میں بنیادی "خرابی" یہ تھی کہ وہ رشوت کو حرام

سمجھتا تھا۔ نہ وہ خود رشوت کھاتا تھا نہ دوسروں کو کھانے دیتا تھا۔ اس قسم کے لوگ پولیس سروس کے لیے انتہائی ناموزوں سمجھے جاتے ہیں۔

بالآخر اس نے تنگ آکر پولیس کی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔

نئی ملازمت کے لیے مختلف کمپنیز میں سیکیورٹی آفیسر کے لیے اپلائی کیا لیکن وہاں کام گدھوں کی طرح لیا جاتا تھا اور تنخواہ کے نام پر اتنے پیسے ملتے تھے کہ اس کا مہینا بھی بمشکل تمام گزرتا تھا۔

آخر تنگ آکر اس نے تین مہینے پہلے صدر کے علاقے میں یہ آفس لے کر اپنی سیکیورٹی ایجنسی کھول لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ شہر کے بڑے بڑے کاروباری لوگ اس کی صلاحت سے واقف ہیں اور چند ہی مہینے میں اس کا کام چل پڑے گا۔

بلال پولیس میں اے ایس آئی تھا۔ بابر ہی کی طرح وہ بھی معتوب تھا۔ اس نے بابر کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تو بابر نے کہا۔ ''دیکھو بلال! ابھی سیلری کے نام پر میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکوں گا۔ ہاں، جب ہمارا کام چل نکلے گا تو......''

''میں جانتا ہوں سر!'' بلال مسکرایا۔ ''میں بس آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔''

یوں بلال بھی اس کے ساتھ شامل ہوگیا۔ بلال بھی اس کی طرح خاصا ذہین اور پُرجوش افسر تھا۔ ایمان داری کا مرض اسے بھی لاحق تھا۔

بابر آفس جا کر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے سیل فون کی بیل بج اٹھی۔

''السلام علیکم! الیو پروڈ سیکیورٹی ایجنسی۔'' بابر نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''بابر صاحب بول رہے ہیں؟'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''جی ہاں، بول رہا ہوں۔'' بابر نے حیرت سے جواب دیا۔ بولنے والا اس کا نام بھی جانتا تھا۔

''میں عثمانی گروپ آف کمپنیز سے بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو کیا آپ ہمارے آفس آسکتے ہیں۔ ہمارے سی ای او عثمانی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''جی! وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جی ہاں، اگر آپ کے پاس ٹائم ہو تو ابھی آجائیں۔ عثمانی صاحب آپ کا انتظار کررہے ہیں۔''

''اوکے، میں بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' بابر نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

اسی وقت بلال آفس میں داخل ہوا۔ اس نے بابر کو عجلت میں دیکھ کر پوچھا۔ ''سر، کہیں جارہے ہیں آپ؟''

''ہاں یار۔'' بابر نے کہا۔ ''میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ ہمیں کام ملنے والا ہے۔'' اس نے جیکٹ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔ بغلی ہولسٹر تو وہ پہلے ہی لگا چکا تھا۔

''سر! کوئی بڑا کلائنٹ ہے؟''

''بڑا نہیں، بہت بڑا ہے۔'' بابر نے کہا۔ ''لیکن میں ابھی سے اسے کلائنٹ نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو وہاں سے واپسی ہی پر معلوم ہوگا کہ عثمانی صاحب کلائنٹ ہیں یا کسی مشورے کے سلسلے میں بلایا ہے؟''

''عثمانی صاحب؟'' بلال نے حیرت سے کہا۔ ''عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے سی ای او؟''

''ہاں، یار! ابھی ان ہی کے آفس سے کال آئی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔

''وش یو بیسٹ آف لک سر!'' بلال نے ہنس کر کہا۔

بابر نے اپنی ہیوی بائیک نکالی، ہیلمٹ لگایا اور تیز رفتاری سے عثمانی صاحب کے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

''یار، تو مجھ سے آج شام میریٹ میں مل لے۔ بقیہ بات وہیں ہوگی۔'' فہد نے جاوید سے کہا۔ حسن لاہور سے واپس آنے والا تھا اور فہد خطرے کی اس تلوار کو جلد از جلد ہٹانا چاہتا تھا۔

اسی وقت انٹرکام پر عثمانی صاحب نے اسے اپنے آفس میں طلب کرلیا۔

''ایک تو یہ بڈھا جان کو آگیا ہے۔ نہ خود فارغ بیٹھتا ہے، نہ کسی کو بیٹھنے دیتا ہے۔'' فہد بڑبڑایا اور عثمانی صاحب کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

وہ آفس میں داخل ہوا تو عثمانی صاحب تنہا نہیں تھے بلکہ ان کے کمرے میں جیکٹ میں ملبوس ایک وجیہہ و شکیل نوجوان بھی موجود تھا۔ وہ کسرتی جسم کا مالک تھا اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

فہد نے سر سے پاؤں تک بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ جوابی طور پر اس نے بھی فہد کو گہری نظر سے دیکھا۔

''آؤ فہد۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''ان سے ملو۔

مسٹر بابر خان، لیوپرڈ سیکیورٹی ایجنسی کے ایم ڈی ہیں۔ میں اپنی سیکیورٹی کے لیے ان کی خدمات حاصل کر رہا ہوں۔'' پھر وہ بابر سے مخاطب ہوئے۔ ''بابر صاحب! یہ کمپنی کے ایم ڈی اور میرے رائٹ ہینڈ مسٹر فہد ہیں۔''

''ہیلو سر!'' بابر نے اپنا ہاتھ فہد کی طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو!'' فہد نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ بابر کے ہاتھ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس کا ہاتھ بھی بہت مضبوط تھا۔

''سر! اگر آپ اجازت دیں تو میں بابر صاحب سے کچھ سوالات کرلوں؟''

''شیور!'' عثمانی صاحب نے ہنس کر کہا۔

''بابر صاحب! آپ کی سیکیورٹی ایجنسی کس لیول کی ہے، میرا مطلب ہے کہ آپ کمپنی پروفائل تو ضرور لائے ہوں گے؟''

''فہد صاحب! میں نے ابھی حال ہی میں بلکہ تین مہینے پہلے ہی اپنی سیکیورٹی ایجنسی شروع کی ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے سی ای او میرے پہلے کلائنٹ ہیں۔''

''وہاٹ؟'' فہد نے ناگواری سے پوچھا۔ ''آپ نے حال ہی میں کمپنی شروع کی ہے۔ آپ کی سیکیورٹی کا کوئی سابقہ تجربہ بھی نہیں ہے۔ آپ کس کے ریفرنس سے یہاں آئے ہیں؟'' فہد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''مسٹر بابر! عثمانی صاحب ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں۔ انہیں دھمکی آمیز فون موصول ہو رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں تو ہمیں کسی انتہائی پروفیشنل شخص کی ضرورت ہوگی۔'' پھر وہ عثمانی صاحب سے مخاطب ہوا۔ ''سوری سر! میں بابر صاحب سے مطمئن نہیں ہوں۔''

''فہد!'' عثمانی صاحب مسکرائے۔ ''تم شاید بابر سے واقف نہیں ہو ورنہ ایسی بات کبھی نہ کرتے۔ بابر سابقہ پولیس آفیسر ہیں، بہترین کمانڈو ہیں۔ شہر کے جرائم پیشہ شخص ان کے نام سے کانپتے تھے اور آج بھی یقیناً کانپتے ہوں گے۔ ان کی کمپنی کی پروفائل نہ سہی لیکن ان کی ذاتی پروفائل میں درجنوں ایسے کیس ہیں جو دوسروں کے لیے ناممکن تھے۔ انہوں نے ہزار ملزمان سے زیادہ کو سلاخوں کے پیچھے پہنچایا ہے۔''

''او، آئی سی۔'' فہد نے کہا۔ ''سوری مسٹر بابر، مجھے علم نہیں تھا کہ آپ اتنے باصلاحیت افسر رہ چکے ہیں۔''

''سر، فوری طور پر میں اجازت چاہوں گا۔'' بابر نے کہا۔ ''مجھے کچھ تیاری کرنا ہوگی۔ اس بھتا خور نے آپ کو چوبیس گھنٹے کا ٹائم دیا ہے۔ میں اس سے بہت پہلے یہاں پہنچ جاؤں گا۔''

''بابر صاحب! آپ فوری طور پر اپنی ایجنسی کے دو بہترین گارڈز تو یہاں بھجوا ہی سکتے ہیں۔'' فہد نے کہا۔ ''اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ بابر کا نام اس نے بھی سن رکھا تھا لیکن فوری طور پر اسے یاد نہیں آیا تھا خیر فی الحال تو مجھے حسن کا بندوبست کرنا ہے۔ فہد نے سوچا، اس وقت تک جاوید، بابر کا بھی کوئی علاج سوچ لے گا۔

بابر جانے کے لیے کھڑا ہوا تو فہد کو اس کے دراز قد کا علم ہوا۔ وہ فہد سے بھی ایک ڈیڑھ انچ زیادہ ہی ہوگا۔ فہد خود بھی خاصا دراز قد تھا اور پابندی سے جم جاتا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فہد بھی عثمانی صاحب سے اجازت لے کر وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ بابر کی شخصیت اتنی رعب دار تھی کہ فہد مرعوب ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر اس کے کریڈٹ پر بہت سے اِن کاونٹر بھی تھے۔ اگر اسے شبہ ہو جاتا کہ ملزم گرفتاری کے بعد سزا سے بچ جائے گا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑتا تھا۔

وہ اسی پریشانی کے عالم میں... جاوید سے ملنے میریٹ روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

بابر آفس پہنچا تو خوشی اس کے چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ بلال اسے دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ''سر! لگتا ہے کہ آپ کی میٹنگ کامیاب رہی ہے۔''

''ہماری بسم اللہ بہت بڑے کلائنٹ سے ہوئی ہے۔'' بابر نے کہا۔ ''اب ہمیں ان پیسوں کو حلال کرنا ہے۔ عثمانی صاحب کو بھتے کے لیے گمنام ٹیلی فون کالز موصول ہو رہی ہیں اور انہیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ اب ہمیں ان کی حفاظت کرنا ہے۔ اب تم ایکشن میں آجاؤ۔ انہوں نے دس لاکھ کا چیک بھی دیا ہے۔''

اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک بروشر نکالا۔ یہ عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کی پروفائل تھی۔ اس میں کمپنی کے سی ای او سے لے کر ایم ڈی، تمام ڈائریکٹرز، اکاؤنٹس منیجر اور تمام اسٹاف کا تعارف بھی تھا اور ان کی تعداد بھی۔

''یہ کمپنی کا ایم ڈی فہد ہے۔'' بابر نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''انتہائی ذہین اور باصلاحیت آدمی ہے۔ اس نے محض تین سال کے عرصے میں کمپنی کو بہت اوپر پہنچا دیا ہے۔ اس کے اسٹائل سے لگ رہا تھا کہ کمپنی میں اس کی

خاص پوزیشن ہے پھر عثمانی صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے کہ فہد میرا رائٹ ہینڈ ہے۔''

''لیکن اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟'' بلال نے پوچھا۔

''تم جانتے ہو کہ میری چھٹی حس بہت تیز ہے۔ جس انداز میں اس نے میری مخالفت کی ہے، اس پر مجھے شک ہے۔ تم ابھی عثمانی گروپ آف کمپنیز چلے جاؤ اور فہد پر نظر رکھو۔ اس کے ساتھ اس کے بارے میں مجھے مکمل رپورٹ بھی چاہیے۔''

''اوکے باس۔'' بلال اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا ریوالور پینٹ کی بیلٹ میں پیچھے کی طرف لگایا اور اوپر سے جیکٹ پہن لی اور اپنا ہیلمٹ اٹھا کر روانہ ہو گیا۔

وہ عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے ہیڈ آفس پہنچا تو فہد وہاں سے نکل چکا تھا یہ بات اسے آفس کے ایک سیکیورٹی گارڈ نے بتائی تھی۔ وہ لفٹ میں سوار ہو کر اوپر پہنچا۔ دفتر کی ریسپشنسٹ جا چکی تھی۔ اس کی جگہ پر کوئی نوجوان بیٹھا تھا۔ بلال جانتا تھا کہ فہد آفس میں موجود نہیں ہے۔ اس نے بلا جھجک اس نوجوان سے پوچھا۔ ''مجھے مسٹر فہد سے ملنا ہے۔''

''سر! مسٹر فہد تو ابھی تھوڑی دیر پہلے جا چکے ہیں۔'' نوجوان نے جواب دیا۔

بلال نے پریشان ہونے کی اداکاری کی اور بڑبڑایا۔ ''یہ تو بہت برا ہوا۔ مجھے آج ہی ان سے ملنا تھا کیا آپ کو ان کے گھر کا ایڈریس معلوم ہے؟''

''میں تو عارضی طور پر یہاں بیٹھ گیا ہوں۔'' نوجوان نے کہا۔ ''ایسا کریں، آپ ڈائریکٹر اکاؤنٹس آصف صاحب سے مل لیں۔ وہ اس وقت آفس میں ہیں۔ انہیں فہد صاحب کا ایڈریس معلوم ہے۔''

''تھینکس مسٹر!''

بلال اس کا شکریہ ادا کر کے کوریڈور کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

''یار، یہ معاملہ تو الجھتا ہی جائے گا۔'' جاوید نے کہا۔ تو حسن کو راستے سے ہٹائے گا تو اس کی جگہ کوئی اور آ جائے گا۔ شہر میں آئی ٹی کے ماہرین کی کمی نہیں ہے۔ آصف کو راستے سے ہٹائے گا تو اس کی جگہ کوئی دوسرا لے گا پھر یا تو وہ تجھے ہمیشہ بلیک میل کرتا رہے گا یا پھر تیرا سارا کچھا چٹھا عثمانی کو بتا دے گا۔''

''تو پھر اس پرابلم کا کوئی حل بھی ہے تیرے پاس؟'' فہد جھنجلا کر بولا۔ ''میرا ذہن تو اس وقت کام نہیں کر رہا ہے، تو تو ان معاملات میں بہت شارپ ہے۔''

وہ دونوں میریٹ ہوٹل کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔

''میں عام طور پر لوگوں سے اتنی بات کرتا نہیں ہوں۔ نہ انہیں مشورے دیتا ہوں، صرف ان کے احکامات پر عمل کرتا ہوں۔'' جاوید نے منہ بنا کر کہا۔ ''لیکن تو چونکہ میرا دوست بھی ہے اور آڑے وقتوں میں میری مدد بھی کی ہے اس لیے تجھے یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ شاخوں کو صاف کرنے کے بجائے تو درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔''

''یار، صاف صاف بات کر۔'' فہد الجھ کر بولا۔ ''میں سمجھا نہیں، تو کیا کہنا چاہتا ہے؟''

''تو اپنی کمپنی کے سی ای او کو راستے سے ہٹا دے۔'' جاوید نے بے نیازی سے کہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

فہد نے چونک کر اسے دیکھا، پھر بولا۔ ''یار! میں بھی چاہتا تو یہی ہوں لیکن یہ کام اب بہت مشکل ہو گیا ہے۔''

''اونہہ۔'' جاوید ترش لہجے میں بولا۔ ''تو شاید مجھے ہلکا لے رہا ہے۔ یہ کام ہمیشہ مشکل ہی ہوتا ہے۔ یہ تیرا مسئلہ نہیں ہے۔''

''ابھی کچھ دن ٹھہر جا۔'' فہد نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''تجھے ابھی فیصلہ کرنا ہوگا فہد ورنہ خطرے کی تلوار ہمیشہ تیرے سر پر لٹکی رہے گی اور کسی بھی وقت گر کر تیری گردن اڑا دے گی۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ابھی اس لیے نہیں کہ عثمانی صاحب نے اپنی سیکیورٹی کے لیے بابر خان کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔''

''بابر خان!'' جاوید بری طرح چونکا۔ ''وہ اِن کاؤنٹر اسپیشلسٹ؟''

''ہاں، وہی۔'' فہد نے جواب دیا۔

''وہ پولیس میں واپس کیسے آ گیا۔ اس نے تو پولیس کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا؟''

''وہ اب پولیس میں نہیں ہے۔'' فہد نے کہا۔ ''بلکہ اپنی ذاتی سیکیورٹی ایجنسی چلا رہا ہے۔''

جاوید کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ وہ آہستہ سے بولا۔ ''یہ تو بہت بری خبر سنائی تو نے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''اسے وہاں لایا کون ہے؟''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

''یار، لایا کوئی بھی ہو۔'' فہد جھنجلا کر بولا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس کے حوالے سے وہاں آیا ہے۔''

جاوید چند منٹ تک سوچتا رہا، پھر پُرخیال انداز میں بولا۔ ''یہ بھی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے لیکن تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پہلے ہمیں حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔''

''فی الحال تو تو حسن کو راستے سے ہٹا دے۔ اس طرح ہمیں کچھ دن کی مہلت مل جائے گی۔''

''چل پھر یوں ہی سہی۔'' جاوید نے کہا۔ وہ کچھ فکرمند نظر آرہا تھا۔ ''اس کام کے دس لاکھ لوں گا۔'' اس نے فہد سے کہا۔

''یار، تو ہوش میں تو ہے اتنے سے کام کے دس لاکھ؟''

''یہ اتنا سا کام نہیں ہے۔'' جاوید نے منہ بنا کر کہا۔ ''کروڑوں روپیا اور تیری عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ حسن نے اگر تمام ڈیٹا ری اسٹور کرلیا تو پھر تو سوچ لے کہ تیرا کیا ہو گا؟''

''یار، تو واقعی بہت کمینہ ہے۔'' فہد کھسیانی ہنسی ہنسا۔ ''چل دس لاکھ ہی سہی لیکن کام آج ہی ہونا چاہیے۔ حسن آج رات کی فلائٹ سے کراچی پہنچ رہا ہے۔''

''کام کی تو فکر مت کر۔'' جاوید نے کہا۔ ''ہاں تو جانتا ہے کہ میں ففٹی پرسنٹ ایڈوانس لیتا ہوں۔''

فہد نے بغیر کچھ کہے بریف کیس میں سے چیک بک نکالی اور اسے پانچ لاکھ کا چیک دے دیا۔

''اب میں چلتا ہوں۔'' جاوید نے کہا۔ ''مجھے کچھ انتظامات بھی کرنے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

فہد فی الحال گھر نہیں جانا چاہتا تھا اس لیے وہیں بیٹھا رہا اور کافی پیتا رہا۔

☆☆☆

ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ لیمپ روشن کیا اور ریسیور اٹھا لیا۔ وال کلاک میں اس وقت چار بج رہے تھے۔

''ہیلو۔'' اس نے غنودہ لہجے میں کہا۔

''میں اظہر بول رہا ہوں سر۔'' دوسری طرف سے کمپنی کے جی ایم کی آواز سنائی دی۔

''بولو۔'' فہد نے چڑچڑے انداز میں کہا۔ ''کبھی کوئی کام خود بھی کرلیا کریں۔ آپ جانتے ہیں، اس وقت کیا ٹائم ہوا ہے؟''

''جانتا ہوں سر!'' اظہر نے کہا۔ ''لیکن آپ کو اطلاع دینا ضروری تھا۔ کمپنی کے آئی ٹی ایگزیکٹو حسن کا مرڈر ہوگیا ہے۔''

''وہاٹ؟'' فہد نے اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ ''حسن تو لاہور میں تھا کیا لاہور میں......''

''نو سر!'' اظہر نے کہا۔ ''وہ لاہور سے آج ہی ڈیڑھ بجے کے قریب کراچی پہنچا تھا۔ ڈسٹرب کرنے کی معذرت چاہتا ہوں لیکن عثمانی صاحب کا اور آپ کا حکم ہے کہ کسی ایمرجنسی یا غیر معمولی واقعے کی اطلاع آپ کو دی جائے۔ میں نے عثمانی صاحب کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اس لیے......''

''اٹز آل رائٹ اظہر صاحب۔'' فہد نے کہا۔ ''لیکن حسن کا مرڈر کیسے ہوا؟ وہ تو اپنے کام سے کام رکھنے والا لڑکا تھا۔ اس کی بھلا کس سے دشمنی ہوسکتی ہے؟ اس کی ڈیڈ باڈی کہاں ہے؟''

''وہ ابھی تک جناح اسپتال میں ہے۔ وہ جس کیب میں سوار تھا، اس کا ڈرائیور بھی مارا گیا ہے۔''

''حسن کے گھر والوں کو انفارم کردیں۔ میں جناح اسپتال پہنچ رہا ہوں۔'' ایک لمحے کو فہد کے ضمیر نے اسے ملامت کی۔ اس کے والدین نے ہمیشہ اسے سچائی اور دیانت داری کے ساتھ ساتھ قناعت پسندی کا سبق بھی سکھایا تھا۔ اس کے ماموں نے بھی ہمیشہ اسے اچھائی کا درس دیا۔ اسے اس قابل بنایا کہ آج وہ ملک کی ایک بہت بڑی فرم کا ایم ڈی تھا۔ اس نے دولت کے جنون میں اپنی محبت کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ نادیہ تو اس کی جان سے زیادہ ماموں کی امانت تھی، اس کی اپنی امانت تھی جسے اس نے دولت کے انبار میں زندہ دفن کردیا تھا اور آج ایک انسان کی جان بھی لے لی تھی۔

یہ احساس صرف چند لمحوں کا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر میں حسن کو راستے سے نہ ہٹاتا تو میرا ٹھکانا جیل ہوتا یا عثمانی صاحب بہت زیادہ رعایت کا مظاہرہ کرتے تو غبن کی رقم واپس لے کر شاید اسے معاف کردیتے لیکن پھر عثمانی گروپ آف انڈسٹریز میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی پھر وہ نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم' کی تعبیر بن کررہ جاتا۔

وہ اسپتال پہنچا تو جی ایم کے علاوہ وہاں آصف صاحب، آئی ٹی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ انوار صاحب اور حسن کے گھر والے موجود تھے۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ حسن اپنی ماں اور دو جوان بہنوں کا واحد کفیل تھا۔ اس کی

ماں اور بہنوں کی حالت خراب تھی۔

فہد ان کے نزدیک پہنچا تو وہ سسک سسک کر رونے لگیں۔ فہد نے حسن کی بہن سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”روبینہ!“ اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

”پڑھ چکی ہو یا پڑھ رہی ہو؟“ فہد نے پوچھا۔

”میں نے اس سال گریجویشن کیا ہے سر!“ اس نے کہا۔

”تم ایسا کرنا، میرے پاس آفس آجانا۔ میں حسن کی جگہ تمہیں جاب دے دوں گا۔“ فہد کے پاس اتنے اختیارات تھے کہ وہ چند ڈائریکٹرز اور منیجرز کے علاوہ کسی کو بھی ملازمت سے نکال سکتا تھا اور ملازمت دے بھی سکتا تھا۔

حسن کی ماں اور بہنوں کی آنکھوں میں حسن کے لیے ممنونیت تھی۔

حسن کی باڈی پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی جا چکی تھی۔

اسی وقت پولیس کا ایک سب انسپکٹر وہاں آگیا اور بولا۔ ”مقتول کمپنی کے کس ڈپارٹمنٹ میں تھا؟“

”وہ آئی ٹی ایگزیکٹو تھا۔“ آئی ٹی کے ہیڈ انوار صاحب نے جواب دیا۔ بہت محنتی اور ذہین نوجوان تھا۔ کمپیوٹر کا تو وہ سمجھ لیں کیڑا تھا۔“

پولیس کی معمول کی کارروائی جاری تھی۔

آصف بہت پریشان تھا۔ اکاؤنٹس کا ڈیٹا ریاسٹور کرنے کی ایک امید بندھی تھی تو حسن کی موت کے ساتھ وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ آخر اکاؤنٹس کے رجسٹر کہاں غائب ہو گئے۔ کمپیوٹر کا ڈیٹا تو کسی بھی وجہ سے ڈیلیٹ ہو سکتا تھا۔ لاہور برانچ کی مثال اس کے سامنے تھی۔ وہ کچھ بھی کہتا لیکن عثمانی صاحب کی نظروں میں تو وہی ذمے دار تھا۔

اب بابر زیادہ تر عثمانی گروپ آف کمپنیز کے آفس ہی میں رہتا تھا۔ وہ گاڑی میں عثمانی صاحب کے ساتھ نہیں بیٹھتا تھا بلکہ اپنی بائیک پر ان کی گاڑی کے پیچھے آگے اور دائیں بائیں رہتا تھا۔

بابر نے ایک سیکیورٹی ایجنسی کے دو گارڈز بھی ہائر کر لیے تھے۔ وہ ایجنسی اس کے دوست ریٹائرڈ میجر سلطان کی تھی۔ سلطان نے اسے اپنی ایجنسی کے دو گارڈز دے تو دیے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی جتا دیا تھا کہ کسی گارڈ کو نقصان پہنچا تو اس کی پوری ذمے داری بابر پر ہوگی۔ ان کی ماہانہ تنخواہیں بھی بابر ہی کے ذمے تھیں۔

ان ہی دنوں آفس میں ملازمت کے لیے ایک لڑکا آیا۔ یوں تو کمپنی میں بے شمار درخواستیں موصول ہوتی تھیں لیکن اس کی سی وی میں خاص بات یہ تھی کہ کوالیفکیشن میں آئی ٹی اسپیشلسٹ بھی لکھا ہوا تھا۔

سی وی دیکھ کر آئی ٹی ہیڈ انوار صاحب خوش ہو گئے۔ اس نوجوان کا نام عاصم تھا۔ انوار صاحب نے اس کی درخواست فہد کو بھیج دی اور اس پر یہ نوٹ بھی لگایا کہ یہ امیدوار ہمارے کام کا ہے۔ ہمیں ایک آئی ٹی اسپیشلسٹ کی ضرورت تھی اور یہ حسن سے بھی زیادہ ماہر ہے۔

درخواست پڑھ کر فہد پریشان ہو گیا۔ اسے جاوید کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ حسن کو راستے سے ہٹا دیا تو کوئی اور آجائے گا، پھر کوئی اور۔ شہر میں ذہین نوجوانوں کی کمی نہیں تھی۔

اس نے عاصم کی درخواست ایک مرتبہ پھر پڑھی اور انوار صاحب کو اپنے آفس میں بلا لیا۔

”یہ ایپلی کیشن آپ نے مجھے فارورڈ کی ہے؟“ فہد نے ان سے پوچھا۔

”یس سر! میں تو اسے ادارے کے لیے موزوں ترین سمجھتا ہوں۔“

”آپ نے اس شخص کا گزشتہ ریکارڈ چیک کیا ہے۔ اس نے آخری جاب ٹیلکو میٹ سے چھوڑی ہے اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان سے مارکیٹ میں ہمارا بہت سخت کمپٹیشن ہے۔ آپ اس شخص کو آئی ٹی جیسے حساس ڈپارٹمنٹ میں جاب دینے کی بات کر رہے ہیں۔ ممکن ہے اس نے وہاں سے جاب چھوڑی ہی نہ ہو اور وہ ان ہی لوگوں کے کہنے پر یہاں آیا ہو۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اگر وہ ہمارے رائیول گروپ کا آدمی ہوا تو ہمیں کتنا نقصان پہنچا سکتا ہے؟“

”سوری سر!“ انوار صاحب اب شرمندہ تھے۔ ”میں نے اس پہلو سے تو غور ہی نہیں کیا تھا۔“

”مارکیٹ میں آئی ٹی کے ہزاروں لوگ ہیں۔ میں نے کئی لوگوں سے کہا ہوا ہے۔ جلد ہی کسی کا انتظام ہو جائے گا۔“ فہد نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا اگر میں نے فوری طور پر اس مسئلے کا کوئی مستقل حل نہ نکالا تو میری ملازمت بھی تو جائے گی ہی، میرا سارا پلان بھی چوپٹ ہو

جائے گا۔ اسی دولت کے لیے تو میں نے نادیہ جیسی محبت کرنے والی لڑکی کو اس دلدل میں اتار دیا تھا۔

اس نے سیل فون اٹھایا اور جاوید کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

"میں نے تو تجھ سے پہلے ہی کہا تھا کہ حسن کو راستے سے ہٹانا اس پرابلم کا حل نہیں ہے۔" جاوید نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ ایک دفعہ پھر میریٹ میں بیٹھے تھے۔

"اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔" جاوید نے کہا۔

"عثمانی صاحب کو اوپر پہنچا دیا جائے۔"

"لیکن بابر، ان کی سیکیورٹی بابر کر رہا ہے اور......"

"بابر کوئی سپر مین نہیں ہے۔" جاوید نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "میں نے اس کے بارے میں بھی معلومات کی ہیں پولیس چھوڑنے کے بعد اس نے صدر کے ایک دڑبا نما فلیٹ میں اپنی سیکیورٹی ایجنسی کھولی ہے۔ وہ اس آفس کا سیکریٹری بھی خود ہے، اپنا اسسٹنٹ بھی خود ہے اور پیون بھی خود ہی ہے۔"

فہد جھنجلا کر بولا۔ "میں اس وقت شدید ٹینشن میں ہوں جاوید، اگر تو ہٹا سکتا ہے تو اس بڈھے کو راستے سے ہٹا دے۔"

"بڈھے کو کب پھڑکانا ہے؟" جاوید مطلب کی بات پر فوراً آ گیا۔

"جلد از جلد۔" فہد نے کہا۔ "مجھ سے اب مزید ٹینشن برداشت نہیں ہو گی۔ میں تجھے اس کام کے پچاس لاکھ روپے دوں گا۔"

"پچاس لاکھ؟" جاوید کے چہرے پر ناگواری تھی۔ "تو عثمانی گروپ آف کمپنیز کے سی ای او کو راستے سے ہٹا رہا ہے یا کسی ریڑھی والے یا بھک منگے کو۔ میں اس کام کے پانچ کروڑ لوں گا۔"

"پانچ کروڑ؟" فہد نے حیرت سے دہرایا۔ "یہ تو بہت زیادہ ہیں جاوید! ہم پرانے دوست ہیں اور......"

"اسی وجہ سے تو میں نے ڈسکاؤنٹ کیا ہے ورنہ اتنے معروف اور دولت مند لوگوں کو قتل کے دس کروڑ روپے بنتے ہیں۔" وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔ "جلدی فیصلہ کر۔ مجھے ابھی ایک اور پارٹی سے بھی ملنا ہے۔ یہ کام تو کسی دوسرے پروفیشنل ٹارگٹ کلر سے کرا لے۔ ہو سکتا ہے، تیرا کام دس، پندرہ لاکھ ہی میں ہو جائے۔"

"یار، تیری پرانی کمینگی ابھی تک برقرار ہے۔" فہد مسکرایا۔ "ٹھیک ہے، میں تجھے پانچ کروڑ دوں گا لیکن کام اتنی صفائی سے ہونا چاہیے کہ......"

"اس کی تو فکر مت کر۔ ہاں تو شاید یہ بھول رہا ہے کہ میں ففٹی پرسنٹ ایڈوانس بھی لیتا ہوں۔"

"مجھے یاد ہے۔" فہد نے کہا اور اپنا بریف کیس اٹھا کر چیک بک نکال لی۔ وہ اسے چیک دے کر بولا۔ "کام کرنے سے پہلے مجھے انفارم ضرور کر دینا۔"

"اس کی تو فکر مت کر۔" جاوید نے کہا۔ "ہو سکتا ہے میں پرسوں ہی یہ کام کر لوں۔"

☆☆☆

بابر حسب معمول دفتر میں موجود تھا کیونکہ ابھی تک عثمانی صاحب بھی موجود تھے۔

اچانک فہد کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ جاوید کی کال تھی۔ اس کے کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا لیکن اس کے دل میں چور تھا اس لیے اس نے غیر شعوری طور پر ارد گرد دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔ "ہیلو۔"

"آج میں آپریشن کر رہا ہوں۔ میں اپنے آدمی کے ساتھ دفتر کے باہر موجود ہوں۔ بڈھا جیسے ہی باہر نکلے گا۔ میں اس کے پیچھے لگ جاؤں گا۔ اپنا سیل فون فری رکھنا، مشکل سے ایک گھنٹے میں تمہیں خوش خبری سناؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

فہد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بابر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کسی سے سیل فون پر بات کر رہا تھا۔

اسی وقت عثمانی صاحب اپنے کمرے سے باہر نکل کر کوریڈور سے گزرے۔ ان کے پیون کے ہاتھ میں ان کا بریف کیس تھا۔ وہ باہر جانے کے بجائے فہد کے کمرے کی طرف آئے تو فہد خود باہر نکل آیا۔

"فہد!" عثمانی صاحب نے اس سے کہا۔ "طارق کی طبیعت صبح سے خراب ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ کوریا کی پارٹی کا ایک ضروری ٹیلی فون آئے گا۔ تم اس سے پہلے آفس سے مت نکلنا۔"

"او کے سر۔" فہد نے کہا۔ "میں تو ابھی آفس ہی میں بیٹھوں گا۔ لاہور اور گجرات کے آفس منیجرز بھی کال کریں گے۔ ممکن ہے ملائیشیا سے بھی کسی کلائنٹ کی کال آجائے۔"

"او کے بیٹا! اللہ حافظ۔" عثمانی صاحب نے کہا اور

باوقار انداز میں چلتے ہوئے آفس کے داخلی دروازے کی طرف بڑھے۔

فہد نے بابر کو بھی مستعدی سے اٹھتے دیکھا۔ اس نے اپنی جیکٹ کی زپ بند کی اور ہیلمٹ اٹھا کر ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

وہ دوبارہ اپنے کمرے میں بیٹھ گیا اور وقت گزاری کو لیپ ٹاپ کھول لیا لیکن اس کا ذہن تو کہیں اور تھا۔ وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا ابھی تو عثمانی صاحب کو نکلے دس ہی منٹ ہوئے ہیں مجھے خود پر قابو پانا چاہیے۔ اس نے انٹرکام اٹھایا اور کافی کے لیے کہا پھر خود کو کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

عثمانی صاحب باہر نکلے تو بابر کی عقابی نگاہیں اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔

عثمانی صاحب کے ڈرائیور نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھولا اور جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئے تو بابر بھی اپنی ہیوی بائیک کی طرف دوڑا۔

اسی وقت اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ہیلمٹ پہننے سے پہلے ہی کان میں ہینڈ فری لگا لیا تھا۔ دوسری طرف بلال تھا۔ ''ہاں بلال۔'' بابر نے کہا۔

''سر، رشید نے آج آفس کے اردگرد دو مشکوک آدمیوں کو منڈلاتے دیکھا ہے۔'' بلال نے کہا۔ رشید اس گارڈ کا نام تھا جو سادہ لباس میں آفس کے باہر ڈیوٹی دیتا تھا۔ وہ گاڑیاں صاف کرتا تھا تاکہ کسی کو اس پر شبہ نہ ہو سکے۔

''ٹھیک ہے۔'' بابر نے کہا۔ ''عثمانی صاحب آفس سے نکل چکے ہیں۔ تم ان کی گاڑی پر نظر رکھنا۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے آرہا ہوں اور رابطہ منقطع مت کرنا۔ مجھے ایک ایک لمحے کی رپورٹ چاہیے۔''

''او کے سر۔'' بلال نے کہا۔ پھر بابر کے کانوں میں صرف ٹریفک کا شور ہی گونجتا رہا۔ وہ عثمانی صاحب کی پراڈو سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس نے اسپیڈ بڑھائی اور گاڑی کو اوورٹیک کر کے آگے نکل گیا۔ پھر وہ پراڈو کے بائیں جانب آیا اور اسپیڈ کم کر دی۔ گاڑی اس کے نزدیک سے گزری تو اس نے بہت غور سے اردگرد چلنے والوں کا جائزہ لیا۔

''سر! میں نے موٹر سائیکل پر سوار دو آدمیوں کو دیکھا ہے۔'' بلال کی آواز آئی۔ ''پہلے تو مجھے صرف شبہ تھا، اب یقین ہو گیا ہے۔''

''او کے۔'' بابر نے کہا اور بولا۔ ''اس وقت وہ لوگ کہاں ہیں؟''

''وہ عثمانی صاحب کی گاڑی کے بالکل پیچھے ہیں۔'' بلال نے کہا۔ ''میں نے انہیں کور کر رکھا ہے۔''

بابر نے اسپیڈ بڑھائی اور عثمانی صاحب کی گاڑی کے نزدیک پہنچ گیا۔

اچانک بلال کی ہیجانی آواز سنائی دی۔ ''سر! یہ دو نہیں بلکہ چار آدمی ہیں دوسری بائیک ابھی ابھی بائیں جانب کی سروس روڈ سے مین روڈ پر آئی ہے، دونوں بائیک والوں نے ایک دوسرے کو کوئی اشارہ بھی کیا ہے۔ دوسری بائیک بلیک کلر کی سیونٹی سی سی ہے اور...... سر، وہ اسپیڈ کم کر کے آپ کے پیچھے آگئے ہیں۔''

''تم میری فکر مت کرو۔ اس بائیک پر نظر رکھو جو عثمانی صاحب کی گاڑی کے پیچھے ہے۔''

''او کے سر!'' بلال نے کہا۔ پھر دوسری طرف سے خاموشی چھا گئی۔

آگے سگنل بند تھا۔ سگنل پر تیزی سے بابر نے گن جیب سے نکالی اور بہت مہارت سے اس پر سائیلنسر فٹ کر لیا۔

اسی وقت سگنل کھل گیا۔ اچانک بابر کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی پشت پر زوردار مکا مارا ہو، بابر سمجھ گیا کہ پیچھے سے کسی نے اس پر فائر کیا ہے۔ لیکن بلٹ پروف جیکٹ کی وجہ سے وہ بچ گیا تھا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کے سر کے پچھلے حصے میں زوردار جھٹکا لگا۔ دوسرا فائر اس کے سر پر کیا گیا تھا لیکن اس کا ہیلمٹ بھی خصوصی تھا اور مکمل بلٹ پروف تھا۔

اس نے پھرتی سے بائیک سائڈ اسٹینڈ پر لگائی اور اپنا ریوالور نکالتا ہوا اتر گیا۔ بائیک پر سوار دو افراد پر اس کی نظر پڑی۔ دونوں نے ہیلمٹ پہن رکھے تھے۔ وہ بابر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے اور ٹریفک کی وجہ سے بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔

اچانک بابر کی طرح وہ بھی بائیک سے اترے اور انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی، بابر نے ایک کے پیر کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گرا اور لنگڑاتا ہوا پھر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے آدمی پر بابر نے جمپ لگائی اور اسے دبوچ لیا۔

ٹریفک سگنل کھل چکا تھا اور گاڑیاں ہارن بجا رہی تھیں۔ جو گاڑیاں بابر اور ان اچکوں کے بائیکس کے پیچھے

تھیں انہیں راستہ نہیں مل رہا تھا۔
بابر نے ان دونوں کی تلاشی لی اور ان کی جیب سے ایک ایک ٹی ٹی برآمد کرلی، پھر پشت سے ان دونوں کی گردن دبوچی اور فٹ پاتھ کی طرف بڑھا۔ وہاں کئی موٹر سائیکل سوار بھی تماشا دیکھنے کو کھڑے ہوگئے تھے۔
''آپ لوگ ایک کام کریں۔'' اس نے نوجوانوں سے کہا۔ ''یہ دونوں بائیکس راستے سے ہٹا کر ایک طرف لگا دیں۔ میں ان دونوں کو تھانے لے جارہا ہوں۔''
اسی وقت وہاں سے پولیس کی ایک موبائل گزری۔
بابر نے ہیلمٹ اتار کے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔
وین کا ڈرائیور بابر کا پرانا شناسا تھا۔ اس نے بابر کو سلام کیا۔ اے ایس آئی وین سے باہر آگیا اور بولا۔ ''بابر صاحب! خیریت تو ہے؟''
''یار، ان دونوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ تم انہیں لے کر تھانے چلو میں ابھی آتا ہوں۔ ہاں، وہ پیچھے ان کی بائیک بھی کھڑی ہے۔ اسے بھی تھانے لے جانا۔''
موبائل وین کے سپاہیوں نے پلک جھپکتے میں ان دونوں کو دبوچ لیا۔
یہ کہہ کر وہ اپنی بائیک کی طرف بھاگا۔ اس ہنگامے میں دس منٹ گزر چکے تھے۔ بابر نے اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور اسے خوفناک انداز میں دوڑاتا ہوا ٹریفک کے درمیان زگ زیگ چلتا ہوا رواں ہوگیا۔ بھری پری شاہراہ پر اس کی بائیک کی رفتار سو اور ایک سو بیس کو چھو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہی خیال تھا کہ اگر خدانخواستہ عثمانی صاحب کو کچھ ہوا تو اس کی سیکورٹی ایجنسی شروع ہونے سے پہلے ہی اپنی موت آپ مرجائے گی۔ اسے عثمانی صاحب کی زندگی کی فکر تھی۔ انہیں کوئی نقصان پہنچتا تو بابر کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچتا۔
اس نے بائیک کی رفتار مزید بڑھادی۔ آگے ایک پیٹرول کا ٹینکر جارہا تھا۔
آئل ٹینکر اور ایک گاڑی کے درمیان مختصر سی جگہ سے گزرنے کے بعد بابر نے رفتار مزید بڑھائی اور بلال سے پوچھا۔ ''بلال تم کہاں ہو؟''
''میں اس وقت کالاپل کراس کرچکا ہوں۔ بائیک والے بھی اب کچھ کرنے کے موڈ میں نظر آرہے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ وہ پراڈو کے برابر پہنچ جائیں لیکن انہیں راستہ نہیں مل رہا ہے۔ ٹریفک بہت زیادہ ہے۔'' بلال نے کہا۔
''تم اگر کوئی خطرہ محسوس کرو تو بائیک والوں کو بلا جھجک اُڑا دینا۔ ویسے میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں۔''
بابر اس وقت ایف ٹی سی کے سامنے تھا۔ اس نے بائیک کی رفتار مزید بڑھائی دی۔
اس کی جنونی ڈرائیو کو دیکھ کر کئی گاڑی والے تو خود ہی سائیڈ میں ہوگئے۔
وہ جیٹ فائٹر کی طرح اڑتا ہوا کالاپل عبور کرگیا.....
پہلے اسے بلال کی بائیک نظر آئی، پھر پراڈو بھی نظر آگئی اس کے ساتھ ہی اس کی نظران دو موٹر سائیکل سواروں پر پڑی جو جان پر کھیل کر پراڈو کے برابر میں پہنچ گئے تھے۔
بابر نے ریوالور بائیں ہاتھ میں تھاما اور اپنی بائیک کی رفتار مزید بڑھادی۔
بابر کی موٹر سائیکل کی گرج... سن کر وہ دونوں کچھ گھبرا گئے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے پسٹل نکالا اور پلک جھپکتے میں گاڑی پر فائر کردیا۔
بابر کا دل اچھل کر حلق میں آگیا کیونکہ پراڈو بے قابو ہوئی تھی۔ بابر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پسٹل والے کی گردن پر فائر کردیا۔ دوسرا فائر بلال نے لیا جو موٹر سائیکل چلانے والے کی پیٹھ میں لگا۔ موٹر سائیکل بے قابو ہوکر پُرشور آواز کے ساتھ سڑک پر گری اور دور تک گھسٹتی چلی گئی۔ دونوں سوار بھی سڑک پر گرے اور سڑک پر کچھ دور گھسٹنے کے بعد رک گئے۔
انہیں چھوڑ کر بابر پراڈو کی طرف متوجہ ہوا جو لہراتی ہوئی فٹ پاتھ سے ٹکرا کر رک گئی تھی۔
بابر چشم زدن میں وہاں پہنچ گیا۔ گولی ڈرائیور کے دائیں بازو میں لگی تھی لیکن عثمانی صاحب محفوظ تھے اور سہمے ہوئے ایک طرف جھکے بیٹھے تھے۔ شاید انہیں خطرہ تھا کہ حملہ آور پھر ان پر فائرنگ کریں۔
''آپ ٹھیک تو ہیں سر؟'' بابر نے اپنا ہیلمٹ اتارتے ہوئے پوچھا۔
''میں ٹھیک ہوں۔'' عثمانی صاحب نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ڈرائیور کی فکر ہے۔''
''اس کی فکر مت کریں۔'' بابر نے کہا۔ ''اسے بازو میں گولی لگی ہے۔''
بلال اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ بابر نے اسے اشارہ کیا کہ ڈرائیور کو اسپتال لے جاؤ۔
اسی وقت فضا میں کسی ایمبولینس کا سائرن گونجا اور دوسرے ہی لمحے ایمبولینس پراڈو کے نزدیک آکر رک گئی۔
اس سے پہلے ہی ایمبولینس سے دو آدمی اسٹریچر لے

کر گاڑی تک آ گئے تھے۔ ڈرائیور اس وقت ہوش میں تھا۔ اس نے اسٹریچر پر لیٹنے سے انکار کر دیا۔ اور اپنے پیروں پر چل کر ایمبولینس میں بیٹھ گیا۔

بابر نے بلال کو اشارہ کیا۔ وہ بھی ڈرائیور کے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھ گیا۔

ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی روانہ ہوگئی۔

ان سے کچھ فاصلے پر دوسری ایک ایمبولینس بھی موجود تھی جو مرنے والوں کی لاشیں اٹھا رہی تھی۔

بابر نے اپنی گاڑی وہیں فٹ پاتھ پر چڑھا کر لاک کی اور پراڈو کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”پہلے گھر چلو۔“ عثمانی صاحب نے کہا۔ ”میں اس وقت سکون چاہتا ہوں۔“

عثمانی صاحب کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بابر مشکل سے سات منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔

گاڑی کا ہارن سن کر چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ بابر نے عثمانی صاحب کو اندر تک چھوڑا اور بولا۔ ”مجھے ابھی بہت سے ضروری کام نمٹانا ہیں۔ مجھے واپسی میں کم سے کم دو گھنٹے لگیں گے پھر میں آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتا دوں گا۔ ہاں، آپ کو اسپتال جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ آفس کے کسی بھی ذمے دار آدمی کو کال کر کے بتا دیں۔ وہ اسپتال چلا جائے گا۔ ویسے ڈرائیور زیادہ زخمی بھی نہیں ہوا ہے۔“ یہ کہہ کر بابر وہاں سے نکل آیا۔ اسے دوبارہ وہیں پہنچنا تھا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کی بائیک وہیں کھڑی تھی۔

☆☆☆

فہد بہت بے چینی سے جاوید کی کال کا منتظر تھا۔ اس نے ایک گھنٹے میں خوش خبری سنانے کا وعدہ کیا تھا اب تو دو گھنٹے ہو رہے تھے۔

اس نے گھبرا کر جاوید کو ٹیلی فون کر دیا۔

دوسری طرف سے ایک کرخت آواز سنائی دی۔ ”جی فرمایئے؟“

”مجھے جاوید صاحب سے بات کرنا ہے۔“ فہد نے کہا۔

”کون صاحب بول رہے ہیں؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

فہد نے ایک عقل مندی کی تھی کہ جاوید کو ہمیشہ ایک دوسری سم سے کال کرتا تھا۔ جاوید کے سیل میں اس کا نمبر پارٹنر کے نام سے محفوظ تھا۔

”میں جاوید کا ایک دوست ہوں۔“ فہد نے کہا۔

”جاوید ... ایک حادثے میں زخمی ہو گئے ہیں۔ اور اس وقت جناح اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ہیں۔ اس وقت جاوید کو آپ کی ضرورت ہے پارٹنر صاحب۔“ بولنے والے کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”آپ کون صاحب بات کر رہے ہیں؟“

”میں انسپکٹر نعیم ہوں۔“ بولنے والے نے جواب دیا۔

فہد لرز کر رہ گیا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔“

فہد نے پہلے تو وہ سم نکال کر توڑ پھوڑ کر پھینک دی جس کے ذریعے وہ جاوید سے بات کیا کرتا تھا، پھر وہ شدید اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ اس کے سر میں اچانک شدید درد شروع ہو گیا تھا۔ اس نے کافی منگائی اور اپنی دراز سے دو پین کلر ایک ساتھ پانی سے نگل گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر جاوید نے اس کے بارے میں کچھ الٹی سیدھی بکواس کر دی تو وہ بہت مصیبت میں پڑ جائے گا۔ اس نے اسپتال جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا کہ ممکن ہے عثمانی صاحب کی گاڑی پر فائر کرتے ہوئے جاوید کی بائیک کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا گئی ہوگی یا فائر کرتے وقت بے قابو ہو گئی ہوگی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا ہوگا۔ فہد نے سوچا۔ ورنہ زخمی ہونے کی اطلاع پولیس انسپکٹر کیوں دے رہا ہے؟

☆☆☆

بابر اس علاقے کے پولیس اسٹیشن پہنچا جہاں اس نے حملہ آور کے دو ساتھیوں کو گرفتار کر کے پولیس کے حوالے کیا تھا۔

بابر پولیس اسٹیشن پہنچا تو اسٹاف کے بہت سے لوگ اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ اس نے پولیس کی جاب چھوڑی ضرور تھی لیکن وہ ماتحت عملے میں اب بھی ہر دلعزیز تھا۔

ایک کانسٹیبل نے اسے لاک اپ تک پہنچا دیا جہاں دونوں حملہ آور بند تھے۔ اسے دیکھتے ہی ایک حملہ آور بولا۔

”انسپکٹر صاحب! میرا ساتھی زخمی ہے اور اس کا خون ضائع ہو رہا ہے۔ اگر اس کا خون اسی طرح بہتا رہا تو یہ مر جائے گا۔“

”تو مر جائے۔“ بابر نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم لوگوں نے بھی تو مجھے مارنے کی کوشش کی تھی۔“ پھر اس نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ”اسے ابھی تک تم لوگوں نے فرسٹ ایڈ نہیں دی ہے؟“

''اس کا زخم ایسا نہیں ہے کہ یہ مر جائے۔'' کانسٹیبل نے کہا۔ ''گولی اس کی پنڈلی ادھیڑتی ہوئی گزر گئی ہے۔ ہم نے اسے فوری طور پر فرسٹ ایڈ دے دی تھی۔ اس کا خون اب رک چکا ہے۔''

''لیکن پھر بھی اس کا اسپتال پہنچنا ضروری ہے۔'' حملہ آور بولا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' بابر نے پوچھا۔

''میرا نام ارشد ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''مجھ پر فائرنگ کیوں کی تھی؟'' بابر نے پوچھا۔

''فائرنگ؟'' اس نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''ہم آپ پر فائرنگ کیوں کرنے لگے۔ ہم تو آپ کو جانتے بھی نہیں ہیں۔ فائرنگ تو آپ نے ہم پر کی تھی۔ یہ بات تو ہمیں پوچھنا چاہیے۔''

''بہت اچھے جا رہے ہو۔'' بابر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں سچ اگلوانا بھی جانتا ہوں۔ اگر خود ہی سچ بولو گے تو فائدے میں رہو گے۔'' پھر وہ حوالات کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس نے ایس آئی ساجد کو ہدایت کی کہ وہ ان دونوں سے اگلوائیں کہ ان دونوں کا ان حملہ آوروں سے کیا تعلق تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ''ان لوگوں نے عثمانی صاحب کی گاڑی پر فائرنگ کی تھی۔ یہ عثمانی صاحب کی خوش قسمتی ہی ہے کہ اس حملے میں انہیں خراش تک نہیں آئی، ہاں ان کا ڈرائیور زخمی ہو گیا ہے۔ میں اگر وہاں موجود نہ ہوتا تو اس وقت عثمانی کی موت کی بریکنگ نیوز چل رہی ہوتی۔ تم ان لوگوں سے پوچھ گچھ کر کے مجھے بتاؤ میں اب چلتا ہوں۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ یہ دونوں صرف کرائے کے بدمعاش ہیں۔ انہیں اصل مجرموں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔''

بابر دوبارہ عثمانی صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں پولیس کی ایک موبائل موجود تھی۔ برآمدے میں پولیس کے دو سب انسپکٹر کھڑے تھے۔ شاید وہ لوگ ابھی ابھی آئے تھے۔

''سر، آپ یہاں کیسے؟'' ایک سب انسپکٹر نے پوچھا۔

''عثمانی صاحب نے میری سیکیورٹی ایجنسی کی خدمات حاصل کی تھیں۔'' بابر مسکرا کر بولا۔ ''آپ لوگ اپنی کارروائی کریں۔ میں عثمانی صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔''

''سر! آپ کوشش کریں، ممکن ہے عثمانی صاحب بیان دینے پر آمادہ ہو جائیں۔''

''وہ اس وقت کوئی بات نہیں کریں گے، میں کچھ ہی دنوں میں ان کی عادت جان گیا ہوں۔ ہاں، کل تک میں انہیں راضی کر لوں گا۔''

اسی وقت کئی پریس رپورٹر اور مختلف چینلز کے نمائندے بھی وہاں پہنچ گئے۔

''اب ان لوگوں کو روکنا آپ کا کام ہے۔'' بابر نے کہا اور اندر کی طرف چل دیا۔

اس کا نام سن کر عثمانی صاحب نے اسے اپنے بیڈروم میں بلا لیا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز تھے۔ کمرے میں ان کا بیٹا طارق اور اس کی بیوی بھی موجود تھی۔

اسے دیکھ کر عثمانی صاحب کھل اٹھے اور بولے۔ ''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اب ذرا مجھے تفصیلات بتاؤ۔''

بابر نے انہیں شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ جانتے تھے، تمہیں راستے سے ہٹائے بغیر وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

''جی سر، اسی لیے تو انہوں نے اپنے دو آدمیوں کو میرے پیچھے لگایا اور خود آپ کے پیچھے روانہ ہو گئے۔''

''بابر! میری ایک آفر ہے۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے چیف سیکیورٹی آفیسر کا عہدہ سنبھال لو۔ کمپنی کے تمام گارڈز کو ٹرینڈ کرو یا پھر اپنی مرضی کے آدمی رکھو۔''

''سوری سر!'' بابر نے آہستہ سے کہا۔ ''میں آزادانہ کام کرنے کا قائل ہوں۔ شاید اسی لیے پولیس کی ملازمت میں ناکام رہا۔ میں نے اپنی ایک سیکیورٹی ایجنسی قائم کی ہے اور......''

''تم کسی کو جواب دہ نہیں ہو گے۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کی بلڈنگ میں ابھی ایک پورا فلور موجود ہے جسے ہم لوگ گودام کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ تم اپنی ایجنسی کا آفس وہاں قائم کر سکتے ہو۔''

''میں وہاں بیٹھ کر اپنا ذاتی کام کر سکوں گا؟'' بابر نے پوچھا۔

''آف کورس۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''تم اپنے طور پر وہاں کام کرو گے۔ یوں سمجھو، تمہاری ایجنسی کا عثمانی گروپ آف انڈسٹری سے صرف اتنا تعلق ہو گا کہ ہماری

کمپنی بھی تمہاری کلائنٹ ہوگی۔

”مجھے آپ کی آفر منظور ہے..... لیکن......“

”لیکن کیا؟“ عثمانی صاحب نے پوچھا۔

”لیکن میں اس وقت پورا فلور افورڈ نہیں کر سکوں گا۔ پورا فلور کیا میں تو اس کے دو کمرے بھی افورڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تم نے میری جان بچا کر بہت بڑا کام کیا ہے۔ تم اس کا معاوضہ نہیں لو گے؟“

”اس کا معاوضہ تو میں لے چکا ہوں۔“ بابر نے کہا۔

”وہ تو ابتدائی اخراجات تھے۔ میں کل ہی سے وہ فلور تمہارے لیے تیار کرواتا ہوں۔ اس کے اخراجات بھی تمہارے معاوضے میں شامل ہوں گے۔“

”سر، میں نے اتنا بڑا کام تو نہیں کیا ہے۔“

”میری جان تمہاری نظر میں سستی ہے؟“ عثمانی صاحب مسکرائے۔

”آپ کی جان تو اللہ نے بچائی ہے سر، میں نے تو صرف کوشش کی تھی۔“

”بس، اب میں کچھ اور نہیں سنوں گا۔“ عثمانی صاحب کے لہجے میں شفقت تھی۔

”بابر صاحب!“ نادیہ نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔ ”آپ ڈیڈی کی بات مان جائیں۔ اتنا اصرار تو وہ اپنے بیٹے طارق سے بھی نہیں کرتے ہیں۔“

بابر نے پہلی دفعہ اس خوب صورت لڑکی کو غور سے دیکھا۔ وہ سرتاپا قیامت تھی۔ بابر کو لڑکیوں سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے اس نے اپنی نظریں ہٹالیں۔ اس کے نزدیک ہی وہیل چیئر پر طارق بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر بابر کو افسوس ہوتا تھا۔ اتنا خوب رُو جوان وہیل چیئر پر بیٹھا اچھا نہیں لگتا تھا۔

”جب آپ کی ایجنسی کام شروع کردے گی تو ہمیں گھر پر بھی تو سیکیورٹی کی ضرورت پڑے گی۔“ نادیہ نے کہا۔

”عثمانی صاحب لیو پروف سیکیورٹی ایجنسی کے پہلے کلائنٹ ہیں اس لیے سب سے پہلے میں ان ہی کی حفاظت کا فول پروف بندوبست کروں گا۔“

”او کے۔“ عثمانی صاحب مسکرائے۔

”اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے ابھی پولیس سے بھی نمٹنا ہے۔“

☆☆☆

فہد ان دنوں بہت زیادہ پریشان رہنے لگا تھا۔ وہ

وقت
بڑا نازک ہے

دو جیب کترے بس اسٹاپ پر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک بار بار اپنی جیبی گھڑی نکال کر دیکھتا اور پھر جیب میں رکھ لیتا۔

اسے بار بار گھڑی نکالتے اور جیب میں رکھتے ہوئے دیکھ کر دوسرے جیب کترے نے پوچھا۔ ”بھئی یہ تم بار بار اپنی گھڑی نکال کر وقت کیوں دیکھتے ہو؟“

”وقت بڑا نازک ہے۔ میں صرف یہ اطمینان کر رہا ہوں کہ گھڑی ابھی تک میری جیب میں ہی ہے۔“

ساہیوال سے ملک یاسین کی عقل مندی

بات بے بات آفس کے دوسرے اسٹاف کی بے عزتی کر دیتا تھا۔ عثمانی صاحب کے زندہ بچنے کا اسے بہت افسوس تھا۔ اس سے کہیں زیادہ افسوس اسے جاوید کی موت کا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس کا دوست تھا۔ افسوس اسے اس لیے تھا کہ اب اس کے پاس بھروسے کا کوئی آدمی نہیں تھا جو عثمانی صاحب کو ٹھکانے لگا سکے۔ وہ حد سے زیادہ مایوس ہو گیا تھا۔

نئی زندگی ملنے کی خوشی میں عثمانی صاحب نے اپنے گھر ایک پارٹی رکھی تھی۔ پارٹی میں اکثریت صنعت کاروں اور تاجروں کی تھی۔ ایک دو بیوروکریٹس بھی تھے۔ عثمانی صاحب نے فہد اور بابر دونوں کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ ان کے علاوہ آفس اسٹاف میں سے آصف، آئی ٹی ہیڈ انوار اور دو منیجرز شامل تھے۔

اس موقع پر نادیہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ طارق بھی بہت خوش تھا۔ فہد موقع کی تلاش میں تھا کہ نادیہ تنہا ہو تو اس سے بات کرے لیکن وہ تو مہمانوں کے درمیان گھوم رہی تھی۔ عثمانی صاحب کے کاروباری دوست ان کے لیے تحائف بھی لائے تھے اور پھول بھی۔

اچانک فہد کی نظر بابر پر پڑی۔ وہ نادیہ سے بہت بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ نادیہ بھی مسکرا مسکرا کر اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔ فہد کے دل میں اچانک نفرت دوڑ گئی۔ فہد کا پلان اسی حرام زادے بابر کی وجہ سے چوپٹ ہوا تھا۔ بابر نے اسے دیکھ کر دور سے ہاتھ ہلایا تو فہد مزید چڑ گیا۔ کمپنی کے دوسرے ملازمین اسے بہت عزت اور احترام سے مخاطب کرتے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر دور سے

ہی یوں ہاتھ ہلا رہا تھا جیسے فہد کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔

آصف کو یہاں بھی یہی پریشانی تھی کہ اسے آئی ٹی کا کوئی ماہر نہیں مل رہا تھا۔ عثمانی صاحب نے اسے الٹی میٹم دے دیا تھا کہ یا تو آپ اکاؤنٹ ری اسٹور کرائیں یا پھر اکاؤنٹ میں جو گھپلا ہے، اس کی ذمے داری قبول کریں۔

بالآخر فہد کو نادیہ سے بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ اس نے بہت بے تکلفی سے پوچھا۔ ''کیسی ہو نادی؟''

''میں نادی نہیں، نادیہ طارق عثمانی ہوں مسٹر فہد، مائنڈ اِٹ۔''

''اوہو، تم ابھی تک غصے میں ہو؟'' فہد نے مسکرا کر کہا۔

''تم نے تو اپنی سی کوشش کر لی لیکن ہوا کیا؟''

''کیسی کوشش مسز عثمانی؟'' فہد نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ڈیڈی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش۔'' نادیہ نے نفرت سے اسے گھورا۔

''تم ہوش میں تو ہو؟'' فہد کو اس کے انداز پر اچانک غصہ آ گیا۔ ''اور تم مجھ سے یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟''

''اپنی اوقات میں رہو ورنہ اس ملازمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔'' نادیہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اب اگر تمہاری طرف سے ڈیڈی کے خلاف کوئی کوشش ہوئی تو میں پولیس کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں گی۔''

''نادیہ! تم غلط سوچ رہی ہو ایسا نہیں ہے۔ میں......''

نادیہ اس کی بات سنے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

دوبارہ اسے نادیہ سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ نادیہ کی طرف سے خاصا بددل ہو گیا تھا۔ پارٹی میں بھی اس کا دل نہیں لگا اور وہ عثمانی صاب سے اجازت لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر بھی وہ بہت دیر تک نادیہ کے رویے پر غور کرتا رہا۔ وہ اداکاری نہیں کر رہی تھی بلکہ واقعی اس سے شدید نفرت کرنے لگی تھی۔ اربوں کی جو دولت اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی اب اس کے لیے خواب و خیال ہوتی جا رہی تھی۔ اس پلان کا بنیادی کردار نادیہ تھی۔ وہی جب اس سے بدظن ہو گئی تھی تو دولت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس نے سوچا اربوں کی دولت نہ سہی، وہ فرم سے کروڑوں روپے تو اب بھی حاصل کر سکتا ہے۔ ہاں یہ کرنا ہوگا۔ میں کمپنیز کے اکاؤنٹ سے دو چار ارب نکال کر پاکستان سے امریکا یا کینیڈا کی طرف نکل جاؤں گا۔

خواب میں اسے اپنی امی دکھائی دیں۔ وہ بہت افسردہ تھیں اور فہد سے ناراض بھی تھیں۔ انہوں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''فہد، کیا میں نے تجھے اسی دن کے لیے پڑھایا لکھایا تھا کہ تو میری ہونے والی بہو کو بیچ دے، اس کا سودا کر دے۔''

''میں نے اس کا سودا نہیں کیا ہے امی۔'' فہد نے کہا۔ ''میں نے تو طارق سے اس کی شادی کرائی ہے۔''

''تو نے اس کی شادی...... دولت ہی کے لیے کرائی ہے۔'' امی کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

پھر اسے مشتاق صاحب نظر آئے۔ وہ اسے قہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے۔ اور اس کو لعن طعن کر رہے تھے۔

اچانک فہد کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا چہرہ پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ اس نے سائڈ میز پر رکھا ہوا جگ اٹھا کر اس سے پانی لیا اور پورا گلاس ایک ہی سانس میں پی گیا۔ اس نے سوچا، میں نادیہ سے آخری مرتبہ بات کروں گا اگر اب بھی اس کے دل میں میرے لیے محبت ہے تو مجھے بتا دے، ورنہ میں بھی آئندہ اس کی شکل نہیں دیکھوں گا۔ وہ خود کو سمجھتی کیا ہے؟

دوسرے دن وہ آفس پہنچا تو اس کی طبیعت بہت بوجھل تھی۔ وہ اب جلد از جلد نادیہ سے آخری بات کرنا چاہتا تھا۔ عثمانی صاحب آفس میں موجود تھے۔ وہ ایک میٹنگ کے بہانے سے نکل گیا۔ اس نے سوچا، عثمانی صاحب کو علم بھی ہوگا کہ میں ان کے گھر گیا تھا تو میں طارق سے ملنے کا بہانہ بنا دوں گا۔

وہ عثمانی صاحب کے بنگلے پر پہنچا تو گارڈ نے اسے دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ لاؤنج میں ایک ملازمہ جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ فہد نے اس سے نادیہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ بیگم صاحبہ ٹیرس پر بیٹھی ہیں۔

فہد سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ نادیہ واقعی وہاں موجود تھی۔ فہد کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ پہلے کی طرح پیچھے سے نادیہ کے گلے میں بانہیں ڈال دے۔

نادیہ جب اس سے ناراض ہوتی تھی وہ ایسا ہی کرتا تھا جواب میں نادیہ مصنوعی غصہ دکھاتی، پھر مسکرانے لگتی۔

فہد اپنے دل پر ضبط نہ کر سکا اور اس نے بے اختیار نادیہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

نادیہ نے بھڑک کر پلٹنے کی کوشش کی لیکن وہ فہد کی بانہوں کے شکنجے میں تھی اس لیے کامیاب نہ ہو سکی۔ اس نے

بپھر کر کہا۔ ''فہد! مجھے چھوڑ دو۔''

''تم مجھے پہچانیں کیسے؟'' فہد نے کہا۔

''میں تمہیں بھی جانتی ہوں اور تمہاری ہر عادت کو بھی۔'' نادیہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''چھوڑو مجھے۔'' اس مرتبہ نادیہ نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

فہد نے اسے چھوڑ دیا اور بولا۔ ''نادیہ! آج میں تم سے صاف صاف بات کرنے آیا ہوں۔ اگر تم اب بھی اپنی ضد پر قائم ہو تو میں آئندہ نہیں آؤں گا بلکہ یہ شہر ہی چھوڑ دوں گا۔'' فہد ایک دم جذباتی ہوگیا۔

''کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' نادیہ نے بے اعتنائی سے کہا۔

''تمہاری شادی سے پہلے ہمارے درمیان کیا معاہدہ ہوا تھا؟'' فہد نے کہا۔

''ہمارے درمیان نہیں بلکہ صرف تم نے اپنے طور پر یہ معاہدہ کیا تھا۔'' نادیہ کا لہجہ تلخ تھا۔

''اب تم کیا چاہتی ہو؟'' فہد نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا اب تمہارے دل میں میری محبت کی کوئی رمق کوئی چنگاری ہے یا پھر پوری زندگی اسی معذور کے ساتھ گزارنا چاہتی ہو؟''

''تمیز سے بات کرو فہد۔'' نادیہ نے اسے جھڑک دیا۔ ''طارق میرے شوہر ہیں اور یہ میری نہیں تمہاری چوائس تھی۔''

''لیکن اس کی کچھ شرائط بھی تو تھیں۔'' فہد نے کہا۔

''تم کیا مجھے کھلونا سمجھتے ہو کہ جب جی چاہا اس سے خوب دل بہلایا اور پھر دولت کے لالچ میں اسے کسی دوسرے کے حوالے کر دیا۔ میں جیتی جاگتی، سانس لیتی عورت ہوں فہد۔ میرے بھی کچھ جذبات ہیں، کچھ احساسات ہیں۔ میں تمہاری اس گھناؤنی خواہش کی خاطر دو انسانوں کی جان نہیں لے سکتی۔ تم تو شاید دولت کے لیے اپنی ماں کا بھی سودا کر دیتے، اپنے باپ کا خون بھی کر دیتے۔''

''بکواس بند کرو نادیہ۔'' فہد اچانک بپھر گیا۔ ''تم میری مری ہوئی ماں کے لیے ایسا کہہ رہی ہو؟''

''میں تمہیں آئینہ دکھا رہی ہوں۔'' نادیہ نے تلخ انداز میں کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ ابھی ڈیڈی پر جو قاتلانہ حملہ ہوا ہے، اس میں تمہارا ہی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ میں ایک سال میں تمہارے راستے سے دونوں کانٹے صاف کر دوں گا۔'' پھر وہ چیخ کر بولی۔ ''مجھے نہیں چاہیے ایسی دولت جسے حاصل کرنے کے لیے دو انسانوں کا خون کرنا پڑے۔ میں تمہیں بہت خوددار اور بااصول سمجھتی تھی۔ ترقی کی خواہش ہر انسان کو ہوتی ہے لیکن ایسا جنون صرف مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کو ہوتا ہے۔ تم اسی دن میری نظروں سے گر گئے تھے جب تم نے طارق سے میری شادی کی بات کی تھی۔ میں اسے مذاق سمجھتی رہی لیکن تم تو دولت کے لیے اندھے ہو رہے تھے۔ اس وقت نہ تمہیں میری محبت یاد رہی، نہ میری وفا۔ اب میں تم سے نفرت کرتی ہوں فہد، شدید نفرت۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا ورنہ تم اس ملازمت سے بھی جاؤ گے۔ ناؤ گیٹ لاسٹ۔''

فہد اس سے زیادہ توہین برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بپھر کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ تمہاری یہ خوب صورت گردن دبوچ لوں اور اس وقت تک نہیں چھوڑوں جب تک تمہارے جسم میں سانس باقی ہے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں نے تم سے محبت کی تھی، آج بھی کرتا ہوں اور جب تک زندہ ہوں کرتا رہوں گا۔ اب تم کبھی یہاں میری شکل نہیں دیکھو گی۔'' یہ کہہ کر وہ بوجھل قدموں سے سیڑھیاں اتر گیا۔

☆☆☆

جب سے بابر نے جان پر کھیل کر عثمانی صاحب کی جان بچائی تھی، وہ اس کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کا ایک فلور تو انہوں نے بابر کو دے ہی دیا تھا، اس کی تزئین و آرائش بھی کمپنی ہی کرا رہی تھی۔ اس پر بابر نے شدید احتجاج کیا تھا لیکن عثمانی صاحب نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''تم آزادانہ طور پر اپنی سیکیورٹی ایجنسی چلانا چاہتے ہو نا، ضرور چلاؤ۔ عثمانی گروپ آف انڈسٹریز سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ہاں، کمپنی صرف تمہاری کلائنٹ ہوگی۔ اس کے علاوہ تم جسے چاہو اپنی خدمات فراہم کر سکتے ہو۔''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ کے آفس کا کرایہ بھی میں ادا کروں۔'' بابر نے کہا۔

وہ لوگ اس وقت عثمانی صاحب کے لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہاں نادیہ بھی تھی اور طارق بھی موجود تھا۔

''میں جانتا ہوں تم بہت خوددار ہو۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''جب تمہاری ایجنسی مالی طور پر مستحکم ہو جائے تو تم ضرور کرایہ دے دیا کرنا لیکن ابھی نہیں۔''

اچانک عثمانی صاحب کو کچھ خیال آیا اور وہ نادیہ سے بولے۔ "نادیہ بیٹا! ذرا میرا بریف کیس تو کسی سے منگوالو۔"

"میں خود ہی لے آتی ہوں۔ بریف کیس آپ کے بیڈروم کی الماری میں ہے۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی۔

"میں نے یہاں بھی سیکیورٹی کے فول پروف انتظامات کر دیے ہیں۔" بابر مسکرایا۔ "بظاہر آپ کو نظر نہیں آئے گا لیکن میرے آدمی ہر وقت یہاں کی نگرانی کرتے ہیں۔"

نادیہ، عثمانی صاحب کا بریف کیس لے کر واپس آگئی۔

عثمانی صاحب نے اس میں سے چیک بک نکالی اور بولے۔ "میں آفس کے بکھیڑوں اور دوسرے کاموں میں بالکل بھول گیا کہ تمہیں پے منٹ بھی کرنا ہے۔"

"کیسی پے منٹ سر؟" بابر حیرت سے بولا۔

"بھئی، میں نے سوچا تھا کہ تم نے اتنا بڑا کام کیا ہے۔ میں تمہیں اس کا انعام بھی دوں گا۔" انہوں نے چیک لکھ کر بابر کی طرف بڑھایا۔

"نہیں انکل!" بابر نے کہا۔ "پلیز آپ مائنڈ مت کیجیے گا لیکن میں اپنے کام کا معاوضہ لے چکا ہوں۔"

"یہ انعام ہے بابر صاحب!" نادیہ نے کہا۔ "اسے آپ معاوضہ کیوں سمجھ رہے ہیں؟"

"دیکھو ہماری بیٹی کتنی سمجھ دار ہے۔" عثمانی صاحب نے کہا۔ "جو بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی، وہ اس کی سمجھ میں آگئی۔"

"سر پلیز!" بابر نے کہا۔ "مجھے مجبور مت کریں۔ انعام، لاکھ، دو لاکھ یا زیادہ سے زیادہ پانچ لاکھ کا ہوتا ہے۔ ایک کروڑ کا نہیں، سوری سر، میں یہ چیک نہیں لے سکتا۔ میں نے اگر آپ کی جان بچائی ہے تو کوئی کمال نہیں کیا۔ یہ میرا پروفیشن ہے۔"

"لیکن میں نے کہا نا کہ یہ انعام ہے۔" عثمانی صاحب سنجیدہ ہو گئے۔

"مجھے مجبور مت کریں سر۔" بابر بھی سنجیدہ ہو گیا۔ "میری محنت کا صلہ مجھے مل چکا ہے اور میرے پاپا کہتے تھے کہ جو پیسا بغیر محنت کے آئے، وہ جائز نہیں ہوتا۔"

"او کے۔" عثمانی صاحب کچھ کھسیانے سے ہو گئے۔ اب تک لوگ ان سے لیتے ہی رہے تھے، کسی نے اتنی خطیر رقم کا چیک محض اپنے اصولوں کی خاطر انہیں لوٹایا نہیں تھا۔

"میں تمہاری خودداری کی قدر کرتا ہوں، تم نہ جانے کس دور میں جی رہے ہو۔"

"سر، میں اسی دور میں جی رہا ہوں لیکن اپنے اصولوں اور ضابطوں کے ساتھ۔"

عثمانی صاحب نے وہ چیک دوبارہ اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔

"بابر صاحب!" طارق نے کہا۔ "سنا ہے آپ کو کُتّے پالنے کا شوق ہے؟"

"ہاں، کتوں کا شوق تو مجھے جنون کی حد تک ہے۔ کتوں کی وجہ سے اماں نے مجھے گھر سے نکال دیا، وہ کہتی ہیں کہ جس گھر میں کتے ہوں، وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ میں نے انہیں لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر کتا چوکیداری اور حفاظت کے لیے پالا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن وہ نہ مانیں۔"

"اور آپ نے گھر چھوڑ دیا؟" نادیہ نے حیرت سے کہا۔

"تو کیا کرتا؟" بابر نے کہا۔ "لیکن گھر چھوڑنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدانخواستہ میرے دل میں اماں یا بابا جان کا احترام نہیں رہا۔ میں اب بھی دن میں کم سے کم دو دفعہ تو اماں کے پاس جاتا ہوں۔"

"بابر صاحب!" طارق نے کہا۔ "کتے پالنے کا شوق تو مجھے بھی ہے کیا آپ مجھے گرے ہاؤنڈ یا جرمن شیفرڈ کا ایک جوڑا دے سکتے ہیں؟"

"طارق صاحب! میرے پاس ڈوبرمین کا ایک بہترین پیئر ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے لیا تھا۔ وہ میں آپ کو دے سکتا ہوں۔"

"ڈیڈی!" طارق نے بچوں کی طرح کہا۔ "کیا میں بابر صاحب سے وہ پیئر لے لوں؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" عثمانی صاحب نے کہا۔

"طارق صاحب!" بابر نے کہا۔ "ڈوبرمین بہت خونخوار کتا ہے۔ آپ کو اس سے مانوس ہونے میں ایک مہینا تو لگ ہی جائے گا۔"

"نو پرابلم۔" طارق نے کہا۔ "میں دن بھر گھر میں پڑا پڑا بور ہو جاتا ہوں، مجھے وہ پیئر لا دیں۔"

دوسرے دن بابر ڈوبرمین کتوں کا وہ جوڑا لے آیا۔

وہ کتے دیکھنے میں تو اتنے خوفناک نہیں تھے لیکن بقول بابر کے انتہائی خونخوار تھے۔ ابھی ان کی عمر صرف چھ ہفتے تھی۔

طارق کو کتے کیا ملے کہ اس کے ہاتھ ایک نیا مشغلہ آ گیا۔ اس نے بنگلے کے عقب میں ان کے لیے شاندار ڈاگ ہاؤس بنوا دیا۔ اب اس کا زیادہ وقت کتوں ہی کے ساتھ گزرتا تھا۔

مزید چار ہفتے میں کتے خوب بڑے اور تندرست و توانا ہو گئے۔

☆☆☆

فہد اب بہت زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ اسٹاف کے لوگوں پر اب ڈانٹ ڈپٹ بھی نہیں کرتا تھا۔

وہ چند لمحے سوچتا رہا، وہ اب تک خوف کے سائے میں جی رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی دراز سے ایک ڈائری نکالی۔ اس کا جائزہ لیا اور وہ ڈائری لے کر آصف کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ اس مسئلے کو کیس حل کرنا ہے۔

آصف اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ عموماً وہی آصف کو اپنے کمرے میں طلب کرتا تھا۔ وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''جی فہد صاحب! کوئی خاص کام ہے۔ آپ مجھے بلا لیتے۔''

''خاص کام ہے اسی لیے تو آیا ہوں۔'' فہد نے مسکرا کر کہا۔ ''اسے کہتے ہیں بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں سر؟'' آصف نے کہا۔

''بھئی جس رقم کا حساب نہیں مل رہا تھا، وہ مل گیا ہے۔ وہ رقم نہ جانے کیسے میں نے اپنے اکاؤنٹ میں ڈپازٹ کرا دی۔ اس کا حساب اس ڈائری میں ہے۔ ویسے آپ کو یاد ہے کہ وہ رقم کتنی تھی؟''

''مجھے تو وہ فگر ازبر ہیں سر۔'' آصف کے چہرے پر اچانک طمانیت آ گئی تھی۔ وہ فگر اکتیس کروڑ اکاون لاکھ چونسٹھ ہزار اور دو سو پندرہ روپے ہے، میری تو راتوں کی نیندیں حرام تھیں سر۔'' آصف نے کہا۔ ''مجھے تو خواب میں بھی یہی فگر نظر آتی تھی۔''

''اس ڈائری میں اتنی ہی رقم کا ایک چیک بھی ہے۔ وہ آپ میرے اکاؤنٹ سے کمپنی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرا دیں۔ اب تو خوش ہیں آپ؟''

''سر، آپ نے تو میری بہت بڑی الجھن دور کر دی۔ آج رات مہینوں بعد میں سکون کی نیند سو سکوں گا۔''

''آپ عثمانی صاحب کو بتا دیجیے گا کہ وہ رقم غلطی سے فہد صاحب نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی تھی۔ اب بینک اسٹیٹ منٹ دیکھ کر انہیں علم ہوا کہ میرے ذاتی اکاؤنٹ میں اتنی رقم تو ہی نہیں۔ مزید چھان بین کے بعد معلوم ہوا کہ وہ رقم فہد صاحب کے اکاؤنٹ میں محفوظ ہے۔'' یہ کہہ کر فہد کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے حساب لگایا تو اسے علم ہوا کہ اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں اب صرف ستائیس لاکھ روپے بچے ہیں۔ یہ رقم اس کی محنت کی کمائی کی تھی۔

اس نے ایک کارٹن میں وہاں سے اپنا ذاتی سامان سمیٹا، درازیں خالی کیں اور سارا سامان پیون کے ذریعے اپنی گاڑی میں رکھوا دیا۔

عثمانی صاحب صبح سے کسی اہم میٹنگ میں تھے۔ میٹنگ کے بعد آفس آنے کے بجائے ان کا گھر جانے کا پروگرام تھا۔

فہد روانگی سے پہلے آفس کے ہر فرد سے ملا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

گھر جا کر وہ صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے گھر کے کام کاج کے لیے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی جو صبح آ کر گھر کا جھاڑو پونچھا کرتی، برتن دھوتی، پھر فہد کے لیے کھانا بنا کر فریج میں رکھ کر چلی جاتی۔

اس رات اسے کئی مہینے بعد پُرسکون نیند آئی۔

☆☆☆

آفس کے بعد بابر کا زیادہ وقت عثمانی صاحب ہی کے گھر میں گزرتا تھا بلکہ اکثر وہ سیکیورٹی کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے لنچ کے وقت بھی عثمانی صاحب کے بنگلے پر چلا جاتا تھا۔ نادیہ اور طارق اب اس سے بہت زیادہ بے تکلف ہو گئے تھے۔

ایک دن نادیہ نے باتوں باتوں میں مسکرا کر کہا۔ ''بابر صاحب! ایک بات پوچھوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟''

''پوچھیں۔'' بابر مسکرایا۔ ''آپ کی بات کا برا مان کر میں اپنا ہی نقصان کروں گا۔''

''یہ بتایئے، پیسے کیا آپ کو کاٹتے ہیں یا آپ کو رقم سے ازلی بیر ہے؟''

''میں سمجھا نہیں میڈم۔'' بابر نے کہا۔

''آپ نے ڈیڈی کا دیا ہوا ایک کروڑ روپے کا چیک واپس کر دیا، پچھلے دنوں طارق نے آپ کو پچاس لاکھ روپے دینا چاہے تو آپ نے انکار کر دیا، آخر کیوں؟''

''مسز عثمانی!'' بابر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے پاپا

نے شروع ہی سے میرے ذہن میں یہ بات نقش کر دی تھی کہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت میں جو مزہ ہے وہ حرام کی دولت میں نہیں آتا بلکہ آدمی اس سے مزید پریشانیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو دولت بغیر محنت کے ملے، وہ حرام ہے۔ یہ میرا اپنا نقطہ نظر ہے ورنہ میں نے دولت کی خاطر لوگوں کو خون خرابہ کرتے دیکھا ہے، اپنا ایمان بیچتے دیکھا ہے۔ رشتوں کی بولی لگاتے دیکھا ہے اس دولت سے تو ایک وقت کی روکھی روٹی کہیں بہتر ہے۔''

''آپ نے بالکل صحیح کہا۔'' نادیہ نے کہا۔ ''اور آپ واقعی سب سے الگ ہیں۔''

''مجھے یہ خوف ہے کہ یہ اصول عموماً لوگوں کو پسند نہیں آتے، خاص طور پر لڑکیوں کو تو ان اصولوں سے بیر ہے، اس لیے میں نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''خیر چھوڑیے اس بات کو۔ آپ جم جوائن کرنے والی تھیں۔ اس کا کیا ہوا؟'' بابر نے موضوع بدل دیا۔

☆☆☆

اس دن حسب معمول طارق اپنی وہیل چیئر پر ڈاگ ہاؤس کی طرف چلا گیا۔ اب اس کے ڈاگ ہاؤس میں ڈوبر مین کے علاوہ جرمن شیفرڈز اور گرے ہاؤنڈز کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ کتوں کو اپنے ہاتھوں سے غذا کھلاتا تھا تاکہ کتے اس سے مانوس رہیں۔

بنگلے میں طارق کے علاوہ ایک ملازم خیر دین تھا جو کتوں کی دیکھا بھال کرتا تھا۔ کتے اس سے بھی مانوس تھے۔

طارق نے خیر دین سے کہا۔ ''ڈوبر مین کے پنجرے کا دروازہ کھول دو۔''

خیر دین نے پنجرے کے دروازے پر لگا ہوا لاک کھول دیا۔

دونوں کتے اچھل کر باہر نکلے اور غراتے ہوئے خیر دین کی طرف بڑھے۔ ان کی غراہٹ میں پیار نہیں بلکہ شدید غصہ تھا۔ پھر اچانک دونوں کتوں نے خیر دین پر حملہ کر دیا۔ خیر دین بری طرح چیخا لیکن ڈوبر مین غصے میں سب سے پہلے سامنے والے کی گردن دبوچتا ہے اور ہاتھوں سے ادھیڑ دیتا ہے، پھر اپنے مضبوط جبڑے کے جھٹکے سے گردن توڑ دیتا ہے۔

''ٹائی سن!'' طارق نے چیخ کر کتے کو آواز دی اور وہاں پڑی ہوئی وہ چھڑی اٹھالی جو خیر دین اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔

طارق چھڑی لے کر کتوں کی طرف بڑھا۔ یہ اس کی شدید غلطی تھی۔ بپھرا ہوا ڈوبر مین چھڑی یا اس قسم کی کوئی اور چیز دیکھ کر مزید مشتعل ہو جاتا ہے۔ خیر دین کو چھوڑ کر دونوں کتوں نے طارق پر چھلانگ لگا دی۔ انہوں نے طارق کی وہیل چیئر الٹ دی اور اس کا نرخرہ ادھیڑ ڈالا۔

طارق اور خیر دین کی فلک شگاف چیخیں سن کر سب سے پہلے مالی وہاں پہنچا کیونکہ وہ اس حصے کے نزدیک تھا۔ خیر دین اور طارق کو خون میں لت پت دیکھ کر مالی وہاں سے سراسیمہ ہو کر بھاگا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ بچاؤ...... بچاؤ۔''

''کیا ہوا؟'' دو سیکیورٹی گارڈز کود کر اس کے سامنے آ گئے۔ اس نے اس طرف اشارہ کر دیا جہاں ڈاگ ہاؤس تھا۔

دونوں گارڈز اپنی گنیں سنبھالتے ہوئے ڈاگ ہاؤس کی طرف دوڑ پڑے۔

دونوں کتوں نے خیر دین اور طارق کا نہ صرف نرخرہ ادھیڑا تھا بلکہ ان کے چہرے اور جسم بھی بھنبھوڑ ڈالے تھے۔ گارڈز کو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو گیا کہ ان دونوں میں سے کوئی اب زندہ نہیں ہے۔

کتے گارڈز کی طرف بھی جھپٹے لیکن وہ دونوں پہلے ہی سے تیار تھے، ان کی گنز نے شعلے اگلے اور دونوں کتے وہیں ڈھیر ہو گئے۔

فائرنگ کی آواز سن کر بنگلے کے دوسرے ملازمین کے ساتھ نادیہ بھی ڈاگ ہاؤس کی طرف دوڑی۔ وہاں خیر دین اور طارق کی خون میں لت پت ادھڑی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ نادیہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے وہ ہولناک منظر دیکھا پھر اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی اور وہ چکر کھا کر وہیں گر پڑی۔ بنگلے کے تمام ملازمین سہمے کھڑے تھے۔

☆☆☆

فہد نے اطمینان سے ناشتا کیا۔ پھر وہ اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ وہ اٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ لے آیا اور اس پر تیزی سے کچھ ٹائپ کرنے لگا۔ ٹائپ کرنے کے بعد اس نے تنقیدی نظروں سے اپنی تحریر کا جائزہ لیا، پھر اسے ای میل کرنے والا تھا کہ کچھ سوچ کر رک گیا۔ اس نے لیپ ٹاپ کو پرنٹر سے منسلک کیا، اس تحریر کے دو پرنٹ آؤٹ نکالے اور ان پر سائن کر کے انہیں ایک لفافے میں رکھ لیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی طمانیت تھی۔

وہ دوبارہ اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ اور بزنس کا صفحہ کھول

کراس کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر آفس کے جی ایم اظہر کا نام بلنک کر رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کیے بغیر سیل فون صوفے پر اچھال دیا۔

فوراً ہی اس کے سیل فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس مرتبہ بھی جی ایم کی کال تھی۔ اس نے برا سا منہ بنا کر سیل فون دوبارہ ایک طرف رکھ دیا اور بڑبڑایا۔ ”جب میں بتا چکا ہوں کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو یہ لوگ کیوں مجھے ڈسٹرب کر رہے ہیں؟“

اس نے دوبارہ اخبار اٹھا لیا۔ مشکل سے ایک منٹ گزرا تھا کہ اس مرتبہ اس کی لینڈ لائن کے ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی بجی۔ فہد جھنجلا کر اٹھا۔ ٹیلی فون کے اسکرین پر آصف کا نمبر تھا۔ اس نے جھٹکے سے ریسیور اٹھا لیا اور ترش لہجے میں بولا۔ ”آصف صاحب! جب میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں آفس نہیں آسکوں گا، پھر آپ لوگ مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہے ہیں؟ اب مجھے کال......“

آصف نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی اور بولا۔ ”سر، عثمانی صاحب کے گھر میں بہت بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔ ان کے گھر سے ابھی ان کے ملازم کا ٹیلی فون آیا تھا۔ طارق صاحب کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔“

”وھاٹ؟“ فہد نے حیرت سے کہا۔

”کیسا حادثہ آصف صاحب؟“ فہد گھبرا کر بولا۔

”تفصیلات کا علم تو مجھے بھی نہیں ہے۔ میں ایک دو ضروری کام نمٹا کر خود بھی ان کے بنگلے پر جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں ابھی پہنچتا ہوں۔“ فہد نے کہا۔

پھر اس نے بہت عجلت میں کپڑے تبدیل کیے اور عثمانی صاحب کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں کا منظر ہی عجیب تھا۔ گھر کے ملازمین سہمے ہوئے ایک طرف کھڑے تھے اور پولیس کا ایک سب انسپکٹر ان سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ عثمانی صاحب نڈھال سے برآمدے ہی میں ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور وہ اس وقت اپنی عمر سے بھی دس پندرہ سال بڑے لگ رہے تھے۔

فہد ان کے پاس پہنچا تو وہ اس سے لپٹ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔

فہد پریشان ہو گیا اتنے مضبوط اعصاب اور قوتِ ارادی کا شخص، عثمانی گروپ آف انڈسٹریز جیسے عظیم الشان بزنس ایمپائر کا مالک بچوں کی طرح بلک رہا تھا۔ اپنے بال نوچ رہا تھا۔

وہ بوجھل قدموں سے ڈاگ ہاؤس کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک اے ایس آئی موجود تھا۔ اس نے فہد کو دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا۔

وہ منظر اتنا دل خراش تھا کہ فہد کو چکر سا آ گیا۔ ایک طرف خیر دین کی ادھڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ اس کے گرد خون کا تالاب سا بن گیا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر طارق کی وہیل چیئر الٹی پڑی تھی اور اس کے نزدیک ہی طارق کی لاش تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کسی جنگلی درندے نے بری طرح بھنبھوڑا ہو۔ ان دونوں سے کچھ فاصلے پر دونوں کتوں کی لاشیں پڑی تھیں۔

وہاں بابر بھی موجود تھا۔ پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور ایک حوالدار ڈاگ ہاؤس کا تفصیلی جائزہ لے رہے تھے۔

وہ بابر کے نزدیک پہنچ گیا اور اس سے پوچھا۔ ”مسٹر بابر! یہ سب کیا ہے؟“

”یہ ان خونخوار کتوں کی کارستانی ہے۔“ بابر نے مردہ کتوں کی طرف اشارہ کیا۔

”عثمانی صاحب نے کتے کب پال لیے؟“ فہد نے پوچھا۔ ”انہیں تو کتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی؟“

”یہ کتے عثمانی صاحب نے نہیں، طارق صاحب نے پالے تھے۔“ بابر نے کہا۔ ”انہیں کتے پالنے کا شوق تھا۔ یہ کتے اس وقت محض چند ہفتے کے تھے جب میں نے طارق صاحب کو لا کر دیے تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا بھی تھا کہ آپ کو کتے پالنے کا شوق ہے تو کوئی بے ضرر سا فوکس ٹیریئر یا اسی نسل کا کوئی کتا پال لیں لیکن وہ ڈوبر مین، جرمن شیفرڈ اور گرے ہاؤنڈز پالنا چاہتے تھے۔ کہتے تھے کہ کتا اگر خونخوار نہ ہو تو اسے رکھنے کا کیا فائدہ؟“

بابر کی باتوں نے اسے اور بھی اس سے بدظن کر دیا تھا۔

پولیس اپنی کارروائی میں مصروف تھی۔ پولیس کا ایک فوٹو گرافر دونوں لاشوں کی تصویریں لے رہا تھا اور غالباً ویڈیو بھی بنا رہا تھا۔ فنگر پرنٹ ایکسپرٹ وہاں سے انگلیوں کے نشانات اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے، پھر پولیس نے دونوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیں۔

عثمانی صاحب اسی حالت میں بیٹھے تھے۔ بابر نے ان سے کہا۔ ”سر! آپ یہاں بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہوں گے، چلیں بیڈ روم میں چل کر آرام کریں۔“

”اب تو آرام ہی کرنا ہے۔“ عثمانی صاحب نے

کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ "جاؤ تم اپنا کام کرو۔"
بابر اُن کے سرد لہجے کو سن کر پیچھے ہٹ گیا۔
فہد نے آگے بڑھ کر کہا۔ "سر، کب تک یہاں بیٹھے رہیں گے۔ چلیں اٹھیں۔"
اسے دیکھ کر عثمانی صاحب پھر بری طرح رونے لگے۔ فہد نے کہا۔ "حوصلہ رکھیں سر! پلیز آپ روئیں مت۔"
وہ فہد کا سہارا لے کر اٹھے اور بوجھل قدموں سے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے۔ عثمانی صاحب تکیوں کے سہارے بیڈ پر نیم دراز ہو گئے۔
فہد کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس نے کمپنی کی وہ رقم لوٹا دی تھی جس کا حساب نہیں مل رہا تھا۔ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دینے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ بلکہ استعفے کا پرنٹ آؤٹ نکال کر اس پر سائن بھی کر دیے تھے کہ اچانک یہ سانحہ رونما ہو گیا۔ عثمانی صاحب بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے تھے۔ حالات پہلے والے ہوتے تو وہ عثمانی صاحب کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا لیکن نادیہ کے رویے کے بعد ایک دم سب کچھ اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ایسے وقت میں عثمانی صاحب کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔
اس نے عثمانی صاحب کو کافی پلا کر کچھ دیر آرام کا مشورہ دیا اور خود کمرے سے باہر نکل آیا۔ اسے اب تک نادیہ دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ دکھائی دے بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو عدت میں ہو گی۔
وہ عثمانی صاحب کے بیڈ روم سے نکل کر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔ لاؤنج میں اس وقت آفس کے کئی لوگ موجود تھے۔ ان سبھی کے چہرے پر افسردگی کا تاثر تھا۔ ابھی ایک مرحلہ مزید باقی تھا۔ طارق اور خیر دین کے پوسٹ مارٹم کے بعد ان کی تدفین کا مرحلہ۔
پھر وہ اذیت ناک مرحلہ بھی طے ہو گیا اور طارق کی کٹی پھٹی لاش کو منوں مٹی کے نیچے دبا کر وہ لوگ واپس آ گئے۔
طارق کے سانحے کو چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ فہد آخری بار طارق کی موت کے موقع پر عثمانی صاحب کے بنگلے پر گیا تھا۔ پھر وہاں جانے کو دل ہی نہیں چاہا۔
ایک دن آفس کے جی ایم اور آصف صاحب اس کے پاس آئے۔ آصف نے اس سے کہا۔ "فہد صاحب! عثمانی صاحب نے تو کسی بھی کام میں دلچسپی لینا چھوڑ دی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ پہلے کی طرح اپنے گھر پر پارٹی کریں۔ ان کی عدم دلچسپی کی وجہ سے کئی کنٹریکٹ ہمارے ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ مارکیٹ میں لوگوں نے یہ افواہ اڑا دی ہے کہ عثمانی صاحب بیٹے کی موت کے بعد ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔"
"ہاں۔" فہد نے کہا۔ "اس قسم کی کچھ اطلاعات مجھے بھی ملی ہیں۔"
"عثمانی صاحب گھر میں پارٹی کریں گے تو لوگوں کی یہ غلط فہمی تو دور ہو جائے گی کہ وہ خدانخواستہ ذہنی توازن کھو چکے ہیں۔" جی ایم اظہر نے کہا۔
"اور یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔" آصف بولا۔ "وہ آپ کی بات کبھی نہیں ٹالتے۔"
"میں کوشش کروں گا، ممکن ہے وہ میری بات مان جائیں۔" فہد نے کہا۔
وہ دونوں رخصت ہو گئے تو فہد نے سوچا، عثمانی صاحب ہر معاملے میں خوش قسمت ہیں۔ انہیں کام کرنے کے لیے پُرخلوص اور دیانت دار اسٹاف ملا ہے، سیکورٹی کے لیے بابر جیسا فرض شناس انسان موجود ہے لیکن اولاد کے معاملے میں وہ نہ جانے کیوں بدقسمت نکلے۔
وہ ان کے کمرے میں جانے ہی والا تھا کہ انٹرکام پر انہوں نے خود ہی فہد کو بلا لیا۔
وہ کمرے میں داخل ہوا تو اسے دھچکا سا لگا۔ عثمانی صاحب شکن آلود سوٹ میں ملبوس تھے۔ انہوں نے غالباً دو دن سے شیو بھی نہیں بنائی تھی۔ ان کا چہرہ جو کبھی ہر وقت تروتازہ رہتا تھا اب مرجھا کر رہ گیا تھا۔
"آؤ فہد!" انہوں نے آہستہ سے کہا۔ "بیٹھو۔"
وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
"آج دسمبر کی پچیس تاریخ ہے۔" انہوں نے کہا۔
"میں چاہتا ہوں کہ نئے سال سے عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کی نئی پالیسی جاری کر دوں۔ میں اس سلسلے میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"
"سر، پالیسی میٹر تو آپ ہمیشہ جنرل میٹنگ میں اناؤنس کرتے ہیں پھر......"
"میں ابھی تم سے صرف مشورہ کرنا چاہ رہا ہوں۔" عثمانی صاحب مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں بھی کرب تھا۔ "فہد، میں نے عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے منافع میں سے اسٹاف کو شیئر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اتنی دولت کیا میں قبر میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

''ایسی باتیں مت کریں سر۔'' فہد نے کہا۔
''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آفس کے ہر ایمپلائی کا شیئر ون پرسنٹ ہوگا۔''
''ون پرسنٹ۔'' فہد نے حیرت سے سوچا۔
''تمام منیجرز، ڈپارٹمنٹ ہیڈز کا شیئر پانچ پرسنٹ ہو گا۔'' عثمانی صاحب نے یوں کہا جیسے پانچ روپے کی بات کررہے ہوں۔ یہ فہد جانتا تھا کہ یہ پانچ تقریباً ستر سے اسی لاکھ تک ہوگا۔
''سر!......''
''ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔'' انہوں نے فہد کو ٹوک دیا۔''اس منافع میں تمہارا شیئر تھرٹی پرسنٹ ہوگا۔''
فہد کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ خاموشی سے عثمانی صاحب کو دیکھتا رہا۔
وہ مسکرا کر بولے۔''اگر تمہیں یہ کم لگ رہا ہے تو تھرٹی فائیو پرسنٹ کرلو۔''
''نہیں سر۔'' تھرٹی پرسنٹ بھی زیادہ بلکہ بہت زیادہ ہے۔''
انہوں نے اپنے سامنے رکھے ہوئے فولڈر سے ایک پرنٹ آؤٹ نکالا اور بولے۔''اس میں پالیسی کی پوری تفصیل ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔''ایک منٹ!'' یہ کہہ کر وہ لیپ ٹاپ پر مصروف ہوگئے۔ پھر اس میں سے دوسرا پرنٹ آؤٹ نکالا۔ اس پر اپنے سائن کیے اور اسٹیمپ لگا کر فہد کو دے دیا۔''یہ تم آصف صاحب کو دے دینا۔''
''لیکن سر! ایک شرط پر۔'' فہد نے ہمت کر کے کہا۔
''اس پالیسی کا اعلان ہم نئے سال کے موقع پر ایک تقریب میں کریں گے اور وہ تقریب آپ کے بنگلے پر ہوگی۔''
عثمانی صاحب فہد کی بات سن کر کچھ گم صم سے ہو گئے اور بولے۔''بھئی، ہم آفس میں اسٹاف کو ایک پارٹی دے کر بھی اس کا اعلان کر سکتے ہیں۔''
''نہیں سر!'' فہد نے کہا۔''آپ کو میری بات ماننا ہی ہوگی۔''
''اوکے۔'' انہوں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''اس پارٹی میں صرف آفس کا اسٹاف ہی نہیں ہوگا بلکہ وہ تمام لوگ ہوں گے جو اس سے پہلے ہماری پارٹیز میں شریک ہوتے رہے ہیں۔''
عثمانی صاحب چند لمحے تک اسے خاموشی سے دیکھتے رہے پھر اٹھ کر اسے گلے لگا لیا اور گلوگیر لہجے میں بولے۔

''میں واقعی خوش قسمت ہوں۔ مجھے ایسا اسٹاف ملا جو میرے اپنوں سے بڑھ کر میرا خیال رکھتا ہے۔''
''تو پھر آپ تیار رہیے گا۔ میں رات کو ٹھیک آٹھ بجے آپ کو گھر سے پک کرلوں گا۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔
اپنے کمرے میں آکر اس نے لسٹ کا جائزہ لیا۔ اس میں معمولی کلرک سے لے کر ہر شخص کا نام تھا، صرف بابر کا نام نہیں تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ بابر عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کا ملازم کب ہے؟
اس دن اسے عثمانی صاحب کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ انہوں نے نہ صرف اپنے لباس پر توجہ دی تھی بلکہ اپنا مخصوص پرفیوم بھی استعمال کیا تھا۔
وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں پہنچے تو وہاں موجود لوگ عثمانی صاحب کو دیکھ کر چونکے اور ان سے ملاقات کے لیے آگئے۔
فہد نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ اس کی نظر نادیہ پر پڑی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے انتہائی قیمتی اور ماڈرن لباس پہن رکھا تھا، چہرے پر وہی شادابی اور نکھار تھا اور وہ انتہائی خوش نظر آرہی تھی۔
''نادیہ یہاں اکیلی کیا کررہی ہے؟'' فہد نے سوچا۔
پھر اسے دوسرا زوردار دھچکا لگا۔ بابر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ وہ بھی بہترین لباس میں تھا اور چہرے پر لگاوٹ کے آثار تھے۔
نوالہ فہد کے حلق میں اٹک گیا۔ اس نے پانی کے گھونٹ سے اٹکا ہوا نوالہ حلق سے نیچے اتارا اور عثمانی صاحب سے کہا۔
''سر! یہاں کا کھانا تو بہت بکواس ہے۔ آپ کو سی فوڈز پسند ہے نا، چلیے ہم آج سی فوڈز ہی کھائیں گے۔''
اس نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔
''تم بھی بعض اوقات میری طرح حرکتیں کرتے ہو۔'' عثمانی صاحب مسکرائے۔''ایک لمحے میں فیصلہ کرتے ہو اور اس پر عمل بھی کرلیتے ہو۔ مجھے تمہاری یہی عادت پسند ہے۔''
اب فہد انہیں کیسے بتاتا کہ اس نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟ اس کا تو کچھ کھانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔
گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔''سر! شاید آپ نے بابر کی سروسز اپنی سیکیورٹی کے لیے حاصل کی ہیں؟''
''اس میں شاید کی گنجائش کہاں ہے؟'' عثمانی صاحب مسکرائے۔
''پھر آپ کا وہ سیکیورٹی چیف کہاں ہے؟'' اس نے

''کمپنی کے مالک کا بھتیجا ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم نیکر پہن کر دفتر آنے لگو......''

اپنے لہجے کی ناگواری کو چھپاتے ہوئے کہا۔

''بھئی، اب تو مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کافی عرصے سے کوئی دھمکی آمیز فون یا بھتے کی پرچی بھی موصول نہیں ہوئی ہے اس لیے......''

''اس لیے آپ اپنی سیکیورٹی کی طرف سے بے پروا ہو گئے؟'' فہد نے ان کا جملہ پورا کر دیا۔

عثمانی صاحب کی وجہ سے اس نے اگل نگل کر کھانا کھایا، پھر انہیں گھر چھوڑنے کے بعد وہ بھی اپنے گھر چلا گیا۔

فہد کو رہ رہ کر نادیہ کا خیال آرہا تھا۔ اس کی شادی طارق سے تو فہد نے کرائی تھی اس لیے وہ مجبور تھی لیکن بابر میں ایسی کیا خاص بات تھی جو وہ اس سے اتنی بے تکلف ہوگئی تھی کیا وہ بابر کو پسند کرنے لگی تھی؟ فہد نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نہ صرف یہ ملازمت چھوڑ دے گا بلکہ ملک ہی سے چلا جائے گا لیکن اچانک طارق کی ناگہانی موت کے باعث وہ عثمانی صاحب کو استعفیٰ دینے کی ہمت نہ کرسکا۔

پھر وہ پارٹی کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ ان کے پاس صرف پانچ دن تھے۔ فہد کے ساتھ آفس کے دوسرے اسٹاف نے مل کر پارٹی کے تمام انتظامات مکمل کر لیے۔

عثمانی صاحب کا بنگلا ایک عرصے بعد بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ اس مرتبہ مہمانوں کا استقبال عثمانی صاحب کے ساتھ فہد بھی کر رہا تھا۔ شہر کے کاروباری حلقوں میں اب وہ جانا پہچانا جاتا تھا۔

فہد نے لان کے ایک سرے پر اسٹیج بھی بنوایا تھا اور ساؤنڈ سسٹم کا انتظام بھی کیا تھا۔ لان میں ہلکے سُروں میں مہدی حسن کی کوئی غزل بج رہی تھی۔

عثمانی صاحب اسٹیج پر آئے تو موسیقی یک لخت تھم گئی۔ انہوں نے کہا۔ ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہر سال کی طرح میں نے اس سال بھی عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کی نئی پالیسی بنائی ہے۔ اس کی تفصیلات آپ لوگوں کو عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے ایم ڈی مسٹر فہد رضا صاحب بتائیں گے۔''

فہد اسٹیج پر آیا تو بے شمار افراد کی پُرشوق نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ تقریر کا تو وہ بادشاہ تھا۔ اس نے کمپنی کی پالیسی کا اعلان کیا تو لوگوں نے تالیاں بجا کر اس کا خیر مقدم کیا۔ اس نے اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے کہا۔ ''عثمانی صاحب نے مجھے جو شیئر دینے کا اعلان کیا ہے۔ میں تمام رقم ایدھی ٹرسٹ کو دینے کا اعلان کرتا ہوں۔ مجھے احساس ہو گیا ہے کہ خوشی دولت سے نہیں ملتی بلکہ انسانیت کی خدمت سے ملتی ہے۔''

اسی وقت اس کی نظر نادیہ پر پڑی جو غیر یقینی کی حالت میں فہد کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔

وہ اسٹیج سے نیچے اترا تو اسے میڈیا کے لوگوں نے گھیر لیا۔ ان سے جان چھڑا کر وہ مہمانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ہر شخص فہد کے اس اعلان پر تبصرہ کر رہا تھا۔

مہمان کھانے کے بعد خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ فہد کئی گھنٹے سے ادھر اُدھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ جب ذرا سکون ہوا تو وہ کمر سیدھی کرنے کو لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ لان میں مہمان اب تک موجود تھے۔ گھر کے سب ملازمین بھی باہر لان میں تھے۔ وہ جس صوفے پر بیٹھا تھا اس کی پشت خاصی اونچی تھی۔ پھر وہ صوفے پر نیم دراز تھا اس لیے باہر سے آنے والے کو نظر نہیں آرہا تھا۔

اچانک اسے چوڑیوں کی کھنک سنائی دی پھر قدموں کی آہٹ گونجی، آنے والی کوئی خاتون تھی کیونکہ اس کی ہیل کی آواز سے یہی لگ رہا تھا تھوڑی دیر بعد پھر قدموں کی آہٹ ہوئی، فہد کے کانوں میں بابر کی آواز آئی۔ ''تم یہاں بیٹھی ہو، میں تمہیں پورے لان میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔''

فہد بری طرح چونک اٹھا۔ اسی وقت نادیہ کی آواز سنائی دی۔ ''میں بہت تھک گئی تھی اس لیے یہاں چلی آئی۔''

''نادیہ!'' بابر نے بہت پیار سے اسے پکارا۔ ''پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''کیسا فیصلہ؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کس فیصلے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم طارق سے محبت کرتی

تمہیں۔لیکن مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا تمہارے سامنے ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔ تم کہو تو میں عثمانی صاحب سے بات کروں؟''

''میری ایک شرط ہے۔'' نادیہ نے کہا۔

فہد کا دل اس کی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

''کیسی شرط ڈارلنگ؟'' بابر نے رومینٹک ہونے کی کوشش کی۔

''میں اس دولت اور جائداد میں سے ایک پیسا بھی نہیں لوں گی۔''

''کم آن ڈارلنگ!'' بابر نے کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ پیسا میرا مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری دولت یا جائداد کی نہیں۔''

نادیہ خوشی سے چہکی۔ ''پھر میں موقع دیکھ کر ڈیڈی کی وصیت تبدیل کرا دوں گی۔''

''یہ بعد کا مسئلہ ہے نادیہ۔'' بابر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم تو مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم راضی ہو یا نہیں؟''

''ہاں، اس شرط پر میں راضی ہوں۔'' نادیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ویسے فہد نے آج مجھے حیران کر دیا۔ اس نے کروڑوں روپے سالانہ کی رقم ویلفیئر ادارے کو دینے کا اعلان کر دیا۔''

''یہ بھی اس کی کوئی چال ہوگی نادیہ؟'' بابر نے ترش لہجے میں کہا۔ ''ورنہ کروڑوں کی رقم اس دور میں کون چھوڑتا ہے؟''

فہد کا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا۔ غصے کی زیادتی سے اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ اسے نادیہ سے یہ امید تو کسی بھی صورت میں نہیں تھی کہ وہ ایسی کوئی حرکت بھی کر سکتی ہے۔ فہد کا خیال تھا کہ اب نادیہ زندگی بھر شادی ہی نہیں کرے گی۔ وہ اس کی عادت کو اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس کے بارے میں فہد کا اندازہ زندگی میں پہلی بار غلط ثابت ہوا تھا۔

اسے نادیہ سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ ابھی ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

''ویسے تم بھی عجیب ہو نادیہ۔'' بابر نے ہنس کر کہا۔ ''طارق سے......''

''مجھے طارق سے کبھی بھی محبت نہیں تھی۔'' نادیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''بس ایک رشتہ تھا جسے میں نبھا رہی تھی۔''

اسی وقت لاؤنج میں کوئی اور داخل ہوا۔ پھر فہد کے کانوں میں ایک مرد کی آواز آئی۔ ''سر! آپ یہاں بیٹھے ہیں، میں آپ کو باہر ڈھونڈ رہا ہوں۔'' وہ غالباً بابر کا کوئی ماتحت تھا۔

''میں ذرا مہمانوں کو دیکھ لوں۔'' نادیہ نے کہا اور وہاں سے رخصت ہو گئی۔

فہد کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا پورا جسم مفلوج ہو گیا ہو۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ کچھ دیر بعد وہ کچھ سنبھلا تو اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی، اس مرتبہ وہ کامیاب رہا اور ڈگمگاتے قدموں سے باہر کی طرف چل دیا۔ کوئی اس حالت میں اسے دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ فہد بہت زیادہ نشے میں ہے۔

☆☆☆

''یہ کیا ہے؟'' عثمانی صاحب نے فہد سے پوچھا۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آفس پہنچے تھے۔

''سر! آپ خود ہی دیکھ لیں۔'' فہد نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''ہر اہم میل پڑھنا اور اس کا جواب دینا تمہاری ذمے داری ہے۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔

''لیکن سر! یہ صرف آپ کے لیے ہے۔'' فہد نے نظریں جھکا کر کہا۔

عثمانی صاحب نے فہد کا دیا ہوا فولڈر اپنی طرف گھسیٹا اور چشمہ لگا کر وہ تحریر پڑھنے لگے۔

تحریر پڑھ کر ان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ انہوں نے اپنا چشمہ اتار کے میز پر پھینکا اور درشت لہجے میں بولے۔ ''وہاٹ نان سینس! تم عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کو چھوڑ رہے ہو؟''

''جی سر۔'' فہد نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''کیوں؟'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے، کوئی دوسرا ادارہ تمہیں اس سے زیادہ سیلری اور مراعات دے رہا ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے بتاؤ۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے سر۔'' فہد نے کہا۔ ''میں اب یہاں جاب نہیں کر سکتا۔ میں ملک سے باہر جا رہا ہوں۔''

عثمانی صاحب چند لمحے اسے گھورتے رہے، پھر گلوگیر لہجے میں بولے۔ ''تم سب مجھے چھوڑ جاؤ، طارق کی تو زندگی ہی اتنی تھی، وہ مجھے چھوڑ گیا تو یہ اللہ کی مرضی ہے لیکن اب تم بھی مجھے چھوڑ رہے ہو اور نادیہ بھی شادی کر رہی ہے۔ میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا تھا لیکن......'' عثمانی صاحب کی

آواز بھرا گئی اور وہ آگے کچھ نہ بول سکے۔

فہد خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''ایسا کرو۔'' عثمانی صاحب نے کچھ توقف کے بعد کہا۔''تم فوری طور پر استعفیٰ مت دو۔ کچھ دن چھٹی پر چلے جاؤ۔ دو مہینے، چار مہینے یا ایک سال۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔''تم کام کر کے بہت تھک چکے ہو، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تمہارے سفر کے تمام اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ اس دوران میں تم ٹھنڈے دل سے سوچنا، پھر تم جو فیصلہ بھی کرو گے، مجھے منظور ہوگا۔ بس اب انکار مت کرنا۔'' عثمانی صاحب نے کہا اور اس کا استعفیٰ پھاڑ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

فہد نے سوچا، چلو یونہی سہی۔ عثمانی صاحب بھی اس دوران میں ذہنی طور پر تیار ہو جائیں گے۔

''اوکے سر۔'' فہد نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''آج تم کافی نہیں پیو گے؟''

''آپ کی کافی سے بھلا میں انکار کر سکتا ہوں۔'' فہد نے مسکرا کر کہا۔ وہ کشیدگی کم کرنا چاہتا تھا۔

عثمانی صاحب نے انٹرکام پر کافی کے لیے کہا، پھر اس سے بزنس کی باتیں کرتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد ان کی آفس میڈ کافی لے آئی۔

فہد نے کافی کا مگ اپنی طرف کھسکایا تو وہ جلدی سے بولی۔''یہ کپ باس کا ہے سر! باس کافی میں شوگر نہیں لیتے ہیں۔''

''کبھی کبھی شوگر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔'' فہد نے مسکرا کر کہا۔

اس نے کپ سے کافی پینا چاہی تو میڈ جلدی سے بولی۔''سر پلیز! ڈاکٹر صاحب نے باس کو شوگر لینے سے بہت سختی سے منع کیا ہے۔''

''میرا کپ مجھے دے دو یار۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔''یہاں قدم قدم پر خیر خواہ موجود ہیں۔'' ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

فہد نے وہ مگ عثمانی صاحب کو دے دیا۔ اس مگ کا رنگ اسکائی بلیو تھا، فہد کا مگ آف وہائٹ تھا۔ شاید اسی لیے وہ مختلف مگ لے کر آئی تھی کہ پہچاننے میں آسانی رہے۔

آفس میڈ نے ٹرالی سے بسکٹ اور سینڈوچز نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے اور آہستہ سے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

عثمانی صاحب نے اپنے مگ سے ایک سپ لیا اور انٹرکام پر اپنی سیکریٹری کو زیکو انٹر پرائزز کا نمبر ملانے کو کہا۔

''یہ لوگ پھر کوئی گڑبڑ کر رہے ہیں سر۔'' فہد نے پوچھا۔''ڈیو ڈیٹ گزرنے کے بعد بھی ان کی طرف سے پے منٹ نہیں آئی ہے۔''

''میرے خیال میں تم تو چھٹی پر ہو؟'' عثمانی صاحب نے مسکرا کر کہا اور کافی کا سپ لیا۔

''میں ابھی تو آفس میں موجود ہوں۔ اس قسم کے معاملات......'' اس نے دیکھا کہ عثمانی صاحب کے چہرے پر تکلیف کے آثار ہیں اور اسپلٹ چلنے کے باوجود ان کے چہرے پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے تھے۔ فہد تشویش سے بولا۔''سر، آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''ہاں...... میں...... ٹھیک ہوں...... ذرا پنکھا چلا دو اور میری...... ٹائی......'' ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگے۔ کھڑکی...... کھول...... دو...... میرا...... دم...... گھٹ رہا ہے......''

فہد جھپٹ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ پہلے اس نے سوچا کہ ایمبولینس کے لیے ٹیلی فون کرے پھر اس نے آپریٹر سے کہا۔''میرے ڈرائیور سے کہیں، وہ فوراً گاڑی نکالے۔ عثمانی صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ انہیں فوری طور پر اسپتال لے جانا ہے۔ ہری اپ۔''

''اوکے سر۔'' آپریٹر نے کہا۔

فہد نے عثمانی صاحب کی کرسی گھما کر انہیں بہت مشکل سے کندھے پر اٹھایا اور باہر کی طرف دوڑا۔ وہ کوریڈور ہی سے چیخا۔''لفٹ اوپر منگاؤ۔''

آفس کا پورا اسٹاف فہد کے گرد اکٹھا ہو گیا لیکن فہد بھاگتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھا اور اس میں سوار ہو گیا۔ عثمانی صاحب اب گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔

ڈرائیور نے فہد کی گاڑی داخلی دروازے کے سامنے لگا دی تھی۔ اس نے جلدی سے عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ فہد انہیں لے کر گاڑی میں سوار ہوا اور ڈرائیور سے بولا۔''جتنی تیزی سے چل سکتے ہو اسپتال چلو۔ آج تمہاری مہارت اور ڈرائیونگ کا بھی امتحان ہو جائے گا۔''

ڈرائیور نے گاڑی کا انجن پہلے ہی اسٹارٹ کر رکھا تھا۔ اس نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور زناٹے سے آگے بڑھا دی۔ ایک عقل مندی اس نے یہ کی تھی کہ لینڈ کروزر نکالی تھی۔

پھر فہد اس کی مہارت پر واقعی اش اش کر اٹھا۔ وہ گاڑی کو یوں دوڑا رہا تھا جیسے نوجوان لڑکے اپنی ٹریل موٹر سائیکلوں کو گھماتے ہیں۔

''کسی بھی سگنل کی پروا مت کرنا۔'' فہد نے کہا۔

''بس یہ خیال رکھنا کہ اس کی وجہ سے گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا نہ جائے۔''

''جی سر۔'' ڈرائیور نے کہا اور گاڑی کی اسپیڈ مزید بڑھا دی۔ دو تین دفعہ وہ انتہائی سنگین حادثوں سے بال بال بچا لیکن وہ آندھی اور طوفان کی طرح گاڑی چلاتا ہوا آغا خان کے ایمرجنسی وارڈ تک پہنچ گیا۔

گاڑی دیکھتے ہی وارڈ بوائز اسٹریچر لے کر ان کی طرف دوڑ پڑے۔ اس تمام بھاگ دوڑ میں فہد بری طرح ہانپ گیا تھا۔ کئی مہینے سے وہ جوگنگ بھی نہیں کر رہا تھا۔

ڈرائیور پارکنگ میں گاڑی لگا کر آیا تو آفس کا دوسرا اسٹاف بھی وہاں پہنچ گیا۔ ہر آدمی فہد سے یہ سوال کر رہا تھا کہ اب عثمانی صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ابھی تک مجھے بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔ ڈاکٹرز نے انہیں آئی سی یو میں شفٹ کر دیا ہے۔'' فہد نے جواب دیا۔

اس کی نظر بابر پر بھی پڑی۔ وہ بھی پریشان پریشان سا ویٹنگ ایریا میں بیٹھا تھا۔ فہد کو دیکھ کر وہ اس کے پاس آیا اور بولا۔ ''فہد! آخر ہوا کیا تھا؟''

''فہد؟'' فہد نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''تم میرا نام کب سے لینے لگے۔''

''سوری سر!'' بابر نے جلدی سے کہا لیکن لہجے کی ناگواری کو نہ چھپا سکا۔

''میں اس وقت بہت ٹینس ہوں اس لیے ابھی مجھ سے کچھ مت پوچھو۔''

''میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اس وقت آپ ہی عثمانی صاحب کے ساتھ تھے۔'' بابر نے کہا۔

''احمقانہ سوالات سے پرہیز کرو مسٹر سیکورٹی آفیسر!'' فہد اس کی توہین کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس کا بس چلتا تو وہ بابر کو کھڑے کھڑے وہاں سے نکال دیتا۔

اسی وقت نادیہ حواس باختہ سی وہاں پہنچ گئی۔

''ڈیڈی کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''ابھی تک ڈاکٹرز نے کچھ بتایا نہیں ہے۔'' فہد کا لہجہ خشک تھا۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

فہد اس جگہ ٹھہر گیا جہاں سیکورٹی گارڈ بیٹھا تھا۔ وہاں سے آگے جانا بند تھا۔

اسی وقت ایک نرس اندر سے برآمد ہوئی اور بولی۔

''مسٹر فہد آپ ہی ہیں؟''

''جی ہاں۔'' فہد نے جواب دیا۔ اس کا دل انجانے خدشات سے بری طرح دھڑکنے لگا۔

''ڈاکٹر سلطان آپ کو بلا رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''سیکورٹی گارڈ نے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر سلطان چند بہترین فزیشن اور کارڈیالوجسٹ میں سے ایک تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''مسٹر فہد! عثمانی صاحب کی کنڈیشن بہت کریٹیکل ہے۔ انہیں بہت سیریز ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ آئندہ بارہ گھنٹے ان کے لیے بہت اہم ہیں۔ اگر یہ بارہ گھنٹے خیریت سے گزر گئے تو ان کی حالت خطرے سے باہر ہو جائے گی۔'' پھر ڈاکٹر کچھ سوچ کر بولا۔

''عثمانی صاحب کب سے ہارٹ پیشنٹ ہیں؟''

''عثمانی صاحب ہارٹ پیشنٹ نہیں ہیں۔ انہیں شوگر ضرور ہے لیکن وہ بھی کنٹرول ہے۔''

''انہوں نے کوئی ایسی چیز تو نہیں کھائی ہے جس سے ان کا بلڈ پریشر ایک دم شوٹ اَپ کر گیا ہو؟''

''ڈاکٹر صاحب! میں اس وقت ان کے ساتھ ہی تھا۔ ہم لوگ کافی پی رہے تھے۔ انہوں نے شاید ایک بسکٹ بھی کھایا تھا۔''

''پھر؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''عثمانی صاحب نے مشکل سے کافی کے دو تین گھونٹ ہی پیے تھے کہ ان کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ چہرہ پسینے میں تر ہو گیا اور انہوں نے کہا کہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ ان کی حالت دیکھ کر میں نے ایمبولینس کا انتظار بھی نہیں کیا اور انہیں اپنی گاڑی میں لے کر دوڑ پڑا۔''

''اچھا۔'' ڈاکٹر نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''عثمانی صاحب نے اس وقت کافی پی تھی اور ایک دو بسکٹ لیے تھے؟''

''جی ہاں سر، ہم دونوں ہی کافی پی رہے تھے۔'' فہد نے جواب دیا۔

''وہ بسکٹس کی وہ پلیٹ اور بچی ہوئی کافی تو اب وہاں موجود نہیں ہوگی؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

''وہ چیزیں اب بھی وہیں موجود ہوں گی۔ عثمانی صاحب کے روم کا ڈور آٹومیٹک ہے۔ وہ ایک دفعہ بند ہو جائے تو پھر عثمانی صاحب سے بھی نہیں کھلتا۔''

''وہاٹ ڈو یو مین؟'' ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب، عثمانی صاحب اتنی بڑی گروپ آف انڈسٹریز کے سی ای او ہیں ان کے روم میں بہت سی کانفیڈینشل فائلز اور ڈی وی ڈیز موجود ہیں۔ اس لیے میں نے ان کے دروازے کے لیے اس خصوصی لاک کا انتظام

کیا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد چابی کے ساتھ ساتھ نمبروں سے کھلتا ہے اور غفور نمبرز کا کمبی نیشن ڈیل ایک دن چھوڑ کر بدل دیتا ہے۔ صرف غفور ہی ان کے روم کا دروازہ کھول سکتا ہے۔''

''آپ نے بہت ضروری بات پوائنٹ آؤٹ کی ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے اپنا گاؤن پہنا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر سلطان ''ابھی'' کہہ کر آدھے گھنٹے بعد واپس آئے اور بولے۔ ''فہد صاحب! یہ پولیس کیس ہے۔ کسی نے عثمانی صاحب کو زہر دیا ہے۔''

''وہاٹ؟'' فہد گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا ہوا، آپ نے ہمیں بتا دیا۔''

''میں پولیس کو انفارم کر رہا ہوں۔ آپ ابھی یہ بات اپنی ذات تک محدود رکھیے گا۔''

''آپ پولیس کو ضرور بلائیں لیکن پلیز پہلے مجھے عثمانی صاحب کی کنڈیشن کے بارے میں بتا دیں۔''

''ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آئندہ بارہ گھنٹے بہت سیریس ہیں۔''

''اب تو گیارہ گھنٹے رہ گئے ہیں ڈاکٹر۔'' فہد نے کہا۔

''چلیے گیارہ گھنٹے ہی سہی۔'' ڈاکٹر مسکرایا۔ ''آپ شاید عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے ایم ڈی ہیں۔''

''جی ہاں، فہد نے کہا اور بوجھل قدموں سے باہر نکل آیا۔

ایک مرتبہ پھر اسے آفس اسٹاف نے گھیر لیا۔ فہد نے صرف اتنا بتایا کہ عثمانی صاحب ابھی خطرے سے باہر نہیں ہیں۔ آئندہ بارہ گھنٹے ان کے لیے بہت اہم ہیں۔ انہیں بہت شدید قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔''

''عثمانی صاحب ہارٹ پیشنٹ تو نہیں ہیں؟'' بابر نے کہا۔

''ہارٹ اٹیک تو کسی کو بھی دبے پاؤں دبوچ لیتا ہے۔''

وقت بہت سست رفتاری سے گزرتا رہا۔ آفس کا بیشتر اسٹاف بالخصوص خواتین جا چکی تھیں۔ اب وہاں فہد، آصف، جی ایم اظہر اور آئی ٹی ہیڈ طاہر کے علاوہ بابر اور نادیہ تھے۔

فہد نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آصف اور اظہر اصرار کر کے اسے کیفے ٹیریا لے گئے۔ ان لوگوں نے نادیہ اور بابر کو بھی کیفے ٹیریا چلنے کو کہا۔

آصف کافی اور کچھ ہلکا پھلکا اسنیکس کا سامان لے آیا۔

ابھی انہوں نے کھانا ہی شروع کیا تھا کہ بابر کی نظر ایس ایس پی کرائمز نواز احسن پر پڑی۔ وہ چونک اٹھا اور بولا۔ ''یہ ایس ایس پی یہاں کیا کر رہا ہے؟''

نواز احسن اس وقت سادہ لباس میں تھا۔ اس نے کاؤنٹر سے کافی کا ایک مگ لیا اور ان کے نزدیک ہی ایک میز پر آبیٹھا پھر وہ بابر کو دیکھ کر بولا۔ ''تم ابھی تک پاکستان میں ہی ہو؟''

''سر، میں اپنا ملک چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں۔'' بابر مسکرایا۔

کیفے ٹیریا سے اٹھ کر وہ لوگ دوبارہ ایمرجنسی کے ویٹنگ ایریا میں آ گئے۔

نرس نے ایک مرتبہ پھر فہد کو بلایا اور اس سے کہا کہ ڈاکٹر سلطان آپ کو بلا رہے ہیں۔

ڈاکٹر سلطان نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کہا۔ ''مبارک ہو مسٹر فہد! عثمانی صاحب کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ ہم کل تک انہیں روم میں شفٹ کر دیں گے۔''

''تھینک یو ڈاکٹر!'' فہد نے ممنونیت سے کہا۔ ''کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟''

''نو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ابھی ان سے کوئی بھی نہیں مل سکتا۔ ویسے بھی ایس ایس پی نواز نے سختی سے تاکید کی ہے کہ ابھی کوئی ان سے نہ ملے۔''

''او کے ڈاکٹر۔'' فہد نے مسکرا کر کہا اور باہر آ گیا۔

باہر آ کر اس نے وہاں موجود لوگوں کو یہ خوش خبری سنائی تو ان سب کے چہرے کھل اٹھے۔

بابر نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''تھینکس گاڈ! اگر خدانخواستہ عثمانی صاحب کو کچھ ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کرتا۔''

نادیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔

''آپ لوگ اب گھر جا کر آرام کریں۔'' فہد نے کہا۔ ''میں یہاں موجود ہوں۔''

''میں بھی یہاں رکوں گی۔'' نادیہ نے کہا۔

''میڈم نادیہ!'' فہد نے کہا۔ ''آپ کے یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یوں بھی یہاں مریضوں کے اٹینڈنٹ کو رکنے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ کو پوری رات باہر لان میں گزارنا پڑے گی۔ دیکھیے، نیچے کتنے لوگ بنچوں پر بیٹھے ہیں۔''

''فہد سر ٹھیک کہہ رہے ہیں میڈم۔'' آصف نے کہا۔ ''آپ گھر جائیں۔ کل ان شاء اللہ عثمانی صاحب کمرے میں

شفٹ ہو جائیں گے تو آپ یہاں آجایئے گا۔“

وہ سب اصرار کر کے نادیہ کو گھر لے گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ بابر بھی چلا گیا۔

ڈاکٹر سلطان بھی ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے فہد سے کہا۔ ”آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ پے منٹ پر ایک روم بک کرا لیں۔ میں دیکھتا ہوں، پرائیویٹ ونگ میں کوئی روم ضرور خالی ہوگا۔“

”تھینک یو ڈاکٹر اس سے مجھے بہت آسانی ہو جائے گی۔“

ڈاکٹر سلطان نے فہد کے لیے ایک روم بک کرا دیا۔ آرام وہ بیڈ پر نیم دراز ہو کر فہد کو کافی آرام ملا۔ وہ صبح سے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا اور اب اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو فہد چونک پڑا۔ اس نے کہا۔ ”یس پلیز!“

دروازہ کھول کر ایس ایس پی نواز احسن اندر آ گیا اور بولا۔ ”سوری سر، ڈسٹرب کرنے کی معذرت چاہتا ہوں لیکن مجھے......“

”اِٹز او کے آفیسر۔“ فہد نے کہا۔ ”فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھے تفصیل سے بتائیں کہ جب عثمانی صاحب کی طبیعت بگڑی تو اس وقت کیا حالات پیش آئے تھے؟“

فہد نے ایس ایس پی کو ہر بات تفصیل سے بتا دی، صرف استعفے کی بات اسے نہیں بتائی۔

”وہ آفس میڈ کب سے آپ کے آفس میں کام کر رہی ہے؟“

”اس درجے کے ملازمین کی ذمے داری جی ایم صاحب کی ہے، ویسے میں نے اس لڑکی کو اس دن پہلی دفعہ دیکھا تھا۔“

”چائے، کافی وغیرہ تو آپ بھی منگواتے ہوں گے؟“ نواز نے پوچھا۔

”جی ہاں، میں بھی چائے اور کافی وغیرہ پیتا ہوں لیکن میری چائے مجھ تک میری پی اے پہنچاتی ہے ممکن ہے وہ آفس میڈ اسے ٹرالی دے کر چلی جاتی ہو۔“

”تو پھر عثمانی صاحب کے کمرے میں وہ براہِ راست کیسے آ گئی؟“

”عثمانی صاحب کی پی اے چھٹی پر تھی۔“ فہد نے جواب دیا۔

”آپ نے عثمانی صاحب کا مگ اٹھایا تو اس کا کیا ری ایکشن تھا؟“

”وہ گھبرا کر بولی تھی کہ سر، یہ مگ باس کا ہے۔ وہ شوگر نہیں لیتے۔ میں نے مذاق میں کہا کہ کبھی کبھی شوگر بھی لے لینا چاہیے۔ اس پر وہ مزید گھبرا گئی تھی اور بولی کہ ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ عثمانی صاحب کو شوگر نہ دی جائے۔“

”او کے مسٹر فہد۔“ نواز نے کہا۔ ”اب آپ آرام کریں، صبح شاید میں پھر آپ کو زحمت دوں۔“

فہد جوتوں سمیت ہی بستر پر گر گیا اور ایسا سویا کہ صبح دس بجے وارڈ بوائے کے جگانے پر اس کی آنکھ کھلی۔

وہ فریش ہو کر باہر نکلا تو نادیہ اور بابر کے علاوہ جی ایم اظہر اور آصف بھی وہاں موجود تھا۔

”آپ لوگوں کو تو اس وقت آفس میں ہونا چاہیے تھا۔“ فہد نے سرد لہجے میں کہا۔

”آفس میں عجیب ہڑبونگ مچی ہوئی ہے۔ پولیس نے عثمانی صاحب کا روم کھلوا کر بچی ہوئی کافی اور بسکٹ وہاں سے حاصل کر لیے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ آفس میڈ کل سے غائب ہے۔“

”وہاٹ؟“ فہد نے جھنجلا کر کہا۔ ”اظہر صاحب، اسے آپ نے اپائنٹ کیا تھا۔ اس کی فائل میں ایڈریس تو ہوگا؟“

”وہ ایڈریس غلط ہے، اس نے جو ٹیلی فون نمبر دیا تھا وہ بھی غلط ہے۔“

”اور آپ نے بغیر چھان بین کیے اسے ملازمت دے دی؟“

اسی وقت ڈاکٹر سلطان مسکراتا ہوا آیا اور بولا۔ ”فہد صاحب! ہم نے عثمانی صاحب کو روم میں شفٹ کر دیا ہے۔ اب آپ ان سے مل سکتے ہیں صرف آپ۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”میں بھی ڈیڈی سے ملنا چاہتی ہوں ڈاکٹر۔“ نادیہ نے کہا۔

”اس کے لیے آپ کو ایس ایس پی نواز احسن صاحب سے اجازت لینا پڑے گی۔ یہ اب پولیس کیس بن چکا ہے میڈم، اقدامِ قتل کا کیس۔“

”فکر مت کریں میڈم!“ فہد نے کہا۔ ”میں نواز صاحب سے بات کروں گا۔ آپ کا حق تو مجھ سے زیادہ ہے۔ وہ آپ کو نہیں روکیں گے۔“

عثمانی صاحب کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ وہ تکیوں کے سہارے بیڈ پر نیم دراز تھے۔ فہد کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ گلوگیر لہجے میں بولے۔ ”فہد!

مجھے صرف تمہاری وجہ سے نئی زندگی ملی ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اگر میں پانچ منٹ مزید لیٹ ہوجاتا تو میرا بچنا محال تھا۔''

''زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے سر۔'' فہد نے کہا۔

''آپ کی زندگی تھی اس لیے اللہ نے آپ کو بچالیا ورنہ میں لاکھ کوشش کرتا، کچھ بھی نہ ہوتا۔''

''اب تم آفس جاؤ، آج میری کئی اہم میٹنگز تھیں۔ یا تو انہیں کینسل کردینا یا پھر اپنے طور پر انہیں ڈیل کر لینا۔ اب تمہیں بھی بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میں تو یہاں محفوظ ہوں، تم بابر کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

''سر، میرا جانا کیا ضروری ہے؟''

اسی وقت نرس نے کمرے میں جھانکا اور بولی۔ ''مسٹر فہد! اب پیشنٹ کو آرام کرنے دیں۔''

''او کے۔'' فہد نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

بابر باہر موجود تھا۔ فہد اسے اپنے ساتھ رکھنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن اسے ساتھ لے جانا بھی ضروری تھا۔ جب سے وہ نادیہ کے عاشق کے روپ میں سامنے آیا تھا۔ فہد کو اس سے نفرت ہوگئی تھی۔

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''مسٹر بابر! آپ آج سے میری سیکیورٹی کریں۔ میرے ساتھ آئیں۔''

''میں عثمانی صاحب کی سیکیورٹی کا ذمے دار ہوں۔''

''آپ کی خدمات عثمانی گروپ آف انڈسٹریز نے حاصل کی ہیں اور اس ایگریمنٹ پر عثمانی صاحب کے نہیں بلکہ میرے سائن ہیں۔ ادارے کے ایم ڈی کی حیثیت سے میں آپ کو کسی کی بھی سیکیورٹی پر مامور کرسکتا ہوں۔ آیئے میرے ساتھ بلکہ آپ تو اپنی بائیک پر ہوں گے۔''

بابر کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک رنگ جارہا تھا۔

فہد اسے حکم دے کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہ اسپتال سے پہلے گھر گیا۔ وہاں سے تیار ہوکر آفس پہنچا تو حیران رہ گیا۔ آفس کے اردگرد پولیس والے موجود تھے۔

فہد لفٹ سے نکل کر کوریڈور میں پہنچا تو وہاں بھی پولیس کے دو جوان موجود تھے۔ آفس کے ہال کمرے میں فہد کو ایس ایس پی نواز اور ایک سب انسپکٹر نظر آیا۔

فہد کے پیچھے ہی بابر بھی ہال کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ہنس کر نواز سے بولا۔ ''سر، آپ یہاں اپنا ٹائم کیوں ضائع کررہے ہیں جاکر اس آفس میڈ کو تلاش کریں۔''

''آفس میڈ مل چکی ہے۔ وہ بہت بری طرح زخمی ہے لیکن میں نے ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں اس کا بیان لے لیا ہے۔'' اس نے سب انسپکٹر کو اشارہ کیا۔

وہ آگے بڑھا اور بولا۔ ''بابر صاحب! میں آپ کو عثمانی صاحب اور اس آفس میڈ آسیہ کے اقدام قتل میں گرفتار کرتا ہوں۔'' اس نے جیب سے اسٹیل کی پتلی سی لیکن مضبوط ہتھکڑی نکالی اور بابر کے ہاتھوں میں ڈال دی۔

بابر نے حیرت سے کہا۔ ''بلال تم...... تم......''

''جی ہاں، میں۔'' بلال نے کہا۔ ''میں نے پولیس کی ملازمت چھوڑی نہیں تھی بلکہ ملازمت چھوڑنے کا بہانہ کیا تھا تاکہ آپ کا اعتماد جیت سکوں۔ آپ کے جرائم کی فہرست تو بہت لمبی ہے بابر صاحب، اب تو دنیا کا ماہر سے ماہر وکیل بھی آپ کو پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا سکتا۔''

نواز نے اسے ٹھڈا مارا۔

اسی وقت نادیہ آفس میں داخل ہوئی۔ وہ بابر کو اس حال میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی اور لمحے بھر کو گم صم ہوگئی۔

☆☆☆

''بابر کی جرائم کی لسٹ بہت طویل ہے سر۔'' ایس ایس پی نواز نے کہا۔

وہ لوگ اس وقت عثمانی صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عثمانی صاحب ایک دن پہلے اسپتال سے گھر آئے تھے اور اب ہر طرح چاق و چوبند تھے۔

''بابر بہت ذہین اور جی دار آدمی ہے۔'' نواز نے کہا۔ ''لیکن اس کی ذہنیت مجرمانہ ہے۔ اس نے ابتدا میں بہت اچھا کام کیا۔ کئی گینگز کا صفایا کیا۔ جرائم پیشہ لوگ بابر کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے کیونکہ وہ ملزم کو گرفتار کرنے کے بجائے گولی ماردیتا تھا کہ وہ عدالت سے بری ہوکر دوبارہ نہ آجائے۔ دو سال پہلے کچھ خطرناک گینگسٹر نے بینک کی ایک وین لوٹ لی۔ وہ وین تمام برانچوں سے کیش جمع کرنے کے بعد ہیڈ آفس جارہی تھی۔ وہ ایک معروف کمپنی کی وین تھی۔ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ مجرموں نے اسے کیسے لوٹا لیکن عین وقت پر بابر وہاں پہنچ گیا۔ آدمی جی دار ہے اس لیے اس نے پانچ خطرناک مجرموں کو ٹھکانے لگادیا اور لوٹ کا سارا مال لے کر وہاں سے غائب ہوگیا۔ مجرموں میں سے ایک آدمی مرا نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ سارا روپیا بابر لے کر چلا گیا اس کے فوراً بعد وہ آدمی بھی چل بسا۔ پولیس اس کا باضابطہ بیان نہیں لے سکی۔ کرائم برانچ نے ڈراما کرکے بلال کو اس کے ساتھ لگادیا۔ اس سے پہلے کہ بلال اس سے کچھ اگلواتا، اسے عثمانی صاحب نے اپنی سیکیورٹی کے لیے رکھ لیا۔ ہاں، انہیں دھمکی آمیز فون جس

نے بھی کرائے میں اس کا نام لینا نہیں چاہتا لیکن وہ جعلی کالز تھیں لیکن جس نے بھی کرائی تھیں وہ عثمانی صاحب کی بہتری چاہتا تھا۔ بلال نے ان جعلی کالز کرنے والے کا سراغ بھی لگالیا ہے۔ وہ فلموں اور ڈراموں میں کام کرنے کا شوقین نکما سا ایک نوجوان ہے۔''

فہد نے نادیہ کی طرف دیکھا۔ اس نے شرمندہ ہوکر نظریں جھکالیں۔

''پھر واقعی عثمانی صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ پولیس کا خیال ہے کہ اس حملے کا ماسٹر مائنڈ بھی بابر تھا۔ اس پر ان دو آدمیوں کے خون کا الزام بھی ہے جو اس کے ہاتھوں مارے گئے۔

پھر اس نے کرمنل مائنڈ ہونے کا ایک اور خوفناک منصوبہ بنایا۔ وہ عثمانی صاحب کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے میڈم نادیہ کو سیڑھی بنایا۔ اس نے طارق صاحب کو کتے پالنے کا مشورہ دیا۔ ڈوبر مین دنیا کے خونخوار ترین کتوں میں شمار ہوتے ہیں یہ درست ہے کہ وہ اپنے مالک اور رکھوالے کے علاوہ کسی سے مانوس نہیں ہوتا لیکن اگر کسی بھی کتے کو ایک خاص انجکشن دے دیا جائے یا محض اسے دیے جانے والے گوشت میں وہ انجکشن لگا دیا جائے تو بیس سے پچیس منٹ کے اندر وہ اتنا خونخوار ہو جاتا ہے کہ اپنے سامنے آنے والے کسی بھی شخص کو چیر پھاڑ سکتا ہے۔ بابر نے پولیس کا ایک ذہین افسر ہونے کے باوجود کئی جگہ فاش غلطیاں کیں۔ اس نے جس سرنج سے گوشت میں وہ انجکشن لگایا تھا اسے وہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا جو پولیس نے اپنی تحویل میں لے لی۔ اس میں اس دوا کے قطرے بھی تھے اور سرنج پر بابر کی انگلیوں کے نشان بھی۔

طارق صاحب کو راستے سے ہٹانے کے بعد اس نے میڈم نادیہ کو نہ جانے کیسے اپنے قابو میں کرلیا۔ وہ ان سے شادی کرنا چاہتا تھا اس کے بعد وہ عثمانی صاحب کو بھی راستے سے ہٹادیتا لیکن اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے پہلے عثمانی صاحب کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے لیے اس نے ایک ضرورت مند لڑکی کو بھاری معاوضے پر تیار کیا اور اسے ادارے میں آفس میڈ کی ملازمت دلائی۔ پھر اسے ایک سریع الاثر زہر کی شیشی دے کر کہا کہ اس میں سے چند قطرے عثمانی صاحب کو کافی، چائے یا پانی میں ملا کر پلا دینا۔ وہ تو شکر ہے کہ عثمانی صاحب نے اس کافی کے صرف دو، تین گھونٹ ہی پیے ورنہ آج یہ یہاں موجود نہ ہوتے۔''

نواز بولتے بولتے شاید تھک گیا تھا۔ اس نے پانی پیا اور بولا۔ ''اب شاید آپ لوگوں کی سمجھ میں ساری بات آگئی ہوگی۔''

☆☆☆

دو دن بعد فہد پھر عثمانی صاحب کے گھر میں موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ''سر، میں کل چھٹی پر جارہا ہوں۔ آپ ہی نے کہا تھا کہ......''

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''لیکن صرف چھٹی پر!''

''اس پر میں غور کروں گا۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم فیصلہ میرے ہی حق میں کرو گے۔'' عثمانی صاحب مسکرائے۔

فہد باہر نکلا تو اس کی نظر نادیہ پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر اسی انداز میں مسکرا رہی تھی جیسے شادی سے پہلے مسکرایا کرتی تھی۔

''میں نے سنا ہے تم طویل رخصت پر جارہے ہو مسٹر پرفیکٹ؟''

فہد نے چونک کر اسے دیکھا۔ مسٹر پرفیکٹ وہ اسے پیار میں کہا کرتی تھی۔

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے میڈم نادیہ۔'' فہد نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو کیا اتنے طویل سفر پر تم اکیلے ہی جاؤ گے مسٹر پرفیکٹ؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''میں تو اب اکیلا ہوں اور اکیلا ہی رہوں گا میڈم۔''

''اے مسٹر پرفیکٹ اب زیادہ اداکاری نہیں چلے گی۔ مجھے معاف کردو، کہو تو کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک بھی شروع کردوں؟''

''اس کی ضرورت نہیں ہے نادیہ۔'' عثمانی صاحب کی آواز آئی۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں موجود تھے۔ ''فہد اکیلا نہیں جائے گا بلکہ تم بھی اس کے ساتھ جاؤ گی۔''

''لیکن سر...... میں......''

''نو مسٹر پرفیکٹ۔'' عثمانی صاحب مسکرائے۔ ''میں نے سب انتظام کرلیا ہے۔ اب تمہاری یہ طویل رخصت اصل میں ہنی مون کی رخصت ہوگی لیکن اس سے پہلے تمہارا نکاح ہوگا۔ پھر شاندار ولیمہ ہوگا۔ اس کے بعد تم جاسکو گے رائٹ مسٹر پرفیکٹ۔''

''باس از آل ویز رائٹ سر۔'' فہد مسکرایا اور نادیہ کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

قاتل مقتول

مختار آزاد

ہر انسان کے کچھ مسائل ہوتے ہیں... جو بڑھتے بڑھتے المیے بن جاتے ہیں... کبھی کبھی یہ مسائل... یہ المیے زندگی میں اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں... جن سے الگ ہونا ممکن نہیں رہتا... شاہراہِ حیات پر تنہا چلنے والی ایک معصوم لڑکی کی دل گداز کہانی... اس کے دکھوں... رونما ہونے والی ناانصافیوں کو سننے والا کوئی منصف نہیں تھا... وہ خود ہی منصف تھی... خود ہی مظلوم تھی... اس کی بے عنوان زندگی میں تازہ ہوا کا کوئی گزر نہ تھا... اسے چلنا تھا... اور سفر کو جاری رکھنا بھی ضروری تھا... چلتے چلتے اس نے بالآخر ایک فیصلہ کن راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر ڈالا...

زہر پی کر انانیت کو دوام حیات دینے والے

قاتل مقتول کی چونکا دینے والے انجام کی تیکھی کہانی

وہ مارچ کی ایک خنک شام تھی۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں آگے بڑھنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ ابھی وہ سپر مارکیٹ کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اسے عین اپنے عقب سے کار کا ہارن سنائی دیا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بجائے فٹ پاتھ کی سمت تھوڑا سا اور سمٹ کر چلنے لگی۔ توقع کے مطابق چند سیکنڈ کے وقفے سے دوبارہ ہارن بجا مگر اس نے پھر کوئی توجہ نہ دی۔ اب ہارن والی سیاہ کرولا اس سے لگ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی

تھی۔ وہ تھوڑا سا اور سٹ گئی۔ ایک بار پھر ہارن بجا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ گاڑی کا سیاہ شیشہ اتر چکا تھا۔

"گڈ ایوننگ میڈم۔"

نوری نے ذرا سی گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر دبی دبی سی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

وہ بھی گھاگ شکاری تھا۔ مطلب سمجھ چکا تھا۔ اس نے چہرہ کھڑکی کے قریب کیا۔ "یوں کیا پیدل چلی جا رہی ہیں، آیئے میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔"

وہ رکی۔ فوراً کچھ کہنے کے بجائے چاروں طرف اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور پھر سوالیہ نگاہوں سے کار سوار کو دیکھا۔

"بیٹھ جائیں، ڈیفنس فیز فائیو چلنا ہوگا۔" وہ سمجھ گیا تھا کہ وقت بھاؤ تاؤ کا ہے۔

"چلنے کا کیا دو گے؟" نوری نے شانِ بے نیازی سے سر جھٹک کر سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"تین ہزار۔"

"چھ ہزار، دو گھنٹے۔ منظور ہے تو دروازہ کھولو۔" یہ کہتے ہوئے نوری نے آہستگی سے قدم آگے بڑھائے۔

"آجاؤ......" کار تھوڑا سا آگے بڑھ کر رکی۔ دروازہ کھلا لیکن وہ نہ بیٹھی۔

"فل پیمنٹ ایڈوانس۔" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوکے......" کار سوار نے کہا۔ "چھ ہزار ایڈوانس۔" چند لمحوں کے بعد اس نے نوٹ کھڑکی سے اسے دکھائے۔ نوری نے مسکراتے ہوئے دروازہ اپنی طرف کھینچا۔ بیٹھتے ہی پیسے تھام کر پرس میں رکھے، اس کی طرف ادائے دلبری سے دیکھا اور والہانہ انداز میں مسکرا دی۔ یہ اس کی پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی۔ یہ بھی بزنس ڈیل کے پیکج میں شامل تھی۔ وہ اس کھیل کے سارے بھید بھاؤ سے خوب واقف تھی۔ جانتی تھی کہ بکرے کو قربانی سے پہلے چھری نہیں دکھائی جاتی۔

شون چورنگی سگنل سے کار آگے بڑھی تو نوری نے گہری نظر سے اس شخص کا جائزہ لیا۔ عمر میں اس کے باپ کے برابر کا تو ہوگا۔ سفید بال، ماتھے پر شکنیں۔ عمدہ لباس مگر چہرے پر شیطانی مسکراہٹ۔

"کیا دیکھ رہی ہو جانِ جہاں۔" اس نے بازاری لب و لہجے میں کہا۔

نوری کو اس کا یہ انداز بہت گھٹیا لگا لیکن وہ سمجھ گئی کہ درست شکار کا انتخاب کیا ہے۔ اس کے ایک جملے نے ہی واضح کر دیا تھا کہ وہ کس قماش کا بندہ ہے۔ اب جو ہونے والا ہے، وہی اس کا کفارۂ ذات ہے۔ اس نے ایک ادا سے زلفوں کو جھٹکا اور خود سپردگی کی مصنوعی مخمور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "شام بخیر......"

"شام تو وہی جو چلے رات دیر تک۔" یہ کہہ کر اس نے نوری کی طرف دیکھا۔ "شام ہو، گلاس ہو، تم ہو اور تنہائی تو پھر کس کمبخت کو صبح کا انتظار ہوگا۔" وہ رومینٹک ہو رہا تھا۔

"تو پھر آپ بھی صبح کا خیال دل سے نکال دیجیے۔ شام سہانی ہو تو آنے والے دن کے بکھیڑوں کی بات نہیں کرتے۔" نوری نے اپنے دل کی سچی بات کو کچھ اس لگاوٹ سے کہا کہ وہ جھوم گیا۔

"کیا کہنے بھئی، لگتا ہے شاعری کا ذوق بھی رکھتی ہو۔"

نوری نے کچھ کہنے کے بجائے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ کار تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ "سنو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کہیے حضور......" وہ چہک کر بولا۔

"گلا خشک ہو رہا ہے۔"

"ارے تو ابھی گھر پہنچتے ہی اسے تر بتر کر دیتے ہیں۔"

"تمہارے گھر پر کولڈ ڈرنک تو ہوگی نا، ورنہ رستے میں کہیں رک کر لے لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ "ویسے بھی مجھے تھکن دور کرنے کے لیے کولڈ ڈرنک کی ضرورت پڑتی ہے اور شاید تمہیں تھکن کے لیے......" یہ کہہ کر وہ ڈھٹائی سے کھلکھلا کر ہنس دی۔

"بے فکر رہو۔" اس نے کار کی رفتار اور بڑھا دی۔ "میں خود بھی ڈرنک کا شوقین ہوں۔" یہ کہہ کر اس کی طرف گردن موڑی "اور سافٹ ڈرنک کا بھی اگر وہ تم جیسی ہو تو......" جواباً اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"وہ تو میں سمجھ چکی ہوں، بتانے کی ضرورت نہیں۔"

اس پر بوڑھے شکار کا زوردار قہقہہ گونجا۔

کچھ دیر بعد کار خیابان مجاہد کے ایک وسیع و عریض مگر سنسان بنگلے کے پورچ میں رک رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہوئے نوری مین گیٹ پر لگی نام کی تختی پڑھ چکی تھی: سیٹھ نعمان احمد چائے والا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ ان کے سوا وہاں تیسرا کوئی نہ تھا۔ حتیٰ کہ مین گیٹ پر چوکیدار بھی نہ تھا۔ سیٹھ نعمان نے ریموٹ کے الیکٹرانک لاک آپریٹ کرتے ہوئے مین گیٹ کھولا تھا۔ بنگلے میں داخل ہوتے وقت وہ یہی سوچ رہی تھی کہ وہاں ملازمین یا گیٹ پر چوکیدار ہوئے تو وہ خود کو ان کی نظروں سے کس طرح بچائے

گی۔ اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے ذرا سی گردن موڑ کر گیٹ پر نظر ڈالی۔ سیٹھ نے اندر آنے کے بعد گیٹ میں بنے چھوٹے دروازے کا تالا کھول کر کنڈی لگی رہنے دی تھی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ اس گھر سے ہو کر آخر سیلاب بلا کو کہیں اور بھی تو جانا ہوگا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی ورنہ الیکٹرانک لاک سسٹم دیکھ کر وہ تھوڑا سا پریشان ہوگئی تھی کہ جاتے ہوئے دروازہ کیسے کھولے گی مگر سیٹھ نے خود ہی یہ مشکل آسان کر دی۔

اگرچہ وہ پہلی بار کسی ایسے سنسان بنگلے میں اجنبی مکین کے ساتھ داخل نہیں ہو رہی تھی۔ یہ اس کے کھیل کا حصہ تھا لیکن اس کی ہمیشہ سے کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے پیچھے کوئی پہچان چھوڑ کر نہ جائے۔ البتہ اسے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ اس شخص کو خود اپنی نیک نامی کا زیادہ خیال تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے کرتوتوں کو دوسروں کی نظروں سے چھپانے کے لیے رازداری کا سارا انتظام خود ہی کر رکھا تھا۔ یہاں اس کے لیے پریشانی کی کوئی بات تھی ہی نہیں۔

سیٹھ نعمان احمد چائے والا شہر کا معروف بزنس مین تھا۔ اس کے پردادا نے چائے کا بزنس شروع کیا تھا اس لیے بمبئی سے کراچی آکر بس جانے والا گجرات کا یہ کاروباری خاندان اب بھی چائے والا کے لقب سے جانا جاتا تھا۔ اگرچہ اب اس کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا لیکن 'چائے والا' کی یہ پہچان اس کا بزنس ٹریڈ مارک تھا۔ نوری کو ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ آج اس کے جال میں پھنسنے والا شکار کاروباری دنیا کا کتنا بڑا نام ہے۔ اگرچہ کاروباری حلقوں میں اس کا نام بہت بڑا تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ اتنا بڑا عیاش تھا کہ اس کے دفتر میں نوکری کرنے والی کوئی لڑکی ایک ماہ سے زیادہ نہیں ٹک پاتی تھی۔ اگر کوئی لڑکی اس کا رنگ قبول کرلے تو وہ اسے زمین سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیتا لیکن جوں ہی اس کا دل بھرتا، وہ ایک بار پھر کہیں اور اپنے لیے نوکری تلاش کر رہی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود بھی کسی کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس کے اوپر کوئی انگلی اٹھا دیتی۔ سب لڑکیاں جانتی تھیں کہ اگر انہوں نے سیٹھ نعمان کے خلاف کوئی بات کی تو شاید اس کے اپنے گھر والے بھی اس پر یقین نہ کریں۔ اس نے اپنے ملازمین بالخصوص خواتین ملازمین کے گھر والوں میں اپنا بھرم ہی ایسا قائم کر رکھا تھا کہ بیٹیوں والے لٹیرے کو ہی اپنی عزت کا محافظ سمجھتے تھے۔ اس کا شکار جب کوئی لڑکی ملازمت چھوڑ کر جاتی تو وہ ان کے باپ، بھائی یا ماں سے رابطہ کر کے لڑکی کے کردار کی ایسی منظر کشی کرتا کہ وہ لوگ خود اپنی ہی نظروں میں گر جاتے کہ پلّو سے بندھے اپنے ہی سونے میں کھوٹ نکلا۔ شکریہ ادا کرتے تھکتے کہ سیٹھ صاحب نے ان کی عزت بچانے کی کتنی کوشش کی تھی۔

سیٹھ نعمان کو اب تو یہ بھی یاد نہ تھا کہ اس نے کتنی لڑکیوں کی زندگی تباہ کی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ جو لڑکی ایک بار اس کی زندگی سے نکلی وہ اتنی رقم ضرور ساتھ لے کر گئی کہ اس کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان سود و زیاں کا سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا تھا۔ وہ کاروباری بندہ تھا۔ اس لیے ہر لین دین اس کے نزدیک ایک سودے سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ ایک ہاتھ لیا، دوسرے ہاتھ دیا۔ ہاتھ جھاڑے، دامن جھٹکا اور سب کچھ صاف۔

سیٹھ نعمان کی بیوی بہت دین دار عورت تھی۔ وہ ایک شریف گھرانے کی اکلوتی بیٹی تھی۔ یہ واحد عورت تھی، جس سے وہ ڈرتا تھا۔ اگرچہ اس کی بیوی کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ شوہر ایسا پاکباز نہیں جیسا ظاہر کرتا ہے لیکن پھر بھی وہ اس کے اصل کرتوتوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی۔ جب تک بیوی زندہ رہی، وہ کبھی نشے کی حالت میں گھر نہیں لوٹا۔ ان دنوں جمعہ کی ہفتہ وار تعطیل ہوتی تھی۔ بیوی کو دکھانے کے لیے وہ نہایت اہتمام سے نماز جمعہ کی تیاری کرتا، بیٹے کو ساتھ لے جا کر جامع مسجد میں نماز ادا کرتا۔ دونوں بیٹیوں کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتا۔ بچوں کی دینی تعلیم کے لیے گھر پر بہترین انتظام کر رکھا تھا۔ دین دار بیوی نے دونوں بیٹیوں اور اکلوتے بیٹے کی پرورش اس طرح کی تھی کہ تینوں کا ظاہر و باطن شیشے کی طرح صاف ستھرا تھا۔ بیٹے پر بھی بدخصلت باپ کی کسی عادتِ بد کا کوئی اثر نہ تھا۔ یہ سب کچھ اس کی بیوی کی بدولت تھا۔ بیوی کو دکھانے کے لیے وہ باقاعدگی سے دینی مدارس، یتیم خانوں اور امدادی اداروں کی مالی معاونت کرتا تھا لیکن اس کے پردے میں اس کی شیطانی چالیں بھی جاری تھیں لیکن وہ کھاتا پیتا سب کچھ مگر خالی گلاس نہ توڑتا کہ بارہ آنے کی پکار سنائی دے۔ اس لیے گھر ہو یا باہر، ہر جگہ اس نے اپنا کردار سولہ آنے کھرا اور نیک نام سیٹھ کا بنا رکھا تھا۔

سیٹھ نعمان کی بیوی کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ دونوں بیٹیاں شادی شدہ تھیں اور امریکا میں رہ رہی تھیں۔ اکلوتا بیٹا بینکنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے جرمنی سے لوٹنے والا تھا۔ کامران احمد اپنے باپ کے الٹ تھا۔ باپ جتنا رنگین مزاج، بیٹا اتنا ہی مشرقی اقدار اور آداب و حیا کا

پابند۔ اپنے مذہبی رجحانات کی بدولت ہی کامران نے ان دنوں نئی متعارف ہونے والی اسلامی بینکنگ کا انتخاب کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بیٹے کی آمد کے بعد گھر پر اخلاقی پابندیاں لگ جائیں گی اور وہ اپنے ہی گھر میں کھل کھیل نہیں سکے گا، اسی لیے رنگین مزاج سیٹھ بیٹے کی آمد سے پہلے کا تمام تر وقت اپنی مرضی سے عیش وعشرت میں بتانے کا خواہش مند تھا۔ ویسے بھی اگلے روز کامران واپس لوٹ رہا تھا۔ سیٹھ نعمان نے بھی طے کرلیا تھا کہ بیٹے کے آنے سے پہلے اس گھر میں آخری بار اپنی من مانی کررہا ہے۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی معمولی غلطی سے اس کی عمر بھر کی بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے۔ یہی وجہ تھی کہ بیٹے کے جرمنی جانے کے بعد اس نے ملازمین کے اوقات کار بدل دیے تھے۔ گھریلو ملازمین صرف صبح میں تین گھنٹے کے لیے جبکہ چوکیدار رات دس بجے اپنی ڈیوٹی پر آتا تھا۔ یوں جب وہ نوری کو ساتھ لیے گھر میں داخل ہوا تو بالکل بے فکر تھا۔ وہ آزادی کی آخری شام بھرپور طریقے سے منانا چاہتا تھا۔

بیڈروم میں داخل ہونے تک وہ گھر کا اچھی طرح جائزہ لے چکی تھی۔ اس سے پہلے وہ اتنے پُرآسائش اور وسیع و عریض گھر میں کبھی نہیں آئی تھی۔ سیٹھ نعمان بریف کیس تھامے اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔

''تم آرام سے بیٹھو، میں ذرا نہا کر فریش ہوجاؤں۔'' سیٹھ نعمان نے بریف کیس میز پر رکھا اور ائرکنڈیشنر آن کرتے ہوئے کہا۔

''یقیناً......'' وہ صوفے پر بیٹھی۔ ''مجھے کوئی جلدی نہیں۔ آخر یہ وقت تم نے خریدا ہے۔''

''ارے ارے......'' وہ باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک پلٹا۔ ''تم نے کولڈ ڈرنک کی فرمائش کی تھی نا، بس ایک منٹ۔''

''ہاں سچ...... پیاس سے گلے میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔'' نوری نے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس طرح کہا جیسے بولنے سے اسے گلے میں تکلیف محسوس ہورہی ہو۔

سیٹھ کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ پلٹا تو کولڈ ڈرنک اور مشروبِ مغرب کی بوتل کے ساتھ ساتھ دو گلاس اور کیوبس سے بھرا آئس باکس بھی ہاتھوں میں تھا۔

''لیجیے...... جب تک میں فریش ہوتا ہوں، تب تک آپ اپنی پیاس بجھایئے۔'' سیٹھ نے لوفر انداز میں آنکھ مارتے ہوئے کہا اور دوبارہ باتھ روم کی طرف بڑھا۔ ''بڑی گرمی ہے، شاید نہانے سے من کی آگ میں تھوڑی کمی آئے۔''

یہ سن کر نوری زور سے ہنسی اور اسی کے عامیانہ انداز میں بولی۔ ''یہ آگ پانی سے نہیں بجھتی۔ آگ کو آگ مارتی ہے۔''

''چلیے، فریش ہوکر یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے باتھ روم کا دروازہ بند کردیا۔

کچھ دیر بعد سیٹھ باتھ روم سے نکلا تو نوری صوفے پر نیم دراز کولڈ ڈرنک پی رہی تھی۔ برابر میں اس کا بڑا سا وینیٹی بیگ دھرا تھا۔

''کہیے کچھ پیاس بجھی؟'' اس نے گاؤن کی ڈوری باندھتے ہوئے کہا۔

''پانی نے تو آپ کی آگ اور بھڑکا دی ہوگی۔''

''ارے چھوڑیے...... وہ اس کے برابر آکر بیٹھا تو نوری نے ٹیبل پر سے گلاس اٹھایا۔ ''لیجیے...... خوبصورت شام کا پہلا جام۔''

''ہم دونوں اور اس خوبصورت تنہائی کے نام۔'' سیٹھ نے لقمہ دیا۔

''یادگار......'' نوری نے کولڈ ڈرنک سے بھرا گلاس لبوں سے لگایا۔

''یادگار کیوں؟'' سیٹھ چونکا اور آگے ہوکر نوری کو بانہوں میں بھرلیا۔

''اس لیے کہ کسی کو کیا پتا کہ ہم پھر کبھی ملیں گے یا نہیں۔'' اس نے بڑے ناز سے جواب دیا۔

''ہم کئی بار مل سکتے ہیں۔'' وہ پھر شیطانی انداز میں مسکرایا۔ ''میرا بٹوا بہت بھاری ہے۔''

''زندگی شرط ہے۔'' یہ کہتے ہوئے نوری نے دوسرے ہاتھ سے گلاس کو نیچے سے اوپر کی طرف کرکے اس کے لبوں سے لگا دیا۔ ایک ہی گھونٹ میں سیٹھ نے گلاس خالی کردیا۔

کچھ دیر تک دونوں سحرانگیز لمحات میں ایک دوسرے میں کھوئے رہے اور پھر نوری کسمسائی۔ ''بیڈ پر چلیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

سیٹھ اس سے الگ ہوا اور مخمور چال چلتے ہوئے بیڈ کی طرف بڑھا اور پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا۔ ''آجاؤ جانِ من۔'' اس نے بانہیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی۔ ''میں ذرا فریش ہوکر آتی ہوں۔''

''اُفوہ...... اب اور کتنا انتظار کراؤ گی جانِ من۔'' سیٹھ نے مصنوعی لگاوٹ سے کہا۔

''بس ایک منٹ '' نوری نے لگاوٹ سے جواب

دیا۔

پانچ منٹ بعد وہ باہر آئی اور بیڈ کے کونے سے ٹک گئی۔ اس نے آہستگی سے سیٹھ کے چہرے پر انگلیاں پھیریں لیکن سیٹھ نے کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔ اس نے آنکھوں کی پتلیاں ضرور پھرائیں مگر چاہنے کے باوجود اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ اس کا چہرہ پتھریلا ہو رہا تھا۔ نوری نے اس کی پیشانی کی طرف دیکھا۔ پسینے کی چند بوندیں نمودار ہو رہی تھیں۔ اس نے گاؤن کھسکا کر سیٹھ کے سفید بالوں سے بھرے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ جسم ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ اس کے اعصاب سن پڑتے جا رہے تھے، البتہ حواس اب تک قدرے سلامت تھے۔

”مبارک ہو۔“ نوری نے اس کے چہرے کے قریب اپنا چہرہ کرتے ہوئے کہا اور پھر زوردار قہقہہ لگایا۔ ”زندگی کی آخری شام کے کچھ اور لمحات۔“ نوری نے اس کے چہرے پر انگلیاں پھرائیں۔ ”خوش نصیب عیاش ہو۔ حسینہ کی بانہوں میں زندگی کے آخری لمحات......“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

سیٹھ نعمان کا جسم مکمل طور پر بے جان ہو چکا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ اب جان کی بازی ہاری جا چکی ہے۔ اب وہ تیزی سے اپنے حواس بھی کھو رہا ہے۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر قوتِ گویائی جواب دے چکی تھی۔

”تو سیٹھ صاحب، اب ہم دونوں کے چلنے کا وقت ہو گیا ہے۔“ کچھ دیر بعد وہ یہ کہتے ہوئے اٹھی۔ ”ملک الموت کو خوش آمدید کہیے۔“

نوری ٹیبل کی طرف پلٹی۔ وہ سادہ سا بریف کیس تھا، لاک بھی نہیں تھا۔ بریف کیس کھولتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ بڑے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے جلدی جلدی سارے نوٹ اپنے وینٹی بیگ میں ٹھونسے اور صوفے پر بیٹھ کر منتشر سانسیں درست کرنے لگی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اتنے ڈھیر سارے نوٹ اکٹھے دیکھے تھے۔ اس نے جلدی جلدی بڑے بڑے گھونٹ لے کر کولڈ ڈرنک کا گلاس خالی کیا۔ وہ پہلی بار خود کو نروس محسوس کر رہی تھی۔ اس کی وجہ سیٹھ کی وہ دولت تھی جو اب اس کی ہو چکی تھی۔ کچھ دیر تک وہ گہری گہری سانسیں لے کر اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ اٹھی، بیگ کندھے پر لٹکایا اور بیڈ کی طرف پلٹی۔ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے سیٹھ کی آنکھیں بدستور کھلی تھیں مگر بے نور آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ چکی تھیں۔ یکدم اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ وہ تیزی سے پلٹی۔ چند لمحوں بعد وہ سنسان سڑک پر آگے بڑھ رہی تھی۔

اسے گھر جانے کی جلدی نہ تھی۔ اس کا دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ آخر ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ پلکیں بھیگنے لگیں۔

”ایک بار پھر......“ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ”مجھے معاف کر دے، مجھے معاف کر دے اے اللہ۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

سگنل کے قریب پہنچ کر نوری نے انگلی کی پور سے نم آنکھیں صاف کیں۔ ”صدر چلو گے؟“ اس نے وہاں کھڑی ایک ٹیکسی کے ڈرائیور سے پوچھا۔

”بیٹھیے۔“ ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

بیس پچیس منٹ بعد وہ ٹیکسی سے اتری اور سڑک کے قریب بنے فلیٹوں کی طرف بڑھنے لگی۔ گھنٹا بھر بعد جب نوری فلیٹ سے باہر نکل کر سڑک پر آئی تو اس کا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔ وہ سفید رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس اور سرتاپیر سیاہ برقع میں ملفوف تھی۔ کاندھے پر وہی بڑا سا سرخ وینٹی بیگ لٹکا ہوا تھا۔ اس کا رخ بس اسٹاپ کی طرف تھا۔ دس منٹ بعد وہ منی بس میں بیٹھی گھر لوٹ رہی تھی۔ اس کا دل اب بھی بوجھل تھا مگر آنکھیں خشک تھیں۔ چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔

☆☆☆

اس کا اصل نام نورین تھا لیکن جاننے والوں کے لیے وہ صرف نوری تھی۔ یہ نام اس کے باپ کا دیا ہوا تھا مگر ہوس کے ماروں نے اس کا نام ماتھے پر لگتا بدنامی کا جھومر بنا دیا تھا، جسے اس نے برقع میں چھپانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی نہ تھی مگر زمانے کی تند و تیز ہوا نے اسے بہت جلد یہ سبق سکھا دیا تھا کہ زندہ رہنے کے لیے جسم کا خراج دینا مجبوری بن جائے تو کیوں نا اس کی پوری پوری قیمت بھی وصول کر لی جائے۔ کئی سال کی عسرت، تنگ دستی اور رزقِ حلال کی تگ و دو نے اسے زندگی اور زندہ رہنے کا سبق بہت اچھی طرح پڑھا دیا تھا مگر نورین سے نوری بننے پر وہ خوش نہیں تھی۔ ہر شام وہ مرتی تھی۔ ہر روز سورج ڈھلے اس کا جسم ہوس کی کانٹوں بھری سیج پر نوچا کھسوٹا جاتا تھا۔ ہر صبح وہ ایک بار پھر جی اٹھتی تھی، ایک بار پھر کانٹوں کی سیج پر ہوس کے بھیڑیوں کی خوراک بننے کے لیے مگر اس کے باوجود دیکھنے والوں کے لیے وہ خوش حال اور خوش تھی۔

نورین کے من کا درد ظاہری مسکراہٹ کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ شاید ہی کوئی اس کی اصلیت جانتا تھا۔

معاشرے کی دی ہوئی مجبوریاں، خدا کی طرف سے آئی آزمائشیں یا پھر پیٹ کی آنچ...... اس کے لیے سب مشکلات سے نکلنے کا حل پیسہ تھا مگر محنت سے کمایا ہوا۔ مڈل تعلیم، خالی ہاتھ مگر خوبصورت بدن اور نوکری کی تلاش......

بہت جلد اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ مجبوری کی قیمت ہر اس شخص کو چکانا پڑتی ہے جو بازار کے بھید بھاؤ نہ جانتا ہو۔ قسمت کی ستم ظریفی کہ اسے قدم قدم پر شاطروں اور عیاروں سے واسطہ پڑا تھا۔ کئی بار لٹنے پر بھی جب اس کی مجبوریاں سامنے کھڑی ہنستی رہیں تب اسے خیال آیا کہ بازار میں تو نکل آئی ہے اگر خود کو بازار کی جنس بنا دیا جائے تو وہ مول حاصل کر سکتی ہے جو من چاہا ہو۔ یہ احساس دلایا تھا اتفاقاً جانے والی آنٹی رضیہ نے۔ ایسا ہوا بھی۔ جلد ہی وہ تنگ دستی سے تو پیچھا چھڑا گئی مگر دل پر گناہ کا بوجھ بڑھتا گیا۔ وہ سوچتی تھی کہ چہرے کی مسکراہٹ سب دیکھتے ہیں، اسی لیے مسکراتی رہتی تھی لیکن من کے آنسو کسے دکھائی دیتے ہیں۔

کئی برس کی خواری کے بعد نورین اپنے کام کی بدولت خوش حال زندگی بسر کرنے کے قابل تو ہو چکی تھی مگر اس کی روح ناآسودہ تھی۔ پیٹ کی آگ سرد کرنے کے لیے پیسے کا پانی اس کے پاس تھا۔ جسم کی زیبائش کے لیے وہ قیمتی لباس خرید سکتی تھی اور اکثر خریدتی بھی تھی۔ اب تو کئی سال ہو گئے نہ تو گھر میں فاقہ ہوا اور نہ ہی شدید بیماری کے باوجود اس کی بیوہ ماں کو دوا خریدنے کے لیے سلائی مشین چلانا پڑی۔ بظاہر سب کچھ بہت عمدگی سے چل رہا تھا۔

نورین کی ماں خوش تھی۔ وہ اکثر ملنے جلنے والیوں کو بڑے فخر سے کہتی تھی کہ بیٹی نے بیٹا بن کر دکھا دیا۔ ماں کی بات سن کر وہ اکثر سوچ میں ڈوب جاتی تھی۔ سچ ہے کہ اگر بیٹی خود کو لکڑی بنا کر چولھے میں جھونک دے تو گھر کا چولھا ضرور گرم ہو جاتا ہے۔

نورین کی ناآسودہ زندگی میں خوش حالی خود اس کے وجود کی مرہونِ منت تھی۔ وہ جوان تھی، کم عمر تھی اور بہت خوبصورت تھی مگر زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ اسے بھی اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ وہ بہت جلد جان گئی کہ معاشرے میں دوسروں پر اپنی دھاک جمانے کے لیے ان لوگوں کے سامنے بھی فرفر انگریزی بولنا ضروری ہے جو شاید وہ زبان بھی اچھی طرح نہیں بول پاتے ہوں، جس میں ان کی ماں نے لوریاں سنائی تھیں۔

☆☆☆

نورین کا باپ ایک سرکاری دفتر میں چپراسی تھا۔ وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ابھی وہ ساتویں میں ہی تھی کہ ایک روز اس کے باپ کو سڑک پار کرتے ہوئے تیز رفتار بس نے کچل دیا۔ وہ اسی گز کے ایک مکان میں رہتی تھی۔ یہ مکان بھی اس کے نانا کی موت کے بعد ترکے میں ملا تھا۔ باپ ایمان دار اور بے اختیار سرکاری ملازم تھا۔ وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنی کمائی سے گھر بنا سکے۔ میاں کی پچیس سال کی ملازمت کا جو پھل اس کی بیوہ کو ملا وہ معمولی سی ماہانہ پنشن تھی۔ اس رقم میں بیوہ کیا گھر چلاتی، کیا بیٹی کو پڑھاتی مگر پھر بھی جیسے تیسے کر کے نورین نویں جماعت میں پہنچ ہی گئی۔ سرکاری اسکول کی ماہانہ ٹیوشن فیس تو نہیں تھی مگر اس بار بورڈ کے امتحان ہونے تھے۔ امتحانی فیس کی رقم نہ ہونے کے سبب کپڑے سی سی کر اخراجات پوری کرنے والی بیوہ نے بیٹی کو گھر بٹھا لیا۔ اب وہ بھی دن بھر گھر پہ رہتی۔ گھرداری کے ساتھ ساتھ کپڑوں کی سلائی میں ماں کا ہاتھ بٹاتی رہتی تھی۔

نورین کے گھر کا ہو جانے کے بعد اس کی ماں مستقل طور پر سر اور کمر درد کے ساتھ سلائی مشین کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ کپڑے سی سی کر گھر کا خرچہ نکل آیا کرے تو پنشن کی رقم جمع کر کے وہ بیٹی کے بیاہ کے بارے میں سوچنے کے قابل ہو جائے گی۔ نورین ماں کے خیالات کو اچھی طرح جانتی تھی۔ کبھی کبھار وہ دل میں حساب لگاتی کہ بڑھتی مہنگائی میں مرحوم باپ کی پنشن جوڑ جوڑ کر وہ کتنے سال میں اپنے گھر کی ہو سکتی ہے۔ وہ ذہین تھی۔ اسے ماں کی سوچ فرسودہ نظر آتی تھی۔ اس پر وہ دل ہی دل میں ہنس بھی لیتی تھی۔ شاید بیوہ ماں مرحوم شوہر کی پنشن جوڑ جوڑ کر بیٹی کے ہاتھ پیلے کر ہی دیتی مگر تقدیر کی کسے خبر۔ غیر محسوس انداز میں تقدیر کی ایک کروٹ نے اس گھر کے حالات کا رخ بدل دیا۔

سلائی کے لیے مستقل بیٹھے رہنے کے باعث ماں کو کمر کی تکلیف ہو گئی تھی۔ تکلیف حد سے بڑھی تو وہ اسے سرکاری اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ ریڑھ کی ہڈی کے مہروں پہ سوزش ہے۔ تقریباً چھ ماہ آرام کا مشورہ اور اس دوران استعمال کے لیے پرائیویٹ میڈیکل اسٹور سے خریدنے کے لیے کئی ہزار روپے کی دواؤں کا نسخہ سرکاری ڈاکٹر نے بالکل مفت میں لکھ کر دے دیا۔ غریب جان کر

ساتھ ہی یہ مفت مشورہ بھی بنا مانگے دے دیا کہ اگر آرام نہ آئے تو مزید اچھے علاج کے لیے کلینک پر مریضہ کو لے آئے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی مریضہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا۔ ایک وقت کی معائنہ فیس تھی ہزار روپے۔

نورین نے کارڈ تو لے لیا مگر بے دلی سے۔ وہ بے چاری تو سوچ رہی تھی کہ ماں تو بستر پہ پڑ گئی ہے، اب گھر کیسے چلے گا۔ دوا کا خرچ کیسے پورا ہوگا۔ زندگی کے ساتھ ضرورت کے نام پہ جڑے سیکڑوں اخراجات کس طرح پورے ہوں گے۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کی بوڑھی ماں بھی اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

سوچنے سے مسئلے حل ہوتے ہوں تو شاید دنیا میں کوئی مسئلہ باقی نہ بچے۔ یہی حال ان کا بھی تھا۔ مسائل، سوچ، فکر، پریشانی اور بیماری...... ان کے گھر میں ڈیرے ڈال چکے تھے۔

جیسے تیسے کر کے پندرہ دن گزر گئے۔ ماں تو اٹھنے بیٹھنے سے قاصر تھی۔ مشین کی ہتھی نے گھومنا چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں مشین کی گھوں گھوں کب کی بند ہو چکی تھی۔ سناٹے، گرد آلود مشین اور بیماری...... کپڑوں کی سلائی سے ملنے والے دو پیسوں کا آسرا ختم ہو چکا تھا۔ جمع جتھے پر گزارا چل رہا تھا مگر کب تک...... بوڑھی ماں، بیٹی کے بیاہ کے لیے جمع رقم خود پہ خرچ ہوتا دیکھ کر دل ہی دل میں روتی تھی مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ ماں بیٹی پر مشکل یہ آن پڑی تھی کہ جمع جتھا خرچ ہونے سے جہاں کئی خوابوں کی کلیاں مرجھا رہی تھیں، وہیں ایک پریشانی یہ تھی کہ اس کے بعد کیا ہوگا...... پنشن سے گھر چلے یا دوا دارو کا خرچ پورا ہوگا۔

نورین نے ایک بار سوچا کہ خود کپڑے سینا شروع کر دے مگر اس کے ہاتھ میں صفائی نہیں تھی۔ اس نے دو عورتوں کے لان کے سوٹ سیے اور وہ دونوں عورتیں سلائی اور سلے سوٹ اس کے منہ پر مار کر چل دیں۔ اس کے بعد کسی نے پلٹ کر خبر نہ لی کہ درزن نے دوبارہ کپڑے سینا شروع کیے یا نہیں۔ تقریباً ایک ماہ ہونے والا تھا۔ اب نورین یہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ کیا کرے۔ وہ کونسلر صاحب کے گھر گئی۔ حاجی صاحب شفیق انسان تھے۔ انہوں نے بہت جلد اس کا شناختی کارڈ بنوا دیا۔ اب نورین خود کچھ کرنے کے لیے کمر کس چکی تھی۔ کم تعلیم کے باوجود نورین کا حوصلہ، صلاحیت اور اعتماد بلا کا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کر لے گی۔

پہلے پہل تو وہ ایک جاننے والی عورت کی وساطت سے گارمنٹس فیکٹری پہنچی۔ یہاں اسے بہت کم معاوضے پر سلے کپڑوں کی فنشنگ کا کام مل گیا مگر صبح آٹھ سے رات نو بجے تک کام اور پھر فیکٹری آنے جانے کے لیے مزید دو ڈھائی گھنٹے بس میں سفر...... صبح چھ بجے گھر سے نکلتی تو رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے گھر پہنچتی۔ اوپر سے یہ کہ اگر کہیں ہنگامے ہو جائیں تو پھر رات کے ایک دو بھی بج جاتے تھے۔ کبھی ہڑتال ہو جاتی تو دیہاڑی گئی۔ اوپر سے یہ مصیبت کہ بوڑھی ماں تو اٹھنے بیٹھنے سے لاچار تھی۔ وہ سارا دن بھوکی پیاسی پلنگ پر پڑی بیٹی کے آنے کی منتظر رہتی کہ کب وہ آئے گی اور اسے کھلائے پلائے گی۔ نورین کی زندگی بہت مشکل سے دوچار تھی مگر جیسے تیسے وہ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور تھی۔

ان دنوں کراچی کی بدامنی عروج پر تھی۔ ایک بار جو ہڑتال ہوئی تو تین دن تک چلی۔ چوتھے دن خدا خدا کر کے سڑکوں پر بسیں نکلیں اور جب وہ فیکٹری پہنچی تو معلوم ہوا کہ کچھ شرپسندوں نے اسے دوران رات پہلے ہی آگ لگا دی تھی۔ روزگار نہیں رہا، اس کے پچیس دن کی تنخواہ بھی گئی۔ اس روز وہ بس میں بیٹھی سارے راستے رو رو کر ہلکان ہوتی گھر لوٹ رہی تھی۔ برقع کے نقاب میں چھپی اس کی آنکھیں مجبوری کا نوحہ پڑھ رہی تھیں مگر ان سے کسی کو کیا واسطہ...... دنیا تو وہ دیکھتی ہے جو نظر آتا ہے۔

نورین بہت حسین تھی لیکن حسن بے نقاب نہ ہو تو پرستار قریب نہیں آتے۔ شمع کی روشنی نہ پھیلے تو پروانے شمع دان کے پاس نہیں آتے۔ جو دکھائی نہ دے، وہ دنیا کے بازار میں انمول نہیں بے قیمت ہے۔ برقع میں لپٹا نورین کا معصوم حسن اور روتا بلکتا دل...... ان سے کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ البتہ کئی ایسے تھے کہ جو چلتی بس کی کھلی کھڑکی سے تیز ہوا کے ایسے جھونکے کے منتظر تھے جو اس کے رخ پہ پڑے نقاب کو پلٹ دے مگر اس روز کسی کی حسرت پوری نہ ہوئی۔ اسٹاپ آتے گئے، بس رکتی اور چلتی رہی، لوگ اترتے اور چڑھتے رہے مگر نقاب الٹنے کی حسرت...... وہ اترنے والوں کے ساتھ جانے کے بجائے ہر آنے والے کے دل میں گھر کرتی رہی۔ نورین بدستور بے آواز رو رہی تھی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے مگر نقاب کے پیچھے چھپی آنکھوں سے۔

جیسے تیسے کر کے مزید ایک ہفتہ گزر گیا۔ نورین بری طرح ٹوٹ چکی تھی مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ ایک بار پھر حوصلہ کیا اور [illegible]مت کی تلاش شروع کر دی۔ اس بار اس

نے فیصلہ کیا تھا کہ کسی دفتر میں نوکری کرے گی تا کہ ماں کی دیکھ بھال کا وقت مل سکے۔ ویسے بھی اب وہ کسی حد تک چلنے پھرنے کے قابل تو ہو چکی تھی مگر مہروں کی سوزش پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔

کئی روز کے بعد ایک نوکری مل ہی گئی۔ اسے سٹی اسٹیشن کے قریب واقع ایک بہت بڑے پلازہ میں دو کمروں پر مشتمل دفتر میں ملازمت ملی تھی۔ نیم تاریک دفتر کا ماحول بہت پُراسرار تھا۔ یہ ایک ریکروٹنگ ایجنسی کا دفتر تھا جو لوگوں سے پیسے لے کر انہیں دبئی، سعودی عرب وغیرہ میں ملازمت دلواتی تھی۔ نورین کو دفتر کے مالک نے ٹیلی فون آپریٹر رکھا تھا۔ ملازمت کے اوقات صبح نو سے شام پانچ تک تھے۔

دو تین دن تو ٹھیک گزرے۔ نورین سارا دن داخلی دروازے کے سامنے ایک میز اور کرسی پر مشتمل استقبالیہ پر بیٹھی رہتی۔ دن بھر لوگوں کے فون آتے رہتے۔ وہ انہیں ہولڈ کروا کر مالک سے بات کراتی۔ اکثر جوابات وہ خود دیتی تھی۔ دو دن میں ہی وہ سمجھ گئی کہ دفتر کا مالک عبدالقادر خود بات کرنے سے گریز کرتا تھا۔ زیادہ تر لوگ صرف یہی جاننے کے لیے فون کرتے تھے کہ ان کا ویزا کب آرہا ہے اور جواب میں نورین مالک کا رٹایا ہوا جواب سنا دیتی تھی۔

”پروسیس ہو رہا ہے، جیسے ہی ویزا آتا ہے، آپ کو اطلاع کر دی جائے گی۔ بے فکر رہیں اور جانے کی تیاری کریں۔“ پہلے ہی دن اس نے اتنی بار یہ جملہ دہرایا کہ پھر مشین کی طرح اسے ادا کرنے لگی تھی۔

ہفتہ، دس دن تو خیریت سے گزرے مگر پھر ایک دن عبدالقادر نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ کچھ دیر تک وہ اسے کرید کرید کر گھر والوں، رشتے داروں اور ان کے مالی حالات کے بارے میں پوچھتا رہا۔ نورین بھی بھولپن میں اسے ہمدرد سمجھ بیٹھی اور سارا ماجرا کہہ ڈالا۔

”بے فکر رہو۔“ سب کچھ سننے کے بعد عبدالقادر نے میٹھے لہجے میں اس سے کہا۔ ”یہ ملازمت تمہاری ہے اور جب تک تم چاہو گی، تمہاری ہی رہے گی۔“

”جی بہت شکریہ۔“ یہ سن کر نورین کی ڈھارس بندھی کہ چلو ملازمت تو پکی ہے۔ اس خوشی میں بے چاری نے یہ نہ دیکھا کہ اس وقت عبدالقادر کے ہونٹوں پہ رقصاں مسکراہٹ اور اس کے سراپا کا طواف کرتی آنکھیں خاموشی کی زبان میں کیا کہہ رہی تھیں۔ فون کی گھنٹی بجی تو وہ دوسرے کمرے میں استقبالیہ کی طرف جانے کو مڑی۔

”تم ایک کام کرو۔“ اسے اٹھتا دیکھ کر عبدالقادر نے جلدی سے کہا۔

”جی سر!“ وہ ٹھہر گئی۔

”کسی کا بھی فون ہو، کہہ دینا میں دفتر میں نہیں ہوں۔“

”جی بہتر سر۔“ وہ پلٹ رہی تھی کہ اس نے پکارا۔

”پوری بات سنو۔“ اس نے ٹوکا۔

وہ خاموشی سے کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”میں نے بریانی، کھیر اور کولڈ ڈرنکس منگوائی ہیں۔ لڑکا لے کر آئے تو فون لائن آف کر کے دروازہ بند کر دینا۔ سکون سے بیٹھ کر لنچ کریں گے۔“

”ٹھیک ہے سر...... اب میں جاؤں؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔ فون کی گھنٹی بدستور بج رہی تھی۔

عبدالقادر نے سر ہلا کر جانے کا اشارہ کیا۔

کوئی ڈیڑھ بجے ڈیلیوری بوائے کھانا لے کر آیا۔ اس نے کھانا اندر کمرے میں بھجوا دیا۔ ابھی وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف ایک کلائنٹ تھا۔ وہ کئی روز سے فون کر رہا تھا لیکن عبدالقادر نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ لائن اسے ٹرانسفر نہ کی جائے۔ اسے مطمئن کرنے میں دس پندرہ منٹ لگ گئے۔ جب وہ اٹھ کر کمرے میں پہنچی تو عبدالقادر میز پر کھانا سجائے اس کا منتظر تھا۔ بریانی، رائتہ اور کھیر کے ساتھ کولڈ ڈرنکس سے بھرے دو گلاس بھی سامنے رکھے تھے۔ سمٹی سمٹائی نورین خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا جب وہ کسی غیر مرد کے ساتھ تنہائی میں لنچ کر رہی تھی۔ اسے اس وقت خاصی شرم محسوس ہو رہی تھی جو کہ فطری بات تھی۔ وہ اس طرح کے ماحول کی عادی ہی نہ تھی۔ کمرے میں ائر کنڈیشنر چلنے کی گھوں گھوں کے سوا مکمل خاموشی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے ایک گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے شکریہ کہتے ہوئے گلاس تھام لیا۔ وہ کولڈ ڈرنک پی کر جانے کے لیے اٹھی تو ہلکے سے لڑکھڑا گئی مگر فوراً کرسی تھام کر خود کو گرنے سے بچایا۔

”کیا ہوا محترمہ......“ عبدالقادر نے اپنائیت سے کہا۔

”کچھ نہیں سر...... لگتا ہے پاؤں سن ہو گیا تھا۔“

”کوئی بات نہیں۔“

”اچھا سر میں چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

”سنو......“

”جی سر!“

''بھئی ابھی ابھی لنچ ختم کیا ہے۔ ویسے بھی تمہارے کمرے میں خاصی گرمی ہوگی۔ بہتر ہے کچھ دیر یہیں صوفے پر بیٹھ جاؤ۔''

''نہیں سر...... فون آف ہے۔ لوگوں کے فون آرہے ہوں گے۔''

''ارے بھئی آنے دو۔ کچھ دیر آرام کرلوگی تو کوئی پہاڑ نہیں گر پڑے گا۔ ویسے بھی فون کرنے والوں کے پاس ہمارے فائدے کا تو کچھ ہے نہیں۔ اپنے مقصد سے فون کرتے ہیں، پھر کرلیں گے۔ تم آرام کرلو۔ کھانے کے بعد قیلولہ کرنا ویسے بھی صحت کے لیے بہت بہتر ہے۔''

''جیسا آپ کہیں......'' یہ کہتے ہوئے وہ پلٹی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ نورین کو کھانے کے بعد جسم کچھ کچھ سن سا لگنے لگا تھا۔ سر بھی بھاری ہورہا تھا۔ ویسے بھی وہ ناشتا کرکے نہیں آئی تھی۔ اسے لگا کہ شاید بھوک کے باعث کھانے کے خمار سے ایسا ہورہا ہے۔ سر کا بھاری پن بڑھتا جارہا تھا۔ اس نے لاکھ کوشش کی کہ آنکھیں کھلی رہیں لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے اپنے اعصاب پر قابو کھوتی جارہی ہو۔ اس نے صوفے سے سر ٹکادیا۔ لاکھ کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ نیم تاریک ٹھنڈے کمرے میں صوفے پر ڈھے گئی۔ آنکھ بند ہونے سے پہلے اس نے آخری بار سامنے نظر ڈالی۔ عبدالقادر قریب کھڑا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خباثت بھری مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شیطانیت رقصاں تھیں۔ نورین کا دماغ بدستور نیند تلے دبتا جارہا تھا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوچکی تھی۔ وہ گہری نیند سوچکی تھی۔

نہ جانے کتنی دیر وہ گہری نیند میں رہی جاگنے پر پہلے تو اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جب اس کا دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا اور اس نے خود پر نظر ڈالی تو سب کچھ سمجھ گئی۔ بے ترتیب لباس فرش پر پڑا دوپٹا اس کے لٹنے کی دہائی دے رہا تھا۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ عبدالقادر وہاں نہ تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپا اور زاروقطار رونے لگی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے سامنے دیکھا۔ عبدالقادر کمرے میں داخل ہورہا تھا۔ اس نے لائٹ جلائی اور نورین کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

''اتنا اداس مت ہو۔'' وہ نورین کے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور روئے جارہی تھی۔

''جو ہونا تھا، ہوچکا۔ اب رونے سے کیا فائدہ۔'' یہ کہتے ہوئے عبدالقادر نے اس کی گردن میں اپنی بانہیں حمائل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ تڑپ کر اٹھی۔

''تم...... بے غیرت انسان۔''

''بکواس مت کرو۔'' یہ کہتے ہوئے عبدالقادر تیزی سے اٹھا اور اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ وہ فرش پر گرگئی۔ ''ایسا ناٹک کررہی ہے جیسے بہت انہونی بات ہوگئی ہو۔'' اس نے نہایت رعونت سے کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے قدموں میں پڑی نورین روئے جارہی تھی۔

کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ آخر نورین بدقت تمام اٹھی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ خباثت سے مسکرایا۔ ''باتھ روم میں جاکر منہ ہاتھ دھولو۔''

نورین نے اس کے چہرے کی طرف غصے سے دیکھا لیکن بنا کچھ کہے اپنا لباس درست کرکے اٹیچڈ باتھ روم میں چلی گئی۔ رونے اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس کی طبیعت میں لٹنے کا احساس بظاہر تو کچھ کم ہوگیا تھا مگر اسے یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے اپنی بے توقیری پر اس کے جسم کا روں روواں دھاڑیں مار مار کر رورہا ہو۔ وہ باتھ روم سے باہر آئی تو سامنے عبدالقادر کھڑا تھا۔ اس نے نورین کو دونوں بازوؤں سے پکڑلیا۔ ''جو کچھ ہوا، اتنا برا بھی نہیں تھا۔''

''چھوڑو مجھے......'' وہ کسمسائی۔ ''مجھے جانے دو۔'' اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

''میں تمہیں روک نہیں رہا، جاؤ بڑے شوق سے جاؤ مگر ایک بات یاد رکھنا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نورین کو زبردستی صوفے پر بٹھادیا۔ ''پولیس کے پاس جانا چاہو تو فوراً جاؤ مگر یہ یاد رکھنا کہ بدنامی تمہارا مقدر ہوگی میرا نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گڈی اس کی نظروں کے سامنے گھماتے ہوئے بولا۔ ''میری بات مانو گی تو یہ نہیں اس جیسی بہت سارے نوٹوں کی گڈیاں تمہارے پاس آتی رہیں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے وہ نوٹ نورین کے ہاتھ میں پکڑانے کی کوشش کی مگر اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ نوٹ فرش پر بکھر گئے۔ یہ دیکھ کر وہ زور سے ہنسا۔ ''ابھی برا لگ رہا ہے لیکن جب تمہارا غصہ ٹھنڈا پڑجائے گا تو تمہیں اسی میں فائدہ نظر آئے گا۔ عیش کروگی عیش...... مان لو میری بات۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نورین کو خود سے چمٹانے کی کوشش کی مگر اس نے غصے سے اس کے

بازوؤں کو جھٹکا اور غصے سے تلملاتی ہوئی اٹھی۔

''لعنت بھیجتی ہوں ایسے نوٹوں پر اور تم جیسے مردوں پر......'' یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔

''آنا ضرور، انتظار رہے گا۔'' پیچھے سے عبدالقادر نے کہا مگر اس نے کچھ کہے بنا اپنا پرس اٹھایا اور دفتر سے نکل گئی۔

شام ڈھل رہی تھی۔ وہ غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے پیدل چلتی رہی۔ اس کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں مگر اس کا دل بدستور روئے جا رہا تھا۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ سر پر وارث نہ ہو تو پیٹ کی آنچ سرد کرنے کے لیے بیٹیوں کو کیا کچھ قیمت چکانا پڑ سکتی ہے۔ اسے رہ رہ کر اپنی کم تعلیم پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے اچھی تعلیم حاصل کی ہوتی تو شاید اسے ملازمت کے لیے ایسے گھٹیا مردوں کے بجائے باعزت اداروں میں نوکری ضرور مل جاتی۔ اس کے دماغ میں ایک کے بعد دوسری سوچ آندھی طوفان کی طرح داخل ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے دماغ کی تنی ہوئی نسیں کسی بھی لمحے پھٹ کر سارا لہو اگل دیں گی۔ وہ بیک وقت اپنی یتیمی، بے چارگی اور غربت کے طوفان میں تھی تو دوسری طرف عزت لٹ جانے کا دکھ اسے مارے جا رہا تھا۔

بے عزتی کا احساس اور لاچارگی کے دیے گئے دکھوں کا بوجھ اٹھائے اٹھائے وہ ایمپریس مارکیٹ تک پہنچ گئی۔ اچانک اسے لگا کہ جیسے زمین گھوم رہی ہو۔ ہر طرف آندھیاں چل رہی ہوں۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا اور پھر وہ سڑک پر ڈھتی چلی گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اسے گرتا دیکھ کر سڑک کنارے چلتی ہوئی دو نوجوان لڑکیاں تیزی سے اس کی طرف لپکیں۔ ''شاید گرمی سے بے ہوش ہو گئی ہے، چکر آ گئے ہوں گے۔'' ان میں سے ایک نے دوسری سے کہا۔

ان دونوں لڑکیوں نے نورین کو عورت ہونے کے ناتے سنبھالا۔ اسی دوران سامنے والے ہوٹل کا ویٹر پانی سے بھرا جگ لے آیا۔ ایک لڑکی نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ دوسری اس کے چہرے پر دوپٹے کے پلو سے ہوا جھلنے لگی۔ کچھ دیر میں وہ ہوش میں آ گئی۔

''میں چلتی ہوں۔'' نورین نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے لہجے سے نقاہت جھلک رہی تھی۔

''تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔'' ان میں سے نسبتاً بڑی لڑکی نے کہا۔ ''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ بہتر ہے کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔ ویسے تمہیں جانا کہاں ہے؟''

''ماڈل کالونی......''

''وہ تو بہت دور ہے۔ کہیں بس میں تمہاری طبیعت بگڑ گئی تو......'' دوسری لڑکی نے ٹوکا۔

''دیکھو......'' پہلی لڑکی نے نورین کو مخاطب کیا۔ وہ اس کا بازو تھامے کھڑی تھی۔ ''یہاں قریب میں ہی ہمارا فلیٹ ہے۔ تم ہمارے ساتھ گھر چلو۔ تھوڑی دیر پنکھے میں بیٹھو۔ تمہاری طبیعت بہتر ہو جائے تو ہم دونوں تمہیں خود بس میں بٹھا دیں گے۔ اس وقت تمہارا سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''نہیں میں چلی جاؤں گی۔''

''ہرگز نہیں۔'' دونوں لڑکیوں نے بیک زبان ہو کر کہا۔

''مگر......''

نسبتاً بڑی عمر کی لڑکی نے تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم ہماری بہن جیسی ہو۔ ہم تمہیں خوامخواہ خطرہ مول نہیں لینے دیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھی۔ نورین بھی کچھ کہے بنا ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

صدر میں لکی اسٹار کے قریب واقع اپارٹمنٹس میں زیادہ تر کرسچن اور تھوڑے بہت مسلمان آباد تھے۔ قدیم انداز میں تعمیر کردہ اس اپارٹمنٹس بلڈنگ میں عام طور پر متوسط طبقے کے افراد رہائش پذیر تھے۔ وہ دونوں لڑکیاں آنٹی رضیہ کے ساتھ اسی بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر رہتی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام شازیہ تھا جو شازی کہلاتی تھی دوسری تھی نعیمہ عرف نمو۔ دونوں کا تعلق پنجاب سے تھا اور کراچی میں آنٹی رضیہ نہ صرف ان دونوں بلکہ ان جیسی کئی بے سہارا اور غریب لڑکیوں کی چھپر چھاؤں تھی۔ صبح سے شام تک ان گنت لڑکیوں کی فلیٹ میں آمد و رفت رہتی تھی لیکن نمو اور شازی وہاں کی مستقل رہائشی تھیں۔ اس دوپہر دونوں گھر کا سودا سلف لینے کے لیے ایمپریس مارکیٹ پہنچی تھیں کہ انہوں نے نورین کو بے ہوش ہو کر گرتا دیکھ لیا اور جب وہ اسے سہارا دے کر اپنے فلیٹ میں لائیں، اس وقت آنٹی رضیہ کے سوا وہاں کوئی اور نہ تھا۔

نورین اس وقت تک پورے ہوش و حواس میں نہ تھی۔ اس کی نہ کوئی بہن تھی نہ بھائی۔ لے دے کر صرف ایک ماں تھی وہ بھی مصیبتوں کی ماری ہوئی۔ ایسے میں وہ کس سے اپنے دل کا حال کہتی۔ کس کے کندھے پر سر رکھ کر روتی۔

اب جو اسے ان لڑکیوں اور آنٹی کی توجہ ملی تو اس کا دل بھر آیا۔ شازی اور نمو نے مختصراً ساری کہانی آنٹی کو سنائی اور جب انہوں نے اسے بیڈ پر لٹا کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر پیار سے سہلانا شروع کیا تو نورین کا دل بھر آیا۔ وہ جی بھر کر روئی اور نہ جانے کیسے اس دوران اس کی آنکھ لگ گئی۔ شاید یہ اس خواب آور دوا کا اثر تھا جو عبدالقادر نے اسے سوفٹ ڈرنک میں ملا کر پلائی تھی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ آنکھیں موندے لیٹی رہی اور پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اسی دوران آنٹی کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہیں آتا دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

''آنٹی میں چلتی ہوں، گھر پہنچنا ہے۔ شام ہو چکی۔''

اس نے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

''چلی جانا میری بچی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کے برابر بیٹھ گئیں۔ ''اب تمہاری طبیعت کافی بہتر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے نورین کے سراپا پر نظر ڈالی اور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''آج بہت گرمی ہے۔ لگتا ہے اسی کی وجہ سے تمہاری طبیعت خراب ہوئی تھی۔ میرے خیال میں تم نہالو تو طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔ پھر نمو اور شازی تمہیں اسٹاپ تک چھوڑ آئیں گی۔'' وہ پوچھنا تو بہت کچھ چاہتی تھی لیکن یہ سوچ کر کچھ کہنے سے گریز کیا کہ لڑکی اجنبی ہے، پہلی ملاقات ہے اور بھی ناخوش گوار حالات میں۔ ایسے میں اس نے نورین کو کریدنے کے بجائے پیار جتانے پر ہی اکتفا کیا۔

اسی دوران نمو اور شازی بھی کمرے میں آگئیں۔ وہ دونوں بہت ہمدرد تھیں۔ ان کے اصرار پر نورین غسل خانے کی طرف چل دی۔ نہا کر نکلی تو وہ تینوں چائے کے ساتھ اس کی منتظر تھیں۔ نہانے اور چائے پینے کے بعد اس کی طبیعت کافی ہشاش بشاش ہو گئی۔ تذلیل کا دکھ بھی کچھ کم ہو گیا تھا۔ چائے کے دوران بھی وہ تینوں مسلسل اس کی دلجوئی کرتی رہیں۔

نورین جب گھر پہنچی تو رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ ماں کو سلام کر کے وہ سیدھے اپنے کمرے میں گئی اور بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

''کیا ہوا میری بچی......'' کچھ دیر بعد ماں نے کمرے میں آکر لائٹ جلاتے ہوئے کہا تو اس نے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں۔ ''لگتا ہے آج بہت کام کیا، تھک گئی ہو۔'' وہ پلنگ پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''بس امی......'' نورین نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بدقت تمام کہا۔

''کیا سر میں درد ہو رہا ہے؟''

''جی امی......''

''لاؤ سر دبا دوں۔''

''رہنے دیں۔''

''اچھا کھانا کھالو، پھر گولی کھا کر سو جانا۔''

''امی مجھے بھوک نہیں ہے۔ سر میں درد ہے۔ آپ گولی لا دیں۔''

وہ ساری رات نورین نے نہایت کرب میں گزاری۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب وہ روتے روتے سو گئی۔ صبح ماں نے جگایا تو اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ جسم بھی ہلکا ہلکا تپ رہا تھا۔

''تجھے تو حرارت ہو رہی ہے بیٹا۔'' ماں نے اس کے چہرے سے ہی بھانپ لیا تھا کہ بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ''سو جا۔ آج دفتر جانے کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے چلی گئی۔

نورین دوبارہ سو گئی اور جب آنکھ کھلی تو دوپہر کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ آنکھیں موندے بستر پر لیٹی رہی۔ اس نے کئی بار کن انکھیوں سے ماں کو کمرے میں آتا جاتا دیکھا لیکن بظاہر وہ سوتی بنی رہی۔ تذلیل کا گھاؤ اگرچہ تازہ تھا لیکن زخم مندمل ہونے لگے تھے۔ اگرچہ اس کا دل اب بھی دکھی تھا لیکن اب وہ اس سے آگے کا سوچ رہی تھی۔ عبدالقادر کے دفتر میں دوبارہ جانے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پریشان تھی کہ ماں کو نوکری چھوڑنے کا کیا جواز بتائے۔ اس کی پریشانی یہ بھی تھی کہ چند روز کی ملازمت تھی وہ بھی کافی دن بعد ملی تھی اب وہ کیا کرے گی۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی تذلیل کا راز سینے میں ہی دفن کر لے گی لیکن جیسے ہی موقع ملا، وہ عبدالقادر سے اس ظلم کا حساب ضرور بے باق کرے گی۔

وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے کمرے سے نکل کر باہر آئی تو ماں تخت پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ ''سلام امی......'' یہ کہتے ہوئے وہ ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

ماں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''بالکل ٹھیک......'' وہ زبردستی مسکرائی۔

''جا کر منہ ہاتھ دھو لے، میں ناشتا بناتی ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

ناشتے کے بعد وہ ماں کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''امی ایک بری خبر ہے......''

''کیا......'' یہ سنتے ہی اس نے حیرت سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ''کیا ہوا، سب خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں امی، سب خیریت ہے۔'' اس نے فرش پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔''

''لیکن کیوں......تم تو اپنے وقت پر دفتر جاتی تھیں، لیٹ گھر لوٹتی تھیں تو پھر......''

''بس امی، انہیں ماڈرن لڑکی چاہیے فیشن ایبل، پٹ پٹ انگریزی بولنے والی۔ یہ سب خوبیاں مجھ میں نہیں ہیں۔''

یہ سن کر ماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ''اے پروردگار ہم پر اپنا کرم کردے۔'' صاف ظاہر تھا کہ بیٹی کی ملازمت چھوٹنے کی یہ اطلاع ان پر کسی بم کے گرنے سے کم تباہ کن نہ تھی۔

''امی فکر نہ کرو......'' نورین نے نگاہیں اوپر کر کے دیکھا تو ماں کے چہرے پر لکھی پریشانی فوراً پڑھ لی۔

''بیٹا کیسے فکر نہ کروں۔''

''امی میں شام کو کونسلر صاحب کے پاس ان کے گھر جاتی ہوں۔ ان کی بہت جان پہچان ہے۔ ان سے کہتی ہوں۔ اللہ کوئی بندوبست کردے گا۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' ماں کے چہرے پر امید کی کرن تھی۔

''بس آپ فکر نہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''اللہ تیری زبان مبارک کرے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر سبزی کاٹنے لگی۔

شام ڈھلے وہ کونسلر صاحب کے گھر گئی اور ان سے کسی ملازمت کا بندوبست کرنے کی درخواست کی۔ اس نے انہیں بھی ملازمت چھوٹنے کی وہی وجہ بتائی جو ماں سے کہی تھی۔

کچھ دیر تک سوچ و بچار کے بعد کونسلر صاحب نے نورین کی طرف دیکھا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ ایک صاحب کا خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ میرے دوست ہیں، امید ہے دو چار دن میں تمہارا کام بن جائے گا۔''

''بہت شکریہ انکل......'' ان کی یہ بات نورین کی ہمت بندھانے کے لیے کافی تھی۔

''ارے نہیں، تم میری بیٹی کی طرح ہو اور بیٹیاں باپ کا شکریہ ادا نہیں کرتی ہیں۔''

''جی انکل......'' وہ مسکرائی۔ اس وقت کونسلر صاحب اسے اپنے باپ جیسے لگے تھے۔

نورین گھر لوٹی تو اس کی طبیعت خاصی بہتر تھی۔ ذہن بھی ہلکا ہو چکا تھا لیکن جب اسے اپنی تذلیل یاد آتی تو اس کے ذہن و دل میں ہلچل مچنے لگتی تھی۔ تین چار دن گزر گئے۔ آخر ایک شام کونسلر صاحب ان کے گھر آئے۔ انہوں نے لانڈھی سائٹ ایریا میں واقع ایک دواساز فیکٹری میں نورین کے لیے ملازمت کا انتظام کردیا تھا۔ پیکنگ گرل کی ملازمت تھی۔ پک اینڈ ڈراپ کے ساتھ ساتھ اوور ٹائم اور تنخواہ بھی اچھی تھی۔ لنچ کے لیے کینٹین تھی جہاں معمولی رقم میں بہترین کھانے کا انتظام تھا۔ نورین اور اس کی ماں کے لیے یہ بہت بڑی خبر تھی۔ نورین خوش تھی کہ اسے بسوں میں دھکے بھی نہیں کھانا پڑیں گے۔ ساتھ ہی وہ شام ساڑھے چھ تک گھر بھی واپس آجایا کرے گی۔ یہ بات بھی اس کے لیے قابلِ اطمینان تھی کہ اسے لڑکیوں کے ساتھ ہی کام کرنا پڑے گا۔ اس واقعے کے بعد سے اس کے دل میں مردوں کا ڈر بیٹھ گیا تھا۔ اب تک وہ یہی سوچ سوچ کے ہلکان تھی کہ کہیں اسے مردوں کے ساتھ کام نہ کرنا پڑے۔ اس خبر نے تو جیسے اس کے زخم ہی مندمل کردیے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس بار اس کے دکھوں کا مداوا کر ڈالا ورنہ تو ایک طرف اس کے اندر تذلیل کے باعث ہونے والی کشمکش اور دوسرا غم روزگار کی فکر، دونوں نے جیسے اس کی زندگی اجیرن کر ڈالی تھی۔ ماں، بیٹی کے من سے تو ناواقف تھی مگر پیٹ کی آنچ سرد کرنے کا وسیلہ نہ ہونے سے وہ بھی بہت پریشان تھی مگر کونسلر صاحب کی شکل میں تو جیسے ان کی مشکل آسان ہوگئی ہو۔

اس رات دونوں ماں بیٹیوں نے تمام پریشانیوں سے نجات حاصل کر کے نہایت سکون سے کھانا کھایا۔ اس کے بعد وہ دونوں بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنی روح پر لگنے والے زخم کو بھول چکی ہو۔

وقت دکھوں کا سب سے بڑا مداوا اور زخموں کا سب سے اکسیر مرہم ہے۔ نورین اپنی ملازمت سے بے حد خوش تھی۔ جس سیکشن میں وہ کام کرتی تھی وہاں مردوں کا عمل دخل

نہ ہونے کے برابر تھا۔ کینٹین میں بھی خواتین کا حصہ الگ تھا۔ لنچ کے لیے ایک گھنٹا ملتا تھا۔ کھانے کے دوران ہی اس کی ملاقات نجمہ سے ہوئی۔ دونوں بہت جلد اچھی سہیلیاں بن گئیں۔ اگرچہ ان دونوں کے درمیان کوئی مشترکہ بات نہ تھی۔ نجمہ نے کراچی یونیورسٹی سے فارمیسی میں ایم ایس سی کیا تھا۔ وہ کئی سال سے ملٹی نیشنل دوا ساز کمپنی کی لیبارٹری میں کام کررہی تھی۔ اس کے والد سول انجینئر تھے اور وہ گلشن اقبال میں ایک بڑے بنگلے میں رہتی تھی۔ خود کار چلاتی تھی۔ کمپنی نے اسے کار اور پیٹرول کی سہولت بھی دے رکھی تھی۔

اس کے مقابلے میں نورین ایک غریب گھرانے کی مڈل پاس لڑکی تھی۔ دونوں کی عمروں میں بھی فرق تھا۔ نجمہ اس سے کئی سال بڑی تھی لیکن اس کے باوجود بہت جلد دونوں میں دوستی کا رشتہ اس قدر مضبوط ہوگیا کہ ان کے درمیان کسی بھی قسم کا معاشی یا سماجی فرق باقی نہ رہا۔ وہ دونوں کینٹین میں ساتھ لنچ کرتی تھیں۔ اس دوران باتیں بھی کرتی جاتی تھیں۔ نجمہ کئی بار اس کے گھر آئی۔ نورین کی ماں بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔ دوسرے دولت مند لوگوں کے برعکس نجمہ کے ذہن میں اونچ نیچ کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس سے ملنے کے بعد نورین کی زندگی میں خوش گوار تبدیلی آئی تھی۔ اس کی کوئی بہن تھی نہ کوئی سہیلی لیکن اس سے ملنے کے بعد لگا کہ جیسے اس کی زندگی میں بڑی بہن کی کمی پوری ہوگئی ہو۔

نورین، عبدالقادر کے دیے ہوئے زخم کو بڑی حد تک بھلا چکی تھی لیکن اس کے باوجود ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں یہ زخم اب بھی تازہ تھا۔ کبھی کبھی رات کو لیٹے لیٹے اسے وہ بھیانک وقت یاد آتا تو اس کی نیند اڑ جاتی تھی۔ وہ گھنٹوں کروٹیں بدلتی رہتی۔ اس وقت اس کے ذہن میں بس ایک ہی بات ہوتی کہ کاش اسے موقع ملے اور وہ عبدالقادر کو اس جرم کی اتنی بھیانک سزا دے کہ پھر وہ زندگی بھر کسی اور لڑکی کے ساتھ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہ سکے۔ کئی بار اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ اسے قتل کررہی ہے اور وہ فرش پر پڑا، تڑپتا ہوا زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے، گڑگڑا رہا ہے لیکن وہ اس کی منت سماجت سے بے نیاز اس پر خنجر کے وار پہ وار کیے جارہی ہے۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ خود اپنے خوف سے ہی اس کی آنکھ کھلتی تو پسینے میں شرابور ہوتی لیکن دن کا اجالا ایک بار پھر اس کی زندگی کو نارمل کردیتا تھا۔ نورین جانتی تھی کہ اس کی زندگی کو معمول پر لانے میں کونسلر صاحب اور نجمہ کا بہت عمل دخل تھا۔ ان دونوں کے لیے اس کے دل سے ہمیشہ دعائیں نکلتی تھیں۔

نورین کی زندگی کے اس سب سے بڑے سانحے کو کئی ماہ گزر چکے تھے۔ ملازمت بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔ تنخواہ بہت اچھی تھی۔ اچھی طرح کھانے پینے کے باوجود نورین کی ماں خاصی رقم پس انداز بھی کرلیتی تھی۔ اب اس کی ماں کا صرف ایک ہی خواب تھا کہ کسی طرح اتنی رقم جمع ہوجائے کہ وہ بیٹی کے ہاتھ پیلے کرکے سکون کی موت مرسکے۔ وہ دعا کرتی کہ دو چار سال بیٹی اور ملازمت کرلے تاکہ وہ اپنا فرض پورا کرنے کے قابل ہوسکے۔

نورین کو ملازمت کرتے ہوئے چھ ماہ ہوچلے تھے۔ اس کی روح پر لگا گھاؤ بھی کسی حد تک بھر چکا تھا۔ اب اسے بھیانک سپنے بھی نہیں آتے تھے۔ زندگی نئی ڈگر پر سکون سے آگے بڑھتی جارہی تھی لیکن نورین کی زندگی میں تقدیر کے کئی موڑ آنا ابھی باقی تھے۔

☆☆☆

ایک شام نورین فیکٹری سے گھر لوٹی تو بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ماں نے چائے بنائی۔ وہ دونوں برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ چائے پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ اچانک جیسے ماں کو کچھ یاد آیا۔ ''لو...... میں تو بتانا ہی بھول گئی۔'' انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا امی، کیا بتانا بھول گئیں؟'' نورین نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ارے بتاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور کمرے میں چلی گئی۔

''یہ لو۔'' باہر آکر اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ ''کوئی عبدالقادر نام کا شخص آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تم اس کے دفتر میں ملازمت کرتی تھیں۔ بغیر بتائے نوکری چھوڑ آئی تھیں۔ کہہ رہا تھا یہ کارڈ دے دینا اور کہہ دینا کہ مجھے فون کرلے اور آکر اپنی ایک ہفتے کی تنخواہ لے جائے۔''

''کیا......'' ماں کی بات سن کر تو جیسے اس کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ اس کے ذہن میں جھماکے ہورہے تھے۔

''اور کیا کہہ رہا تھا وہ۔'' نورین نے اپنی دلی کیفیات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ نہیں چاہتی کہ ماں کو اس سانحے کے بارے میں کچھ پتا چلے۔

''اور تو کچھ خاص بات نہیں کی اس نے۔'' ماں نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ارے ہاں یاد آیا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ ملیر کینٹ آیا تھا۔ یہاں کا فون نمبر تو تھا نہیں اس لیے اس نے تمہاری درخواست سے پتا نوٹ کر کے رکھا ہوا تھا کہ کسی دن اس طرف جانا ہوا تو تم سے مل کر یہ بات کہہ دے گا۔''

''اوہ میرے خدا!'' اس نے زیرِ لب کہا۔

''کیا ہوا بیٹی؟''

''کچھ نہیں امی......''

''تم کہہ رہی تھیں کہ اس نے تمہیں خود نکال دیا تھا مگر وہ تو کہہ رہا تھا کہ تم نے خود......''

''ہاں امی میں نے خود ملازمت چھوڑی تھی۔''

''لیکن کیوں......''

''امی......'' نورین نے کچھ کہنا چاہا مگر رک گئی۔

''تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو؟''

''امی...... میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ انہوں نے نہیں نکالا تھا، میں نے خود ہی وہ نوکری چھوڑ دی تھی۔ اس نے مجھے ذلیل کر دیا تھا۔''

''کیا......'' ماں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

اچانک نورین کو خیال آیا کہ شاید وہ جذبات میں کچھ غلط کہہ گئی ہے۔ اس نے فوراً اپنے ذہن و دل پر قابو پانے کی کوشش کی اور لہجے کو نارمل کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''وہ دراصل دفتر کے ایک کام میں مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ جس پر انہوں نے کلائنٹس کے سامنے مجھے بری طرح ڈانٹا۔ بس میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکی۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ مجھے لگا کہ ابھی ہفتہ بھر ہوا نہیں کہ وہ اتنا بے عزت کر رہا ہے، آگے تو وہ اس سے بھی زیادہ برا سلوک کرے گا۔ بس! پھر یہی سوچ کر میں نے چھوڑ دی تھی نوکری۔''

''اوہ......'' ماں نے یہ سن کر گہری سانس لی۔ وہ نہ جانے کیا کچھ سمجھ بیٹھی تھی لیکن یہ سن کر دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو کوئی ایسی ویسی بات نہ تھی۔ ''اچھی بات ہے بیٹی، ہاتھ پیچھے ہیں عزت نہیں جو کوئی بھی دو ٹکے دے کر ہماری بے عزتی کر دے۔''

''جی امی......'' نورین نے اوپری دل سے کہا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ پلکیں نم ہو رہی تھیں۔

''چل دل خراب نہ کر۔ منہ ہاتھ دھو کے تھوڑا آرام کر لے۔''

نورین اٹھ کر کمرے کی طرف جانے لگی۔

''ارے سن تو سہی......''

نورین پلٹی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے اسے فون کرنے یا اس کے دفتر جانے کی۔ لعنت بھیج اس پر۔ کوئی ضرورت نہیں ہمیں ایک ہفتے کے چند سو روپوں کی۔ آنے دے۔ اگر اب کبھی اِدھر آیا تو اس کی وہ خبر لوں گی کہ پھر کسی لڑکی کو دوبارہ ڈانٹنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ تو فکر نہ کر......''

نورین کے ہاتھ میں اب تک وہ وزیٹنگ کارڈ تھا۔ اس نے ماں کی بات سنی اور خاموشی سے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کی باتیں آ رہی تھیں۔

اس رات وہ رات دیر گئے تک کروٹیں بدلتی رہی۔ وہ عبدالقادر کو ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھلانے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ وہ ایک بار پھر اس کے سامنے آکھڑا ہو گا۔ وہ من ہی من میں بہت ڈر رہی تھی۔ اس نے تو یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ بے غیرت آدمی اتنی ڈھٹائی سے اس کے گھر کی دہلیز تک پہنچ جائے گا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر بھی پریشان تھی اگر وہ دوبارہ اس کے گھر آیا اور ماں نے اسے کھری کھری سنا دیں تو نہ جانے طیش میں آ کر وہ کیا کچھ کہہ بیٹھے۔ کہیں وہ سب کچھ ماں کو نہ بتا دے۔ اگر ایسا ہوا تو کیا ہو گا۔ ماں شاید یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور کہیں شرمندگی کے مارے وہ اپنی جان ہی نہ لے لے۔ اگر ماں نہ رہی تو وہ کیا کرے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا اور ماں کو سب پتا چل گیا تو وہ کس منہ سے ماں کا سامنا کرے گی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ نہ تو عبدالقادر کے دفتر جانا چاہتی تھی اور نہ ہی یہ چاہتی تھی کہ وہ دوبارہ اس کے دروازے پر آئے۔ اوپر سے ماں کا غصہ۔ وہ تکیے میں منہ دیے روئے جا رہی تھی۔ اس کی کوئی غلطی نہ تھی لیکن اس کے باوجود اس کی نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ جو گناہ گار تھا وہ چین کی نیند سو رہا تھا۔ صبح فجر کی اذان تک وہ جاگتی رہی۔ اس کے دل و دماغ میں جنگ چل رہی تھی۔ آخر کافی سوچ و بچار کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عبدالقادر سے فون پر بات کرے گی۔ غصے یا پیار سے، جیسے بھی ہو وہ اس بات پر اسے رضامند کرنے کی کوشش کرے گی کہ اب نہ تو وہ کبھی اس کے گھر آئے اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی رابطہ کرے۔ جو ہو چکا، اسے وہ بھی بھول جائے۔

صبح ہو چکی تھی جب نورین کی آنکھ لگی۔ ماں نے جگانے کی کوشش کی لیکن بیٹی کی گہری نیند دیکھ کر جگانا مناسب نہ

سمجھا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے جب نورین ہڑبڑا کر اٹھی۔ اس نے دیوار پہ لگی گھڑی پر نظر ڈالی لیکن ڈیوٹی پہ جانے کا وقت کب کا گزر چکا تھا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ کمرے سے باہر آئی تو ماں نے پوچھا۔

''جی امی، رات نیند ہی نہیں آرہی تھی۔''

''کیوں...... کیا کوئی پریشانی کی بات ہے؟''

''ارے نہیں امی...... آپ تو خوامخواہ پریشان ہو جاتی ہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ لگتا ہے پلنگ میں کھٹمل ہو گئے ہیں۔ ابھی دوا لا کر چھڑکتی ہوں۔ رات بھر کاٹتے رہے کمبخت، کہیں صبح جا کر آنکھ لگی تھی۔''

''ارے یہ بھی جان نہیں چھوڑتے۔'' ماں نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''تم برش کر لو، میں ناشتا بناتی ہوں۔''

''جی امی......'' یہ کہتے ہوئے وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

ناشتے سے فارغ ہوئی تو سوا بارہ بج رہے تھے۔ نورین نے ماں کی نظر بچا کر عبدالقادر کا وزیٹنگ کارڈ پرس میں رکھا۔ وہ برقع پہننے لگی تو ماں نے پوچھا۔ ''کہاں جارہی ہو؟''

''امی فیکٹری میں سپروائزر کو فون کر دوں کہ طبیعت خراب ہے، ورنہ غیر حاضری کی تنخواہ کٹے گی۔''

''کہہ دینا کہ رات سے بخار ہے۔''

''یہی کہوں گی، تبھی میڈیکل کی چھٹی ملے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم ہو کر آجاؤ تو پھر میں بازار جاؤں گی۔''

نورین گھر سے نکل کر مارکیٹ میں واقع پی سی او تک پہنچی۔ اگرچہ پی سی او اس کی گلی میں بھی تھا لیکن یہاں خواتین کے لیے علیحدہ بوتھ تھا۔ اسی لیے وہ کافی دور تک پیدل چل کر یہاں تک پہنچی تھی تاکہ کوئی اس کی بات نہ سن سکے۔ اس نے عبدالقادر کا نمبر ملایا۔ فون اسی نے اٹھایا۔

''ہیلو...... کون بول رہا ہے؟''

''نورین......'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''ارررے...... کیسی ہو جانِ من۔''

یہ سنتے ہی نورین کا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا۔

''خاموش کیوں ہو، کچھ بولو۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی تمہیں میرا کارڈ ملے گا، تم مجھے فوراً فون کرو گی۔'' عبدالقادر خوشی سے چہک رہا تھا۔

''آپ کو میرے گھر نہیں آنا چاہیے تھا۔'' نورین نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''تو تم بھی تو پلٹ کر نہیں آئی تھیں۔ آجاتیں تو میں کیوں تمہارے گھر آتا۔'' الٹا چور کوتوال سے شکوہ کر رہا تھا۔

''آپ نے جو کیا، اس کے بعد وہاں آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''ارے بھئی بھول جاؤ، اس بات کو۔ اب تو نارمل ہو جاؤ۔ واپس آجاؤ عیش کرو گی عیش......''

یہ سنتے ہی نورین کو طیش آگیا۔ اس نے عبدالقادر کی بات کاٹی اور غصے سے کہا۔ ''لعنت بھیجتی ہوں تم اور تمہارے عیش کی دعوت پر۔''

''ارررے...... اتنا غصہ......؟''

''بکواس مت کرو۔''

''اچھا بکواس نہیں کرتا۔'' عبدالقادر کا لہجہ یکدم نہایت سنجیدہ ہو گیا۔ ''لیکن ایک بات اچھی طرح کان کھول کر سن لو۔ تمہیں میرے پاس آنا ہی ہوگا۔'' وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''بھول جاؤ۔ ایک بار میری نادانی کا فائدہ اٹھالیا لیکن اب میں تمہارے جھانسے میں نہیں آنے والی۔''

''وہ تو تم آہی چکی ہو ورنہ فون کیوں کرتیں۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔

''میں نے صرف یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ اب میرے گھر کبھی مت آنا ورنہ......''

''ورنہ کیا کر لوگی میری ننھی پری......''

''جان لے لوں گی تمہاری۔''

''وہ تم پہلے ہی لے چکی ہو، تبھی تو تمہارے در کا چکر لگایا تھا۔''

''تم کمینے انسان......''

''بکواس مت کرو۔ منہ بند کرو اور میرے پاس آجاؤ۔''

''ناممکن...... اب سب کچھ بھول جاؤ، یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔'' نورین نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

''ناممکن......'' عبدالقادر نے اس کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے سکون سے کہا۔ ''تمہیں وقتاً فوقتاً میرے پاس آتے رہنا ہوگا ورنہ......''

''ورنہ کیا کر لوگے تم......'' نورین شدید غصے میں تھی۔

''اگر تم نہ آئیں اور میری بات نہ مانی تو میں صرف ایک ہفتے انتظار کروں گا اور پھر تمہارے گھر آؤں گا۔''

''اگر اب دوبارہ ہمارے گھر آئے تو میری ماں تمہیں چیر دے گی۔''

''ارے نہیں میڈم، اس طرح مت ڈراؤ ورنہ میں وہ تصویریں انہیں ڈاک سے بھیج دوں گا۔'' عبدالقادر نے ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا اور بات مکمل کر کے زور سے ہنسا۔'' کچھ سمجھ آیا میڈم......''

''کیا مطلب ہے تمہارا......'' نورین کچھ سمجھی نہ تھی۔

''ارے میں تو بھول ہی گیا تھا، تمہیں تو پتا ہی نہیں ہوگا کہ میں نے تمہاری کتنی اچھی تصویریں کھینچی تھیں اس دن۔''

''کیا بک رہے ہو منحوس انسان......''

''جب تم لنچ کے بعد مزے سے خواب خرگوش میں تھیں تو میں نے تمہارے حسن کی ایسی ایسی تصویریں لی ہیں کہ بس......''

''کیا......'' وہ اب ساری بات سمجھ چکی تھی۔

''میڈم اگر وہ تصویریں تمہاری ماں نے دیکھ لیں تو خوشی سے مر جائیں گی، بہتر ہے تم دفتر آ کر خود دیکھ لو، پھر سوچنا کہ مجھ سے دوستی رکھنا ہے یا نہیں۔''

''تم نے ٹھیک نہیں کیا۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''میڈم ایک بار تصویریں دیکھ لو۔ مجھے یقین ہے کہ پھر تم کبھی مجھ سے تعلق توڑنے کا سوچو گی بھی نہیں۔ ویسے فائدے میں ہی رہو گی، عیش کرا دوں گا عیش۔'' عبدالقادر کو نورین کے لہجے سے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کا تیر نشانے پر لگا ہے۔ وہ اس کے لہجے سے شکست بھانپ چکا تھا۔ اب اس کا لہجہ حکمیہ تھا۔

دوسری طرف کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ نورین رو رہی تھی۔

''چپ کیوں ہو؟''

''خدا کے لیے میری جان بخش دو۔'' نورین نے روتے روتے کہا۔

''اوہ مائی گاڈ...... تم رو رہی ہو۔'' عبدالقادر پھر اداکاری پر اتر آیا تھا۔ ''دیکھو رو مت۔ رونے سے مسائل حل ہوتے تو پھر پوری دنیا اپنے مسائل حل کرنے کے لیے زور زور سے، دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہوتی۔'' وہ سمجھ چکا تھا کہ لوہا گرم چکا ہے۔

''پلیز...... مجھے معاف کر دو۔'' کمزور نورین خود کو اس کے سامنے بے بس پا رہی تھی۔

''دیکھو میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتا۔ بس جب میں بلاؤں تب تم آ جایا کرو۔ باقی تمہیں نوٹ اور عیش دونوں ملیں گے۔''

''نہیں چاہئیں مجھے ایسے نوٹ، میں عزت سے دو وقت کی روٹی کما رہی ہوں۔'' نورین نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''بس! بات بہت لمبی ہو چکی، رونا دھونا بند کر دو۔''

یہ سن کر لمحہ بھر کو نورین کو ایسا لگا کہ شاید عبدالقادر کا دل پسیج گیا۔ اس نے فوراً کہا ''جی......''

''جو کہہ رہا ہوں وہ غور سے سنو۔''

''کہیے۔''

''تمہارے پاس ایک ہفتے کا وقت ہے۔ میرے پاس آ ؤ یا پھر تیار ہو جاؤ۔'' عبدالقادر نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

یہ سن کر نورین پریشان ہو گئی ''ایک ہفتے کے اندر تم میرے پاس نہیں آئیں تو اگلے ہفتے تمہاری وہ تصویریں تمہاری ماں کے پاس پہنچ جائیں گی۔''

''خدا کے لیے ایسا مت کرنا، میری عزت دار ماں یہ برداشت نہیں کر سکے گی۔'' نورین نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''ایک ہفتہ...... فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ دوستی یا پھر......''

''خدا کے لیے......'' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن عبدالقادر نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کی چال کامیاب رہی ہے۔

نورین پی سی او سے نکلی تو اس کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کی طرف چل دی۔ اس دن شدید گرمی تھی لیکن ذہن و دل کی تپتی بھٹی میں جلتی بھنتی نورین کو آگ برساتے سورج کی تمازت کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ وہ گھر پہنچی تو ماں اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔

''کیا پیدل آرہی ہو۔'' انہوں نے بیٹی کا برقع اتارتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے لو لگ گئی ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ اس بھری دوپہر میں تم کیوں باہر گئیں۔ بھاڑ میں جائے ایسی نوکری۔ تمہاری جان سے زیادہ تو نہیں ہے۔''

نورین پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کا پورا جسم تپ رہا تھا۔ ماں شربت بنا کر لائی تو اسے پینے کے بعد اسے اپنی طبیعت کچھ بہتر لگی۔

''تم سو جاؤ۔'' ماں نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

نورین نے آنکھیں موند لیں۔

شام کو وہ اٹھی تو طبیعت بظاہر کچھ بہتر تھی لیکن وہ اسی سوچ میں گرفتار تھی کہ اب کیا ہوگا۔ جو کچھ ہو چکا تھا، وہ اسے ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھلا چکی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ جو ہوا وہ ایک لمحہ تھا۔ وقت پلٹ کر نہیں آتا لیکن اس کی زندگی اب ایک نیا موڑ لینے جارہی تھی۔ گیا وقت پلٹ کر سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ وقت خراج کا طلب گار تھا اور کمزور بے بس نورین تہی داماں تھی۔ وہ نہ تو کسی سے اپنا دکھ کہہ سکتی تھی اور نہ ہی مدد مانگ سکتی تھی۔ اس کا دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بظاہر اسے یہی نظر آرہا تھا کہ ماں کو بچانا ہے تو عبدالقادر کی بات ماننا ہوگی لیکن اس کے بعد...... اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس دوپہر عبدالقادر نے جو جال اس پر پھینکا تھا، وہ اس میں بری طرح پھنس چکی ہے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ بات صرف ایک بار اور ملنے تک محدود نہیں، وہ اسے بار بار بلائے گا تاوقتیکہ خود اس کا دل نہ بھر جائے۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ ایسی دلدل میں پھنس گئی ہے، جس سے نکلنے کی جدوجہد میں وہ مزید دھنستی چلی جائے گی۔

شام کو وہ اٹھی تو فیصلہ کر چکی تھی کہ خواہ کچھ ہو جائے وہ اپنے رویّے اور جذبات سے ماں کو ایسا ہرگز محسوس نہ ہونے دے گی کہ وہ پریشان ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ماں کو بیچ میں لائے بغیر وہ تنہا اس مصیبت کا سامنا کرے گی۔ اپنے دماغ میں یہ طے کر کے جب وہ کمرے سے باہر آئی تو شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ ماں مغرب کی نماز ادا کر کے تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ وہ ''امی، میری پیاری امی......'' کہتے ہوئے ان کے گلے لگ گئی۔ بیٹی کو کھکھلاتا دیکھ کر ماں کی سانس میں سانس آئی۔ انہوں نے اس پر پھونکا۔

''امی...... چائے پلائیں۔''

''شکر ہے اللہ کا، میں تو دوپہر کو تیری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔''

''ارے گرمی بہت تھی نا باہر۔ اوپر سے مارکیٹ چلی گئی تھی کھٹل کی دوا لینے۔ نہ دوا ملی اور نہ بس......'' یہ کہہ کر اس نے منہ بنایا۔ ''خوامخواہ پیدل چلنا پڑا دو میل دور تک۔''

''آئندہ ایسی حرکت مت کرنا۔ پتا ہے لو کتنی خطرناک چیز ہے، جان بھی لے لیتی ہے۔''

''جی امی، آئندہ نہیں کروں گی۔'' نورین نے چھوٹے بچوں کی طرح معصوم صورت بنا کر کان پکڑے تو ماں نے فرطِ محبت سے اسے گلے لگا لیا۔

ماں کی آغوش میں جا کر نورین کا دل بھر آیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ سب کچھ ماں کو صاف صاف بتا دے۔

''چل ہٹ، چائے بناتی ہوں۔'' ماں نے بڑے دلار سے بیٹی کو اپنی آغوش سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب نورین نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس کی نظر ماں کے چہرے پر تھی۔ بیٹی کو کھکھلاتا دیکھ کر ان کے چہرے پر اطمینان صاف جھلک رہا تھا۔ نورین نہیں چاہتی تھی کہ حقیقت کا پتا چلنے پر اس کی ماں کا یہ اطمینان چلا جائے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا سب کچھ صاف صاف کہہ دینے کے بعد وہ ماں سے نگاہیں ملانے کے قابل رہ پائے گی۔ کیا ماں سب کچھ جاننے کے بعد اسے کبھی اپنی آغوش میں لے سکے گی۔

رات بھر وہ اسی ادھیڑبن کا شکار رہی۔ نہ جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح ساڑھے چھ بجے ماں

نے اسے اٹھایا۔ وہ کسلمندی سے اٹھی۔ رات بھر بے آرامی اور کم نیند کے باعث اس کی ہمت نہ تھی کہ بستر سے اٹھے لیکن وہ ایک روز پہلے ہی چھٹی کر چکی تھی۔ فیکٹری جانا ضروری تھا۔ اس نے جیسے تیسے کر کے ناشتا کیا اور اسٹاپ پر آگئی۔

لنچ بریک تک بظاہر وہ اپنے کام میں مصروف تھی لیکن عبدالقادر کی دھمکی نے اس کے دل و دماغ کو بدستور اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ کینٹین پہنچی تو نجمہ وہاں موجود تھی۔ اس نے نورین کو دیکھ کر آواز دی۔ کچھ دیر بعد دونوں ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" کھانے کے دوران میں نجمہ نے خلافِ معمول اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں...... بالکل ٹھیک ہے۔" نورین نے چونکتے ہوئے کہا۔

"لگتا تو نہیں ہے۔" نجمہ نے نوالہ توڑا۔ "لگتا ہے تمہیں کوئی پریشانی لاحق ہے۔"

"نہیں تو......" نورین نے دلی کیفیات کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی۔

"گھر میں تو سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں......" نورین نے نظریں ٹیبل پر جماتے ہوئے کہا۔ دراصل اس وقت بھی وہ عبدالقادر کی دھمکی کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔

"دیکھو......" نجمہ نے اسے مخاطب کیا۔

"جی......"

"میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو کہ تمہیں کوئی پریشانی نہیں۔"

یہ سنتے ہی نورین نے سر جھکا دیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

نجمہ بھانپ گئی کہ کوئی ایسی تشویش ناک بات ضرور ہے جس کے باعث نورین نہ صرف سخت پریشان ہے بلکہ وہ اس بات کو بتانے سے بھی ڈر رہی ہے۔ "دیکھو...... اگر پریشانی کی کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ، اس طرح چھپاؤ گی تو پریشانی اور بڑھے گی۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں......" نورین نے بدستور نظریں نیچی رکھتے ہوئے جواب دیا۔

نجمہ کا شک حقیقت میں بدل چکا تھا۔ اس نے مزید کچھ کہنے کے بجائے کھانے پر توجہ دی۔ لنچ سے فراغت کے بعد اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بریک ختم ہونے میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔

نجمہ نے نورین کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر فیکٹری کے پارک میں آگئی...... وہاں کچھ لوگ بیٹھے ستا رہے تھے۔ وہ اسے...... ایک درخت کے نیچے رکھی ہوئی بینچ پر لے آئی۔

"اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے......" نجمہ نے اِدھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد نورین کے چہرے پر نگاہیں گڑاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو کچھ چھپانا مت۔ میں صرف سچ سننا چاہتی ہوں۔"

یہ سن کر نورین نے نگاہیں نیچی کرلیں۔ اس کی پلکیں نم ہو رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار کوئی ہمدرد دوست ملا تھا۔ وہ اس سے سب کچھ کہہ کر اپنا دل ہلکا کرنا چاہتی تھی لیکن اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیسے کہے۔

اسے روتا دیکھ کر نجمہ سمجھ گئی تھی کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اس نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ اس کے گلے لگ گئی۔ اب وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد نجمہ نے اسے خود سے علیحدہ کیا اور اپنی بوتل سے پانی پلایا۔ "دیکھو تم میری بہن اور دوست ہو۔ میں تم سے بڑی ہوں۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ، سب کچھ سچ سچ بتادو۔ ورنہ یوں تم اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر خود کو بیمار کرلوگی۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہوا تو پھر تمہاری ماں کا کیا بنے گا۔"

نجمہ کا تیر نشانے پر لگا۔ ماں کا سن کر اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے۔ آخر اس نے روتے روتے سب کچھ اسے بتا ڈالا۔ نورین کا حال سن کر تو جیسے خود نجمہ

کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی ہو۔ وہ بھی سکتے کے عالم میں رہ گئی تھی۔ کچھ دیر تک دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہیں۔ آخر نجمہ نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''چلو اٹھو......'' اس نے نورین کا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہیں رونے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں......''

''لیکن وہ، اس کی دھمکی......'' نورین نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''اس کا بھی کوئی حل نکل آئے گا۔'' نجمہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''بس اب تمہیں اپنے ذہن پر زور ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم تنہا نہیں ہو، تمہاری بڑی بہن تمہارے ساتھ ہے۔'' اس کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

وہ فیکٹری کے اندر جارہی تھیں۔ نجمہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح ایسا ہو کہ نہ صرف نورین کا عبدالقادر سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھوٹے بلکہ اس درندے نے جو کچھ کیا ہے، اسے اپنے کیے کی بھی سزا ملے۔ اسے یقین تھا کہ یہ اس کی پہلی یا آخری حرکت نہ تھی۔ نورین کی بپتا سن کر اس کے دل میں بھی انتقام کی آگ جل اٹھی تھی۔ وہ ہر صورت اسے کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتی تھی۔

اپنے اوپر ڈھائے گئے ظلم کی کہانی سنانے کے بعد نورین کا دل بھی کافی ہلکا ہوگیا تھا۔ اب وہ پہلے سے کافی مطمئن تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ شاید وہ عبدالقادر کے ظلم سے اب ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا جائے گی۔ ورنہ تو اسے رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ اس نے جس لب و لہجے میں دھمکی دی تھی، اس کے چنگل سے بچنا آسان نہ ہوگا۔

اس رات کئی روز کے بعد نورین پُرسکون نیند سوئی تھی۔

معمول کے مطابق دوسرے دن وہ لنچ بریک میں کینٹین پہنچی تو نجمہ اس کی منتظر تھی۔ کھانا شروع ہوتے ہی نجمہ نے آہستہ سے کہا ''جلدی کھانا کھالو، لان میں چلنا ہے۔'' اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

''کچھ سوچا، کیا کرنا ہے؟'' نورین نے بھی اس کی پوشیدہ خوشی کو چہرے سے بھانپ لیا تھا۔

''کھانا کھالو، پھر سب سمجھاتی ہوں۔''

اس روز دونوں نے بہت جلد کھانا ختم کیا۔ جب وہ لان میں پہنچیں تو وہاں کوئی نہ تھا۔ لوگ یا تو لنچ میں مصروف تھے یا نماز میں۔ نجمہ اسے لیے ہوئے لان کے ایک پُرسکون گوشے میں پہنچی۔ وہاں دور دور تک کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی باتیں سن سکے۔

''پھر کیا سوچا آپ نے......'' بینچ پر بیٹھتے ہی نورین نے تجسس سے مجبور ہو کر پوچھا۔

''سوچ لیا جو سوچنا تھا۔'' یہ کہہ کر نجمہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ''اب تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں میری چھوٹی بہن۔ اب باری اس درندے کی ہے، اسے تو اپنے کیے پر پچھتاوا کرنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔''

''کیا مطلب......'' نورین چونکی۔ وہ کچھ سمجھ نہیں سکی۔

''تمہیں عبدالقادر کے پاس جانا ہوگا۔''

''کیا......'' یہ سنتے ہی نورین کا چہرہ اتر گیا۔ ''میں وہاں نہیں جاؤں گی۔''

''جانا پڑے گا، یہ ضروری ہے۔'' نجمہ نے کہا۔

''مگر......''

''پرسوں فیکٹری میں ماہانہ صفائی کے لیے چھٹی ہوگی۔ تم کل شام میرے ساتھ فیکٹری سے نکلو گی اور اسے فون کر کے کہو گی کہ تم اس سے پرسوں ملنے آرہی ہو۔''

''میں گئی تو وہ درندہ پھر......''

''کچھ نہیں کر سکے گا وہ ذلیل انسان۔ بس جیسا میں کہتی ہوں تم ویسا کرتی جاؤ۔'' نجمہ نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' نورین پریشان نظر آرہی تھی۔

''دیکھو میں سب کچھ تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر نجمہ نے کچھ توقف کیا جیسے کہ طے کر رہی ہو کہ نورین کو سب کچھ کیسے سمجھایا جائے اور کس طرح اسے اتنا پراعتماد بنائے کہ جو اس نے سوچا ہے اس پر عمل کر سکے۔

وہ دونوں کچھ دیر تک خاموش رہیں۔

آخر نجمہ نے ایک گہری سانس لی اور نورین کی طرف دیکھا۔ ''دیکھو اصل بات یہ ہے کہ عبدالقادر مجرم ہے اور مجرم کو سزا نہ ملے تو پھر وہ جرم پہ جرم کرتا چلا جاتا ہے۔ ہر ظلم پر بچ نکلنے کے بعد اسے اور شہ مل جاتی ہے۔ اس کی دست درازیاں بڑھتی رہتی ہیں اور جانتی ہو اس کا ذمے دار کون ہوتا ہے؟'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور نورین کے چہرے پر گہری نظر ڈالی۔

''وہ مظلوم جس نے ظلم سہا اور پھر خاموش رہ کر ظالم کی پردہ پوشی کی اور اس کی ہمت مزید بڑھائی۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں......''

''ہمیں اس سے تمہارا بدلہ بھی لینا ہے اور دوسری لڑکیوں کو اس کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچانا ہے اور یہ کام تمہیں کرنا ہے۔ اگر تمہارے قدم ذرا بھی لڑکھڑائے تو یاد

رکھو، زندگی بھر اس کے بچھائے جال میں پھنس کر اس کی زیادتی کا نشانہ بنتی رہوگی۔‘‘

’’میں اس سے کیسے لڑسکتی ہوں؟‘‘

’’تم لڑسکتی ہو۔ بس اتنا سوچ لو کہ تمہیں ظالم کی مدد کرکے اس کے اگلے جرائم میں مددگار بننا ہے یا اس کے ہاتھوں کو روکنا ہے۔‘‘

نورین خاموش رہی۔ اس کا ذہن نجمہ کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ آخر وہ اس کی باتوں کو سمجھ گئی۔ نجمہ کی باتوں نے نورین کے اندر اعتماد کی ایک نئی اور طاقت ور روح پھونک دی تھی۔ اس کے اندر موجود انتقام کی چنگاریوں کو جیسے ہوا مل گئی ہو۔ اب وہ چنگاریاں دہکتے شعلے بن چکی تھیں۔ ’’آپ بتائیے مجھے کیا کرنا ہے؟‘‘

نجمہ اس کا اعتماد دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ ’’شاباش! شکر ہے تم ظالم کی مددگار نہیں بننا چاہتیں۔‘‘

’’اللہ اس زمین کو اس جیسے ظالم درندوں سے پاک کردے۔‘‘

’’آمین......‘‘ نجمہ نے کہا۔ ’’میں بتاتی ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔‘‘ یہ کہہ کر چند لمحے توقف کیا اور پھر تفصیل سے سارا منصوبہ اسے سمجھانے لگی۔ ’’اب آیا سمجھ میں......‘‘

’’سمجھ گئی۔‘‘ نورین نے سر ہلایا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ نجمہ کے منصوبے سے سو فیصد متفق ہے۔

’’تو یہ سب کچھ پرسوں کرنا ہوگا۔ کل شام تم وین کے بجائے میرے ساتھ میری گاڑی میں چلوگی۔ راستے میں رک کر کسی پی سی او سے تم اسے فون کرکے دوسرے روز آنے کا کہنا۔‘‘ نجمہ نے کہا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘

نجمہ نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ’’اٹھو، بریک ٹائم ختم ہونے میں صرف دو منٹ باقی ہیں۔‘‘

وہ دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی ہوئی فیکٹری کے اندر پہنچ گئیں۔

اس شام جب نورین گھر پہنچی تو بہت خوش تھی۔ وہ اپنے اندر بلا کی خود اعتمادی محسوس کررہی تھی۔ کئی روز کے بعد اسے ایسا لگا جیسے --- اللہ نے نجمہ کی صورت میں مدد کا فرشتہ بھیج دیا ہو۔ وہ نجمہ کے دکھائے راستے پر چل کر عبدالقادر سے اس کی اگلی پچھلی، تمام حرکتوں کا بدلہ لینے کے لیے خود کو تیار کرچکی تھی۔ اس رات اس کا ذہن اتنا ہلکا پھلکا تھا کہ رات دس بجے بستر پر لیٹی اور کچھ ہی دیر بعد میٹھی اور پُرسکون نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

دوسرے دن وہ معمول کے مطابق لنچ بریک میں نجمہ سے ملی۔ اس موضوع پر دونوں نے کوئی بات نہ کی بلکہ لنچ کے بعد وہیں بیٹھ کر چائے پی اور جب وقت ہوا تو وہ دونوں اٹھ کر فیکٹری کی طرف چل دیں۔

فارمیسی ریسرچ سیکشن کی طرف بڑھتے ہوئے نجمہ نے نورین کی طرف دیکھا۔ ’’آج شام ہم دونوں ساتھ چلیں گے۔‘‘

’’جانتی ہوں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔‘‘ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

چھٹی کے بعد وہ دونوں نکلیں۔ کافی دور آنے کے بعد نجمہ نے گاڑی روکی۔ ’’نمبر ہے نا تمہارے پاس، یہیں کوئی پی سی او دیکھ کر اسے فون کرتے ہیں۔‘‘

نورین نے پرس سے عبدالقادر کا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور بیٹھے بیٹھے باہر نظر ڈالی۔ ’’وہ رہا پی سی او......‘‘

نجمہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پی سی او کے قریب جاکر روک دی۔ ’’سب کچھ اچھی طرح ذہن نشین کرلیا ہے نا۔‘‘

’’جی ہاں...... اب اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں۔‘‘

پی سی او میں پرائیویسی کا خیال رکھا گیا تھا۔ نورین نے خود نمبر ملایا۔ بوتھ میں ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ کئی گھنٹیوں کے بعد فون اٹھایا گیا۔

’’قادر ریکروٹنگ ایجنسی، کون بول رہا ہے؟‘‘

نورین پہچان گئی۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ نجمہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اشارے سے بات کرنے کو کہا۔

’’جی میں وہ نورین......‘‘ وہ یہ کہتے ہوئے اٹک رہی تھی۔

’’اوہ تم......‘‘ عبدالقادر نے بھی اس کی آواز پہچان لی۔ ’’کیسی ہو تم، خوشی ہوئی کہ تم مجھے فون کررہی ہو۔‘‘

نورین نے بڑی حد تک اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا تھا۔ ’’تو ملنے کے لیے فون کیا ہے؟‘‘ یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ’’بتاؤ نا، میں نے ٹھیک کہا ہے نا۔‘‘

’’جی جی......‘‘

’’ویری گڈ...... تم واقعی عقلمند ہو۔ اچھا بتاؤ کب آرہی ہو۔ ایسے آنا کہ لنچ بھی ساتھ کریں اور اس کے بعد......‘‘ بات ادھوری چھوڑ کر قہقہہ لگایا۔ ’’یہ پروگرام ٹھیک رہے گا نا......‘‘

’’جی، ٹھیک رہے گا۔‘‘ نورین کی گھبراہٹ ختم ہوچکی تھی۔ اب وہ اپنے اندر اعتماد محسوس کررہی تھی۔

''تو کب مل رہی ہو۔''

''آپ نے امی کو وہ تصویریں......''

''ارے نہیں بھیجی ہیں تمہاری قسم اور ویسے تمہارے پاس ہفتہ بھر کی تو مہلت تھی نا، اب تم دوستی کر رہی ہو تو کیسے بھیجوں گا انہیں۔''

''اچھا کیا آپ نے ...... ورنہ تو میں ڈر رہی تھی کہ......''

''بھئی ڈرنا چھوڑو، اب ہم دوست بن رہے ہیں تو پھر کس چیز کا ڈرنا۔ ایک بار دوست بن جاؤ پھر دیکھنا کیا کچھ ہوگا تمہارے پاس۔ عیش کرادوں گا عیش......'' عبدالقادر اسے پوری طرح شیشے میں اتارنے کی کوشش کیے جارہا تھا۔

''اچھا چھوڑو باقی باتیں، وہ تو ہم اکیلے میں بیٹھ کر کریں گے۔ یہ بتاؤ تم کب آرہی ہو؟''

''کل......'' نورین نے جان بوجھ کر اٹکتے ہوئے کہا۔

''واہ، یہ ٹھیک ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو کہتا ابھی لیکن اب تمہاری بات اوپر کل دوپہر میں ڈن ڈن ڈنا ڈن......'' وہ خوشی سے بے تاب ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے کل دوپہر میں آتی ہوں سوا ایک، ڈیڑھ بجے تک۔ بس یہ خیال رکھنا اس وقت کوئی اور نہ ہو وہاں۔''

''کوئی نہیں ہوگا میری جان، بس تم آجاؤ۔ پورا انتظام کردوں گا تمہیں وہاں آتا جاتا کوئی نہ دیکھ پائے۔''

''ٹھیک ہے، اللہ حافظ۔'' نورین نے کہا۔

''کل ملتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے عبدالقادر نے بھی فون رکھ دیا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ مچھلی اتنی آسانی سے جال میں دوبارہ آجائے گی۔

نجمہ بھی ریسیور سے کان لگائے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ جیسے ہی وہ باہر نکلیں، نجمہ نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔ ''شاباش میری شیرنی...... مجھے تمہارے اعتماد پر پورا بھروسا ہے۔''

''میں نے ٹھیک بات کی نہ؟'' اس نے تعریف سن کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم میں ہمت ہے، بس اسے اپنے اندر سے باہر نکالو ورنہ اس جنگل کے درندے تمہیں چیر پھاڑ کھائیں گے۔''

''کوشش کروں گی۔'' نورین نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''دیکھو، اس نے کام خود آسان کر دیا ہے، بس تم بے دھڑک جانا اور خوفزدہ ہوئے بغیر وہ سب کچھ کر ڈالنا، جیسا میں نے سمجھایا ہے۔'' یہ کہہ کر نجمہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''بولو...... کرلوگی نا۔''

''مجھے یہ سب کچھ اپنے لیے کرنا ہے، کرلوں گی۔''

''یہ ہوئی نا بہادروں والی بات......'' نجمہ نے ونڈ اسکرین سے نگاہیں اس کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

نورین بھی ہنس پڑی۔

گاڑی ماڈل کالونی میں داخل ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر میں نورین کا گھر آگیا۔ نجمہ نے گاڑی گلی کے کونے پر پارک کی اور اس کے ساتھ گھر کی طرف بڑھنے لگی۔

نورین نے رات کھانے پر ہی ماں کو بتا دیا تھا کہ کل فیکٹری میں چھٹی ہے۔ وہ دوپہر بارہ بجے کے قریب نجمہ کے ساتھ جائے گی۔ وہ گاڑی لے کر آجائے گی اور اسٹاپ سے پک کرلے گی۔ انہیں شاپنگ کے لیے طارق روڈ جانا ہوگا۔

دوسرے دن پونے بارہ بجے کے قریب نورین گھر سے نکلی۔ دس پندرہ منٹ بعد اسے صدر کی بس مل گئی، جہاں سے اس نے ٹاور کی بس لی اور جب وہ عبدالقادر کے دفتر والی بلڈنگ کے قریب پہنچی تو سوا ایک ہو چکا تھا۔ عبدالقادر عیاش طبع انسان تھا۔ اس نے اپنا دفتر بلڈنگ میں ایسی جگہ لیا تھا کہ کوریڈور سے گزرنے والوں کی اس پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

نورین نے برقع اوڑھ رکھا تھا، چہرے پر نقاب اور دھوپ کا چشمہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ کوئی اسے پہچان نہیں سکے گا۔ جب وہ کوریڈور کے اختتام پر الٹے ہاتھ کو مڑی تو عبدالقادر سامنے ہی نظر آگیا۔ وہ دروازے کے سامنے کھڑا اس کا ہی منتظر تھا۔ ''خوش آمدید میڈم......'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

نورین کچھ کہے بنا اندر داخل ہوئی۔ عبدالقادر نے دروازہ بند کیا۔ وہ اس وقت لاؤنج میں تھے۔ ''چلو اندر بیٹھتے ہیں۔''

وہ نیم تاریک کمرے میں داخل ہوئی تو اے سی کی ٹھنڈک میں اس نے راحت کی سانس لی۔

''برقع اتارو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ اب کیا تکلف تمہارے میرے بیچ۔''

نورین نے کچھ کہے بنا نقاب اتارا۔ چشمہ اور پرس سینٹرل ٹیبل پر رکھا۔ عبدالقادر نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر صوفے کی طرف کھینچا۔

''ابھی ٹھہریں۔'' یہ کہہ کر نورین نے ہاتھ چھڑایا اور اٹیچڈ باتھ روم کی طرف بڑھی۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس کی گھبراہٹ میں کافی کمی آچکی تھی۔

''میں نے بریانی منگوائی ہے۔ ابھی کھائیں یا بعد میں، کولڈ ڈرنک بھی ہے۔''

''رہنے دیں اپنی کولڈ ڈرنک......'' نورین نے ادائے دلبری سے منہ بنا کر کچھ اس طرح کہا کہ وہ اس پر اور لٹو ہو گیا۔

''ارے اس دن کی بات کچھ اور تھی......'' عبدالقادر اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولا۔

''آپ نے اچھا نہیں کیا وہ کولڈ ڈرنک پلا کر......'' نورین کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ دوستانہ انداز میں شکوہ کر رہی ہو۔

''سوری......'' اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑی۔ اسے ہنستا دیکھ کر عبدالقادر کا دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔ وہ اس جھانسے میں آگیا تھا کہ نورین مکمل طور پر خود کو اس کے سپرد کرنے کو تیار ہو چکی، لیکن ایسا ہرگز نہ تھا۔

نورین کا رویہ منصوبے کا حصہ تھا۔ وہ بخوبی اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھی کہ صیاد خود اپنے دام میں آچکا ہے۔

عبدالقادر نے اسے سینے سے لگانے کی کوشش کی تو اس نے آہستگی سے خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا۔ ''تمہیں میرے گھر کا پتا کہاں سے ملا؟''

''تمہاری درخواست سے۔''

''اور وہ تصویریں کہاں ہیں؟'' نورین نے پوچھا۔

''فکر مت کرو، حفاظت سے رکھی ہیں۔''

''کہیں، کبھی کسی نے دیکھ لیں تو......'' نورین نے ادائے ناز سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بڑی بدنامی ہو جائے گی۔''

''لو میں تمہیں دکھاتا ہوں، کہاں رکھی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے عبدالقادر اٹھا اور الماری کا تالا کھول کر چمڑے کا ہینڈ بیگ باہر نکالا اور اس کے قریب آیا۔ ''یہ دیکھو......'' اس نے ایک لفافہ باہر نکالا۔ تصویریں اور تمہارے خوبصورت ہاتھ کی تحریر اس میں ہے۔''

''مجھے دکھاؤ......'' نورین نے ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے وہ لفافہ بے پروائی سے میز پر ڈال دیا۔

نورین نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما۔ ''اگر تم یہ سب کچھ نہ کرتے اور پیار کرتے تو شاید میں ویسے ہی تمہارے قریب آجاتی۔''

''سچ......'' یہ سن کر تو عبدالقادر کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا تھا۔

نورین سمجھ گئی کہ نجمہ کا منصوبہ کامیاب جا رہا ہے۔

''کھانا کھالیں، بھوک لگ رہی اور ویسے بھی میں کہاں جا رہی ہوں۔'' عبدالقادر اس کے قریب بیٹھنے لگا تو اس نے بڑے چاؤ سے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے۔''

کچھ دیر میں عبدالقادر نے میز پر کھانا چن دیا۔ اس نے کولڈ ڈرنک کی سربہ مہر بوتل کھولی اور دو گلاسوں میں ڈال کر ایک اس کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے سامنے کھسکا لیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کھانے کو ہاتھ لگاتا نورین بولی۔ ''جائیں پہلے ہاتھ تو دھولیں۔''

''اوہ......'' وہ جلدی سے باتھ روم کی طرف بڑھا۔

اس نے جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور جب تک وہ باہر آتا، نورین، نجمہ کی ہدایت کے مطابق اپنا کام کر چکی تھی۔ منصوبے کا سب سے کٹھن مرحلہ بھی گزر گیا تھا۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا لیکن اس کے آنے سے پہلے نورین نے خود کو سنبھالا اور جیسے پہلے بیٹھی تھی، اسی طرح سمٹ کر بیٹھ گئی۔

''چلو کھانا شروع کرتے ہیں۔'' وہ اپنی دفتری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ سامنے ہی کھانا چنا ہوا تھا۔

''جی......'' نورین نے بریانی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

عبدالقادر بہت بے صبری سے کھانے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا، ساتھ ہی بار بار نورین سے بھی جلدی کھانا ختم کرنے کا کہے جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر کھانا ختم ہونے میں دیر ہوئی تو وہ چلی جائے گی۔

نورین نے ابھی کھانا ختم نہیں کیا تھا کہ اس نے پلیٹ ایک طرف کھسکائی اور جلدی سے کولڈ ڈرنک کا بھرا گلاس اٹھایا۔ یہ دیکھ کر نورین دل ہی دل میں زور سے ہنسی۔ عبدالقادر نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس آدھا خالی کر دیا تھا۔ پھر اس نے ایک زوردار ڈکار لی اور اگلے ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر کے زور سے ٹیبل پر رکھا اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر نورین کو تکنے لگا۔ یہ دیکھ کر وہ ذرا سی گھبرا گئی تھی۔ گھبراہٹ چھپانے کے لیے تیزی سے اٹھی اور باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھونے لگی۔ وہ جان بوجھ کر کچھ دیر تک باتھ روم میں رکی رہی۔ باہر آئی تو عبدالقادر بدستور اسی پوزیشن میں بیٹھا تھا۔ یہ دیکھ کر نورین نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب تک اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ نجمہ نے کہا، وہ

درست ثابت ہوسکے گا۔ ”سر! کھانا کیسا تھا؟“ نورین نے اس کی کیفیت جاننے کی کوشش کی مگر وہ خاموش بیٹھا رہا۔

نورین آگے بڑھی۔ اسے بازو سے پکڑ کر ہلکا سا ہلایا مگر وہ ساکت رہا۔ نورین نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پتلیاں ایک جگہ ٹکی ہوئی تھیں، البتہ ان میں زندگی کی ہلکی سی رمق باقی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر آگے بڑھی۔ تصویروں والا لفافہ اٹھا کر اسے کھولا۔ اندر تصویریں، ان کے نیگیٹیوز اور شناختی کارڈ کی کاپی کے ساتھ دی گئی نوکری کی درخواست رکھی ہوئی تھی۔ اس نے لفافہ اٹھا کر پرس میں ٹھونسا۔ بریانی والا کھانے کا ڈبا اور اپنا گلاس شاپنگ بیگ میں ڈالا اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ اب ٹیبل دیکھ کر لگتا تھا کہ کھانا صرف عبدالقادر نے ہی کھایا تھا۔

نورین کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ نجمہ کی ہدایت کے مطابق اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے منصوبے کو کامیابی سے انجام تک پہنچایا۔ وہ کمرے سے نکلتے نکلتے پلٹی اور ایک بار پھر عبدالقادر کی آنکھوں میں جھانکا۔ پتلیاں اوپر کو چڑھ رہی تھیں۔ ہاتھ کرسی کے ہتھے سے نیچے لٹک رہے تھے۔ ”لعنت ہو کمینے درندے۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ کوریڈور میں تقریباً سناٹا طاری تھا۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔ بلڈنگ سے باہر نکلتے ہوئے اس نے بریانی والا شاپنگ بیگ کچرے کے ڈھیر پر پھینکا۔ مشن مکمل ہو چکا تھا۔ تھوڑا آگے جا کر اس نے ٹیکسی روکی۔ وہ نجمہ کے گھر جا رہی تھی۔

گھنٹا بھر بعد وہ دونوں اکیلے کمرے میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ نورین نے تصویریں، ان کے نیگیٹیوز اور اپنے ہاتھ سے لکھی درخواست کو قینچی سے پرزہ پرزہ کر کے فلش میں بہا دیا تھا۔

دوسرے دن تمام اخبارات میں عبدالقادر کی موت کی خبر تصویر کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ ”مقامی ریکروٹنگ کمپنی کے مالک کی پُراسرار موت۔“ خبر کے مطابق پولیس کا کہنا ہے کہ ابتدائی تفتیش اور میڈیکل رپورٹ سے پتا چلا ہے کہ متوفی دفتر میں تنہا تھا۔ لنچ کے بعد وہ بیٹھا تھا کہ اسے دل کا دورہ پڑا۔ پولیس نے موت کو فطری قرار دے کر معاملہ نمٹا دیا۔ ورثا لاش کو پوسٹ مارٹم کرائے بغیر تدفین کے لیے چکوال لے گئے۔

سب سے پہلے نورین کو یہ خبر نجمہ نے سنائی۔ وہ دفتر آنے سے پہلے اخبار دیکھ کر آئی تھی۔ نورین بہت خوش تھی۔ وہ یہ خبر اپنی آنکھوں سے پڑھنا چاہتی تھی۔ اس نے شام کو گھر جاتے ہوئے بک اسٹال سے شام کا ایک اخبار خریدا۔ اس میں عبدالقادر کی موت کی خبر اور تصویر نمایاں انداز سے شائع کی گئی تھی۔ خبر کو مرچ مسالا لگا کر چٹخارے دار بنا دیا گیا تھا لیکن خبر میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو اس کے لیے پریشانی کا باعث بنتی۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہ اخبار کو موڑ توڑ کر کچرا کنڈی میں پھینک چکی تھی۔

نورین، عبدالقادر سے پیچھا چھڑانے کے بعد بہت خوش تھی۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ اب تقدیر کا تب اس کی داستانِ حیات کے اگلے پنوں پر چین ہی چین لکھ رہا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ چند ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک دن نجمہ نے اسے اپنا رشتہ طے ہو جانے کی خبر سنائی۔ وہ اس رشتے کا سن کر بہت خوش ہوئی لیکن یہ بات اسے اداس کر گئی کہ نجمہ شادی کے فوراً بعد لندن چلی جائے گی۔ اس کا ہونے والا شوہر برطانوی شہری اور ڈاکٹر تھا۔ نجمہ کی شکل میں اسے جیسے بڑی بہن مل گئی تھی مگر اب یہ تعلق موڑ بدلنے والا تھا۔ چند ہفتوں کے اندر اندر شادی ہو گئی اور نجمہ لندن چلی گئی، اس وعدے کے ساتھ کہ جب بھی وہ کراچی آئے گی، دوبارہ ضرور ملیں گے۔

نورین کو ملازمت کرتے ہوئے دو سال ہونے والے تھے۔ اپنی کارکردگی کی بدولت وہ پیکنگ گرل سے اسسٹنٹ سپروائزر بن چکی تھی۔ بظاہر وہ اپنی معمول کی زندگی سے بہت خوش تھی لیکن اچانک ایک موڑ آیا اور پھر زندگی اسے ایک ایسی راہ پہ لے آئی کہ جہاں سے ہر منظر بدل گیا۔

ایک دن صبح وہ فیکٹری کے لیے نکلی۔ آدھا گھنٹے تک اسٹاپ پر کھڑا رہنے کے باوجود وین نہ پہنچی تو اس نے بس کے ذریعے جانے کا فیصلہ کیا لیکن جب وہ فیکٹری پہنچی تو وہاں کا تو نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ فیکٹری راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی۔ فائر بریگیڈ کی کئی گاڑیاں گزشتہ رات لگنے والی آگ پر قابو پا چکی تھیں مگر بچا کچھ نہیں سکے تھے۔ فیکٹری میں کام کرنے والے درجنوں ملازمین ٹولیوں کی شکل میں کھڑے اپنے مستقبل پر لگے سوالیہ نشان کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ وہ بھی ساتھی لڑکیوں کی ٹولی میں شامل ہو گئی۔ گھنٹا بھر بعد فیکٹری منیجر آیا اور اس نے فیکٹری کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے ساتھ ایک بینر لگا دیا: ”فیکٹری تاحکم ثانی بند رہے گی، ملازمین آنے کی زحمت نہ کریں۔ واجبات کی ادائیگی کے لیے ہیڈ آفس بذریعہ لیٹر ملازمین کو مطلع کر دے گا۔“

چند روز کے بعد اسے فیکٹری انتظامیہ کی طرف سے

ایک لیٹر ملا۔ وہ ہیڈ آفس پہنچی تو اسے تین ماہ کی پیشگی تنخواہ اور دیگر واجبات کا چیک تھما کر شکریے کے ساتھ کوئی اور ملازمت تلاش کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ اس نے چیک کیش کرایا اور گھر لوٹ آئی۔

تین چار ہفتے گزر گئے۔ نورین گھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ پچھلے دو سالوں میں اس کی تنخواہ اور ملازمت کے بعد ملنے والی رقم کے بعد فی الحال گھر چلانے کا کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن پھر بھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ اب کیا کیا جائے۔ پچھلے کئی ہفتوں سے وہ متواتر اتوار کے اخبارات دیکھ رہی تھی۔ کئی جگہوں پر درخواستیں بھی بھیجیں مگر کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔

''بیٹی کچھ سوچا تم نے، اب آگے کیا کرنا ہے۔'' ایک شام کھانے کے بعد ماں اس کے سر میں تیل لگا کر چوٹی باندھ رہی تھی۔

''سوچ تو بہت کچھ رہی ہوں، کچھ نہیں آرہا، درخواستیں بھیجی ہیں لیکن لگتا ہے انہیں ڈگری میں زیادہ دلچسپی ہے۔''

''قسمت کا کھیل ہے سب۔'' ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''کاش تیرے ابا زندہ ہوتے تو اب تک تو خیر سے اپنے گھر بار کی ہو چکی ہوتی۔''

''امی......'' نورین نے گردن پھیری۔ ''آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ میں ہوں نا آپ کا بیٹا۔''

''کیا کروں بچی......''

''مایوس مت ہوں۔''

''اللہ بخشے کونسلر صاحب کو۔ وہ بھی دنیا میں نہ رہے۔ اللہ کے بعد ایک انہی سے امید تھی کہ وہ ایسے وقت میں کچھ کر دیتے۔''

''کوئی بات نہیں امی اللہ ہی کوئی راستہ نکالے گا۔''

''لگتا ہے تجھے خود ہی باہر نکل کر ہاتھ پیر چلانے ہوں گے۔ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے یہ تو پھر نوکری ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کچھ توقف کیا۔ ''کوئی جان پہچان والے ہیں تیری نظر میں۔''

یہ سن کر نورین سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کے ذہن میں صدر والی آنٹی رضیہ اور اسے گھر لے جانے والی ثمو اور شازی کا خیال ذہن میں آیا۔ وہ نوکری سے پہلے ایک بار دن میں ان کے گھر گئی تھی شکریہ ادا کرنے۔ شازی اور ثمو سے تو ملاقات نہ ہو پائی تھی، وہ کہیں باہر تھیں البتہ آنٹی اس سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ بڑی شدت سے دوبارہ آنے کو بھی کہا تھا لیکن پھر وہ فیکٹری میں اتنی الجھی کہ دوبارہ ان سے رابطے کا خیال ہی نہ آیا۔ ''شاید وہ میری مدد کر سکیں......'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

''کیا ہوا، کیا منہ ہی منہ بڑبڑائے جارہی ہو۔'' ماں نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''امی ایک ہیں جاننے والی، شاید کام بن جائے۔ ایسا کرتی ہوں کل دوپہر ان کی طرف جاتی ہوں۔''

''بھروسے کے لوگ تو ہیں؟''

''جی امی، بہت اچھے لوگ ہیں۔'' نورین کا لہجہ بہت پُرامید تھا۔ اسے یقین تھا کہ آنٹی سے مل کر کوئی راستہ ضرور نکل جائے گا۔

وہ ان لوگوں کو تقریباً بھول ہی چکی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اتنے عرصے بعد ملنے جائے گی وہ بھی اپنے کام سے۔ سچ ہے انسان کو مصیبت میں ہی سب کچھ یاد آتا ہے۔ پریشانی نہ ہو تو وہ بس اپنے آپ میں ہی مگن رہتا ہے۔ اسے بھی رات کو رہ رہ کر یاد آتا رہا کہ انہوں نے ایک اجنبی کی کتنی خاطر مدارت اور دلجوئی کی تھی۔ وہ دوسرے دن ان سے ملنے کا ارادہ کر چکی تھی لیکن رات کے بارہ بج رہے ہوں گے کہ لائٹ چلی گئی اور پھر صبح سات بجے آئی۔ پھر جو وہ سوئی تو ماں کے جگانے پر ہی اٹھی۔ وہ ایک لفافہ ہاتھ میں لیے کھڑی تھیں۔ اس کے نام پر ایک خط آیا تھا۔ یہ چائے والا امپورٹ ایکسپورٹ فرم کی طرف سے تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے اخبار میں اشتہار دیکھ کر درخواست بھیجی تھی۔ اسے انٹرویو لیٹر ملنے کے دوسرے دن انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا۔ استقبالیہ کلرک کی نوکری تھی۔

دوسرے دن وہ بتائے گئے پتے پر پہنچی تو منیجر نے اسے رسمی انٹرویو کے بعد ملازمت پر رکھ لیا۔ تنخواہ مناسب تھی لیکن ایک شرط تھی کہ عام طور پر چھٹی چھ بجے ہوگی لیکن جس دن سیٹھ صاحب دفتر میں ہوں گے، اسے بھی ان کے جانے تک بیٹھنا پڑے گا۔ بے روزگاری کی ماری نورین نے اوور ٹائم سن کر فوراً سر ہلا دیا، سوچ رہی تھی کہ اس طرح پوری تنخواہ بچا کر، اوپری خرچ اوور ٹائم سے پورا کرلیا کرے گی۔ اسے بہت افسوس تھا کہ چاہنے کے باوجود آنٹی سے ملنے نہ جا سکی۔ سوچ رہی تھی کہ اگر کسی دن دفتر سے جلدی اٹھی تو وہ ضرور ان کے گھر سے ہوتی ہوئی جائے گی۔ آخر اسے روزانہ صدر سے ہو کر ہی تو دفتر آنا جانا ہوتا تھا۔

دو ہفتے تو مزے سے گزر گئے۔ وہ اپنے ٹائم پر آتی اور ٹائم پر نکل جاتی تھی لیکن ایک دن منیجر نے اسے بلا کر کہا کہ سیٹھ صاحب بیرونِ ملک سے واپس آگئے ہیں۔ کل سے وہ

دفتر آئیں گے۔ روز تو نہیں البتہ مہینے میں تین چار بار ضرور آتے ہیں۔ اس لیے رکنا بھی پڑ سکتا ہے۔ یہ سن کر وہ خوش تھی کہ چلو اسی مہینے سے اوور ٹائم ملنا بھی شروع ہو جائے گا۔
ابھی ملازمت کو ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے دو بار دفتر میں دیر تک رکنا پڑا۔ دفتر میں صرف سیٹھ صاحب، وہ اور ایک بوڑھا چپراسی تھا۔ چپراسی بھی کوریڈور میں کرسی ڈالے بیٹھا رہتا تھا۔ نورین کو بھی سیٹھ صاحب سے ملنے کا شوق تھا کہ دیکھوں تو سہی وہ کیسے ہیں لیکن وہ دفتر کے دوسرے دروازے سے سیدھے اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے اور منیجر کی بات کے برعکس وہ اب تک دیر تک رکے بھی نہیں تھے۔ اسے اوور ٹائم نہ بننے کا افسوس ہو رہا تھا۔

ایک دن شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے اور وہ اٹھنے کی تیاری کر رہی تھی کہ انٹر کام کی گھنٹی بجی۔
''ہیلو سر!''
''سیٹھ بول رہا ہوں۔'' ایک بھاری آواز سنائی دی۔
''مجھے کام ہے تقریباً نو بج جائیں گے۔ تمہیں بھی دفتر میں رکنا ہوگا۔ کچھ ضروری فون کرنا ہوں گے۔''
''ٹھیک ہے سر۔'' نورین کا جواب سننے سے پہلے انہوں نے فون رکھ دیا۔
ہلکی سردیوں کے دن تھے۔ دن چھوٹے ہو چکے تھے، سورج جلدی ڈوب جاتا تھا۔ شام کے ساڑھے سات بجے ہوں گے کہ انٹر کام کی گھنٹی بجی۔
''اندر آؤ۔''
وہ سیدھے سیٹھ صاحب کے کمرے کی طرف لپکی۔
اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔
''سر، آجاؤں۔'' وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی۔
کمرے میں ٹیبل لیمپ کی ہلکی سی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔
سیٹھ صاحب کا چہرہ بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
''قریب آؤ......'' سیٹھ نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔
''جی سر۔'' کہتے ہوئے وہ ان کے برابر جا کر کھڑی ہو گئی۔ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔ اسے دفتری ملازمت کا تو تجربہ ہو چکا تھا لیکن وہ سیٹھ کے رُو برو پہلی بار کھڑی تھی۔
وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ نورین کی نظریں نیچی تھیں۔ ''گھبراؤ مت......''
''جی......''
''تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ نئی آئی ہو کیا۔''
''جی سر، ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا ہے۔''
''بھئی یہ گھبرانا چھوڑو، ذرا گلاس پکڑاؤ۔''
نورین نے ہاتھ بڑھا کر سامنے رکھا گلاس اٹھایا اور سیٹھ صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ بڑھایا سیٹھ صاحب نے اس کی کلائی آہستہ سے پکڑ لی۔
نورین کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے عبدالقادر کا چہرہ گھوم گیا۔ اس نے غصے سے بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''سر چھوڑ دیں۔''
''رہنے دو۔ اوور ٹائم سے کیا ملے گا جو میں دے سکتا ہوں۔ چاہیے تو قریب آجاؤ۔'' سیٹھ اب کھڑا ہو چکا تھا۔
اس سے پہلے کہ سیٹھ کی دست درازی بڑھتی، وہ زور سے چلّائی۔ ''میرا ہاتھ چھوڑو۔'' پوری قوت سے زور لگا کر اس نے سیٹھ کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑائی اور دروازے کی طرف لپکی۔
''کل سے منحوس شکل لے کر دفتر مت آنا۔'' سیٹھ چلّایا۔
نورین استقبالیہ پر پہنچی تو چپراسی اندر داخل ہو رہا تھا۔
''کیا ہوا بیٹی۔ ایسا لگا کہ جیسے تم چلّائی ہو۔''
''کچھ نہیں بابا......'' نورین نے برقع پہن کر بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز روہانسی ہو رہی تھی۔
''سمجھ گیا بیٹی......'' چپراسی نے افسردگی سے کہا۔
''آج پھر سیٹھ صاحب نے غلط لڑکی پر ہاتھ ڈال دیا۔ بیٹی تمہیں کچھ ہوا تو نہیں۔'' لگتا تھا کہ وہ سیٹھ کے کرتوتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔
''نہیں بابا مگر اب میں کل سے نہیں آؤں گی۔ منیجر صاحب سے کہنا میری آج تک کی تنخواہ منی آرڈر کر دیں۔'' اس کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔
یہ تھا سیٹھ نعمان چائے والا سے نورین کا پہلا تعارف۔ وہ اس کا چہرہ تو ٹھیک سے نہ دیکھ سکی البتہ کرتوت کھل کر اس کے سامنے آچکے تھے۔
ایک بار پھر بیٹی کی بے روزگاری نے ماں کے سر پر پریشانیوں کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا، دفتری ملازمت کا خیال دل سے نکال دو۔ کسی فیکٹری وغیرہ میں کام ڈھونڈو۔ واجبی تعلیم کے ساتھ تو یہی ہوتا رہے گا۔
نورین نے ماں کو سچائی نہیں بتائی تھی۔ اسی لیے وہ بے چاری تعلیم کو ملازمت سے نکالے جانے کی وجہ سمجھ رہی تھی۔ بیٹی اپنی تذلیل کے باعث نڈھال تھی لیکن ماں کا خیال تھا کہ وہ نکالے جانے کے باعث پریشان ہے۔

چند روز بعد اس نے یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ وہ جہاں جائے گی اسی طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہی رہے گا لیکن اب کیا کیا جائے۔ آخر کافی سوچ و بچار کے بعد اس نے آنٹی رضیہ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

جب وہ ان کے فلیٹ پر پہنچی تو دروازہ کھلا ہوا تھا، آنٹی رضیہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ وہ اسے پہچان نہ سکیں لیکن جب نورین نے تعارف کرایا تو انہیں سب کچھ یاد آ گیا۔

''شازی اور نمو کہاں ہیں؟''

''چلی گئیں، ہاتھ پیروں والی جو ہو گئی تھیں۔'' انہوں نے دبے لفظوں میں مختصر سا گول مول جواب دیا۔

اس نے آنٹی کے ذو معنی جواب سے مطلب ان کی شادیاں ہو جانے کا لیا۔ ''تو اب آپ اکیلی رہ رہی ہیں؟''

''وہ تو شروع سے ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟''

''آنٹی بہت پریشان ہوں، کئی مہینے ہو گئے لیکن نوکری نہیں ہے۔ ایک نوکری ملی تھی لیکن......'' نجمہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''لیکن کیا......'' انہوں نے چونک کر پوچھا۔

نورین نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ کس طرح فیکٹری میں آگ لگنے سے ملازمت ختم ہوئی اور کس طرح سیٹھ نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا۔ اس نے جان بوجھ کر عبدالقادر والا قصہ گول کر دیا۔

آنٹی نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ''بے وقوف لڑکی، مردوں کے اس معاشرے میں لڑکی کی تعلیم سے زیادہ اس کی شکل و صورت چلتی ہے۔''

''جی......'' نورین نے ہونقوں کی طرح ان کی طرف دیکھا۔

''اپنے آپ کو آئینے میں اچھی طرح دیکھ۔'' یہ کہہ کر کچھ توقف کیا۔ ''تو ہر روز ہزاروں روپے کما سکتی ہے، پھر چند روپلی کے پیچھے کیوں ماری ماری پھر رہی ہے۔''

ہزاروں روپے روز کمانے کا سن کر اس کا تجسس بڑھا لیکن وہ کچھ سمجھ نہ سکی تھی۔ ''آنٹی میں کچھ نہیں، ذرا کھل کر سمجھائیں۔'' اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''لو یہ بھی کوئی بات ہے سمجھانے کی بھلا، جوان ہو، خوبصورت ہو۔'' یہ کہہ کر تھوڑا توقف کیا۔ ''چلو...... میں سمجھائے دیتی ہوں۔ مدد بھی کروں گی۔ لاکھوں روپے کمانے لگی دو تین سال میں شازی اور نمو کی طرح۔''

نورین کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے تو وہ صرف ہزاروں روپے کے سپنے اپنی آنکھوں میں سجا رہی تھی لیکن لاکھوں کی بات سن کر تو اس کے دماغ میں جھماکے شروع ہو گئے۔ ''وہ کیسے......'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''تجھے کام چاہیے تھا نا......''

''نورین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چل...... میں دیتی ہوں تجھے کام۔'' وہ بھی سمجھ گئی تھی کہ لوہا گرم ہے اور پھر آنٹی نے کام اور اس کی نوعیت سمجھانا شروع کی۔

نورین دم بخود بیٹھی اُن کی باتیں سن رہی تھی۔

جیسے جیسے وہ بولتی جا رہی تھیں نورین جیسے زمین میں گڑتی جا رہی ہو۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوئیں، نورین ایک جھٹکے سے اٹھی۔

''کہاں جا رہی ہو، بیٹھو تو سہی۔''

''میں چلتی ہوں۔'' نورین کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''ٹھیک ہے جاؤ، بیچو خود کو دوسروں کی لگائی گئی قیمت پر اور رہو شرافت کا ہار گلے میں لٹکا کر۔''

نورین دروازے کی طرف بڑھی۔ ''سوچنا ضرور اور اگر بات سمجھ آئے تو پلٹ آنا۔ تم جیسوں کے لیے یہ دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔''

نورین کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئی۔

آنٹی کی باتوں نے اس کا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ اسے ان پر شدید غصہ آ رہا تھا لیکن اگلے چند روز تک وہ جوں جوں ان کی باتوں پر غور کرتی رہی، اسے وہ باتیں حقیقت لگنے لگی تھیں۔ اس کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔

اگلے دو ماہ تک وہ نہایت شدت سے نوکری کی تلاش میں لگی رہی۔ شہر میں ہڑتالوں، ہنگاموں، قتل و غارت اور سیاسی محاذ آرائی نے بے روزگاری میں اضافہ کر دیا تھا۔ ہنگاموں اور ہڑتالوں کے باعث عام طور پر کارخانے بند رہتے تھے یا صرف ایک دو شفٹوں میں کام ہوتا۔ وہ جہاں گئی، اسے 'نو ویکنسی' کا بورڈ نظر منہ چڑاتے نظر آیا۔

دو ماہ کی خواری کے بعد اسے آنٹی رضیہ کی باتوں میں پوشیدہ سچائی زیادہ صاف نظر آنے لگی تھی۔ آخر مجبور ہو کر اس نے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ مزید خوار نہ ہونے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اس نے خود کو یقین دلا دیا تھا کہ اگر ہاتھ میں پیسہ ہو تو پھر پیشہ کوئی نہیں پوچھتا، ویسے بھی کٹھن حالات میں انہیں پوچھنے والا تھا ہی کون۔ دو چار عزیز رشتے

دار تھے لیکن سب اپنی اپنی زندگیوں میں گن تھے۔ برسوں ہو چکے تھے، کسی نے ان کے در پر قدم نہیں رکھا تھا کہ کہیں کچھ دینا نہ پڑ جائے۔

آخر لاچار ہو کر نورین نے ایک دن جانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اب اسے صرف اور صرف دولت کمانا تھی۔ اس نے بند دروازے پر دستک دی تو آنٹی رضیہ نے دروازہ کھولا۔ نورین کو دیکھ کر ہنسی۔ ”آخر تم نے حقیقت کو تسلیم کر ہی لیا۔“ وہ دروازے سے ایک طرف ہوتے ہوئے بولیں۔

نورین سر جھکائے گھر میں داخل ہوئی۔

”دولت کمانے کی دنیا میں خوش آمدید نوری۔“

نورین نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

”آج سے یہی تمہارا نام ہے۔“ آنٹی نے ہنس کر کہا۔

نورین اب نوری بن چکی تھی۔

زندگی کی گردش انسان کو کب کہاں لا کر کھڑا کر دے، یہ اوپر والا جانے یا اس کی کتاب تقدیر مگر ایک بات طے ہے۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں، انسان بہت جلد ان سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ یہی بات نورین سے نوری بن جانے والی مجبور لڑکی پر بھی صادق آئی تھی۔

شروع شروع میں تو وہ احساسِ ندامت کے باعث کئی بار موت کو گلے لگانے کا سوچتی رہی لیکن ہر بار ماں کا چہرہ اسے سسک سسک کر زندہ رہنے پر مجبور کرتا رہا۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ پیسے کی قلت دور ہو گئی، گھر میں خوشحالی کا راج شروع ہو گیا، ندامت بھی کچھ کم ہو گئی، البتہ گناہ کے احساس کی ایک خلش رہ رہ کر ضرور سر اٹھاتی رہتی تھی مگر پیسے کے بوجھ اور پیٹ کی آنچ کے آگے اس کی شدت کا احساس ہمیشہ ماند پڑتا رہا۔ نورین نے نوری کی زندگی کو پوری طرح قبول کر لیا تھا۔ ماں، بیٹی کے بیٹا بن کر سہارا دیے جانے پر بہت خوش تھی۔ وہ جو کچھ جانتی تھی، بس اتنا تھا کہ بیٹی ایک فیکٹری میں سپروائزر ہے اور دوپہر سے شروع ہو کر رات گئے ختم ہونے والی شفٹ میں کام کرتی ہے۔ کبھی کبھی پوری پوری رات اوور ٹائم بھی لگتا ہے۔ بیٹی جسے تنخواہ کہتی تھی، ماں لاعلم رہی کہ وہ تن کی آمدن تھی۔

ایک دن وہ حسبِ معمول رضیہ آنٹی کے گھر پہنچی تو یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ انہیں پورے جسم پر لقوہ مار گیا ہے۔ وہ جیتے جی مردہ بن چکی تھیں۔ کچھ ہی دن کے اندر اندر ایک ایک کر کے وہاں آنے والیاں کسی اور آنٹی کی چھپر چھاؤں تلے چلی گئیں مگر گناہ کی دلدل میں دھنسنے کے باوجود نورین کا دل اب تک روشن تھا۔ اس نے آنٹی کو بے یار و مددگار نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال کی اس زندگی میں وہ دھندے کے بہت سے گُر جان چکی تھی۔ اب اس نے آزاد رہ کر کام کرنے کی ٹھانی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی طرح جلد از جلد وہ بہت سارا پیسہ کما کر اس زندگی کا چلن چھوڑ دے گی اور کوئی شریف انسان دیکھ کر گھر بسا لے گی۔

کچھ دن بعد اسے ایک اور خیال دل میں آیا۔ وہ اپنی گناہ کی زندگی سے تو متنفر ہو چکی تھی لیکن یہ ضرور سمجھتی کہ اس کی ذلت کے ذمے دار وہ نہیں بلکہ عبدالقادر جیسے لوگ ہیں۔ اگر سیٹھ اس دن وہ حرکت نہ کرتا تو شاید اس کی زندگی کا چلن کچھ اور ہوتا۔ پھر اسے ایک نیا آئیڈیا سوجھا۔ بہت جلد اس نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ جلد ہی اس نے اپنے تن کو رسوا کیے بغیر کافی پیسہ اکٹھا کر لیا۔ اس کے انتقام کی آگ بھی سرد ہونے لگی تھی۔ اب اسے کافی سرشاری حاصل تھی۔ وہ اپنے کام کو دھندے کے بجائے مشن سمجھنے لگی تھی۔

اسی دوران تین تلوار پر اسے سیٹھ نعمان جانے والا ٹکرایا۔ یہی وہ شخص تھا جس کی ایک حرکت نے نورین کو نوری بنا دیا تھا لیکن اسے تقدیر کہیے کہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے بظاہر اجنبی تھے۔ اس دن وہ سیٹھ کے گھر سے نکلی تو اس کے بیگ میں سیٹھ کے چالیس لاکھ روپے تھے۔ سیٹھ بھی انجام کو پہنچا اور اس کی بھی جھولی بھر گئی۔ سیٹھ نے یہ رقم سہ پہر کو ہی بینک سے نکلوائی تھی۔

نورین نے کبھی کسی واردات میں کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا لیکن اس دن اس سے ایک ہلکی سی چوک ہو گئی۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر وہ سچ مچ حواس کھو بیٹھی تھی۔ اپنا کام پورا کر کے جلد از جلد نکلنے کے چکر میں وہ ایک معمولی سی غلطی کر گئی۔ اب تک وہ سیٹھ جیسے درجنوں شکار کر چکی تھی لیکن یہاں ایک بات غیر معمولی تھی۔ سیٹھ بہت نام والا اور بارسوخ تھا۔ دوسرا یہ کہ اس کے پاس موجود بھاری رقم بھی غائب تھی۔ اسی لیے پولیس اس کیس کو فطری موت قرار دے کر داخلِ دفتر کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔ اوپر سے بڑے لوگوں کا دباؤ تھا کہ تفتیش کو ہر حال میں انجام تک پہنچنا چاہیے۔ سیٹھ کی موت کو چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اخبارات میں پولیس تفتیش کے حوالے سے کبھی کبھار کوئی نہ کوئی خبر آتی رہتی تھی مگر پولیس اب بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔

☆☆☆

اے ایس پی زاہد شیروانی کی پہلی پوسٹنگ ہوتا تھی۔ ڈی آئی جی صاحب نے اسے پوسٹنگ کے لیے پولیس ہیڈ

کوارٹر بلایا تھا۔ سی ایس ایس میں نمایاں پوزیشن لے کر کامیاب ہونے والے زاہد شیروانی نے پولیس کا محکمہ منتخب کیا تھا۔ اسے بچپن سے ہی کھوج لگانے کا بہت شوق تھا۔ بچپن میں چور سپاہی اس کا پسندیدہ کھیل تھا۔ وہ ہمیشہ اس کھیل میں سپاہی بنتا تھا۔ اکیڈمی سے تربیت مکمل کرنے کے بعد اس کی خدمات سندھ پولیس کے حوالے کی گئی تھیں۔ اسی سلسلے میں ہی اسے ڈی آئی جی صاحب نے طلب کیا تھا۔

"فی الحال میں تمہیں ٹاؤن میں تعینات کرنے کے بجائے اپنے ماتحت رکھنا چاہتا ہوں۔" ڈی آئی جی صاحب نے رسمی گفتگو اور ملازمت کے اسرار و رموز نوآموز افسر کو سمجھانے کے بعد کہنا شروع کیا۔

"یس سر!" زاہد شیروانی نے مستعدی سے تائید کی۔

"یہ لو۔" انہوں نے اے ایس پی کی طرف ایک فائل بڑھائی۔ "ہائی پروفائل کیس ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ طبعی موت ہوئی ہے لیکن رقم غائب ہونے سے واردات کا شبہ ہے۔ اب تک کی تفتیش میں تمام مشتبہ افراد کو شک کے دائرے سے باہر کیا جا چکا ہے۔ کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔ وزیراعلیٰ اور چیمبر آف کامرس کا بھی بہت دباؤ ہے۔ اب وزیر داخلہ خود اس کیس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ کیس خود لے لیا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ "کیس پراپرٹیز درخشاں تھانے کی تحویل میں ہے۔ پلیز...... اس پر کام کرو۔"

"ٹھیک ہے سر!"

"کوشش کرو کہ یہ اونٹ جلد از جلد کسی کروٹ بیٹھے تاکہ میری جان چھوٹے۔" ڈی آئی جی خاصے دباؤ میں لگ رہے تھے۔

"سر! مجھے دو دن دیجیے۔ میں فائل اسٹڈی کر کے تفتیش شروع کرتا ہوں۔" زاہد شیروانی کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

"او کے، اب تم جا سکتے ہو۔"

اس کا پہلا دن تو دفتر کو ٹھیک ٹھاک کرانے میں گزر گیا، شام کو سروسز کلب پہنچا تو ڈنر کے بعد سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رات کے تین بج رہے تھے جب اس نے فائل سائڈ ٹیبل پر رکھی اور لائٹ آف کر کے اس پر غور کرتے کرتے سو گیا۔

تفتیشی فائل میں لگی پوسٹ مارٹم رپورٹ کا کہنا تھا کہ موت کا سبب حرکت قلب بند ہونا تھا۔ اندرونی اعضا کے کیمیائی تجزیے سے بھی کوئی سراغ نہیں ملا تھا ماسوائے کولڈ ڈرنک اور شراب کے۔ لاش کے قریب سے کولڈ ڈرنک کی لگ بھگ نصف خالی بوتل، شراب کی ایک تقریباً بھری بوتل، دو گلاس، آئس باکس اور ایک خالی بریف کیس ملا تھا۔ دونوں گلاسوں کے کیمیائی تجزیے سے بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ کی تصدیق ہوتی تھی۔ ایک گلاس میں الکوحل ملی کولڈ ڈرنک جبکہ دوسرے گلاس میں صرف کولڈ ڈرنک تھی۔ دو چیزیں ایسی تھیں جو موت کو طبعی تسلیم کرنے میں رکاوٹ تھیں۔ ایک تو خالی بریف کیس اور دوسرا کولڈ ڈرنک کا دوسرا گلاس، جس پر صرف دو ہاتھوں کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ ایک مردانہ اور دوسرے زیادہ واضح نشانات کسی عورت کی انگلیوں کے تھے۔ مردانہ نشانات سیٹھ کے فنگر پرنٹس سے میچ کر گئے البتہ یہ اب تک نہیں پتا چل سکا کہ دوسرے فنگر پرنٹس کس کے تھے۔ بریف کیس پر بھی عورت کے فنگر پرنٹس پائے گئے۔ اسے چابی سے کھولا گیا تھا۔ اس لیے زبردستی یا ڈکیتی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تفتیش میں بھی مشتبہ افراد کو پہلے ہی بے قصور قرار دیا جا چکا تھا۔ لاش والے کمرے سے لے کر پورے گھر میں کہیں بھی مزاحمت کے آثار نہیں تھے۔ لے دے کر یہ جاننا باقی تھا کہ زنانہ انگلیوں کے نشانات کس کے ہیں۔ کیس کی یہی ایک کڑی تھی جو اب تک غائب تھی۔ جب تک یہ کڑی نہیں ملتی نہ تو کیس داخلِ دفتر ہو سکتا تھا اور نہ ہی چالان عدالت میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ زاہد شیروانی کو یقین تھا کہ وہ اس لاپتا کڑی کا سراغ لگا لے گا لیکن کس طرح۔ یہ جاننا ابھی باقی تھا۔

دوسرے دن اے ایس پی زاہد شیروانی نے تھانے کا دورہ کیا۔ مال خانے سے کیس پراپرٹیز نکلوا کر کئی گھنٹے تک اس کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اس کیس کے پہلے تفتیشی افسر سے بھی ملا مگر سب کچھ لاحاصل رہا۔ کوئی سراغ ایسا نہ مل سکا، جس پر آگے بڑھا جا سکتا۔ آخر اس نے کیس کی ازسرِنو تفتیش کا فیصلہ کیا۔ وہ نئے سرے سے تفتیش کا رخ متعین کرنا چاہتا تھا۔ اس نے تفتیش کا دائرہ سیٹھ کے اس اکلوتے بیٹے سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا جو واقعے کے دن بیرونِ ملک سے وطن لوٹنے کے لیے ہوائی جہاز میں بیٹھ چکا تھا۔ یہ بینکار کامران احمد تھا۔

☆☆☆

سیٹھ نعمان کے بعد نورین نے طے کیا کہ وہ اب یہ سب کچھ چھوڑ کر اپنی پچھلی زندگی میں لوٹ جائے گی اور صرف نورین بن کر جیے گی۔ اس نے طے کر لیا کہ یہ اس کا آخری شکار تھا۔ اس روز رات کو اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کیا اور سیٹھ کے بریف کیس سے ملنے

والی رقم کو گنا، چالیس لاکھ روپے تھے۔ پھر اس نے اپنی الماری کھولی اور خفیہ خانوں سے وہ رقم نکالی جو وہ اب تک اپنے حسن کے جلوے کی آڑ میں موت کی نیند سلا دیے گئے، ہوس کے مارے مردوں سے لوٹ چکی تھی۔

ساری رقم پینسٹھ لاکھ روپے سے زائد تھی۔ اس رات وہ کافی دیر تک جاگتی رہی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ساٹھ لاکھ روپے بینک کے فکسڈ ڈپازٹ میں رکھے گی۔ پانچ لاکھ روپے اس کی شادی کے لیے کافی ہوں اور بینک سے ملنے والا منافع روزمرہ اخراجات کے لیے کافی رہے گے۔

آخری شکار کو کئی مہینے گزر چکے تھے۔ اسے بینکنگ کے معاملات کا کچھ پتا نہیں تھا تاہم اسے پیسے کا اعتماد تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اتنی بڑی رقم فکسڈ ڈپازٹ کرنے کا سن کر کوئی بھی بینک منیجر اس کے آگے پیچھے پھرے گا۔ وہ سب کچھ کرلے گی۔

دوسرے دن وہ ایک غیر ملکی بینک کی کلفٹن برانچ پہنچی۔ اس نے منیجر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو ایک نوجوان افسر اسے منیجر کے کیبن تک لے گیا۔

''ساٹھ لاکھ روپے......'' برانچ منیجر کامران احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔

''جی ہاں کیش......''

''میں بتاتا ہوں یہ سب کچھ کیسے ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے گھنٹی بجائی۔ ''چائے یا ٹھنڈا۔''

''کولڈ ڈرنک......'' نورین نے اعتماد سے کہا۔

اس برانچ میں کامران احمد کا پہلا دن تھا۔ اسے برانچ کے حالات بہتر بنانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ہیڈ آفس کو شکایت تھی کہ ایک سال ہونے کو آیا، نئے اور بڑے ڈپازٹ نہیں آرہے تھے۔ وہ خوش تھا کہ قدرت نے پہلے ہی دن ایسا کلائنٹ بھیج دیا، جس سے ہیڈ آفس میں اس کی ساکھ دھاک بن کر بیٹھے گی۔ ''آپ رقم لائی ہیں۔''

''جی ہاں......'' نورین نے پلاسٹک کے معمولی شاپنگ بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں رکھے کپڑے کے تھیلے میں رقم موجود تھی۔

''واہ......آپ خاصی عقلمند ہیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس معمولی تھیلے میں اتنی بڑی رقم ہوسکتی ہے۔''

''ہم نے اپنا گھر بیچا ہے۔ رقم بھی کیش میں لی تھی۔ کب تک اتنی بڑی رقم کو گھر میں رکھ سکتی ہوں۔'' نورین نے بات بنائی تاکہ رقم کے حوالے سے اس کے ذہن میں اگر کوئی شک ہے تو وہ باقی نہ رہے۔

''سب ہوگیا، بس آپ دستخط کریں۔'' کامران نے کاغذات اس کی طرف بڑھائے۔ ''ارے ہاں، شناختی کارڈ کی کاپی بھی چاہیے ہوگی۔''

نورین کا بینک اکاؤنٹ کھل چکا تھا۔ رقم فکسڈ ڈپازٹ ہوچکی تھی۔ ''دو دن میں آپ کی چیک بک آجائے گی۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ آجایئے گا۔''

''جی آجاؤں گی۔''

اس کے جانے کے بعد کامران اپنے دیگر امور کی انجام دہی میں مصروف ہوگیا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے ذہن میں بار بار نورین کا چہرہ آرہا تھا۔ دوسرے دن بھی وہ اس کے ہی خیال میں کھویا رہا۔ وہ غیر شدی شدہ تھا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اسے کوئی لڑکی اچھی لگی تھی۔ بات صرف اس کی حد تک نہیں تھی۔

نورین خود بھی کامران احمد کی شائستگی سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ اسے بھی وہ اچھا لگا تھا۔ جب سے سیٹھ نعمان کے بعد اس نے اپنی زندگی کا چلن بدلا تھا، تب سے وہ نہایت سنجیدگی سے شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے کامران پسند آیا تھا لیکن اس نے یہ خیال زبردستی اپنے ذہن سے دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شکل وصورت ...اور رکھ رکھاؤ سے تو وہ کسی اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شادی شدہ بھی ہو۔

دو دن بعد جب نورین چیک بک لینے بینک گئی تو وہ سیدھے کامران کے کیبن میں گئی۔ اسے لگا کہ جیسے وہ اس کا ہی منتظر تھا۔ اس نے اسے بہت عزت سے ریسیو کیا۔ چائے منگوائی۔ اسی دوران میں چیک بک دی۔

باتوں ہی باتوں میں وہ نورین سے اس کے بارے میں تقریباً سب کچھ معلوم کرچکا تھا۔ وہ اس کی باتوں میں پوشیدہ مقصد کو سمجھ رہی تھی لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہی۔

''کیا آپ کی امی سے ملاقات ہوسکتی ہے؟''

نورین کے لیے یہ سوال غیر متوقع نہ تھا۔ وہ اسی کی امید کررہی تھی لیکن پھر بھی انجان بنی رہی اور ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتی ہے، جب آپ کہیں وہ مل سکتی ہیں۔'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا اور پھر پوچھا۔ ''کیا کوئی بینک کا مسئلہ ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو آپ جب کہیں میں انہیں لے آؤں گی۔''

کامران یہ سن کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ ''بینک کا تو کوئی کام نہیں مگر......''

''تو......'' نورین نے بظاہر حیرانی سے پوچھا۔ ''پھر کس لیے ملنا چاہتے ہیں آپ اُن سے۔''

''آپ کی وجہ سے۔''

''کیوں، کیا ہوا؟''

''آپ کا ہاتھ مانگنا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر نورین نے بظاہر شرمانے کی اداکاری کی۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید اس کی زندگی کی آزمائشیں مکمل ہوچکیں۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ تصور میں خود کو دلہن بنا دیکھ رہی تھی۔

''آپ خاموش کیوں ہیں، کوئی جواب نہیں دیا۔''

''لیکن......'' نورین نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس کی زبان نے الفاظ کا ساتھ نہ دیا۔

''آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں کھل کر کہیں۔'' کامران احمد لمحہ بھر کے لیے اس کے لہجے سے پریشان ہوگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ پہلے سے ہی کسی کے پیار میں تو مبتلا نہیں۔

''بات یہ ہے کہ ہم شریف اور غریب لوگ ہیں۔''

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اللہ نے منہ میں سونے کا چمچہ دے کر پیدا کیا ہے لیکن پھر بھی ملازمت کو ترجیح دی۔''

''مگر آپ کے والدین......''

''دونوں اس دنیا میں نہیں رہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ افسردہ ہوگیا۔

''افسوس ہوا یہ سن کر......''

''کوئی بات نہیں۔ سب اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے اور یہی بہتر ہوتا ہے۔'' کامران نے یہ کہہ کر چند لمحے توقف کیا۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

''کیا......''

''اگر میں آپ کی امی سے آپ کا ہاتھ مانگوں تو......'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری رہنے دی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں اور شاید امی کو بھی نہیں ہوگا لیکن......'' نورین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیا......''

''ہم ایک دوسرے کو جانتے ہی کہاں ہیں۔''

''اوہ......'' یہ کہہ کر کامران نے گہری سانس لی۔ ''چلیے، ملتے رہتے ہیں، جان بھی جائیں گے ایک دوسرے کو۔''

نورین ہنس دی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

اگلے چند ہفتوں کے دوران وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے لیکن اب تک نہ تو کامران اس کی ماں سے ملا تھا اور نہ ہی نورین نے اس کا گھر دیکھا تھا۔

اس دن نورین اپنے فکسڈ ڈپازٹ کا پہلا منافع لینے بینک آئی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں کامران نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ وہ چاہتا تھا کہ نورین پہلے خود اس کا گھر بار دیکھ لے تاکہ اپنی ماں کو مطمئن کرسکے۔ وہ فوراً راضی ہوگئی۔ طے ہوا کہ دوسرے دن بینک کا ہاف ڈے ہے۔ وہ ایک بجے آئے گی اور پھر وہ اسے اپنا گھر دکھانے لے جائے گا۔ وہیں دونوں لنچ بھی کرلیں گے۔

☆☆☆

اے ایس پی زاہد شیروانی تن دہی سے سیٹھ نعمان کی موت کا عقدہ حل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اس دوران وہ کئی بار بینک جا کر ان کے بیٹے سے بھی ملاقات کرچکا تھا لیکن اب تک ایسا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا کہ جس سے مبینہ قاتل تک پہنچا جاتا یا بریف کیس سے رقم غائب ہونے کا راز کھل پاتا۔ ڈی آئی جی صاحب بھی کئی بار پوچھ چکے تھے۔ وہ خود سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ آخر اس نے ایک بار پھر جائے وقوع دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

زاہد شیروانی نے بینک فون کیا۔ وہاں موجود عملے نے بتایا کہ ہاف ڈے کے باعث منیجر صاحب گھر جاچکے ہیں۔ اس نے گھر فون ملایا لیکن وہ انگیج تھا۔ اس نے مزید ٹرائی کرنے کے بجائے اس سے گھر پر ہی ملنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی اسے گھر ہی دیکھنے جانا تھا۔

جب زاہد شیروانی، سیٹھ نعمان کے گھر پہنچا تو وہ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں نورین کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نوکر نے آنے کی اطلاع دی تو اس نے اسے وہیں بلوالیا۔

''السلام علیکم......''

''وعلیکم السلام......'' کامران نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

وہ اس وقت پولیس یونیفارم کے بجائے جینز ٹی شرٹ میں تھا۔ نورین نے بھی اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

وہ وہیں بیٹھ گئے۔ نورین خاموشی سے کولڈ ڈرنک پیتی رہی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی محسوس ہورہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اچانک کسی پریشانی میں مبتلا ہوگئی ہو۔ اس وقت وہ یہ بھی بھول چکی تھی کہ کمرے میں اس کے سوا دو اور بھی دو افراد بیٹھے ہیں۔ زیادہ سوچ و بچار سے اس کا دل گھبرانے لگا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کمرے میں گھٹن ہورہی ہے۔ اس نے جلدی سے گلاس خالی کرکے سینٹر ٹیبل پر رکھا اور کھڑی

دار تھے لیکن سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ برسوں ہو چکے تھے، کسی نے ان کے در پر قدم نہیں رکھا تھا کہ کہیں کچھ دینا نہ پڑ جائے۔

آخر لاچار ہو کر نورین نے ایک دن جانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اب اسے صرف اور صرف دولت کمانا تھی۔ اس نے بند دروازے پر دستک دی تو آنٹی رضیہ نے دروازہ کھولا۔ نورین کو دیکھ کر ہنسی۔ ”آخر تم نے حقیقت کو تسلیم کر ہی لیا۔“ وہ دروازے سے ایک طرف ہوتے ہوئے بولیں۔

نورین سر جھکائے گھر میں داخل ہوئی۔

”دولت کمانے کی دنیا میں خوش آمدید نوری۔“

نورین نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

”آج سے یہی تمہارا نام ہے۔“ آنٹی نے ہنس کر کہا۔

نورین اب نوری بن چکی تھی۔

زندگی کی گردش انسان کو کب کہاں لا کر کھڑا کر دے، یہ اوپر والا جانے یا اس کی کتابِ تقدیر مگر ایک بات طے ہے۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں، انسان بہت جلد ان سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ یہی بات نورین سے نوری بن جانے والی مجبور لڑکی پر بھی صادق آئی تھی۔

شروع شروع میں تو وہ احساسِ ندامت کے باعث کئی بار موت کو گلے لگانے کا سوچتی رہی لیکن ہر بار ماں کا چہرہ اسے سسک سسک کر زندہ رہنے پر مجبور کرتا رہا۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ پیسے کی قلت دور ہو گئی، گھر میں خوشحالی کا راج شروع ہو گیا، ندامت بھی کچھ کم ہو گئی، البتہ گناہ کے احساس کی ایک خلش رہ رہ کر ضرور سر اٹھاتی رہتی تھی مگر پیسے کے بوجھ اور پیٹ کی آنچ کے آگے اس کی شدت کا احساس ہمیشہ ماند پڑتا رہا۔ نورین نے نوری کی زندگی کو پوری طرح قبول کر لیا تھا۔ ماں، بیٹی کے بیٹا بن کر سہارا دیے جانے پر بہت خوش تھی۔ وہ جو کچھ جانتی تھی، بس اتنا تھا کہ بیٹی ایک فیکٹری میں سپروائزر ہے اور دوپہر سے شروع ہو کر رات گئے ختم ہونے والی شفٹ میں کام کرتی ہے۔ کبھی کبھی پوری پوری رات اوور ٹائم بھی لگتا ہے۔ بیٹی جسے تنخواہ کہتی تھی، ماں لاعلم رہی کہ وہ تن کی آمدن تھی۔

ایک دن وہ حسبِ معمول رضیہ آنٹی کے گھر پہنچی تو یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ انہیں پورے جسم پر لقوہ مار گیا ہے۔ وہ جیتے جی مردہ بن چکی تھیں۔ کچھ ہی دن کے اندر اندر ایک ایک کر کے وہاں آنے والیاں کسی اور آنٹی کی چھپر چھاؤں تلے چلی گئیں مگر گناہ کی دلدل میں دھنسنے کے باوجود نورین کا دل اب تک روشن تھا۔ اس نے آنٹی کو بے یار و مددگار نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال کی اس زندگی میں وہ دھندے کے بہت سے گر جان چکی تھی۔ اب اس نے آزاد رہ کر کام کرنے کی ٹھانی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی طرح جلد از جلد وہ بہت سارا پیسہ کما کر اس زندگی کا چلن چھوڑ دے گی اور کوئی شریف انسان دیکھ کر گھر بسا لے گی۔

کچھ دن بعد اسے ایک اور خیال دل میں آیا۔ وہ اپنی گناہ کی زندگی سے تو متنفر ہو چکی تھی لیکن یہ ضرور سمجھتی کہ اس کی ذمے دار وہ نہیں بلکہ عبدالقادر جیسے لوگ ہیں۔ اگر سیٹھ اس دن وہ حرکت نہ کرتا تو شاید اس کی زندگی کا چلن کچھ اور ہوتا۔ پھر اسے ایک نیا آئیڈیا سوجھا۔ بہت جلد اس نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ جلد ہی اس نے اپنے تن کو رسوا کیے بغیر کافی پیسہ اکٹھا کر لیا۔ اس کے انتقام کی آگ بھی سرد ہونے لگی تھی۔ اب اسے کافی سرشاری حاصل تھی۔ وہ اپنے کام کو دھندے کے بجائے مشن سمجھنے لگی تھی۔

اسی دوران تین تلوار پر اسے سیٹھ نعمان چائے والا ٹکرایا۔ یہی وہ شخص تھا جس کی ایک حرکت نے نورین کو نوری بنا دیا تھا لیکن اسے تقدیر کہیے کہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے بظاہر اجنبی تھے۔ اس دن وہ سیٹھ کے گھر سے نکلی تو اس کے بیگ میں سیٹھ کے چالیس لاکھ روپے تھے۔ سیٹھ بھی انجام کو پہنچا اور اس کی بھی جھولی بھر گئی۔ سیٹھ نے یہ رقم سہ پہر کو ہی بینک سے نکلوائی تھی۔

نورین نے کبھی کسی واردات میں کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا لیکن اس دن اس سے ایک ہلکی سی چوک ہو گئی۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر وہ سچ مچ حواس کھو بیٹھی تھی۔ اپنا کام پورا کر کے جلد از جلد نکلنے کے چکر میں وہ ایک معمولی سی غلطی کر گئی۔ اب تک وہ سیٹھ جیسے درجنوں شکار کر چکی تھی لیکن یہاں ایک بات غیر معمولی تھی۔ سیٹھ بہت نام والا اور بارسوخ تھا۔ دوسرا یہ کہ اس کے پاس موجود بھاری رقم بھی غائب تھی۔ اسی لیے پولیس اس کیس کو فطری موت قرار دے کر داخلِ دفتر کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔ اوپر سے بڑے لوگوں کا دباؤ تھا کہ تفتیش کو ہر حال میں انجام تک پہنچنا چاہیے۔ سیٹھ کی موت کو چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اخبارات میں پولیس تفتیش کے حوالے سے کبھی کبھار کوئی نہ کوئی خبر آتی رہتی تھی مگر پولیس اب بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔

☆☆☆

اے ایس پی زاہد شیروانی کی پہلی پوسٹنگ ہوتا تھی۔ ڈی آئی جی صاحب نے اسے پوسٹنگ کے لیے پولیس ہیڈ

کوارٹر بلایا تھا۔ سی ایس ایس میں نمایاں پوزیشن لے کر کامیاب ہونے والے زاہد شیروانی نے پولیس کا محکمہ منتخب کیا تھا۔ اسے بچپن سے ہی کھوج لگانے کا بہت شوق تھا۔ بچپن میں چور سپاہی اس کا پسندیدہ کھیل تھا۔ وہ ہمیشہ اس کھیل میں سپاہی بنتا تھا۔ اکیڈمی سے تربیت مکمل کرنے کے بعد اس کی خدمات سندھ پولیس کے حوالے کی گئی تھیں۔ اسی سلسلے میں ہی اسے ڈی آئی جی صاحب نے طلب کیا تھا۔

''فی الحال میں تمہیں ٹاؤن میں تعینات کرنے کے بجائے اپنے ماتحت رکھنا چاہتا ہوں۔'' ڈی آئی جی صاحب نے رسمی گفتگو اور ملازمت کے اسرار و رموز نو آموز افسر کو سمجھانے کے بعد کہنا شروع کیا۔

''یس سر!'' زاہد شیروانی نے مستعدی سے تائید کی۔

''یہ لو۔'' انہوں نے اے ایس پی کی طرف ایک فائل بڑھائی۔ ''ہائی پروفائل کیس ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ طبعی موت ہوئی ہے لیکن رقم غائب ہونے سے واردات کا شبہ ہے۔ اب تک کی تفتیش میں تمام مشتبہ افراد کو شک کے دائرے سے باہر کیا جا چکا ہے۔ کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔ وزیر اعلیٰ اور چیمبر آف کامرس کا بھی بہت دباؤ ہے۔ اب وزیر داخلہ خود اس کیس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ کیس خود لے لیا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ ''کیس پراپرٹیز درخشاں تھانے کی تحویل میں ہے۔ پلیز...... اس پر کام کرو۔''

''ٹھیک ہے سر!''

''کوشش کرو کہ یہ اونٹ جلد از جلد کسی کروٹ بیٹھے تاکہ میری جان چھوٹے۔'' ڈی آئی جی خاصے دباؤ میں لگ رہے تھے۔

''سر! مجھے دو دن دیجیے۔ میں فائل اسٹڈی کر کے تفتیش شروع کرتا ہوں۔'' زاہد شیروانی کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

''او کے، اب تم جا سکتے ہو۔''

اس کا پہلا دن تو دفتر کو ٹھیک ٹھاک کرانے میں گزر گیا، شام کو سروسز کلب پہنچا تو ڈنر کے بعد سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رات کے تین بج رہے تھے جب اس نے فائل سائڈ ٹیبل پر رکھی اور لائٹ آف کر کے اس پر غور کرتے کرتے سو گیا۔

تفتیشی فائل میں لگی پوسٹ مارٹم رپورٹ کا کہنا تھا کہ موت کا سبب حرکت قلب بند ہونا تھا۔ اندرونی اعضا کے کیمیائی تجزیے سے بھی کوئی سراغ نہیں ملا تھا ماسوائے کولڈ ڈرنک اور شراب کے۔ لاش کے قریب سے کولڈ ڈرنک کی لگ بھگ نصف خالی بوتل، شراب کی ایک تقریباً بھری بوتل، دو گلاس، آئس باکس اور ایک خالی بریف کیس ملا تھا۔ دونوں گلاسوں کے کیمیائی تجزیے سے بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ کی تصدیق ہوتی تھی۔ ایک گلاس میں الکوحل ملی کولڈ ڈرنک جبکہ دوسرے گلاس میں صرف کولڈ ڈرنک تھی۔ دو چیزیں ایسی تھیں جو موت کو طبعی تسلیم کرنے میں رکاوٹ تھیں۔ ایک تو خالی بریف کیس اور دوسرا کولڈ ڈرنک کا دوسرا گلاس، جس پر صرف دو ہاتھوں کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ ایک مردانہ اور دوسرے زیادہ واضح نشانات کسی عورت کی انگلیوں کے تھے۔ مردانہ نشانات سیٹھ کے فنگر پرنٹس سے میچ کر گئے البتہ یہ اب تک نہیں پتا چل سکا کہ دوسرے فنگر پرنٹس کس کے تھے۔ بریف کیس پر بھی عورت کے فنگر پرنٹس پائے گئے۔ اسے چابی سے کھولا گیا تھا۔ اس لیے زبردستی یا ڈکیتی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تفتیش میں بھی مشتبہ افراد کو پہلے ہی بے قصور قرار دیا جا چکا تھا۔ لاش والے کمرے سے لے کر پورے گھر میں کہیں بھی مزاحمت کے آثار نہیں تھے۔ لے دے کر یہ جاننا باقی تھا کہ زنانہ انگلیوں کے نشانات کس کے ہیں۔ کیس کی یہی ایک کڑی تھی جو اب تک غائب تھی۔ جب تک یہ کڑی نہیں ملتی نہ تو کیس داخل دفتر ہو سکتا تھا اور نہ ہی چالان عدالت میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ زاہد شیروانی کو یقین تھا کہ وہ اس لاپتا کڑی کا سراغ لگا لے گا لیکن کس طرح۔ یہ جاننا ابھی باقی تھا۔

دوسرے دن اے ایس پی زاہد شیروانی نے تھانے کا دورہ کیا۔ مال خانے سے کیس پراپرٹیز نکلوا کر کئی گھنٹے تک اس کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اس کیس کے پہلے تفتیشی افسر سے بھی ملا مگر سب کچھ لاحاصل رہا۔ کوئی سراغ ایسا نہ مل سکا، جس پر آگے بڑھا جا سکتا۔ آخر اس نے کیس کی ازسرِنو تفتیش کا فیصلہ کیا۔ وہ نئے سرے سے تفتیش کا رخ متعین کرنا چاہتا تھا۔ اس نے تفتیش کا دائرہ سیٹھ کے اس اکلوتے بیٹے سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا جو واقعے کے دن بیرونِ ملک سے وطن لوٹنے کے لیے ہوائی جہاز میں بیٹھ چکا تھا۔ یہ بینکار کامران احمد تھا۔

☆☆☆

سیٹھ نعمان کے بعد نورین نے طے کیا کہ وہ اب یہ سب کچھ چھوڑ کر اپنی پچھلی زندگی میں لوٹ جائے گی اور صرف نورین بن کر جیے گی۔ اس نے طے کر لیا کہ یہ اس کا آخری شکار تھا۔ اس روز رات کو اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کیا اور سیٹھ کے بریف کیس سے ملنے

والی رقم کو گنا، چالیس لاکھ روپے تھے۔ پھر اس نے اپنی الماری کھولی اور خفیہ خانوں سے وہ رقم نکالی جو وہ اب تک اپنے حسن کے جلوے کی آڑ میں موت کی نیند سلا دیے گئے، ہوس کے مارے مردوں سے لوٹ چکی تھی۔

ساری رقم پینسٹھ لاکھ روپے سے زائد تھی۔ اس رات وہ کافی دیر تک جاگتی رہی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ساٹھ لاکھ روپے بینک کے فکسڈ ڈپازٹ میں رکھے گی۔ پانچ لاکھ روپے اس کی شادی کے لیے کافی ہوں اور بینک سے ملنے والا منافع روزمرہ اخراجات کے لیے کافی رہے گے۔

آخری شکار کو کئی مہینے گزر چکے تھے۔ اسے بینکنگ کے معاملات کا کچھ پتا نہیں تھا تاہم اسے پیسے کا اعتماد تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اتنی بڑی رقم فکسڈ ڈپازٹ کرنے کا سن کر کوئی بھی بینک منیجر اس کے آگے پیچھے پھرے گا۔ وہ سب کچھ کرلے گی۔

دوسرے دن وہ ایک غیر ملکی بینک کی کلفٹن برانچ پہنچی۔ اس نے منیجر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو ایک نوجوان افسر اسے منیجر کے کیبن تک لے گیا۔

''ساٹھ لاکھ روپے.....'' برانچ منیجر کامران احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔

''جی ہاں کیش......''

''میں بتاتا ہوں یہ سب کچھ کیسے ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے گھنٹی بجائی۔ ''چائے یا ٹھنڈا۔''

''کولڈ ڈرنک......'' نورین نے اعتماد سے کہا۔

اس برانچ میں کامران احمد کا پہلا دن تھا۔ اسے برانچ کے حالات بہتر بنانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ہیڈ آفس کو شکایت تھی کہ ایک سال ہونے کو آیا، نئے اور بڑے ڈپازٹ نہیں آرہے تھے۔ وہ خوش تھا کہ قدرت نے پہلے ہی دن ایسا کلائنٹ بھیج دیا، جس سے ہیڈ آفس میں اس کی ساکھ دھاک بن کر بیٹھے گی۔ ''آپ رقم لائی ہیں۔''

''جی ہاں......'' نورین نے پلاسٹک کے معمولی شاپنگ بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں رکھے کپڑے کے تھیلے میں رقم موجود تھی۔

''واہ......آپ خاصی عقلمند ہیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس معمولی تھیلے میں اتنی بڑی رقم ہوسکتی ہے۔''

''ہم نے اپنا گھر بیچا ہے۔ رقم بھی کیش میں لی تھی۔ کب تک اتنی بڑی رقم کو گھر میں رکھ سکتی ہوں۔'' نورین نے بات بنائی تا کہ رقم کے حوالے سے اس کے ذہن میں اگر کوئی شک ہے تو وہ باقی نہ رہے۔

''سب ہوگیا، بس آپ دستخط کریں۔'' کامران نے کاغذات اس کی طرف بڑھائے۔ ''ارے ہاں، شناختی کارڈ کی کاپی بھی چاہیے ہوگی۔''

نورین کا بینک اکاؤنٹ کھل چکا تھا۔ رقم فکسڈ ڈپازٹ ہوچکی تھی۔ ''دو دن میں آپ کی چیک بک آجائے گی۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ آجائیے گا۔''

''جی آجاؤں گی۔''

اس کے جانے کے بعد کامران اپنے دیگر امور کی انجام دہی میں مصروف ہوگیا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے ذہن میں بار بار نورین کا چہرہ آرہا تھا۔ دوسرے دن بھی وہ اس کے ہی خیال میں کھویا رہا۔ وہ غیر شدی شدہ تھا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اسے کوئی لڑکی اچھی لگی تھی۔ بات صرف اس کی حد تک نہیں تھی۔

نورین خود بھی کامران احمد کی شائستگی سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ اسے بھی وہ اچھا لگا تھا۔ جب سے سیٹھ نعمان کے بعد اس نے اپنی زندگی کا چلن بدلا تھا، تب سے وہ نہایت سنجیدگی سے شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے کامران پسند آیا تھا لیکن اس نے یہ خیال زبردستی اپنے ذہن سے دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شکل وصورت ...اور رکھ رکھاؤ سے تو وہ کسی اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شادی شدہ بھی ہو۔

دو دن بعد جب نورین چیک بک لینے بینک گئی تو وہ سیدھے کامران کے کیبن میں گئی۔ اسے لگا کہ جیسے وہ اس کا ہی منتظر تھا۔ اس نے اسے بہت عزت سے ریسیو کیا۔ چائے منگوائی۔ اسی دوران میں چیک بک دی۔

باتوں ہی باتوں میں وہ نورین سے اس کے بارے میں تقریباً سب کچھ معلوم کرچکا تھا۔ وہ اس کی باتوں میں پوشیدہ مقصد کو سمجھ رہی تھی لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہی۔

''کیا آپ کی امی سے ملاقات ہوسکتی ہے؟''

نورین کے لیے یہ سوال غیر متوقع نہ تھا۔ وہ اسی کی امید کررہی تھی لیکن پھر بھی انجان بنی رہی اور ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتی ہے، جب آپ کہیں وہ مل سکتی ہیں۔'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا اور پھر پوچھا۔ ''کیا کوئی بینک کا مسئلہ ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو آپ جب کہیں میں انہیں لے آؤں گی۔''

کامران یہ سن کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ ''بینک کا تو کوئی کام نہیں مگر......''

''تو......'' نورین نے بظاہر حیرانی سے پوچھا۔ ''پھر کس لیے ملنا چاہتے ہیں آپ ان سے۔''

"آپ کی وجہ سے۔"

"کیوں، کیا ہوا؟"

"آپ کا ہاتھ مانگنا چاہتا ہوں۔"

یہ سن کر نورین نے بظاہر شرمانے کی اداکاری کی۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید اس کی زندگی کی آزمائشیں مکمل ہو چکیں۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ تصور میں خود کو دلہن بنا دیکھ رہی تھی۔

"آپ خاموش کیوں ہیں، کوئی جواب نہیں دیا۔"

"لیکن ......" نورین نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس کی زبان نے الفاظ کا ساتھ نہ دیا۔

"آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں کھل کر کہیں۔" کامران احمد لمحہ بھر کے لیے اس کے لہجے سے پریشان ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ پہلے سے ہی کسی کے پیار میں تو مبتلا نہیں۔

"بات یہ ہے کہ ہم شریف اور غریب لوگ ہیں۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اللہ نے منہ میں سونے کا چمچہ دے کر پیدا کیا ہے لیکن پھر بھی ملازمت کو ترجیح دی۔"

"مگر آپ کے والدین......"

"دونوں اس دنیا میں نہیں رہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ افسردہ ہو گیا۔

"افسوس ہوا یہ سن کر......"

"کوئی بات نہیں۔ سب اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے اور یہی بہتر ہوتا ہے۔" کامران نے یہ کہہ کر چند لمحے توقف کیا۔ "آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

"کیا......"

"اگر میں آپ کی امی سے آپ کا ہاتھ مانگوں تو......" اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری رہنے دی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں اور شاید امی کو بھی نہیں ہو گا لیکن......" نورین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیا......"

"ہم ایک دوسرے کو جانتے ہی کہاں ہیں۔"

"اوہ......" یہ کہہ کر کامران نے گہری سانس لی۔ "چلیے، ملتے رہتے ہیں، جان بھی جائیں گے ایک دوسرے کو۔"

نورین ہنس دی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

اگلے چند ہفتوں کے دوران وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے تھے لیکن اب تک نہ تو کامران اس کی ماں سے ملا تھا اور نہ ہی نورین نے اس کا گھر دیکھا تھا۔

اس دن نورین اپنے فکسڈ ڈپازٹ کا پہلا منافع لینے بینک آئی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں کامران نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ وہ چاہتا تھا کہ نورین پہلے خود اس کا گھر بار دیکھ لے تاکہ اپنی ماں کو مطمئن کر سکے۔ وہ فوراً راضی ہو گئی۔ طے ہوا کہ دوسرے دن بینک کا ہاف ڈے ہے۔ وہ ایک بجے آئے گی اور پھر وہ اسے اپنا گھر دکھانے لے جائے گا۔ وہیں دونوں لنچ بھی کر لیں گے۔

☆☆☆

اے ایس پی زاہد شیروانی تن دہی سے سیٹھ نعمان کی موت کا عقدہ حل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اس دوران وہ کئی بار بینک جا کر ان کے بیٹے سے بھی ملاقات کر چکا تھا لیکن اب تک ایسا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا کہ جس سے مبینہ قاتل تک پہنچا جاتا یا بریف کیس سے رقم غائب ہونے کا راز کھل پاتا۔ ڈی آئی جی صاحب بھی کئی بار پوچھ چکے تھے۔ وہ خود سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ آخر اس نے ایک بار پھر جائے وقوع دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

زاہد شیروانی نے بینک فون کیا۔ وہاں موجود عملے نے بتایا کہ ہاف ڈے کے باعث منیجر صاحب گھر جا چکے ہیں۔ اس نے گھر فون ملایا لیکن وہ انگیج تھا۔ اس نے مزید ٹرائی کرنے کے بجائے اس سے گھر پر ہی ملنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی اسے گھر ہی دیکھنے جانا تھا۔

جب زاہد شیروانی، سیٹھ نعمان کے گھر پہنچا تو وہ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں نورین کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نوکر نے آنے کی اطلاع دی تو اس نے اسے وہیں بلوا لیا۔

"السلام علیکم......"

"وعلیکم السلام......" کامران نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

وہ اس وقت پولیس یونیفارم کے بجائے جینز ٹی شرٹ میں تھا۔ نورین نے بھی اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

وہ وہیں بیٹھ گئے۔ نورین خاموشی سے کولڈ ڈرنک پیتی رہی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اچانک کسی پریشانی میں مبتلا ہو گئی ہو۔ اس وقت وہ یہ بھی بھول چکی تھی کہ کمرے میں اس کے سوا اور بھی دو افراد بیٹھے ہیں۔ زیادہ سوچ و بچار سے اس کا دل گھبرانے لگا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کمرے میں گھٹن ہو رہی ہے۔ اس نے جلدی سے گلاس خالی کر کے سینٹر ٹیبل پر رکھا اور کھڑی

ہوگئی۔

”کیا ہوا......“ کامران احمد نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”بس میں اب چلتی ہوں۔“

”ٹھہرو...... میں چھوڑ آتا ہوں بس ذرا......“

”نہیں نہیں، آپ ان سے بات کریں، میں ٹیکسی لے لوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

”ایک منٹ رکو، ڈرائیور سے کہتا ہوں، تمہیں چھوڑ آتا ہے۔“ کامران اس کے پیچھے لپکا۔

زاہد شیروانی یہ تو نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی کون ہے اور اس کا کامران سے کیا تعلق ہے، نہ ہی کامران نے خود اس کا تعارف کرایا تھا لیکن ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اتنا اندازہ ضرور ہوگیا تھا کہ وہ رشتے دار نہیں البتہ ان کے درمیان قریبی تعلق ضرور ہے۔ اچانک اس کی نظر سامنے سینٹر ٹیبل پر پڑی۔ وہاں کولڈ ڈرنک کا خالی گلاس رکھا تھا۔ یہ وہی گلاس تھا جو کچھ دیر پہلے نورین کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھا۔ رومال سے پکڑ کر گلاس اٹھایا اور اپنے ہینڈ بیگ سے ایک پلاسٹک کی تھیلی نکال کر اس میں پیک کر کے بیگ میں رکھ لیا۔

کچھ دیر بعد کامران کمرے میں لوٹا۔ چہرے سے کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ زاہد نے بھی اس کی پریشانی بھانپ لی تھی لیکن کچھ بولا نہیں۔ ”سوری......“

”ارے کوئی بات نہیں۔“ زاہد نے خوش دلی سے کہا۔

”دراصل میں وہ کمرا دیکھنا چاہتا تھا۔“

”اوہ......“ ایک دم کامران کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوگئے۔ ”وہ تو کمرا تب سے لاک ہے، میری تو ہمت ہی نہیں ہوتی اس کے اندر جانے کی۔ میں نوکر سے کہتا ہوں، وہ آپ کو لے چلتا ہے۔“

”کوئی بات نہیں، میں آپ کے جذبات سمجھ سکتا ہوں۔“

کچھ دیر بعد زاہد شیروانی نوکر کی معیت میں کمرے کا معائنہ کرتا رہا مگر بظاہر اسے کوئی کام کی بات پتا نہ چل سکی۔ لوٹتے ہوئے اسے وہ گلاس یاد آگیا۔ اسے اپنی حرکت پر ندامت محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اس کیس سے اتنا اکتا گیا تھا کہ اب چاہتا تھا کسی طرح اس کا انجام ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بنا سوچے سمجھے یونہی وہ گلاس اٹھا لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جائے وقوع سے ملنے والے زنانہ فنگر پرنٹس کا راز حل ہوئے بغیر یہ معاملہ ختم نہیں ہوگا۔ اس نے گلاس تو اٹھا لیا تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ یقیناً اس پر وہ فنگر پرنٹس نہیں ہوں گے جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ کتابوں میں پڑھ چکا تھا کہ جب تدبیر کے راستے بند ہو جائیں تو تقدیر اتفاقات کے ذریعے راستے بناتی ہے۔ اس کیس میں بھی اب اسے قدرت سے اتفاقات کی ہی امید تھی ورنہ سرتوڑ کوشش کے باوجود کوئی سرا پکڑ میں ہی نہیں آرہا تھا۔ دوسرے دن اس نے دفتر پہنچتے ہی نورین والا گلاس پولیس کی فنگر پرنٹس لیبارٹری بھجوا دیا۔

اگلے روز زاہد شیروانی نے طبیعت کی خرابی کے باعث چھٹی کی اور جب وہ تیسرے روز دفتر پہنچا تو رپورٹ آچکی تھی۔ رپورٹ پڑھتے ہی اس نے تفتیشی فائل کھولی اور اسے پڑھنے لگا۔ رپورٹ کے مطابق فنگر پرنٹس میچ کر گئے تھے۔ وہ سخت حیران تھا۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ سیٹھ کا قاتل خود اس کے بیٹے کے ساتھ ہے۔ اسے نورین کے ساتھ ساتھ کامران احمد پر بھی شک ہو رہا تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آیا اس میں وہ لڑکی تنہا ملوث تھی یا کامران بھی شریکِ جرم تھا۔ اسے اب زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ کیس کی گمشدہ کڑی مل چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب چٹکی بجاتے ہی یہ راز کھل سکتا ہے۔ وہ فوراً ڈی آئی جی صاحب سے ملا۔ وہ کیس حل ہونے پر تو بہت خوش تھے لیکن کامران پہ زاہد شیروانی کے شک سے ان کے ماتھے پر بھی شکنیں پڑ گئی تھیں۔ وہ خود بھی ایک جوان اور اکلوتے بیٹے کے باپ تھے، ایسے میں کامران پر شک سے بطور انسان ان کا افسردہ ہونا فطری امر تھا۔

☆☆☆

اس دن گھر پر لنچ کے بعد آج پہلی بار نورین کامران کے بڑے اصرار پر اس سے ملنے بینک پہنچی تھی۔ کامران کافی پریشان تھا۔ وہ بہت اکھڑے اکھڑے لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔ اسے کچھ نہیں آرہا تھا کہ اس دن اس سے ایسی کون سی غلطی ہوئی تھی، جس پر وہ اتنی ناراض ہے۔ ”اگر کوئی بات ہوئی ہے تو صاف صاف کہہ دو۔ دل میں رکھنے سے تو صرف غلط فہمیاں ہی بڑھتی ہیں۔“ کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے دوبارہ بات شروع کی۔

”ضروری نہیں ہے کہ ہر بات کہی جائے اور یہ بھی لازم نہیں کہ میں ہر بات تم سے کہوں۔ آخر ہمارا رشتہ ہی کیا ہے۔“

”میں سمجھ نہیں پا رہا کہ یہ خفگی کس لیے ہے۔“ کامران نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”خیر......“ نورین نے بے رخی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا اس بینک میں اکاؤنٹ ہے۔ آنا جانا تو رہے گا۔ بہتر ہے کہ ہمارے درمیان صرف اچھے تعلقات

رہیں۔ ویسے ہی جیسے بینک منیجر اور ایک اکاؤنٹ ہولڈر کے ہوتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر اس کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے بولی ''صرف پروفیشنل ریلیشنز۔''

''کیا......'' کامران حیرت زدہ تھا۔ ''یہ تم کہہ رہی ہو؟''

نورین نے کوئی جواب نہیں اور اپنا پرس تھام کر اٹھنے ہی والی تھی کہ اے ایس پی زاہد شیروانی سلام کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت وہ وردی میں تھا۔ ''معافی چاہتا ہوں، بنا اجازت اندر آ گیا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ان دونوں کی طرف باری باری دیکھ کر کہا۔ ''کہیں مخل تو نہیں ہوا آپ لوگوں کے بیچ......'' وہ ذومعنی لہجے میں دونوں سے مخاطب تھا۔

''نہیں نہیں، بالکل بھی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' کامران اس کی بات سن کر جھینپ گیا اور اٹکتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''اچھا......'' یہ کہتے ہوئے زاہد شیروانی نے ایک گہری نظر نورین پر ڈالی اور پھر کامران کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو ابھی، اسی وقت میرے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا۔''

''ابھی......'' کامران کے چہرے پر حیرانی تھی۔

زاہد شیروانی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''جی ابھی، اسی وقت، میرے ساتھ......''

نورین چند لمحے تک خاموش کھڑی ان کی باتیں سنتی رہی۔ جب اس نے چلنے کا سنا تو دروازے کی طرف بڑھی۔

''میں چلتی ہوں مسٹر کامران......''

''ارے ارے...... رکیے تو۔'' یہ سنتے ہی زاہد تیزی سے پلٹا۔ ''آپ کہاں جا رہی ہیں محترمہ۔ آپ کو بھی چلنا ہے۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔''

''میں......'' نورین چونک کر بولی۔ ''میرا کیا کام۔ میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ دروازے کی طرف لپکی۔ وہ گھبرا گئی تھی۔

''آپ کہیں نہیں جا سکتی ہیں۔'' وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا اور رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا۔

کامران کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ باپ کے قتل کیس میں پولیس اسے بلا سکتی ہے، ملنے آ سکتی ہے لیکن وہ یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اے ایس پی نورین کو ساتھ چلنے پر کیوں بضد تھا۔ ''دیکھیے آفیسر...... ان کا اس سے کیا تعلق۔ آپ انہیں کیوں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ میں چل رہا ہوں نا آپ کے ساتھ۔''

''آپ دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ خاموشی سے میرے ساتھ چلیں۔ دوستانہ انداز میں باہر نکل کر میری گاڑی میں بیٹھیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بدمزگی ہو ورنہ باہر ایک گاڑی میں سادہ لباس اہلکار موجود ہیں۔ زبردستی بھی لے جائے جا سکتے ہیں آپ دونوں۔''

''لیکن میں کیوں......'' نورین نے پھر مزاحمت کی۔

''محترمہ جیسا کہا ہے، ویسا کریں ورنہ......'' زاہد شیروانی کا لہجہ سخت تھا۔

نورین دل ہی دل میں بہت گھبرا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایسا کیا ہوا کہ پولیس آفیسر کامران کے ساتھ اسے بھی ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہا تھا۔

''چلیے......'' کامران آگے بڑھا۔

''محترمہ آپ بھی......'' زاہد شیروانی نے کہا۔

نورین سمجھ گئی تھی کہ اس کی بات ماننے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

وہ تینوں باہر نکلے تو کامران اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

''سوری سر......'' زاہد شیروانی نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر روکا۔ ''آپ دونوں میری گاڑی میں چلیں گے۔''

''اوکے......''

کچھ دیر بعد وہ تینوں پولیس ہیڈ کوارٹر جا رہے تھے۔ زاہد شیروانی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ کامران اس کے برابر اور نورین پیچھے بیٹھی تھی۔ کامران اور نورین، دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ نورین کے تو پاؤں تلے جیسے زمین ہی نہ تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا کبھی پولیس سے کوئی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا، یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔

نورین کی پریشانی تو بجا تھی لیکن کامران دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ایک تو وہ پہلے اس کی بے رخی سے پریشان تھا، اب یہ نئی افتاد۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ہی باپ کے قتل کی تفتیش کرنے والا پولیس آفیسر اس سے ایسا کیوں سلوک کر رہا ہے اور نورین...... اسے کیوں اس معاملے میں گھسیٹ لیا گیا ہے۔ اس کی ضرورت کیا ہے۔ لاکھ سوچنے کے باوجود اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

زاہد شیروانی بہت خوش تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ دونوں اتنی آسانی ایک ساتھ ہتھے لگ جائیں گے۔ اس نے تو سوچا تھا کہ پہلے وہ کامران کو پکڑے گا اور اس کے

ذریعے لڑکی تک پہنچے گا لیکن خوش قسمتی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

دو گھنٹے بعد پولیس ہیڈ کوارٹر کے تفتیشی کمرے میں چار افراد موجود تھے۔ ڈی آئی جی پولیس، اے ایس پی زاہد شیروانی، کامران احمد اور نورین۔ اس دوران نورین کے لیے گئے فنگر پرنٹس سے یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ جائے وقوعہ سے ملنے والے گلاس پر اسی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ کامران کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ڈی آئی جی صاحب کی طرف سے شاباشی ملنے کے بعد زاہد شیروانی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

"دیکھیے! سب بات ثابت ہو چکی ہے۔ تم سیٹھ نعمان کو پہچان چکی ہو۔ بہتر ہے کہ تم دونوں......" ڈی آئی جی نے رک کر نورین اور کامران کی طرف چھڑی سے اشارہ کیا۔ "سچ بول دو۔ اب جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"پلیز......" یہ سن کر نورین چلائی۔ "پلیز پلیز...... کامران کو اس معاملے میں نہ گھسیٹیں۔ یہ بے گناہ ہے۔ میں تو صرف چند ماہ پہلے ہی اس سے ملی ہوں وہ بھی بینک اکاؤنٹ کے سلسلے میں۔" اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

زاہد شیروانی چونکا۔ "اس کا مطلب کہ صرف تم......" اس نے چند لمحے توقف کیا۔ "کامران صاحب بے گناہ ہیں تو پھر گناہ گار تم ہو۔" اس نے سوالیہ نگاہوں سے نورین کو گھورتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں......" اس کی آواز خاصی اونچی تھی۔ "کامران کا کوئی قصور نہیں۔ یہ بے چارہ تو خود یتیم ہوا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہنسی۔ "فرق صرف اتنا ہے کہ یہ بیٹا ہے، تعلیم یافتہ ہے، دولت مند باپ کی اولاد ہے ورنہ تو......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ورنہ کیا......" ڈی آئی جی نے پوچھا۔

"اگر سب کچھ اس کے برعکس ہوتا تو شاید میری جگہ یہ ہوتے۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تم کیا بک رہی ہو، سمجھ نہیں آرہا۔" زاہد شیروانی نے میبل پر ٹیپ ریکارڈر رکھتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہے تفصیل سے اپنا بیان ریکارڈ کراؤ۔ ہم اسے ٹرانسکرپٹ کر کے تمہارے دستخط بیان پر لے لیں گے۔"

نورین نے گہری سانس لی۔ وہ جان چکی تھی کہ اب کھیل ختم ہو چکا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ اس کے ذہن میں اپنی ماں کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا۔ "ٹیپ ریکارڈر آن کرو۔ میں بیان ریکارڈ کرانا چاہتی ہوں۔ سب کچھ صاف صاف بتاتی ہوں۔ اب کچھ چھپانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے گردن موڑی اور قریب بیٹھے کامران پر نظر ڈالی۔ "آئی ایم سوری......"

کامران کے چہرے پر سخت پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

"ٹیپ ریکارڈر آن کر رہا ہوں۔ پلیز بیان ریکارڈ کرائیے مگر سب کچھ صاف صاف......" اس نے نورین کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی ہلکی سی کلک کی آواز سنائی دی۔ ٹیپ ریکارڈ آن ہو گیا تھا۔

نورین کچھ دیر تک خاموش رہی اور پھر گہری سانس لے کر بولنا شروع کیا۔ "یہ کہانی شروع ہوتی ہے میرے غریب باپ کی حادثے میں ہلاکت کے بعد......" کمرے میں صرف اسی کی آواز گونج رہی تھی۔ اس کا لہجہ سپاٹ اور آواز پاٹ دار تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہر خوف سے آزاد ہو چکی۔ اسے یہ بھی فکر نہیں کہ جب اس کی ماں کے علم میں یہ سب کچھ آئے گا تو اس پر کیا گزرے گی۔ وہ بولتی رہی۔ باپ کی موت سے لے کر کامران سے ملاقات تک کی ساری کہانی صاف صاف بیان کر دی لیکن وہ احسان فراموش ہرگز نہ تھی۔ وہ نجمہ اور مفلوج آنٹی رضیہ کا تذکرہ بالکل غائب کر چکی تھی۔ اس کی نظر میں آنٹی تو خود زمانے کے ظلم و ستم کا شکار تھی، اسے اس حالت میں کیا اس معاملے میں گھسیٹنا۔

کامران، ڈی آئی جی صاحب اور اے ایس پی شیروانی حیرت سے دم بخود تھے۔ ان کی نگاہیں نورین کے چہرے پر جمی تھیں۔ جب وہ خاموش ہوئی تو کمرے میں مکمل سکوت چھا گیا۔

کامران احمد سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے علم نہ تھا کہ اس کا بظاہر فرشتہ صفت نظر آنے والا باپ اتنا شیطان بھی ہو سکتا ہے۔ اسے اب اپنے باپ کے بجائے نورین پر رونا آرہا تھا۔ اس کی پلکیں نم تھیں۔

"بطور انسان میری نظر میں تم مظلوم ہو لیکن قانون کی نظر میں تم مجرم ہو اور تم خود اس کا اعتراف کر رہی ہو۔" ڈی آئی جی صاحب نے گمبھیر آواز میں کمرے کا سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں اندر کا کرب جھلک رہا تھا۔

''ایک بات کا جواب دو۔ تمہارے بیان سے لگتا ہے کہ تم نے سیٹھ نعمان ہی کو نہیں، کئیوں کو قتل کیا ہے؟'' زاہد شیروانی نے سوال کیا ہے۔

''کیا فائدہ......'' وہ مسکرائی۔ جنہیں مرنا تھا مر گئے، گڑے مردے اکھاڑنے جاؤ گے تب بھی تمہیں کہیں کوئی اور گلاس نہیں ملے گا۔ غلطی ایک بار تھی، ہمیشہ نہیں۔ اگر اس دن گلاس کا صفایا کر دیتی تو یہاں نہ بیٹھی ہوتی۔''

''لیکن پھر بھی، تم نے اس طرح کتنے لوگوں کی جانیں لی ہوں گی۔'' ڈی آئی جی نے پوچھا۔

''پلیز...... ریکارڈ درست کریں۔ میں نے ان کی جانیں لی نہیں، وہ خود اپنی جانیں لٹانے کے لیے آئے تھے۔''

''پھر بھی کتنے......'' ڈی آئی جی نے دہرایا۔

نورین کچھ دیر سوچ میں ڈوبی رہی اور پھر سب پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''چھبیس شیطان......''

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ چھبیس لوگ مارے گئے اور کسی کو پتا بھی نہ چل سکا کہ موت فطری نہیں قتل تھا۔

''ایک اور سوال......'' زاہد شیروانی کی آواز کمرے میں گونجی۔ ''سیٹھ صاحب کی پوسٹ مارٹم رپورٹ تو تصدیق نہیں کر رہی کہ انہیں زہر دیا گیا تھا یا موت غیر فطری تھی۔''

''کر بھی نہیں سکتی۔'' وہ پھر ہنسی۔ ''یہ راز صرف میرے سینے میں ہے۔''

''کیسا راز......'' وہ چونکا۔

''فکر نہ کرو۔ سب کچھ بتا چکی ہوں، یہ بھی بتا دوں گی۔'' یہ کہہ کر لحہ بھر توقف کیا۔ ''بتایئے، اب کہنے کو کیا کچھ باقی رہا ہے۔'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''قتل کا طریقہ اور آلۂ قتل......'' زاہد شیروانی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

نورین نے جواب دینے کے بجائے ٹیبل پر رکھے اپنے ہینڈ بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ایک منٹ......'' زاہد شیروانی اٹھا اور آگے بڑھ کر بیگ چیک کیا۔ اس میں ایسا کچھ نہ تھا کہ جس پر شک کیا جا سکے۔

''اٹھا سکتی ہوں......'' وہ پلٹا تو نورین نے بیگ کی طرف دوبارہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

ڈی آئی جی صاحب نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔

''ایک گلاس پانی......'' نورین نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

زاہد شیروانی نے بوتل سے گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھایا۔

نورین نے ہاتھ بڑھا کر گلاس سامنے کیا اور بیگ سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ یہ ہومیو پیتھک ڈراپس جیسی شیشی تھی۔

''یہ کیا ہے......'' ڈی آئی جی صاحب چونک کر بولے۔

''الرجی کی ہومیو پیتھک دوا...... دیکھ لیں۔'' اس نے شیشی آگے بڑھائی اور اپنی سرخ آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے الرجی ہے۔ لگتا ہے پھر اٹیک ہو رہا ہے۔ دوا نہ لی تو بولنے کے قابل بھی نہیں رہوں گی۔''

''او کے، لیجیے۔'' ڈی آئی جی صاحب اس کے جواب سے مطمئن ہو گئے۔ ویسے بھی انہیں نہیں لگتا تھا کہ اتنا کھلا بیان ریکارڈ کرانے کے بعد اب وہ بچنے کی کوئی کوشش کر سکتی ہے۔

نورین نے پانی میں تین ڈراپس ڈالے۔ شیشی تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ اس نے شیشی کو جھٹک کر ایک اور قطرہ ٹپکایا۔ اب شیشی بالکل خالی ہو چکی تھی۔ اس نے ایک بار پھر سب کی طرف غور سے دیکھا اور مسکرائی۔ اسی دوران اس کی آنکھوں میں ماں کا چہرہ گھوم گیا۔ آنکھیں چھلک گئی تھیں۔ دیکھنے والے سمجھے کہ الرجی کا اثر ہے۔ اس نے سر جھکا کر آنکھیں بند کیں۔ تصور میں ماں سے معافی مانگی۔ ان کے ماتھے کا بوسہ لیا اور ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول کر سر اوپر اٹھایا۔ ''کامران......'' پر گہری نظر ڈالی اور آہستہ سے کہا۔ ''سوری...... میں واقعی تمہیں چاہنے لگی تھی۔''

''تو پھر دو چار روز سے خفا کیوں تھیں۔'' کامران نے اداسی سے پوچھا۔

وہ ہنسی۔ ''لنچ کے بعد جب میں کولڈ ڈرنک تمہارے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو دیوار پر لگی سیٹھ صاحب کی تصویر پہچان لی تھی۔ اس کے بعد......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرائی۔ ''میں خود کو تم سے نظر ملانے کے قابل تک نہیں سمجھ رہی تھی۔''

''اور وہ سیٹھ صاحب کی رقم۔'' زاہد شیروانی نے پوچھا۔

نورین نے گردن موڑ کر اس کی طرف چند لمحے خاموشی سے دیکھا اور پھر کہنے لگی ''میں اپنے شکار کے پاس یا اس کے گھر میں موجود تمام نقدی اپنا خراج سمجھ کر ساتھ لے جاتی تھی لیکن پہلی بار مجھے اتنی بڑی رقم ملی تھی۔ سوچا تھا کہ یہ آخری شکار ہوگا لیکن......''

یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے گلاس کی طرف دیکھا اور زیرِ لب کہا۔ ”کیا معلوم تھا کہ اپنا آخری شکار میں خود ہی ہوں گی۔“ یہ کہہ کر نورین نے ایک ہی سانس میں بھرا گلاس ختم کر دیا۔ خالی گلاس ٹیبل پر رکھا اور گہری سانس لی۔ اب وہ بہت زیادہ پُرسکون نظر آرہی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر پولیس افسران کی طرف دیکھا ”اب بتاتی ہوں میں ان شیطانوں کو کیسے ختم کرتی تھی۔“

”کیسے......“ دونوں پولیس افسران نے بیک وقت کہا۔

”میں انہیں ایک ایسے کیمیائی مادّے کے ڈراپس کولڈ ڈرنکس میں ملا کر پلاتی تھی جسے اگر دوا میں شامل کیا جائے تو وہ خون کا پتلا پن ختم کر کے اسے نارمل کرتا ہے لیکن خالص حالت میں اس کا ایک قطرہ انسان کے اعصاب کو، دوسرا قطرہ اس کے جسم کو مکمل مفلوج کر دیتے ہیں اور تین سے چار قطرے چند منٹوں میں موت کی نیند سلانے کے لیے کافی ہوتے تھے۔“

”لیکن سیٹھ صاحب کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں تو ایسا کچھ نہیں بتایا گیا ہے۔“ زاہد شیروانی نے استفساریہ نظروں سے فائل کی طرف دیکھا۔

”کیسے ہوتا۔“ وہ ہلکا سا مسکرائی۔ ”اس دوا سے انسانی جسم میں خون گاڑھا ہونے لگتا ہے۔ حرام مغز میں فوری طور پر بلبلے بنتے ہیں اور جب لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جائے تو لگتا ہے کہ موت فطری تھی۔ دل یا فالج کا دورہ پڑا تھا۔“

”تمہیں یہ دوا کہاں سے ملی؟“ ڈی آئی جی صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔ بیس سالہ ملازمت میں پہلی بار وہ قتل کا ایسا کیمیائی طریقہ سن رہے تھے۔

”بتایا تھا نا کہ میں نے دو سال میڈیسن فیکٹری میں کام کیا تھا، وہیں سے چرائی تھی۔“ وہ نجمہ کا نام نہیں لینا چاہتی تھی۔

”اس دوا کے تین قطرے پینے کے بعد موت کتنی دیر میں واقع ہو جاتی ہے؟“ زاہد شیروانی کے لہجے سے بھی حیرانی جھلک رہی تھی۔

”زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔“ نورین کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

”کہاں ہے وہ دوا؟“ زاہد نے پوچھا۔

”یہ رہی خالی شیشی۔“ نورین نے انگلی سے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے شیشی اٹھائی۔ اس پر کوئی لیبل نہ تھا۔ ”مگر تم نے تو کہا تھا کہ یہ تمہاری الرجی کی دوا ہے۔“

”جھوٹ بولا تھا۔“ وہ ہنسی۔ ”زندہ رہتی تو مزید رسوا ہوتی۔ تب مردوں نے کیا اب مردوں کا بنایا قانون کرتا مگر......“ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ”مجھے یقین ہے کہ سیٹھ کی نیک نامی کی خاطر تم لوگ میری لاش کو رسوا نہیں کرو گے۔ آخر کو وہ عزت دار تھا نا۔“ نورین نے بدقت تمام طنزیہ ہنسی ہنسنے کی کوشش کی۔

”ایمبولینس منگواؤ......“ ڈی آئی جی نے چلا کر کہا۔

”کوئی فائدہ نہیں۔ ایک دو منٹ میں کھیل ختم...... بس میری لاش کو عزت سے میری ماں کے پاس پہنچا دینا۔ اسے کچھ پتا نہ چلے......“ اس نے رک رک کر لڑکھڑاتی زبان میں بدقت تمام کہا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ چکی تھیں اور پھر اس کے ہاتھ کرسی کے ہتھے سے نیچے لٹکنے لگے۔ گردن ایک طرف کو ڈھلک چکی تھی۔

تینوں اس کے گرد دم بخود کھڑے تھے۔ کامران کی آنکھیں تر تھیں۔ کسی کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کو کچھ نہ تھا۔ سب افسردہ تھے۔

آخر ڈی آئی جی صاحب نے کامران کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”اب بتاؤ، اس کیس کا کیا کریں۔ انکوائری اوپن ہوتی ہے تو پھر سیٹھ صاحب کا کردار سامنے آئے گا۔“ یہ کہہ کر چند لمحے توقف کیا۔ ”کیا کریں؟“

”کیس داخلِ دفتر کریں۔ آج جو کچھ ہوا، وہ سب بھول جائیں، سمجھیں نورین نے کچھ نہیں کہا۔ اب کچھ فائدہ نہیں۔“ کامران کی آواز بھرا رہی تھی۔

”ٹھیک کہتے ہو، کیس چلا تو پھر یہ کون طے کرے گا کہ قاتل کون مقتول کون......“ زاہد شیروانی نے افسوس سے کہا۔

ڈی آئی جی صاحب نے یہ سن کر گردن موڑی اور اپنے ماتحت افسر کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ ”سارے ثبوت اور تفتیش جو تم نے کی ہے، اسے ضائع کر دو۔ ریکارڈ کے لیے لاش کا معائنہ کراؤ اور کاغذی کارروائی میں موت کا سبب دل کا دورہ اور مقام بینک ہوگا۔“

”میں نورین کی میت اس کی ماں کے پاس لے کر جاؤں گا۔“ کامران نے لاش کے بے جان پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

باہر سے ایمبولینس سائرن کی گونجتی آواز قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔